ماهنامه



بانی:- حافظ محمد عبدالرحمٰن سہیل سہسرامی • بیادگار:- زین العابدین اختر وادریس [illegible] سہسرامی

ماہنامہ سہیل

شمارہ
جلد اشارہ

فی شمارہ ——— ۳/- روپے
زر سالانہ ——— ۳۰/- روپے
لائف ممبری ——— ۵۰۱/- روپے

فہرست

نمود	۵
دریچہ سیم و سمن کی روشنی - ڈاکٹر تارا چرن رستوگی	۶
شمالی ہند میں اردو مرثیہ [illegible] - ڈاکٹر سید [illegible]	۸
جاپانی نظمیں - (ترجمہ) ڈاکٹر [illegible]	۱۳
[illegible] - منصور [illegible]	۱۵
نظمیں:- جینت پرمار	۱۵
غزلیں:- علی عباس امید، ڈاکٹر سعید عارفی	۱۶
غزلیں:- کلیم حیدر شرر، م۔ ق۔ نجمی	۱۷
غزلیں:- شاہد میر، رسول ساقی	۱۸
غزلیں:- شان بھارتی، وسیم مینائی	۱۹
غزلیں:- راز اعظمی	۲۰
غزلیں:- گلشن [illegible]	۲۱
[illegible] آئینہ — نور الحسنین	۲۲
تاریکیاں — [illegible]	۳۱
شناخت — ایم [illegible]	۳۵
شہر خیال (خطوط)	۳۸

• خط و کتابت اور ترسیل زر کا پتہ •
ماہنامہ سہیل
ریورسائیڈ روڈ، گیا ۸۲۳۰۰۱
فون نمبر ۲۱۵۸۲



رکیے!

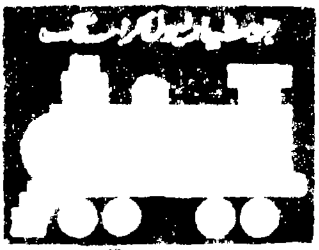


دیکھیے!



سنیے!

کھلی ریلوے لیول کراسنگ کو ہوشیاری کے ساتھ پار کیجیے۔



جنوبی ریلوے

ہندوستانی سیاست - تذبذب کا شکار

ہندوستان سیاسی تذبذب اور فکری بحران کا شکار ہو چکا ہے۔ آزادی کے وقت اور اس کے فوراً بعد ہمارے قائدین نے ملک و وطن کے سامنے جس نظریہ حیات اور سیاسی فکر کو متعارف کیا تھا اب وہ دھندلا چکا ہے۔ اس فکری فقدان نے اسے بے سمتی میں مبتلا کر دیا ہے۔
سب سے اہم خطرناک بات تو یہ ہے کہ ہم ان بنیادی اصولوں سے انحراف کرنے لگے ہیں جن کی دہائی دے کر ہمارے سابقہ مفکرین اور سیاسی قائدین نے آزادی طلب کی تھی اور جن کی پکار پر ہندوستان کے ایک ایک فرد نے حصول آزادی کی جدوجہد کی تھی۔ مگر اب نقشہ بدلتا جا رہا ہے ملک کو مذہبی عصبیت کی طرف لے جانے والی قوت اس وسیع و عریض خطہ کی رنگا رنگی اور عقائد و طرز حیات کے تنوع سے غافل بھی نہیں ہے۔ یہ سب کچھ ایک سوچی سمجھی اسکیم کے تحت ہو رہا ہے اور اس طاقت سے ہو رہا ہے جو ایک بڑی طاقت ہے وہ ہندوستان کو کمزور بنائے رکھنے کے لئے نئے نئے حربے استعمال کر رہی ہے۔ ہاں یہ وہی بڑی طاقت ہے جو ہندوستان کے نظریہ ناوابستگی کا اس طرح مذاق اڑا رہی ہے کہ ہم ایک غلط کاز میں اس کے شریک کار بنے ہیں اور جس جنگ کی ہم مخالفت کرتے رہے ہیں اسے لڑنے کے لئے اس بڑی طاقت کے جنگی جہازوں کو تیل دینے پر مجبور رہے ہیں۔ نظریہ اور پالیسی کا یہ فقدان ہمیں کہاں لے جا رہا ہے۔ کیا ہمارے سیاسی قائدین یہ نہیں دیکھ رہے ہیں؟

(ادارہ)

ڈاکٹر تاراچرن رستوگی

فضا ابن فیضی "دریچۂ سیم و سمن" کی روشنی میں

موجودہ اردو شاعری درماں حالیکہ نئے اثرات
مرتب ہونے کے سبب "سنگِ سیہ" میں ہوتی جا رہی ہے۔ ہنوز
گل سبزہ بھی ہے۔ فضا ابن فیضی اردو کے ایسے شاعر ہیں جن
کو گلِ سرسبز کہا جا سکتا ہے۔ ہر اچھی شاعری ہر دور میں
ہم عصر رہی ہے [illegible] استعارہ بھی ہوتی ہے۔ اقبال کی
شاعری تقسیم وطن کے پہلے تحفۂ اسلام قائم کرنے والی
تحریکوں نے اپنے اغراض کے لئے استعمال کی گئی اور ترانۂ ملی
کو شعلہ بنا دیا گیا ہے

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا
مسلم ہیں ہم وطن ہیں سارا جہاں ہمارا

تقسیم وطن کے بعد سے پاکستانیوں اسی پر توڑ ناکام کوشش
جاری کر رہے ہیں کہ اپنے ملک کی ثقافت کو علیحدہ شناخت
دے سکیں۔ یعنی ہندوستان کی ہمہ گیر اور گنگا جمنی تہذیب جو
[illegible] بہت چھڑی ہے اس سے اپنا دامن بچا سکیں۔ مگر کب
تک کوئی چہرہ شاکر اپنی شکل کو چھپائے رکھ سکتا ہے۔
[illegible] فرماں روی کے دور میں اقبال کے قومی ترانہ پر
پابندی لگی رہی یعنی

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

پر پابندی لگی رہی مگر یہ مصرع خلا رسے گونجتا ہوا ابھی آیا۔
ہندوستان کے پہلے خلا رپیما نے شریمتی اندرا گاندھی
وزیر اعظم ہند کے اس استفسار پر کہ وہاں سے آپ کو
ہندوستان کیسا معلوم ہو رہا ہے۔ یہی کہا تھا

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

اقبال کی شاعری استعارہ تو ہے مگر بدقسمتی سے وہ استعارہ
محفوظات ذہنی کی جانب بھی غلطاں کیا جا سکتا ہے اور
کیا گیا ہے۔ فضا ابن فیضی کی ایک تخلیق ہی کا نام استعارہ
آگنیں ہے "دریچۂ سیم و سمن" جو سرورق پر مصور نے دریچہ،
شمع، شمع سے ابھرتی ہوئی کرنیں برگ و گل یاسمین پر
روشنی کا ارتکاز کو بہ زبان صوت گفتنی کو پیش کیا ہے۔ سرورق
ہی شعر آگنیں ہے۔ شعر جو خیال، جذبہ و ترنم کا حسین و جمیل
امتزاج، حواس خمسہ کا سنگم، ایسا سنگم جو چشم حس
(SIXTH SENSE) کا موجب۔ ہر اچھی شاعری
میں یہ حس ضرور ہونا چاہئے اور فضا کے یہاں اس حس کی
کہکشاں ہر جگہ دکھائی دیتی ہے۔ چھٹا حس یعنی وجدان
معنی ہی شعر کو شعری عرش تک پہنچاتا ہے اور وہ ایسا
بھی ایسا عرش جو فرش سے کبھی لاتعلق نہیں ہوتا ہے

بہار راہ بھٹک جائے گی جلائے رکھ
سرِ دریچۂ سیم سمن ابھی مجھ کو

تساب کے بعد اور گرد پوشش پرنٹ کے فوٹو کے نیچے درج فوق شعر دیا گیا ہے لہٰذا شعر ہذا کلیدی حیثیت حامل نظر آتا ہے۔ شاعر معمولی بہار کا شاہد نہیں ہے۔ خوشبو آگیں سمن کے دریچے سے آنکلنے والی کرنوں کا شاید فضا اس منظر کو قائم و دائم دیکھنا چاہتا ہے۔ سیل بہاراں ہی میں بہار مضمر ہوتی ہے۔ بڑی اچھی بات ہے اور بہت اچھا شعر ہے۔ کلیدی شعر ہی کے ذریعہ فضا کی معنویت کو بھرپور سمجھا جا سکتا ہے۔ شاعر کا یہ شعر تعلی پر مبنی نہیں ہے۔ بلکہ معنویت پر ستوار ہے ۔

میں اپنے دور کے ہر تجربے میں زندہ ہوں
مرے شعور کا ماضی ہے حال میں گم سا

بہ زبان فلسفہ بالقصد و اشتیاقِ شعور۔(INT-)

-ENSIONALITY OF CONSCIOUSNESS=

ایسے ہی وجدانی قوت کو کہتے ہیں۔ فضا کے یہاں فکری نکات کی جذبات میں دل پذیر کشیدہ ہر مقام پر نظر آتی ہے۔ اسی وصف سے متصف دیکھئے درج ذیل متفرقات:

جواب روایت سے ہے عہد میں اپنے تجربوں کا کلیہ بھی
الگ کسی سطح پر نہیں بلکہ فن کے محور نئے پالنے

ہر نفس سلسلہ سنگ زنی ہے گویا
زندگی ٹوٹتے خوابوں سے بنی ہے گویا

تم کہیں سے بھی اسے چھو تو نہیں پڑ جاؤ
وہ بدن بھی کوئی ہیرے کی کنی ہے گویا

سیکھے مفہوم رسالت ہم سے
ہم پہ اترے صحیفے آخر

میں اپنے دور کے ہر تجربے میں زندہ ہوں
مرے شعور کا ماضی ہے حال میں گم سا

ادب سے رابطہ دانش کا جانتا ہی نہیں
الجھ کے وہ بھی مرے مسئلوں میں کیا گیا

کوئی حالات کے تیور کو نہ پہچان سکا
قافلے چلتے رہے راہزنوں کے پیچھے

سب یہاں اک دوسرے سے انحراف کر چکے ہیں
دیکھنے میں گو بہت مربوط ہے باہر کار شہر
پھرتا کہاں ہے نے ہوئے میں جستجو کی آگ
خود اپنی کشتِ فکر و نظر میں اتر گیا

اب کسی بات میں ابلاغ کہاں
لفظ و معنی کے وسیلے بھی گئے

شکستنی سہی یہ آئینہ مگر پھر بھی
حقیقتوں کا تعلق نہ خواب سے ٹوٹا

صحیفے طاق پہ رکھ دو سہارا مصلحت کا
کہ تیرا حاصل ہی سلسلہ ہے کھویا

آشوب روزگار سے تنگ ہے واسطہ
اک عزم روزگار سے سلسلہ ہے جینا

درج فوق اشعار محض حقائق گردانے نہیں گئے۔ روایت و تجربہ، مفہوم رسالت و صحیفہ ادب سے رابطہ و انتشار تعلیم، فکر و نظر، لفظ و معنی کے [illegible]
سیل شہر معاملات کو سمجھوں [illegible]
کے بیچ کے حاصل میں [illegible]
نکات فکر و نظر کے سہارے [illegible]

ڈاکٹر سید حسن عباس

شمالی ہند میں اردو مرثیہ کا ارتقا

یہ چیز اظہر من الشمس ہے کہ شمالی ہندوستان میں مرثیہ کے فروغ میں مغل سلطنت اور اس کے ایرانی درباریوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ تاریخ کے سرسری مطالعہ سے بھی یہ حقیقت بیشتر واضح ہو چکی ہے کہ "مغلیہ دربار میں ایرانی اونچے اونچے عہدوں پر فائز تھے۔" [1] اردو مرثیہ کی تاریخ کے مطالعے سے بھی یہ پتہ چلتا ہے کہ اردو شاعری کی ابتدا مرثیہ سے ہوئی اور شمالی ہند میں اردو شاعری کا چراغ دکن کی اردو شاعری کے چراغ سے ہی روشن کیا گیا۔ لیکن شمالی ہند کے شعراء نے دکنی شعراء کی کورانہ تقلید نہیں کی بلکہ اپنی ایک جداگانہ راہ اختیار کی اور اپنی ہی روش پر چلنا باعث افتخار سمجھا۔

دہلی میں مرثیے کی ابتدائی کڑیاں محمد شاہی دور سے ملتی ہیں مگر بعض محققین کا خیال ہے کہ اس عہد سے پہلے بھی مرثیہ گوئی کا سلسلہ [illegible] چکا ہے۔ مگر محمد شاہی عہد کے پہلے کے مرثیہ گویوں کے [illegible] غائب ہیں جس کی بنا پر محققین نے اپنے مطالعہ کا [illegible] شاہی عہد کے پہلے کے شعراء کے مرثیوں میں فارسی اور ہندی زبانوں کا امتزاج پایا جاتا ہے مگر محمد شاہی عہد کے مرثیہ گویوں نے مخلوط زبان کے استعمال سے گریز کیا اور عوامی انداز میں واقعات کربلا نظم کرنے کی روش کی بنیاد ڈالی۔ محمد شاہی عہد میں مرثیہ گویوں کا ایک طویل سلسلہ نظر آتا ہے جنہوں نے اپنے مرثیوں میں واقعات کربلا کو مختلف انداز، طرز فکر نیز شاعرانہ اظہار کے مختلف طریقوں سے نظم کیا ہے۔ محمد شاہی عہد میں مرثیہ گوئی کے فن کو عروج حاصل ہونے کی وجہ بیان کرتے ہوئے پروفیسر اکبر حیدری صاحب اپنی کتاب "اودھ میں اردو مرثیے کا ارتقاء" میں رقم طراز ہیں۔

> "عہد محمد شاہی میں بہت سے شعراء مرثیہ گوئی کی طرف متوجہ ہوئے تھے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ بادشاہ کی زوجہ نواب قدسیہ الزمانی مذہب شیعہ کی پیروکار تھیں۔ اس عہد کے شعراء میں فضلی اور ان کے چھوٹے بھائی کرم علی کے علاوہ سب سے اہم اور مشہور مرثیہ گو میر عبداللہ مسکین تھے۔" [2]

فضلی کے بارے میں دیباچہ کربل کتھا صفحہ ۴۳ پر درج ہے کہ "انہوں نے ۱۱۴۵ھ مطابق ۱۷۳۲ء میں کربل کتھا لکھی اور بعد میں اس پر نظر ثانی کرکے ۱۱۶۱ھ مطابق ۱۷۴۸ء میں مکمل کیا۔ یہ کتاب اشرف علی خاں کی فرمائش پر لکھی گئی تھی۔ فضلی، نواب موصوف کے محل میں محرم کے دنوں میں مرثیہ پڑھا کرتے تھے[1]

اور کرم علی کے بارے میں اس کتاب کے صفحہ ۵۷ پر ہی یہ تفصیلات درج ہیں۔

"کرم علی فضلی کے چھوٹے بھائی تھے۔ پورا نام تخلص میں لاتے تھے۔ انہوں نے کثیر تعداد میں سلام اور مرثیے لکھے۔ سید مسعود حسن رضوی کے کتب خانہ میں ان کے مراثی کا ایک ضخیم مجموعہ ہے اس میں ۱۱۲ مراثی اور ۶۶ سلام ہیں۔ کرم علی نے اس مجموعے سے پہلے ایک اور مرثیے کا دیوان "مرصع الثقا" کے نام سے مرتب کیا تھا۔ انہوں نے ندیم، ہوشدار، مسکین سودا، مرزا ظہور علی، پسر مرزا ہوشدار کے مرثیوں کے جواب میں اور ولی اور سراج کی غزلوں کی زمینوں میں مرثیے کہے ہیں۔"

مذکورہ شعراء کے علاوہ اس دور میں جن مرثیہ گویوں نے مرثیہ نگاری کے میدان میں قدم رکھا ان میں شاہ مبارک آبرو، مصطفیٰ خاں یکرنگ، شاہ حاتم، سراج الدین علی خاں آرزو، میر سعادت علی سعادت امروہوی، غمگین، حزین، جلیل، خواجہ برہان الدین آثم، محمد نعیم دہلوی، شمس الدین فقیر، اعلیٰ علی، نذر علی خاں گمان دہلوی، آفتاب، شاہ عالم بادشاہ، امامی، مرزا مغل، انسان، اسد یار خاں عرف میر مجنوں، باقر علی، بے نوا، مقبول شاہ، بیہوش، حنیف، محمد حفیظ، اشرف، شیخ شرف الدین حسینی، صبوری، ظہیر، عاشق، نواب مہدی علی خاں، آغا ... عاجز

---

[1] بحوالہ اردو میں ... مرثیے کا ارتقاء ... از ڈاکٹر ...

فقیر، میر شمس الدین گریاں، میر حسام علی عرف مرزا ... میرن، نثار، مرتضیٰ خاں، نجات، ... نجات، ... حسن رضا، نیاز، میر محمد علی وغیرہ کے نام ملتے ہیں۔

جہاں تک غزل اور قصیدہ کی ہیئت ... مرثیہ کہنے کی بات ہے تو اکثر تذکروں کے مطابق سودا سے پہلے مرثیہ غزل، قصیدہ، یا مربع کی ہیئت میں کہا جاتا تھا مسدس کے فارم میں مرثیہ کہنے کی روایت سودا سے شروع ہوتی ہے اور اس کی اولیت کا سہرا سودا کے سر ہی باندھا گیا ہے جبکہ بعض محققین نے اس سے اختلاف بھی کیا ہے۔ مثلاً افضل حسین ثابت نے مسدس میں مرثیہ کہنے کی ابتدا کا سہرا حیدری کے سر باندھا ہے[1]۔ لیکن ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی نے اسے مسترد کر دیا ہے۔ دوسری طرف مولانا مجتبیٰ حسین ... مرحوم نے اس کی اولیت کا تاج پنجاب کے شاعر میاں سکندر کے سر رکھا ہے۔ موصوف لکھتے ہیں۔

"...... میر اور سودا کے عہد تک مرثیے جو "چو بولوں" یا چار مصرعوں میں کہے جاتے ... پنجاب کے مشہور مرثیہ گو میاں سکندر نے پہلی بار مسدس کی شکل میں مرثیہ لکھا۔ میاں سکندر سودا کے ہم عصر تھے ان کا مرثیہ اپنی ... میں آج بھی بے نظیر ہے زبان کی سادگی اور جذبات کی اثر انگیزی سے ان کا مرثیہ سدا بہار بن گیا ہے"[2]

میر نے مختلف فارم میں مرثیے لکھے ہیں۔ ان کے مرثیے کا مجموعہ ڈاکٹر مسیح الزماں مرحوم نے مرتب کرکے شائع کر دیا تھا۔ میر کے مرثیے بیشتر مربع کی صورت میں ہیں لیکن ...

---

[1] مرثیہ ... حسینی صفحہ ... از افضل حسین ثابت لکھنوی

[2] ... ۱۹۶۶ء صفحہ ...

... ترکیب بند اور مفرد بھی لکھتا تھا۔ جس کے
... اور خود علم کو ... کیفیت سے لبریز کیا۔ حمد
... نظر روایات اور ... پہلوؤں کے
... میں ... کا مظاہرہ کیا ہے۔ میر نے فارسی کے
مشہور ... گو شاعر محتشم کاشی کے تتبع ...
... کے طور پر بارہ بند کا ایک ترکیب بند لکھا جو
... یہ اردو مرثیہ گوئی میں میر کا ایک قابل
قدر اضافہ ہے۔ ۱

اردو مرثیہ نگاری میں سودا کے کارنامے کا سبھی تذکرہ نویسوں اور مرثیہ کے نقادوں نے اعتراف کیا ہے۔ انہوں نے مرثیہ میں ہیئت اور مواد کے لحاظ سے تاریخی تجربے کئے ہیں۔ سودا نے مفرد، مثلث، مربع، مخمس، ترکیب بند، ترجیع بند، مسدس اور دوازدہ مصرعہ وغیرہ میں مرثیے کہے۔ انہوں نے باضابطہ اسی کے اجزائے ترکیبی کا خیال رکھا اور ... ان کے مرثیے خاص موضوعات پر مشتمل ہیں۔ انہوں نے ایسے بہت سے مرثیے کہے جن میں ہندوستانی طرز معاشرت کو بڑے عمدہ انداز میں پیش کیا ہے۔ بقول ڈاکٹر اکبر حیدری کشمیری۔

"حق تو یہ ہے کہ سودا کے مرثیوں میں درد و کرب اور سوز و گداز کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ ان کے کلام میں مرثیت کے ساتھ ساتھ فنی خوبیاں بھی پائی جاتی ہیں.....
واقعہ نگاری اور ڈرامائی انداز بھی قابل لحاظ ہے۔" ۲

میر اور سودا کے بعد ان کے شاگردوں نے فن مرثیہ ... سنوارنے کی حتی الامکان کوشش کی۔ سودا

۲ اردو میں اردو مرثیے کا ارتقاء صفحہ ۱۹۱

کو اس سلسلے میں کچھ زیادہ ہی امتیاز حاصل رہا ہے۔ ان کے شاگردوں میں نواب مہربان خاں رند، قیام الدین قیام، فضل علی ممتاز، مرزا احسن، شیخ شرف الدین فرخ کا تنقید نگاروں نے خصوصی ذکر کیا ہے۔ ان میں قائم کو کچھ زیادہ ہی افضلیت حاصل ہے۔ قائم نے بھی سودا کے بعد مرثیہ کو ادبی نکھار عطا کیا۔ ان کے مرثیے مربع کی صورت میں ہیں۔

میر کے شاگردوں میں فیض، تجلی، وطادم، اور راسخ عظیم آبادی نے مرثیے کہے۔ راسخ کے مرثیے مسدس کی شکل میں ہیں جس طرح سودا کے شاگردوں میں قائم کو اہمیت حاصل ہے اسی طرح میر کے شاگردوں میں راسخ عظیم آبادی کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

مرزا مظہر جان جاناں کے شاگرد خواجہ احسن بیان دہلوی (متوفی ۱۲۱۳ھ مطابق ۱۷۹۸ء) نے بھی مرثیے کہے ہیں ان کے قلمی دیوان میں دو مرثیے ملتے ہیں۔ اگرچہ میر حسن کا کوئی مرثیہ نہیں ملتا مگر انہوں نے اپنے تذکرے میں اپنی مرثیہ گوئی کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ دوسری طرف خیر علی افسوس کے اس قول سے بھی ان کی مرثیہ گوئی کے بارے میں پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے مرثیے کہے ہیں۔ خیر علی افسوس کہتے ہیں کہ "مرثیے میں سلیقہ نہایت خوب رکھتے تھے" ۴۔ پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب نے میر حسن کے تین مرثیے "اسلاف انیس" میں شامل کئے ہیں۔ دو مربع میں اور ایک مسدس میں ہے۔

کلیات جعفر علی حسرت مرتبہ و شائع کردہ نور الحسن ہاشمی میں ایک مرثیہ ہے جو مسدس میں ہے اور ۲۹ بند پر مشتمل ہے۔ پورا مرثیہ صنعت تلمیح میں ہے جس میں

۳ اردو میں اردو مرثیے کا ارتقاء صفحہ ۱۷۲
۴ دیباچہ سحر البیان

ہے۔ یہ مرثیہ صنعت تلمیح میں ہے جس میں قرآنی آیات نظم کی گئی ہیں۔

مصحفی جرأت کے ہم عصر تھے۔ ان کی مرثیہ گوئی کے بارے میں کسی مستند یا غیر مستند تذکرے میں کوئی اشارہ نہیں ملتا حتیٰ کہ مصحفی نے بھی اپنے تذکروں میں اپنی مرثیہ گوئی کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا ہے۔ لیکن ایسا نہیں کہ انہوں نے مرثیہ نہ کہا ہو۔ ڈاکٹر اکبر حیدری کشمیری مصحفی کی مرثیہ گوئی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ

"دیوان ششم کے آخر میں ایک مربع مرثیہ بھی ہے جو غالباً اہل لکھنؤ کے ماحول و تمدن سے متاثر ہو کر کہا ہے۔ مرثیہ کا لب و لہجہ بڑا رقت آمیز اور مدح فرسا ہے۔ زبان صاف، شگفتہ اور با محاورہ ہے۔ مصحفی نے بھی دیگر شعراء کی طرح حضرت قاسم کی شادی کا حال نظم کیا ہے اور اس مرثیے میں لکھنوی معاشرت کے مظاہر ادا کر کے مرثیہ میں تاثیر پیدا کی ہے۔ مصحفی نے مرثیہ میں شگفتگی بیان کے علاوہ نفیس اور عمدہ تشبیہات و استعارات کا مظاہرہ کیا ہے۔" [10]

جرأت کے ایک ہم عصر سعادت یار خاں رنگین بھی مرثیے کہتے تھے بقول ضمیر اختر نقوی —

"مصحفی اور جرأت کے ہم عصر سعادت یار خاں رنگین کا پہلا کلام غیر مطبوعہ ہے۔ اور انڈیا آفس لندن میں محفوظ ہے "دیوان ریختہ" میں دو مرثیے ہیں۔ ایک مسدس اور ایک مربع ہے۔ ڈاکٹر صابر علی خاں نے اپنی کتاب "سعادت یار خاں رنگین" میں مسدس اور مربع مرثیوں کا ایک ایک بند درج کیا ہے۔" [11]

شیر علی افسوس کے ہم عصر اور میر درد کے شاگرد مرزا محمد اسماعیل عرف مرزا جان طپش دہلوی بھی مرثیے کہتے تھے۔ دوسرے شعراء میں [illegible] دہلوی، میر [illegible]، ہدایت اللہ خاں ہدایت، شاہ قدرت اللہ قدرت اور میر محمدی بیدار وغیرہ نے بھی مرثیے کہے ہیں۔ میر درد ہی کے بارے میں تذکرہ نگاروں نے خیال ظاہر کیا ہے کہ وہ امام حسن عسکری علیہ السلام کی اولاد سے تھے مگر باوجود اس کے ان کے یہاں مرثیہ کا پتہ نہیں چلتا۔ ضمیر اختر نقوی نے اس غلط فہمی کے ازالہ کا مطالبہ کیا ہے۔ [12] اردو مرثیہ پاکستان میں صفحہ ۶۵-۶۶

غالب، ذوق، مومن، ممنون اور بہادر شاہ ظفر نے بھی مرثیہ گوئی کو جلا دینے کی کوشش کی [illegible] مومن نے تو سرے سے مرثیہ گوئی کی طرف توجہ نہیں کی اور غالب تین بند سے آگے نہ بڑھے۔ صرف ذوق کے مرثیے اور سلام ملتے ہیں۔ بہادر شاہ ظفر کے کلیات میں رثائی اشعار کی کمی نہیں ہے ایک مرثیہ کا ذکر ضمیر اختر نقوی نے اپنی کتاب "اردو مرثیہ پاکستان میں" کیا ہے جو ان کے ذخیرہ مراثی میں [illegible] مطلع ہے۔

جب آمد آمد شہدائے خوش خصال ہوئی

یہ مرثیہ مسدس میں ہے۔

۱۸۵۷ء کے غدر نے دہلوی شعراء کو ہجرت پر مجبور کر دیا تھا لہٰذا اب شاعری خاص کر مرثیہ گوئی کے فن میں کوئی رونق باقی نہیں رہ گئی۔ لے دے کر دو شاعر ظہیر دہلوی اور عزیز دہلوی باقی رہ گئے جو مرثیہ کی کبھی کبھی [illegible] نظر آتے ہیں۔ ظہیر، ذوق کے اور عزیز، غالب کے شاگرد۔ داغ کے شاگرد آغا شاعر قزلباش کو دہلی کے آخری مرثیہ نگار کی حیثیت حاصل ہے۔

---

[10] اودھ میں اردو مرثیے کا ارتقا۔ صفحہ ۲۱۳، ۲۱۲

[11] اردو مرثیہ پاکستان میں صفحہ ۹۳



ایکتا پریڈ

ہمارے مرد، عورتیں اور بچے،
ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی،
بودھ، جین، پارسی ۔۔۔۔۔
مشرق سے مغرب • شمال سے جنوب سے
ملک کے چاروں کونوں سے ہزاروں کی تعداد
میں یوم جمہوریہ کی تقریبات میں حصہ لینے کیلئے
آتے ہیں۔
اسی طرح وہ ایک بار پھر ایکتا اور اتحاد کا مظاہرہ
کرتے ہیں اور ذات پات، نسل و مذہب،
خطے اور زبان کی رکاوٹوں کو توڑتے ہوئے خود کو
وقف کر دیتے اور ہمارے کروڑوں عوام کی
فلاح و بہبود [illegible] ہوئے قوم کو
[illegible] کی طرح [illegible] کا عہد کرتے ہیں۔

آئیے پریڈ کے جذبے کو [illegible] اور
رکھیں اور عمل کر کے آگے بڑھیں۔

دو جاپانی نظمیں

ترجمہ :- مناظر عاشق ہرگانوی

ایکافومیے

"تلاش"

میرے آس پاس کے منظر میں
کہیں کوئی غلط فہمی تھی
جو ہواؤں کے بہاؤ کے مرکز سے
بیشک وہیں سے پیدا ہوئی تھی
آس پاس کچھ بھی تو نہیں ہے
میں ٹٹولتے ٹٹولتے سفید دھندلکے کی سمت
بڑھ رہی ہوں
گنگا جیسی کھیل کا شور سنائی دیتا ہے
تنکے آس پاس پہنچتی گئیتی
مٹی کے نیچے دبی
بھولیں بھولیں بھولیں بھولیں لیکن
تبھی تو
کیچڑ سے سن کر بھی
روز روز —— روز
میں کھودتی آئی

اوکا مسافومی

"وقت"

ٹھنڈی کافی کا بڑا سا گھونٹ بھرا
ارے چینی تو ڈالی ہی نہیں
مگر چینی نہیں ہے
وقت گذر چکا ہے کیونکہ
بال سنوارتے وقت دیکھا
کنگھی ٹوٹی ہوئی ہے
نئی کنگھی نہیں ہے
وقت گذر چکا ہے کیونکہ
سفر پر نکلتے وقت
ساتھ چلنے والا دوست کوئی نہیں ہے
کاش! وہ ہوتا تو
چینی کا انتظام کئے رہتا
ٹوٹی کنگھی دیکھ کر، نئی خرید کر رکھ دیتا
سفر پر بھی ساتھ نکلتا، نہ !
مگر وہ نہیں ہے
وقت گذر چکا ہے کیونکہ !!

نئی حکومت ـ عزم اور ارادے

بہار کی موجودہ حکومت انتظامیہ کے نئے طریقے اور عوام کے مسائل کے تئیں متحرک ہے۔ نئی حکومت صوبہ کے چوطرفہ ترقی اور عام لوگوں کے مسائل کے حل کے لئے پرعزم ہے۔ صوبائی حکومت کے ان ارادوں نے نئی امیدوں کی کرنیں جگائی ہیں۔

وزیر اعلیٰ شری لالو پرساد کی قیادت میں صوبائی حکومت کے کچھ فیصلے



- فرقہ وارانہ حادثوں کے لئے اس ضلع سے متعلق ضلع مجسٹریٹوں اور پولس سپرنٹنڈنٹوں کو مشترکہ طور پر ذمہ دار ٹھہرایا جائے گا !
- فرقہ وارانہ فسادات کے روک تھام کے لئے خاص پولیس فورس بنایا جائے گا۔ متاثرہ افراد کو راحت اور دوبارہ بسانے کے کام میں تیزی لائی جائے گی۔
- مختلف تنظیموں کے ذریعہ امن و امان کی کوشش !
- وزیر اعلیٰ کے ذریعہ ۴۸ گھنٹوں کی بھوک ہڑتال
- ذمہ دار افراد کے خلاف فوراً تادیبی کاروائی
- حال میں رام نومی کا تیوہار امن و امان سے گزرا جو حکومت کے عزم کی علامت ہے

آپ کی سرکار : آپ کے لئے

جاری کردہ : محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ، بہار

P.R. No-296 (INF-216) 90-91

منصور اعجاز

گہری نیند بھی کیا ہوتی ہے

خواب ادھورے، یاد ادھوری
ایسی نیند بھی کیا ہوتی ہے
ایسی نیند میں اکثر مجھ کو
خواب میں ہر دم سانپ آتے ہیں
میں بھی پھر اک تازہ جنوں میں
دوڑ دوڑ کے ان سانپوں کو
موت کے گھاٹ لگا دیتا ہوں
لیکن دن میں، دن بھر مجھ کو
گھر کے اندر گھر کے باہر
سڑکوں، گلیوں اور دفتر میں
سانپ ہی سانپ نظر آتے ہیں
روز خواب میں بے خوفی سے
مار دیا کرتا ہوں جن کو
دن میں زندہ ہو جاتے ہیں

جینت پرمار

(۱)

بگلے کے مانند ہیں ہم
جب بھی باتیں کرتے ہیں
گھاس پہ بکھرے پتے بھی
تتلی کی مانند اڑ کر
بیٹھ گئے ہیں شاخوں پر

(۲)

سبزہ سبزہ دھوپ کھلے گی
اک اک چیز میں چمکے گی
میرے سرہانے میں جھلکے گی
اور ابھی کچھ دیر کے بعد
مجھ کو اندھے کے اک پرچھائیں
بھاگ مرگ سے نکلے گی

علی عباس ازل

بہت اُسے شبہ ہے گرہ زلف گرہ گیر نہیں
شگوں برا ہے کہ اس کا کوئی اسیر نہیں
نہ حادثے ہی نئے ہیں نہ واقعات نئے
الاؤ سونا پڑا ہے کوئی سمیر نہیں
تمہیں نہ پا کے بھی ہم بہر حال جی لیں گے
یہاں کسی کے لئے کوئی ناگزیر نہیں
یہ دونوں مہرے ہٹا دو تو کھیل اچھا ہو
وہ بادشاہ ہی غلط ہے جو خود وزیر نہیں
میں تجھ سے لوح و قلم پا کے مطمئن کیوں ہوں
مری نگاہ میں اتنا بھی تو فقیر نہیں
ترے حضور سب ہی موسموں کے دو تحفے آئے
مگر بہار کا اب بھی کوئی سفیر نہیں
میں روشنی سے اندھیرا کئے ہوں آنکھوں میں
وگرنہ مجھ سا دو عالم میں بھی بصیر نہیں
اسے خدا کی طرح اور مجھے صنم کی طرح
نشے میں اس طرح آتا مرا خمیر نہیں
خدا بھی اپنی جگہ ہوگا اور شیطاں بھی
کہیں کا میں نہ رہوں گا اگر ضمیر نہیں

ڈاکٹر سعید عارفی

تمام شہر میں اس کا ہی بول بالا تھا
جو لفظ تو نے سرِ رہگزر اچھالا تھا
خیال و فکر کی الجھن سے بچ سکے نہ دماغ
ہر ایک کمرے میں بس مکڑیوں کا جالا تھا
اٹھا جو درد تو احساس یہ ہوا مجھ کو
کہ دل کے پاس ہی سورج کا رنگ کالا تھا
حسین لمحے جو سرشاریوں میں گزرے تھے
انھیں کو فکر کے سانچے میں دل نے ڈھالا تھا
پگھل رہا ہے بدن اپنی آنچ سے اب تک
جو خواب دیکھا تھا میں نے بڑا نرالا تھا
سفر طویل تھا ویران راستے تھے مگر
تمہاری یاد نے ہر گام پر سنبھالا تھا
گزر رہی تھی جھلس کر بدن کو بادِ بہار
ہمارے گرد عجب زندگی کا ہالا تھا

کلیم حیدر شرر

آئینہ در آئینہ قد آوری کا کرب ہے
گمشدہ دانشوری ہے خودسری کا کرب ہے

میرا دکھ یہ ہے کہ میں نامعتبر لشکر میں تھا
سر بہ نیزہ میں نہیں ہوں اک جری کا کرب ہے

بھوک کو نسبت نہیں گیہوں کی پیداوار سے
میرا دسترخوان خالی طشتری کا کرب ہے

اپنے دروازے پہ بیٹھا سوچتا رہتا ہوں میں
میرا گھر اجداد کی بارہ دری کا کرب ہے

اک طرف یاروں کی یاری کا بھرم کھلتا ہوا
اک طرف اخلاص کی بخیہ گری کا کرب ہے

وقت کی میزان پر بینائی خنداں ہے شرر
کم بینوں میں بھی اب دیدہ وری کا کرب ہے

م۔ش۔ نجمی

زمیں تھی تنگ کھلا آسمان کیا رکھتے
ہم اپنے سر پہ کوئی سائبان کیا رکھتے

بہت طویل تھا گم نام چاہتوں کا سفر
کہ چل رہے تھے مسلسل تکان کیا رکھتے

جہاں بھی چھاؤں نظر آ گئی بچھا کے کتاب
اک عمر دشت میں گزری مکان کیا رکھتے

بھنا رہے ہیں بزرگوں کی نیک نامی جو
وہ اپنا نام و نسب خاندان کیا رکھتے

جھلس گئے تھے تمازت سے [illegible]
وہ اپنے آپ میں اونچی اڑان کیا رکھتے

کچھ ان کے رنگوں میں خوشبو ضرور تھی ورنہ
گلاب جیسے بھلا آن بان کیا رکھتے

شاہد [illegible]

[illegible] اتنا گہرا پانی کا
[illegible] سے رشتہ پانی کا
[illegible] گہرا پانی کا
[illegible] گیا ہے لہجہ پانی کا
[illegible] تو آنکھوں سے آنسو نکلے
[illegible] دونوں کو رشتہ پانی کا
[illegible] کی بوچھار بھی سہنا ہے مجھ کو
[illegible] ہاتھ میں ہے مشکیزہ پانی کا
[illegible] ریت پہ لکھا ہے [illegible]
[illegible] نے سمجھ لیا ہے لہجہ پانی کا
[illegible] آنکھوں میں بھر لینا [illegible]
[illegible] ہو جاتا ہے [illegible] پانی کا
[illegible] آنسو [illegible]
[illegible] اب کے دریا [illegible] پانی کا

[illegible] آب [illegible]
[illegible] میں پھرتا ہے دریا پانی کا

رسول ساقی

بام غزل پہ جب وہ نمودار ہو گئے
سب میری شاعری کے پرستار ہو گئے

ان کی گلی سے میرا گزرنا نہ ہو سکے
کل تک جو بک رہے تھے خریدار ہو گئے

جب سے خبر ملی ہے مری زندگی ہے تو
سب میری زندگی کے طلب گار ہو گئے

اک اجنبی ملا مجھے اپنوں کے درمیاں
ہم شکل اس کی دیکھ کے بیدار ہو گئے

اس کو حیا کا مجھ کو انا کا خیال تھا
ہم اپنی اپنی راہ میں دیوار ہو گئے

میری وفا کا حد سے گزرنا غلط نہیں
تم بھی تو ساتھ دینے کو تیار ہو گئے

خدارا مت ستاؤ یاد آ کے
بہت شرمندہ ہوں تم کو بھلا کے

جفائیں آج زیادہ مستند ہیں
بجا لے کیا گئے کل سعی وفا کے

حقیقت کیا ہے تیرے سامنے ہے
بہت چرچے تو ہیں میری انا کے

جلایا اس قدر کہ بجھ گیا میں
ہوا مصدقے تری تقلید حیا کے

قضا نے ناتوانی کے سہارے
اٹھایا تو مجھے لیکن گرا کے

ستانا مضطرب کرنا وطیرہ
کئی مفہوم ہیں ان کی ادا کے

شان بھارتی

یوں تو ہر اک قدم پہ ہے فتنہ ہوا کے ساتھ
ہے عافیت اسی میں کہ چلنا ہوا کے ساتھ

ہلچل ہو یا سکون، رہے بادباں شکار
آیا کہاں ہمیں کبھی بہنا ہوا کے ساتھ

میرے لئے تو سانس بھی لینا محال ہے
ہیں لوگ محوِ خواب برہنہ ہوا کے ساتھ

میرے مزاج کو نہیں منظور واقعی
رونا ہوا کے ساتھ نہ ہنسنا ہوا کے ساتھ

خود اعتمادی اس کو کہاں راس آئے گی
جس کی سرشت میں ہے بدلنا ہوا کے ساتھ

میں شمعِ رہگذر ہوں تو گھبراؤں کس لئے
یہ جانتا ہوں شان ہے، لڑنا ہوا کے ساتھ

غزل

وسیم مینائی

یہ جل جاتے ہیں لب تک آہ کبھی آنے نہیں دیتے
مدد کے واسطے آواز یہ دل والے نہیں دیتے

کہیں پر ذکر ان کا بھی نہ آ جائے اسی ڈر سے
وہ رودادِ محبت ہم کو دہرانے نہیں دیتے

مرے بچے بھی میری ہی طرح خود دار ہیں شاید
خیالِ مفلسی مجھکو کبھی آنے نہیں دیتے

چلے ہو میکشو پینے مگر تم ہوش مت کھونا
کسی کو راستہ گھر کا یہ میخانے نہیں دیتے

وہ جس کے حسن کی تاریخ تم نے خود ہی لکھی تھی
وہی تصویر کیوں دنیا کو دکھلانے نہیں دیتے

وسیم انصار نے ایسے ستم ڈھائے مہاجر پہ
کہ ہم ہجرت کا لب پر نام بھی آنے نہیں دیتے

راز اعظمی

دل و دماغ میں اک اضطراب چھوڑے گا
وہ میری جاگتی پلکوں پہ خواب چھوڑے گا
بدلتے وقت کے قدموں پہ گر نہ روک لگی
کوئی شگوفہ نیا انقلاب چھوڑے گا
نظامِ فطرتِ عالم بدل گیا جو کبھی
زمیں پہ دھوپ نئی آفتاب چھوڑے گا
ہماری پیاس بڑھانے کو ریگزاروں میں
نہ جانے کتنے ہی دریا سراب چھوڑے گا
میں ترکِ مے کا ارادہ کروں تو کیسے کروں
مرے لبوں کو یہ جام شراب چھوڑے گا
ہوا جو نالہ کناں رازؔ بزمِ ہستی میں
ہر ایک چہرے پہ غم کا عذاب چھوڑے گا

ہر ایک تن سے جدا سر ہے کیا کیا جائے
غضب میں تیغ ستمگر ہے کیا کیا جائے
نظر اٹھے تو رگِ جاں پہ چوٹ لگتی ہے
کچھ ایسا شہر کا منظر ہے کیا کیا جائے
یہ ماہ جون ہے لیکن عجیب حالت ہے
دماغ و دل میں دسمبر ہے کیا کیا جائے
کسی پہ بوم کا سایہ، کسی پہ ظلِ ہما !
یہ اپنا اپنا مقدر ہے کیا کیا جائے
تو حق نوا سہی، لیکن ترے حریف کے ساتھ
دروغ گویوں کا لشکر ہے کیا کیا جائے
پڑی ہے سب کو یہاں آج نفسی نفسی کی
بپا وہ فتنۂ محشر ہے کیا کیا جائے
اگرچہ رازؔ کا کیسہ ہے مال و زر سے تہی
مگر وہ دل کا تونگر ہے کیا کیا جائے

غزلیں

گلشن پروینا

چشم تر اے چشم تر اے چشم تر
کس لئے بے نور ہیں شام و سحر
پرسشِ اہلِ کرم کیا خاک ہو؟
ہم تو لے پائے نہ اپنی ہی خبر
یہ حسیں شام و سحر یہ رات دن
یہ سبھی کچھ آپ کے زیرِ اثر
دور تک یادوں کا سایہ بھی نہیں
کس قدر سنسان ہے دل کا نگر
جس نے پہنا ہو ستاروں کا لباس
آ نہ پائی ایک بھی ایسی سحر
قافلے الفت کے جن پر تھے رواں
آج کل سنسان ہے وہ رہگزر
میکدے کی راہ میں تنہا نہ تھے
آپ کا غم تھا ہمارا ہمسفر
جو تھے کل تک باعثِ رشکِ حیات
وہ بھٹکتے پھر رہے ہیں در بدر
پھر ہوا پرویز زخمِ دل ہرا
پھر اٹھی ان کی نگاہیں معتبر

غزلیں

زندگی میں یہ بھی اک عالم رہا
اپنے گھر میں اپنا ہی ماتم رہا
کانپ کانپ اٹھا خوشی کے نام سے
عمر بھر دل کا یہی عالم رہا!
حسرتوں کے خون سے روشن کیا
پھر بھی فانوسِ وفا مدھم رہا
تشنگیٔ عشق کا عالم نہ پوچھ
بادۂ مہر و مروت کم رہا
موت کی ہر کشمکش کے باوجود
اپنی وحشت کا وہی دم خم رہا
ہم تو اک اک بوند کو ترسا کئے
وقت کے ہاتھوں میں جامِ جم رہا
ہم نے تو یہ قید رو کر کاٹ لی
کون جانے ان کا کیا عالم رہا؟

شری لالو پرساد وزیر اعلیٰ بہار

ہی متحرک قیادت میں

نئے بہار کی حقیقت

دیہی بہار کی ترقی

(۱) ریاست میں پہلی بار فرقہ وارانہ ہم آہنگی کا نیا ماحول بنا ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے سبھی تہوار پرامن طریقہ سے اختتام پذیر ہوئے فرقہ وارانہ فسادات کو انتظامی چوکسی سے کچل دیا گیا ہے۔ گذشتہ رام نومی کے موقع پر اور ۳۰/ اکتوبر کو وزیر اعلیٰ بہار نے خود اپواس کرکے فرقہ واریت پر قابو پانے کے گاندھی وادی طریقے کو اپنایا جس کا بہت ہی اچھا اثر ریاست کے عوام پر پڑا۔ حکومت کی ان کارروائیوں اور اور دیگر ترقیاتی پروگراموں کے ذریعہ اقلیتوں کے ذہن میں تحفظ کا احساس اور تابناک مستقبل کی توقع پیدا کرنے میں حکومت کامیاب ہوسکتی ہے

(۲) بدعنوانی کے خلاف ریاست کی تاریخ میں پہلی مرتبہ بہت بڑے پیمانے پر مہم چلائی گئی ہے۔ چھاپہ ماری کے ذریعہ کروڑوں روپے کی ناجائز املاک کا پتہ لگایا گیا ہے۔ اور کئی افسران کو رنگے ہاتھوں رشوت لیتے ہوئے پکڑا گیا ہے۔ اس کا اثر ہوا۔

(۳) ریاست کی تاریخ میں پہلی بار لیپڈ مہم چلا کر حکومت کے کروڑوں روپے کے مارچ لوٹ پر روک لگائی گئی ہے۔ محکمہ نگرانی کو زیادہ موثر طور پر کام کرنے کے لئے حکم دیا گیا ہے۔

(۴) حکومت نے پہلی دفعہ مضبوطی کے ساتھ بہار کا موقف مرکزی حکومت کے سامنے رکھا ہے جس سے فلڈ کنٹرول، صنعتی فروغ، ریلوے مواصلات، بجلی اور معدنی اشیاء سے موصول ہونے والی آمدنی میں بہار کی حصہ داری کی راہ ہموار ہوئی ہے۔

(۵) چھوٹا ناگپور اور سنتھال پرگنہ کے لوگوں میں اعتماد کا ماحول پیدا کرکے ریاستی حکومت جھارکھنڈ تحریک کو مشتعل ہونے سے بچانے میں کامیاب رہی ہے

(۶) بھاگل پور فساد سے متاثر لوگوں کی باز آبادکاری کے لئے موثر کارروائی کی گئی ہے

(۷) اس سال خریف پیداوار کا نشانہ ۷۵ر۴۰ لاکھ ٹن ہے۔ بیج، کھاد اور جراثیم کش ادویات کی تقسیم موثر طریقے سے کی گئی ہے۔ کسانوں کے گنا کی بقایا قیمت کی ایک بڑی رقم اس سال میں ادا کر دی جائے گی۔ سنتیل پور، امرپور، جھولکہ

سوپول، پچرونی اور دھنباد میں پرائیویٹ صنعت کاروں کے ذریعہ جیننگ مل قائم کرنے کا کام کیا جا رہا ہے۔

(۸) مربوط دیہی ترقیات پروگرام کے تحت ۴٫۵۰ لاکھ خاندانوں کو قرض فراہم کرنے کا نظم کیا گیا ہے۔ اس پروگرام کو تیزی سے چلانے کی مہم شروع ہو گئی ہے۔ پٹنہ، جمشید پور اور دیگر اہم مقامات پر وزیر اعلیٰ خود کیمپ میں حاضر ہو کر املاک کی تقسیم کر چکے ہیں۔

(۹) شمالی بہار کے سیلاب سے متاثر حلقہ میں بار اسر راچکیہ سڑک میں سکر مہا ندی پر زیر بکڑی گھاٹ پل کی تعمیر اولیت کی بنیاد پر کی گئی ہے۔ گنڈک ندی میں ریوا گھاٹ ندی پل اور بھاگلپور میں گنگا ندی پل پر سنگ بنیاد کر دیا گیا ہے۔ باگمتی ندی میں آبی بہاؤ کو کنٹرول کرنے کے لئے جیلوا دھار میں ایک ریگولیٹر کا تعمیری کام تقریباً ۸٫۵ کروڑ روپے کی لاگت سے شروع کیا گیا ہے۔

(۱۰) چھپرہ میں جے پرکاش نارائن یونیورسٹی قائم کی گئی ہے اور اسے چالو کرنے کے لئے ٹھوس کارروائی کی جا رہی ہے۔ رانچی ضلع کو صد فی صد خواندہ بنانے کی کارروائی کی گئی ہے۔

(۱۱) زراعت اور پھل پر مبنی صنعت، ریشم اور سوت کرگھا صنعت، ہینڈی کرافٹ اور خواتین کے ذریعہ چلائی جا رہی چھوٹی صنعت کے فروغ کے لئے اولیت کی بنیاد پر کارروائی کی جا رہی ہے۔ ۹۱-۱۹۹۰ء میں ۱۰ ہزار سو ایکڑ زمین پر طبری کے پودے لگانے کے پروگرام سے ۹ ہزار لوگوں کو روزگار مل سکے گا۔

(۱۲) میڈیکل کالج کے اسپتالوں، صدر سب ڈویژن اور ریفرل وغیرہ اسپتالوں میں ڈاکٹروں کی تعداد اور خدمت، دوا کی فراہمی اور سپلائی کے لئے منظور روزانہ در میں اضافہ کے اقدامات کئے گئے ہیں۔

(۱۳) اندرا گاندھی انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنسز کے او۔ پی۔ ڈی بلاک کا افتتاح کر دیا گیا ہے۔ انسٹی ٹیوٹ میں پانچ سو بیڈ والے اسپتال کی تعمیر کی جا رہی ہے جس کی جلد پورے ہونے کا امکان ہے۔

(۱۴) خاندانی بہبود پروگراموں کے لئے ۶۰٫۲۴ کروڑ روپے لاگت کی ایک اسکیم پر عالمی بینک سے آخری بات چیت مکمل کر لی گئی ہے۔

(۱۵) پٹنہ میونسپل کارپوریشن میں آبی فراہمی کے مسئلہ کے حل کے لئے تین ٹیوب ویل کی صلاحیت کی توسیع کی گئی ہے۔ چار نئے ٹیوب ویل نصب کئے جا رہے ہیں۔

(۱۶) ریاست میں آبپاشی صلاحیت کے منظور کام کو قومی اوسط تک پہنچانے کے لئے محدود مدتی اسکیم بنائی گئی۔

(۱۷) دس ہزار روپے تک کے قرض معاف کر دیئے گئے ہیں جس کے سند کی تقسیم ایک مہم کے تحت کی جا رہی ہے۔

جاری کردہ

محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ بہار

P. R. NO 2932 (INF-222) 90-91

نورالحسنین

اسرار اور آئینہ

فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ ط
بس بیان کر قصے تو کہ وہ فکر کریں
قال الملا ۹، رکوع ۱۱، الاعراف ۷
کہانیاں کہتے رہو کہ لوگ کچھ تو سوچ بچار کریں۔

اور پھر میری زندگی ایک اور حادثے سے دوچار ہوئی۔ ...کے لئے میں قطعی تیار نہ تھا۔ لیکن حادثات مرضی کے ...ِ منت کب ہوتے ہیں۔ وہ تو بس ہو جاتے ہیں، اور ...ن ان کو یوں بھوگتا ہے جیسے وہ پیدا ہی ان کے لئے ہوا !

میں کسی سندباد جہازی کی طرح اپنی زندگی کے واقعات ...سنا رہا تھا اور میرے اطراف بیٹھے ہوئے لوگ میری طرف تجسس ...ی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔

"ہاں تو بھائیو ——! میں بھی اپنے مقدر سے بے ...پیار کی تلاش میں ساجن پہاڑی تک پہنچ گیا۔"

"اسی ساجن پہاڑی پر ——؟ جس کے متعلق مشہور ...ہ وہاں وہی شخص پہنچ سکتا ہے جس کے پیچھے کوئی رونے والا ...ہ ——؟"

ہاں ہاں —— وہی ساجن پہاڑی ——! میں نے اطمینان سے سگریٹ کا ایک طویل کش لیا۔

"لیکن تمہارے پیچھے آنسو بہانے والے تو بہت سارے ہیں ——؟" ایک سوال میری آنکھوں میں جھانکنے لگا۔

"بھائی ——! کبھی میں بھی یہی سمجھتا تھا۔ مگر وہاں جانے کے بعد یہ راز بھی مجھ پر منکشف ہو گیا کہ میں جن کے لئے اپنی زندگی برباد کر رہا تھا۔ وہ سب خود غرض ہیں ان کا اور میرا ساتھ اس وقت تک باقی رہے گا۔ جب تک میرے ہاتھ پاؤں چلنے پھرنے کے قابل رہیں گے۔" میرے لبوں سے ایک سرد آہ نکلی اور میں نے اس کی لپیٹ میں اپنے سامنے بیٹھے ہوئے ہر شخص کو کپکپاتے ہوئے محسوس کیا۔

"تو تمہاری زندگی ایک حادثے سے دوچار ہوئی!"

"ہاں ——! وہ حادثہ یاد کرتا ہوں تو اب بھی میری آنکھیں بھیگ جاتی ہیں۔ دل بے چین ہو جاتا ہے اور منہ سے ہائے افسوس ہائے افسوس کی صدائیں بلند ہونے لگتی ہیں۔ لیکن میں تم سے کچھ بھی نہیں چھپاؤں گا۔ ممکن ہے تم میری الجھن کو سلجھا سکو۔ اور میں وہ سب پا سکوں

جس کی خاطر برسوں سے بھٹک رہا ہوں — میں نے سگریٹ کو ایک نظر دیکھا، اور پھر ساری نظریں اس کے دھوئیں پر مرکوز ہو گئیں۔ جیسے اسی دھوئیں کی لکیر کے پیچھے سارے اسرار پوشیدہ ہوں۔

" دوستو! وہ کوئی غیر معمولی دن نہ تھا۔ ہمیشہ کی طرح سورج جگمگا رہا تھا۔ آسمان میں پرندے اڑ رہے تھے۔ ہوائیں اپنے رُخ پر شانت بہہ رہی تھی۔ اور میں سا جن پہاڑی کی ترائی میں اترتا جا رہا تھا کہ میں نے دیکھا۔ وہ پیپل کے درخت کے نیچے چپ چاپ کھڑی تھی۔ درخت کے پیچھے ایک جھرنا جھل بل کی آوازوں کے ساتھ بہہ رہا تھا۔ اور پیپل پر بیٹھا ہوا ایک طوطا ٹیں ٹیں کر رہا تھا کاش میں پرندوں کی بولیوں سے واقف ہوتا تو شاید طوطے کی اس وارننگ کو بھی سمجھ جاتا، اور اس حادثے کا شکار ہونے سے بچ جاتا — لیکن نہیں — شاید میں سمجھ بھی جاتا تو اس حادثے سے نہ بچتا، کیونکہ وہ تو بہرحال میری تقدیر میں لکھ دیا گیا تھا۔ یہی یہی تو لوح و قلم کے فیصلے ہیں۔ ارے آدم اور حوا تک ان فیصلوں سے نہ بچ سکے تو بھلا میں کیا اور میری اوقات کیا —؟"

" وہ پیپل کے درخت کے نیچے کھڑی تھی —!

" ہاں — وہ پیپل کے درخت کے نیچے چپ چاپ کھڑی تھی۔ اس کے بدن پر کسی پجارن کا لباس تھا۔ بالوں میں موگرے کے پھولوں کا گجرا، اور ہاتھوں میں ایک پرچی — وہ بار بار اس پرچی کو دیکھ رہی تھی۔ مجھ پر تو جیسے سحر سا طاری ہوتا جا رہا تھا۔ کوئی مقناطیسی قوت مجھے اس کی طرف کھینچ رہی تھی اور جیسے ہی ہماری نظریں ٹکرائیں میں اپنے ماضی کو بھول گیا۔ اور بے خود ہو کر اسے نہارنے لگا۔

لیکن وہ گھبرائی نہیں، اور نا ہی ڈر کر بھاگی، بلکہ میری طرف عجیب نظروں سے دیکھنے لگی۔ پھر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اور میرے ہوش و حواس رخصت ہونے لگے — سچ کہتا ہوں دوستو! اس کے بعد کیا ہوا مجھے کچھ بھی یاد نہیں۔ نہ میرا عمل، اور نا ہی اس کا رد عمل —!

میں ایک لمحے کے لئے خاموش ہو گیا۔ اور لوگوں کے چہروں پر اپنے بیان کی سچائی تلاش کرنے لگا۔ وہ ہمہ تن گوش تھے۔ میں نے پھر کہنا شروع کیا۔

اور پھر جب میں دوبارہ ہوش میں آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہ سارا منظر ہی بدل گیا ہے۔ اب نا وہ موجود، نہ پیپل کا درخت، نہ جھرنا، نہ طوطا — بس سر پر ایک کوا کائیں کائیں کر رہا تھا اور مجھے کسی نے کمزور دھاگوں کی مدد سے ایک سخت چٹان سے باندھ دیا تھا۔ اگرچہ میری طاقت کے آگے ان دھاگوں کی کوئی حقیقت نہ تھی۔ میں اپنی ذرا سی جنبش کے ذریعہ ہی آزاد ہو سکتا تھا۔ لیکن نہیں کیوں مجھے اسی طرح بندھا رہنا اچھا لگ رہا تھا

" لیکن پجارن آخر وہ تھی کون —؟"

" اور وہ جھرنا کیسے غائب ہو گیا؟"

" اور اس کوے کو طوطے کی جگہ کیسے مل گئی —؟

کئی سوالات کا جنم ایک ساتھ ہوا۔ میں نے ہاتھ کے اشارے سے شانت رہنے کی تلقین کی اور پھر شروع کیا۔ " جو سوالات تم مجھ سے پوچھ رہے ہو۔ وہی تو میرے ذہن میں اس وقت کلبلا رہے تھے، اچھا۔ اس حادثے سے متعلق تمہاری کیا رائے ہے —؟"

" وہ یقیناً آسیب رہی ہوگی؟"

"اور وہ سارا منظر آسیبی تھا ـــ!"

"میں نے بھی ابتداً یہی سب کچھ سوچا تھا۔ لیکن بھائی وہ آسیب نہیں تھا، کیا آسیب کو چھو کر ہم اس کے بدن کی ٹھنڈک اور گرمی کا احساس کر سکتے ہیں؟"

"آسیب تو ایک طرح کا ہیولا ہوتا ہے ـــ!"

"لیکن مشکل تو یہی ہے نا ـــ وہ ہیولا بھی نہیں تھی!"

"کیا ـــ؟؟؟"

"ناممکن ـــ!"

"ناقابلِ یقین ـــ!"

"لیکن میں سچ کہہ رہا ہوں، تم میرے بیان پر یقین کرو!"

میں نے سگریٹ کو زمین پر مسل دیا۔ اور پھر کہنا شروع کیا۔

"میں وہیں پڑا رہا، یہاں تک کہ رات ہو گئی۔ ساجن پہاڑی کی رات بڑی پرکشش ہوتی ہے۔ جڑی بوٹیاں انسانوں کی بولیاں بولنے لگتی ہیں۔ عجیب و غریب کیڑے اپنے اپنے بلوں سے باہر نکل آتے ہیں، اور چاندنی ایسی ہوتی ہے جیسے بہت سارے بلب روشن ہوں۔ اچانک میں نے اپنے قریب گھنگھروؤں کی آوازیں سنی۔ اور پھر ایک نسوانی قہقہہ ـــ میں آنکھیں پھاڑے چاروں طرف دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ ٹھیک اسی وقت کسی نے پیچھے سے میری آنکھوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیئے۔ بالکل ٹھنڈے ہاتھ ـــ جیسے برف کی ڈلیاں ـــ میں نے پوچھنا چاہا کہ کون ہے؟ لیکن میری قوتِ گویائی سلب ہو گئی تھی، اور درخت پر بیٹھا طوطا ٹیں ٹیں کر رہا تھا، پھر میرے کانوں نے جھرنے کی چھل بل کی آوازیں بھی سنیں۔ اور وہی نسوانی قہقہہ ـــ میں نے پوری قوت سے اپنی آنکھوں پر رکھے ہاتھوں کو ہٹا لیا، اور جونہی پلٹ کر دیکھا ـــ وہی تھی۔ وہی مسکراہٹ وہی آنکھیں، اور وہی پراسرار منظر ـــ وہ مجھ سے بالکل سٹ کر بیٹھی ہوئی تھی۔ میں سچ کہہ رہا ہوں، میں نے اس کے بدن کی حدت اور دباؤ کو بھی محسوس کیا تھا۔ میں اسے ایکبار پھر نہارنے لگا۔ اچانک میرے دماغ میں بجلی کوندی، اور مجھے اپنے آپ کو ہوش میں رکھنے کا منتر یاد آ گیا۔ میں نے اپنے کلمے کی انگلی کو اتنی زور سے کاٹا کہ خون کی دھار جاری ہو گئی۔ تکلیف کے باعث میرے ہوش و حواس پھر ٹھکانے پر آنے لگے۔ اور میں نے پھر اسے نہارنا شروع کر دیا۔ اس نے بڑی اپنائیت سے میری زخمی انگلی کو اپنے ہاتھوں میں پکڑا۔ اور پھر اسے اپنے منہ میں رکھ لیا۔ اور میں نے جونہی اسے باہر نکالا۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی، میرا زخم بھر چکا تھا۔ میں نے پھر ایکبار اسے چبانا چاہا تو اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور پھر بولی۔ "جو ہوش مندی زخموں کے بل بوتے پر حاصل کی گئی ہو وہ ہوش مندی نہیں کہلائی جا سکتی تم اپنے آپ کو ہوش میں رکھنے کی خاطر کتنے گھاؤ لگاؤ گے۔؟"

میں نے جواب دیا۔ "تمہاری دید کی خاطر میں سر تا پا زخم ہونے کو تیار ہوں۔

اس کے لبوں پر پھر ایک بار کھنکتی ہوئی ہنسی طلوع ہوئی۔ "میں تمہارے ہر زخم کا مداوا کر سکتی ہوں ـــ!"

لیکن میری زندگی تمہی زخموں کا مداوا تو نہیں ہو سکتی۔

اس نے التفات بھری نظروں سے میری طرف دیکھا

"تب تم چاہتے کیا ہو۔؟" میں نے اس کی طرف تیز نظروں سے دیکھا اور پھر بولا۔ "اگر دل کی بات کہوں تو ناراض تو نہیں ہو گی ـــ؟"

اس نے انکار میں گردن ہلائی۔ اور میں نے فوراً کہا۔

"میں تمہیں اپنانا چاہتا ہوں۔ تمہارے حسن نے مجھے دیوانہ بنا دیا

ہے۔ تمہیں دیکھنے کے بعد میں سب کچھ بھول جاتا ہوں، اور میرے جسم کا روم روم تمہارا ورد کرنے لگتا ہے، کیا تم۔ ......!"

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی، اور اس سے بھی زیادہ طوطے نے شور مچایا۔ لیکن میں نے ہمت نہ ہاری۔ اور پھرتی سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس نے میری طرف ایسی نظروں سے دیکھا۔ جیسے کوئی معصوم بچے کو آگ سے کھیلنے سے باز رکھنا چاہتا ہو — لیکن میری گرفت اس کی کلائی پر اور بھی مضبوط ہو گئی۔ اس نے ساجن پہاڑی کی چوٹی کی طرف دیکھا، وہاں ایک ایک مشعل روشن ہو گئی۔ پھر کسی نے زور زور سے تین مرتبہ تالی بجائی۔ آسمان سے تین تارے ٹوٹ کر گرے۔ اور اس کے چہرے پر شرمیلی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے نظریں نیچی کر لیں۔ اور میں نے اسے راضی جان کر اپنی بانہوں میں بھر لیا۔ اور اس کے ہونٹوں پر جونہی اپنے ہونٹ رکھنے چاہے۔ وہ مچھلی کی طرح تڑپ کر میرے بازوؤں سے آزاد ہو گئی اور پھر بولی، گو دیوتاؤں نے تمہاری درخواست منظور کر لی ہے۔ لیکن میری پھر بھی ایک شرط ہے تم مجھ سے میرے کسی عمل کی نہ تو وجہ پوچھو گے۔ اور نا ہی مجھے میرے کسی عمل سے باز رکھنے کی کوشش کرو گے۔ اور اگر تم نے ساری زندگی اسی طرح میسر کر لی تو میں تمہیں ایک ایسا انمول خزانہ دوں گی جس کا تصور دنیا پر آباد کوئی شخص نہیں کر سکتا۔"

میں تو اس کے عشق میں دیوانہ ہو رہا تھا۔ فوراً اقرار میں گردن ہلا دی۔ تب اس نے کہا۔ "آج سے تم میرے جسم کے مالک ہو — کہ یہی تمہاری پہلی اور آخری خواہش ہے — یہی تمہارا عشق ہے — اور یہی تمہاری منزل ہے۔" اور پھر وہ خود ہی میری گردن میں جھول گئی۔ میں سچ کہہ رہا ہوں دوستو! میں نے اس کے بدن کی گرمی اور وزن کو اچھی طرح محسوس کیا تھا۔ وہ ہیولا بالکل نہیں تھی — بلکہ بڑا ٹھوس بدن تھا اس کا — ہم دونوں تمام رات ایک دوسرے میں بار بار اترتے رہے۔ یہاں تک کہ صبح ہو گئی — پھر شام ہوئی — پھر صبح ہوئی — اور نہ جانے کتنے دنوں تک ہم دونوں اسی طرح اسی مقام پر زندگی کا لطف اٹھاتے رہے۔ حد یہ کہ وہ طوطا اڑ گیا۔ پیپل کے پتے جھڑ گئے اور جھرنے کا پانی سوکھ گیا — لیکن ہماری مسرتیں اسی طرح برقرار رہیں۔ ہماری چاہتیں اسی طرح تازہ دم رہیں —! پھر ایک روز اس نے مجھے اپنے پیچھے چلنے کا اشارہ کیا —!

"اور تم اس کے پیچھے پیچھے جانے لگے —؟"

"ہاں —! وہ مجھے ساجن پہاڑی کے اطراف گھماتی رہی — پہلا چکر، پھر دوسرا چکر، پھر تیسرا چکر... پھر چوتھا — اور یہ سلسلہ بڑھتا ہی گیا — میری جوتیاں پھٹ گئیں — پیر زخمی ہو گئے اور ان سے خون رسنے لگا لیکن وہ پھر بھی رکنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ میں لڑکھڑاتا اس کے پیچھے چل رہا تھا۔ یہاں تک کہ میں چلنے کے قابل نہ رہا اور گر پڑا — میری آنکھیں درد کے مارے بند ہوتی چلی گئیں شاید میں بے ہوش ہو گیا تھا۔"

"اور پھر جب تم کو ہوش آیا ہوگا تو نہ وہ ساجن پہ رہی ہوگی، اور نا ہی وہ خود — ہے نا —؟"

"نہیں دوستو —! شاید تم لوگ میری باتوں پر شک کر رہے ہو —؟"

"زیادہ نہیں — لیکن اتنا ضرور ہے کہ کچھ تو داستان ہے اور کچھ زیبِ داستان —!"

"نہیں میرے دوستو! میں قسم کھا کر کہتا ہوں۔"

میں یہاں پر جو کچھ بھی کہہ رہا ہوں وہ حرف حرف حقیقت پر مبنی ہے — میرا یقین کرو —!"

سب پھر ایک بار خاموش ہو گئے۔ میں نے پوچھا "کیا مجھے ایک اور سگریٹ مل سکتی ہے —؟"

"کیوں نہیں — یہ لو —!"

میں نے سگریٹ جلائی، دو ایک کش لئے۔ اور لوگوں کو سننے پر آمادہ پاکر پھر کہنا شروع کیا۔ "ہوش میں آتے ہی میں نے اپنے پیروں کی طرف دیکھا تو کیا دیکھتا ہوں نا کوئی زخم ہے۔ نہ خون ہے اور نا ہی پھٹی ہوئی جوتیاں — بلکہ میں اپنے آپ کو تازہ دم محسوس کر رہا تھا۔ میرے چہرے پر اطمینان بخش مسکراہٹ پھیل گئی۔ مجھے اس طرح خوش پاکر اس نے پوچھا "تمہیں یاد ہوگا جب میں پہلی بار تم سے ملی تھی۔ تو میرے ہاتھوں میں ایک پرچی تھی؟"

لیکن میں جانتا تھا کہ اگر میں وجہ پوچھوں گا تو سب کچھ ہار جاؤں گا — لہٰذا میں خاموش رہا۔ وہ پھر بولی۔ "اور تمہیں وہ منظر بھی یاد ہوگا جب تم اپنی بے ہوشی سے واپس لوٹے تھے تو وہ پیپل کا درخت غائب ہو گیا تھا اور طوطے کی جگہ کوا کائیں کائیں کر رہا تھا —؟"

میں نے اپنے چہرے پر تجسس کی ایک رمق بھی پیدا نہیں ہونے دی۔

"تمہاری زخمی انگلی میرے منہ میں داخل ہوتے ہی اچھی ہو گئی تھی —؟"

میں پھر بھی خاموش رہا

"تمہارے سوال پر میں نے ساجن پہاڑی کی چوٹی کی طرف دیکھا تھا۔ تب تین تالیاں بجیں تھیں اور تین تارے ٹوٹ کر گرے تھے —؟"

میں اسی طرح بے حس بیٹھا رہا

پھر میں نے تمہیں ساجن پہاڑی کے اطراف مسلسل چکر دیئے —؟"

لیکن میں نے اس سے کوئی وجہ نہیں پوچھی۔ بلکہ چپ چاپ زمین پر آڑی ترچھی لکیریں کھینچتا رہا۔

جب یکے بعد دیگرے اس کے سارے ہی سوالات ختم ہو گئے۔ اور میری خاموشی کسی سوال میں تبدیل نہ ہو سکی تو اس کے چہرے پر بڑی پراسرار مسکراہٹ پھیل گئی اور وہ مجھے چھیڑنے لگی۔ "خاموشی موت کی علامت ہے —!"

میں نے جواب دیا "میں موت کو خاتمہ نہیں سمجھتا، بلکہ میرے نزدیک موت ایک ایسا راز ہے جس کے بعد کے سفر سے کوئی بھی واقف نہیں — ممکن ہے موت زندگی سے بھی بہتر ہو!"

میری باتوں کا اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ بلکہ اس کے چہرے کے تاثرات بگڑ گئے۔ میں سمجھ گیا کہ وہ مجھ سے بیزار ہو چکی ہے اور اب آزادی حاصل کرنا چاہتی ہے لیکن میں اپنی جانب سے کوئی وعدہ خلافی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اب اس کا معمول بن گیا تھا کہ وہ بار بار مجھے اسی طرح کے سوالوں میں الجھانے لگی تھی۔ لیکن میں بھی پوری طرح چوکس تھا۔ میں ہر بار اسے اس کی ہی باتوں میں الجھا دیا کرتا۔

تنگ آکر آخر ایک روز اس نے مجھے اپنے پیچھے چلنے کا اشارہ کیا اور میں معمول کے مطابق پیچھے پیچھے قدم اٹھانے لگا۔ ہم دونوں کچی پکی پگڈنڈیوں کو طے کرتے ہوئے ایک قصبے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اور پھر جیسے ہی ہم نے بستی میں پہلا قدم رکھا تھا اس نے پھر ایک اور عجیب و غریب حرکت کی۔

"غالباً اس نے بستی کو دھواں بنا دیا ہوگا —؟"

"نہیں میرے دوستو! نہیں — تم بس سنتے جاؤ کیونکہ تمہارے سارے ہی اندازے غلط ثابت ہو رہے ہیں۔ اس نے اپنے بدن کا ایک ایک کپڑا اتار پھینکنا شروع

میں شرم سے ڈوبا جا رہا تھا۔ لیکن وہ میرے محسوسات
کے لوگوں کی آمد و رفت سے بے نیاز اپنے آپ کو
کرتی جا رہی تھی۔ یہاں تک کہ اس کے جسم پر ایک
پڑا باقی نہ رہا — پھر ایک اور عجیب بات ہوئی:
میں ایک لمحے کے لئے چپ ہو گیا۔ تمام لوگ میری
غصے سے دیکھنے لگے۔

"یہ بھی کوئی وقت ہے چپ رہنے کا — ؟

"ارے بھائی داستان کا اصل مزہ تو اب شروع
"

"کیا وہ واقعی بے حد خوبصورت تھی — ؟"

"ہم اسے اپنے سے بالکل قریب تصور کر رہے ہیں۔
بتے جاؤ — پھر کیا ہوا — ؟"

میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی، اور پھر کہنا شروع
— اس کے برہنہ ہوتے ہی چرند پرند بے تحاشہ بھاگنے
درختوں سے پتے موسم خزاں کے مانند گرنے لگے۔ البتہ
ں کا کوئی بھی شخص اس کی طرف حیرت سے دیکھنے پر آمادہ
تھا۔ اس نے اپنی رفتار بہت دھیمی کر لی تھی۔ جبکہ میں
از جلد اس بستی سے نکل جانا چاہتا تھا۔ وہ مجھے لئے
ملف گلیوں سے گزر رہی تھی۔ آخر ایک چھوٹے سے مکان
ساتھ وہ رک گئی۔ میں بھی رک گیا۔ پھر اس نے آہستہ
دروازے پر دستک دی۔ اور ایک شخص گیروے
وں میں ملبوس باہر نکلا اور اس سے بے تحاشہ لپٹ
۔ وہ بھی اس سے اتنی ہی گرم جوشی سے بغل گیر ہو رہی تھی۔
ر اس شخص نے اس کے گالوں کے بوسے لینا شروع کر دیئے
ر جسم کے مختلف حصوں پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ میرا خون
ول اٹھا۔ میں سب کچھ برداشت کر سکتا تھا
ن میری موجودگی میں کسی غیر مرد کے ساتھ اس کا یہ
عمل میرے لئے نفرت کا لاوا بن گیا۔ میں غصے کے باعث
تھر تھر کانپنے لگا، اور پھر مجھے یہ بھی ہوش نہ رہا کہ میں نے
اس سے کیا وعدہ کیا تھا؟ میں تیر کی طرح لپکا، اور آناً فاناً
ان دونوں کو ایک دوسرے سے جدا کر دیا اور سختی سے
اس کی کلائی پکڑ لی، اور اسے پوری قوت سے گھسیٹنے لگا۔ لیکن
جونہی ہماری آنکھیں چار ہوئیں۔ اس کا ہاتھ اپنے آپ ہی
میری گرفت سے آزاد ہو گیا۔ اور وہ قہقہہ مار کر ہنسی۔ اور پھر
بولی — "اے نامراد —! آخر تو بھی اپنا وعدہ نبھانے میں
ناکام ثابت ہوا — جا — اب تیرا اور میرا سمبندھ ٹوٹ
گیا — لیکن چونکہ تجھ میں دیگر مردوں کے مقابلے میں صبر کا
مادہ زیادہ تھا۔ اس لئے میں تیرے دماغ میں اٹھنے والے کچھ سوالات
کے جواب تو بتا دوں گی۔ لیکن مابقی کے جوابات تجھے ہی تلاش
کرنے ہوں گے — اور سن! جب تو ان سوالوں کے جواب
پا لے گا تو وہ انمول خزانہ اپنے آپ ہی تجھے مل جائے گا —
جس کا میں وعدہ کر چکی ہوں — ساجن پہاڑی پر میرا
تجھ کو نظر آنا دراصل تیری متلاشی طبیعت کا کارنامہ تھا۔
اور ڈھونڈنے کی تہہ میں تیرا وہ وسوسہ تھا جو میرے بارے
میں پیدا ہوا تھا کہ آیا تو مجھے پا بھی سکے گا یا نہیں — پیپل
کا درخت تجھے اسی لئے دکھایا گیا تھا کہ تو یہ اچھی طرح سمجھ
لے کہ تو جس کے پیچھے اپنا وقت ضائع کر رہا ہے اس کی مثال
ایسے درخت کی ہے جس سے کسی پھل کی کوئی امید نہیں رکھی
جا سکتی۔ کمزور دھاگے جیسی وہ سانسیں ہیں جن
پر بھروسہ کرنا سوائے حماقت کے کچھ نہیں۔ بے حس
لوگ جانوروں سے بھی بدتر ہیں کہ ان میں زندگی کی حرارت
پیدا ہی نہیں ہو سکتی۔ جس شخص پر تو نے شک کیا تھا
وہ میرا باپ تھا۔ اور میں اس کے سامنے برہنہ ہی پیدا ہوئی
تھی!"

اور پھر وہ خاموش ہوگئی تو میں نے فوراً پوچھا۔

" اور وہ پرچی جو روزِ اوّل ہی سے تیرے ہاتھوں میں تھی ۔۔۔؟"

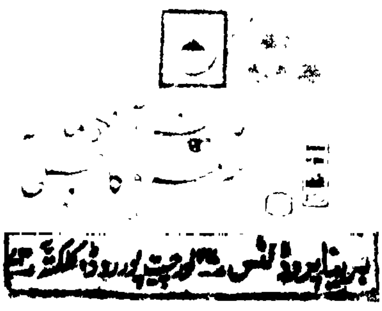
" اس کا جواب تو تجھے ہی تلاش کرنا ہے کہ آخر وہ پرچی میرے ہاتھوں میں کس کے نام تھی ؟ اس میں کیا لکھا تھا ؟ اور آخر وہ راز میں نے تجھ سے کیوں پوشیدہ رکھا ۔؟"

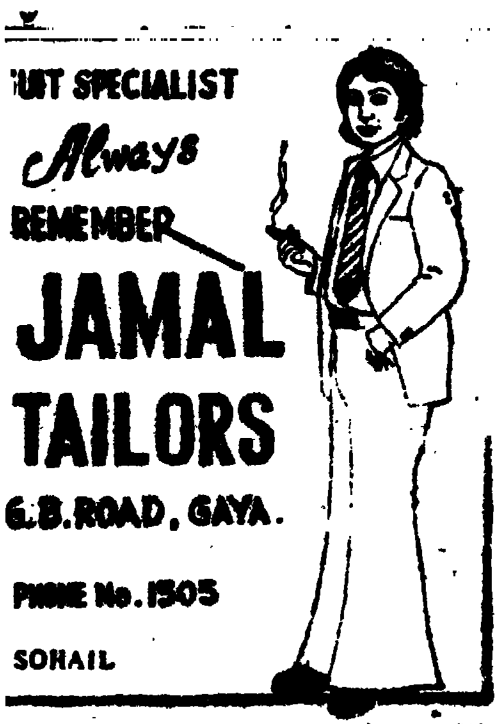
" ساتھیو ! اس کے بعد بڑے زور کی آندھی آئی ۔ دھول اور گرد اتنی اٹھی کہ کوئی چیز نظر نہ آتی تھی۔ ہواؤں کی سیٹیاں گونجنے لگیں۔ میں خوب چیخ کر مارے چلانے لگا ۔ لیکن ہائے افسوس کوئی بھی میری مدد کو نہیں آیا ۔۔

اور پھر جب طوفان تھما تو میں نے دیکھا نا وہ وہاں موجود تھی ۔ نہ وہ شخص تھا، نہ وہ مکان تھا نہ وہ بستی تھی میں سنسان پہاڑی کی ترائی میں یکہ و تنہا کھڑا تھا ۔ اچانک مجھے یاد آیا کہ میں یہاں پر کیمیا کی تلاش میں آیا تھا ۔ تب سے آج تک میں مسلسل بھٹک رہا ہوں ۔ ہر ایک کو اپنی بپتا سناتا ہوں ۔ لیکن آج تک مجھے کیمیا ملی ہے ، اور نا ہی میری الجھنوں کا جواب اور نا ہی وہ انمول خزانہ ہاتھ لگا ہے ۔۔۔ ساتھیو ! کیا تمہارے پاس میرے ماضی کے سوالوں کا جواب موجود ہے ؟ کیا تم میرے حق میں حاتم طائی ثابت ہو سکتے ہو ؟

سب نے انکار میں گردن ہلائی

تب میں وہاں سے بھی نکل پڑا اور پتہ نہیں ابھی مجھے کہاں کہاں بھٹکنا باقی ہے ۔ کس کس کو اپنی داستان سنانا ہے ؟ اور اتنا سب کچھ کرنے کے بعد بھی کیا میں ان اسرار کو جان پاؤں گا ؟ کیا وہ خزانہ مجھے مل جائے گا ؟ یا پھر میرا یہ جنم بھی یونہی ضائع ہو جائے گا ۔۔ ؟ مجھے کچھ بھی خبر نہیں ۔۔۔ میں تو بس مسلسل بھٹک رہا ہوں ۔





دویندر پٹواری

تاریکیاں

جن گلیوں میں، میں اپنے دوستوں کے ساتھ گلی ڈنڈا کھیلا کرتا تھا آج وہ سونی سونی ہیں۔

نکڑ کے پاس وہ ویران مکان میرا گھر ہے۔ اور ساتھ والا مکان میرے لنگوٹیا دوست روشن کا گھر ہے۔ ہمارے دوست اس نکڑ والی گلی کو روشن روشن گلی کہا کرتے تھے۔ وہ اس لئے کہ میرا نام بھی روشن ہے اور میرے دوست کا نام بھی روشن ہے۔ میں روشن علی اور وہ روشن کمار ——— !

اُف مگر آج اس گلی میں نہ روشن کمار رہتا ہے اور نہ میں —— جبھی تو میں کب سے ایک اجنبی کی طرح بار بار اس گلی سے گزرتا ہوں۔ جیپ میں بیٹھے سپاہی یا کھڑکیوں سے جھانکنے والے لوگ مجھے مشکوک نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔ جانے میرے بارے میں کیا کیا سوچ رہے ہوں گے۔ صحیح بات تو یہ ہے کہ میں اس وقت اس انسان کا گھر تلاش کر رہا ہوں جو میرے ساتھ چلتے چلتے سرِ راہ پر گولی کا شکار ہو کر گر پڑا تھا۔ جس نے اپنے خون سے لت پت ہاتھوں سے میرے ہاتھوں میں اپنے والدین کے لئے کھانسی کی دوائی تھما کر یہ کہا تھا کہ دوائی اس کے گھر پہنچا دوں۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ دوائی کو جیب میں رکھ کر مجھے پہلے اس اجنبی دوست کو کندھے پر اٹھا کر شمشان گھاٹ لے جانا پڑے گا۔

حالانکہ شہر میں کرفیو ہے لیکن اندرون شہر کی گلی کوچوں میں چلنے پھرنے سے کوئی نہیں روک رہا ہے۔ اگر کوئی روک رہا ہے تو وہ ہے دہشت ——! میں بھی ڈرا ڈرا سا ہوں مگر سوچ رہا ہوں کہ اپنے ہی شہر کی گلیوں میں چلتے چلتے کس کا ڈر! کس کا خوف؟ سبھی اپنے ہی تو ہیں۔ مگر کیا یہ میرا وہم ہے؟ اگر ایسا نہیں تو مجھے کوئی کیوں نہیں پہچان رہا ہے ——! کیوں آخر کیوں؟؟

اُف یہاں سوال کرنے والے بہت ہیں اور جواب دینے والا کوئی نہیں ——؟ اس لئے میں بس چلتا رہتا ہوں —— ایک محلے سے نکل کر دوسرے محلے میں جاتا ہوں۔ ایک گلی سے نکل کر دوسری گلی میں داخل ہو کر —— سردی سے ٹھٹھرتا ہوا —— بار بار کی ٹوکا ٹوکی سے لرزتا ہوا! حالانکہ نہ میرے پاس کوئی پوسٹر ہے۔ نہ کوئی ٹیپ ہے اور نہ ہی کوئی ریوالور یا بندوق —— جیب میں کھانسی کی دوائی ہے۔ بس اور کچھ نہیں —— پھر بھی —— اُف!؟

کیا میں پل دو پل کہیں رک نہیں سکتا۔ ؟ ۔۔ ؟
اسکول کے آنگن میں چند بچے سردی سے ٹھنڈے کے باوجود خوب ہنس رہے تھے۔ اور اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے زمین سے برف کے گولے اٹھا کر ایک برف کا بت بنا رہے ہیں۔ یہ بن گئی ناک۔ یہ کان ۔۔ یہ بازو ۔۔ یہ آنکھیں ۔۔ لیکن ٹانگیں نہیں ہیں ۔۔ بھاگے گا کیسے؟ گولی لگ گئی تو مر جائے گا۔

بچے ہنس رہے ہیں ۔۔ اور بت کو مختلف نام دے کر قہقہے لگا رہے ہیں ۔۔ لیکن میں نے جب بت کو قریب جا کر دیکھا تو یوں لگا جیسے ایک ماں کی گود میں رکھا ٹیسٹ ٹیوب بچہ ہے ۔۔ مجھے قریب آتے دیکھ کر بچوں کو گویا سانپ سونگھ گیا۔ جیسے کسی نے مٹی دبا کر ان کی ہنسی کو دبوچ ڈالا ۔۔ وہ سب بھاگ گئے اور میں بھی ان کے چھوڑے ہوئے قدموں کے نشانات کے پیچھے پیچھے چل کر اسکول کے احاطے سے باہر نکلا۔

میرے قدم ایک بہت بڑے مکان کے برآمدے کے سامنے رک گئے۔ بہت سارے لوگوں کو ایک ساتھ دیکھ کر کچھ کچھ گھبرا گیا اور کچھ کچھ خوش بھی ہوا ۔۔ وہ اس لئے کہ وہ سب خوش خوش نظر آ رہے تھے۔ وہ اپنے اپنے کام میں مصروف تھے اور اپنے کام میں حد سے زیادہ دلچسپی لے رہے تھے۔ دراصل وہ کاٹھ اور کاغذ کا ایک پتلا بنا رہے تھے۔ اس پتلے کو انہوں نے ایک نام دے رکھا تھا اور ان کی کوشش تھی کہ پتلا بہت ہی اچھا بنے۔ کسی شخص کے خلاف نہایت زہریلے الفاظ کا استعمال کرتے ہوئے وہ یہ بھی کہہ رہے تھے ۔۔ یہ رہی ناک ۔۔ یہ کان ۔۔ یہ آنکھیں ۔۔ یہ بازو ۔۔ اور یہ سالے کا منہ ۔۔ ڈال دو کتے کے منہ میں یہ جوتا تاکہ کچھ بول ہی نا سکے ۔۔ جب کل صبح چوک میں جلا دیں گے تب بھی سالا ایسے ہی چپ چپ نظر آئے! سب لوگ غصے سے بھڑک اٹھے اور اپنے ہی بنائے ہوئے کاٹھ کے پتلے کو ٹھوکریں مارتے رہے ۔۔ اچانک وہ مصور جس نے پتلے کا چہرہ رنگ دیا تھا چلانے لگا ۔۔ یہ کیا کیا جا رہا ہے ۔۔ بامشکل سے آنکھیں بنا دی تھیں۔ تم نے مٹا دیا! اب بنا لوں تو رنگ سوکھے گا بھی نہیں ۔۔ تقریباً سبھی کو اپنی غلطی کا احساس ہوا ۔۔ وہ مجھے گھور گھور کر یوں دیکھنے لگے جیسے میں ان سب کے نام موت کا پیغام لے کر آیا تھا۔

ایک دھماکے کے ساتھ دروازہ بند ہوا ۔۔ پھر کے اندر ایک ساتھ کئی دروازوں کے بند ہونے کی آواز سنائی دی۔ اندر سے کسی عورت کی آواز سنائی دی۔

کیا پھر سے تلاشی لینے آئے ہیں ۔۔؟ کیا پھر سے لڑکیوں کو تہہ خانے میں چھپانا ہوگا ۔۔ یہ کیسا قہر ہے!

اچانک خاموشی چھا گئی ۔۔ اور میں بے بس ہو کر وہاں سے چل پڑا۔

ہسپتال کے ایمرجنسی وارڈ میں زخمی لوگ کراہ رہے تھے۔ تو مجھے بھی اپنے بازو سے بہتا ہوا خون نظر آیا۔ کراس فائرنگ میں کسی کی ٹانگ کٹ گئی تھی اور کسی کی آنکھیں بے نور ہو گئی تھیں ۔۔ سوچا خون بے شک بہتا رہے ۔ مگر ہسپتال کی لال لال رنگ کی کمبلوں سے لپٹ کر اپنے ٹھٹھرتے بدن کو تھوڑی سی گرمی دوں۔ چاہتے ہوئے بھی ایسا نہیں کر پایا۔ ڈاکٹر لوگ پریشان تھے کہ جو عورت ٹیسٹ ٹیوب بچے کو جنم دے رہی ہے اسکو کونسا بیڈ دیا جائے کیونکہ اس کے لئے رکھا کمرہ چند زخمی دہشت گردوں کی کڑی نگاہ بانی کرنے والی پولس ٹیم کو دیا گیا

سردی سے اپنے سکڑتے ہوئے جسم کو تقریباً گیلی چادر سے ڈھانپ کر میں نے ہسپتال سے نکل کر ہوٹل میں جانا چاہا تو ایک سپاہی نے سختی سے ٹوک کر کہا، کہاں جا رہے ہو؟ جانتے نہیں شہر میں کرفیو ہے؟

کیا چھپا رکھا ہے اس کمبل میں —؟ ہاتھ اوپر اٹھا دو ورنہ گولی مار دوں گا —!

گیلی کمبل دور پھینک کر میں اچھل کر تاریک گلی میں داخل ہوا تو سپاہی کی آوازیں میرا تعاقب کرنے لگیں — خبردار۔ ایک دہشت گرد بھاگنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی گولیوں کی آوازیں سنائی دیں۔

سڑک کے اجالوں سے بھاگ کر مجھے گلی کی تاریکیوں نے اپنے آغوش میں نہ لیا ہوتا تو میں مارا گیا ہوتا — ہانپتے اور کانپتے ہوئے میں نے ایک پھاٹک کھٹکھٹائی تو کسی نے سرگوشیانہ آواز میں کہا — گھبراؤ نہیں۔ یہ محفوظ جگہ ہے۔ دروازہ بند کر دو اور اندر چلے آؤ — تمہارے ساتھی پکڑے گئے کیا —؟ کام ہوا یا نہیں؟ جب وہ شخص میرے بالکل قریب آیا تو ہم دونوں کو ہی حیرت ہوئی — نہ وہ مجھے جانتا تھا اور نہ میں اس کو جانتا تھا۔

میری چھاتی پر بندوق رکھ کر وہ گرجنے لگا — کون ہو تم — جاسوس یا مخبر —؟

اس سے پہلے کہ میں کچھ کہہ پاتا ایک زوردار دھماکہ ہوا۔ مکان کی ساری بتیاں بجھ گئیں — ایک فاتحانہ قہقہہ گونج اٹھا — لو کام بن گیا۔ ٹرانسفارمر اڑا دیا گیا —

میں وہاں سے کیسے نکل آیا یہ مجھے معلوم نہیں۔ لیکن ایک اندھیری گلی سے نکل کر دوسری اندھیری گلی میں جاتا رہا ہوں۔ ایک دکان کے بند گیٹ سے ٹکرا کر دوسرے مکان کی پھاٹک کو کھٹکھٹاتا رہا۔ اور آخر ایک دروازہ کھلا — ایک بزرگ میرے چہرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھتا رہا — نہ کوئی سوال — نہ کوئی جواب — میں اس کے پیچھے پیچھے چل کر اندر چلا گیا۔

ایک بہت بڑے مکان کے بہت بڑے ڈرائنگ روم میں ہم تین شخص ہیں — ایک بوڑھا۔ ایک بڑھیا اور میں — میاں بیوی کے چہرے یوں لگ رہے جیسے یخ بستہ جھیل — بوڑھا ایک سفید کپڑا سی رہا ہے اور بوڑھیا نے جب میرے شانوں پر ایک کمبل ڈال دیا تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ایک مردے کے اندر روح ڈال دی گئی ہو۔ اور بڑھیا کی مرجھائی ہوئی آنکھوں میں مجھے زندگی کی کرن دکھائی دی — بڑھیا نے گرم گرم قہوہ پلا دیا تو میرے ٹھٹھرتے ہوئے دانت سنبھل گئے اپنائیت کا احساس دلانے والوں سے میں نے کئی سوالات کئے مگر جواباً صرف اتنا جان پایا کہ عمر رسیدہ والدین کا اکلوتا بیٹا کراس فائرنگ میں مارا گیا ہے اور اطلاع ملی ہے کہ لاش ہسپتال سے کل بھیجی جائے گی یہ جان کر کلیجہ پھٹ گیا کہ بدنصیب باپ اپنے جوان بیٹے کا کفن تیار کر رہا ہے تاکہ انتم سنسکار میں کرفیو کوئی رکاوٹ نہ ڈال سکے۔

رات یونہی گزر گئی ہے۔ سچ پوچھو تو سسکتے سسکتے آج صبح سویرے جب میں نے کھڑکی کھولی تو باہر زبردست برف باری ہو رہی تھی۔ زمین پر بھی برف کی چادر پر نہ قدموں کے نشان تھے اور نہ گاڑیوں کے پہیوں کے نشانات اسکول کے احاطے میں بچوں کے بنائے ہوئے برف کے بت

برف کی ایک موٹی تہہ جمع ہو گئی تھی۔ بت کے بجائے وہ ایک تودہ دکھائی دے رہا تھا۔ چوک میں کسی کا پتلا جلانے والے بھی نظر نہیں آ رہے تھے۔ غالباً بندوق والے بھی مزے کی نیند سو رہے ہیں۔ اس کمرے کے ایک کونے میں بوڑھا اور بڑھیا دونوں رنج و غم میں ڈوبے ہوئے بار بار کفن کو یوں چھو رہے ہیں گویا اپنے بیٹے کے منہ سے لحاف ہٹا کر کہہ رہے ہوں۔ اٹھو بیٹے۔ دیر ہو گئی ہے ——! باہر خاموشی ہے۔ پاس کے مکان سے آ رہی ریڈیو کی مدھم مدھم آواز خاموشی کو گاہے بگاہے توڑ رہی ہے سننے کرالا شاید کوئی دوسرا اسٹیشن پکڑنے کی کوشش کر رہا ہے اس لئے پوری خبریں سنائی نہیں دے رہی ہیں۔ ہاں اتنا سن چکا ہوں کہ کل رات کراس فائرنگ اور بم کے دھماکوں سے چار آدمی مارے گئے ہیں اس کے ساتھ ہی یہ بھی سُن پایا کہ شہر کے صدر ہسپتال میں پہلی بار ایک ٹیسٹ ٹیوب بچے نے جنم لیا ہے۔ اچانک ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی تو فون میں نے ہی اٹھایا پولس نے اطلاع دی کہ مرنے والوں میں بوڑھے بزرگ کا بیٹا شامل نہیں ہے۔ یہ خبر جب میں نے بوڑھے اور بڑھیا کو دی تو یوں لگا جیسے ایک جھیل کی لہریں چمکتی دھوپ میں مچلنے لگی ہوں۔ گویا خوشی اور مسرت سے آکاش کو چھو لینے کی کوشش کر رہی ہوں

میری بھی یہی کیفیت اگر میری نظریں اچانک بوڑھے کے ہاتھ میں رکھی تصویر پر نہ رک جاتی۔

اف خدایا —— یہ تو وہی خوبرو شخص ہے جو اس وقت بھی بین الاقوامی بھائی چارے کی باتیں کر رہا تھا جب اس کے سینے میں گولی لگ گئی تھی —— اف —— اف ——

بوڑھا ہنستے ہنستے کھانس پڑا تو میرا ہاتھ جیب میں رکھی ہوئی کھانسی کی دوائی کی طرف گیا جو اس کے مرحوم بیٹے نے مجھے دی تھی —— اف اس کا نام بھی روشن ہی تھا ——! روشن کے ساتھ روشنی بھی گئی گیا، اُف —— یہ تاریکیاں ——!!

بقیہ :- فضا ابن فیضی . . . .

تخیلات ہیں کشید کرنے کی ماہرانہ استطاعت کے بغیر ایسے اشعار نہیں کہے جا سکتے۔ فضا کی شاعری میں فلسفۂ حیات بھی ہے اور مابعد الطبیعات فرد و معاشرہ بھی ہے۔ اور ہر شعر قاری کو اپنا تجربہ، اپنا خیال اور اپنا تصور معلوم ہوتا ہے۔ از دل خیزد بر دل ریزد کے مصداق شعر فضا میں بے پناہ دل پذیری ہے۔ ہم سوزی ہے، ہم آرزومندی ہے، ہم خوابی و بیداری ہے۔

غزل کا ہر شعر ہمہ از اوست، ہمہ اوست اور ہمہ در ہمہ پر استوار فکر و نظر کا تصوف ہوتا ہے۔

فضا غزل کے شاعر ہیں اور غزل ہی کو (QUINT- ESSENCE OF POETRY) حاصل شعر و سخن سمجھا جا سکتا ہے۔ غزل ہمارے دل کا استعارہ (METAPHOR) ہوتی ہے۔ دل میں لمحہ بہ لمحہ اٹھتے تموجات کی آئینہ دار، لفظ استعارہ دراصل (METAPHOR) سے کمزور لغت ہے کیونکہ دراصل اس کے معنی "مافوق اللغات" ہوتے ہیں۔ اچھی شاعری میں الفاظ کی دروبست کے ساتھ متشکلات ذہنی و فکری کی بھرپور کارفرمائی ہوتی ہے۔

فضا ابن فیضی دور حاضرہ کے بہترین غزل گو شعراء میں ممتاز مقام و مرتبہ رکھتے ہیں۔

شناخت

ایم۔ عارف

دیکھتے دیکھتے رانچی میں فرقہ وارانہ فساد کی آگ بھڑک اٹھی اور نہایت برق رفتاری سے شہر کو ہی نہیں بلکہ اطراف کی بستیوں کو اپنے لپیٹ میں لے لیا۔ آگ اور خون کی ہولی کھل کر کھیلی جانے لگی۔ روزی روٹی کے محاذ پر کندھے سے کندھا جوڑ کر لڑنے والے اب ایک دوسرے سے لڑ رہے تھے۔ رائفلوں سے موت کے نغمے ابل رہے تھے مشین گنوں کے قہقہے بے قصور، معصوم اور بے بس لوگوں کو زندگی کی قید سے نجات دینے کا پیغام سنا رہے تھے۔ آگ کی لپٹیں گھروں اور دکانوں کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے تھیں۔ الغرض ہر جانب موت اور تخریب کے ہرکارے دوڑ رہے تھے۔ لوگ سہمے سہمے ہوئے تھے۔ ظلم و ستم کی بستی میں زندگی اکھڑی اکھڑی سانس لے رہی تھی۔ انسانیت سسک رہی تھی مظلوموں کی آہ و بکا ان کے سینوں میں گھٹ گھٹ کر رہ گئیں تھیں کیونکہ انہیں سننے والا ہی کوئی نہیں تھا۔ خون میں لت پت لاشیں کنوؤں میں بھرے پڑے تھے نالیوں میں معصوم اور شیر خوار بچوں کی لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ وحشت اور بربریت کا ایسا مظاہرہ اس سے پیشتر نہیں ہوا تھا۔ غالباً چنگیز خاں اور نادر شاہ کی روح بھی شرمندہ تھی۔

ارباب حکومت نے نہایت صبر و سکون سے انتظار کیا کہ لڑنے والے تھک ہار کر خاموش بیٹھ جائیں گے انتظار کی طویل گھڑیاں بیت گئیں۔ لیکن ایسا نہیں ہو سکا۔ آخرکار ارباب اقتدار کو جلال آ ہی گیا۔ اور حفاظتی دستے حرکت میں آ گئے۔ ادھر سرے سے خون خرابہ شروع ہو [illegible] بستیوں کو پٹرول سے ایسے بھگویا گیا جیسے برسات میں بھیگے ہوں۔ اور آگ لگا دی گئی۔ موت کی عفریت کو شعلوں کی شکل میں دیکھ کر بھاگنے والوں کو گولی مار کر شعلوں میں پھینک دیا گیا۔ جن جگہوں پر احتجاج کرنے والے تھے ان جگہوں کو نظر انداز کیا گیا کہ کرفیو کے نفاذ کے بعد انہیں دیکھ لیا جائے گا۔ کرفیو کا نفاذ ہوا اور عام لوگ گھروں میں بند ہو گئے۔ حفاظتی دستہ کی نگرانی میں خاص لوگوں کو لوٹ مار آتش زنی اور قتل و غارت گری کی چھوٹ دے دی گئی۔ گلیاں اور سڑکیں لاشوں سے پٹ گئیں۔ سڑکوں، گلیوں اور نالیوں میں پڑی لاشوں کو جھنجھوڑنے کے لئے کتے ویسے ہی گزر رہے تھے۔ جیسے وہ بھی اسی سرزمین پر بسنے والے ہندو یا مسلمان ہوں۔ ہر طرف آہ و بکا کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ جلے ہوئے مکانوں سے شعلے اٹھ رہے تھے جانور بھی یہ منظر

بیٹھ کر یہاں پریشان ہو رہے تھے
حالات قابو میں تسلیم کرکے کرفیو میں ڈھیل ہوئی لوگ گھروں سے نکل پڑے۔ شہر کی حالات دیکھ کر عجیب ہوا۔ کرفیو کے نفاذ کے پہلے جن دکانوں میں تالے لگے ہوئے تھے کرفیو ٹوٹنے کے بعد جو دکانیں مقفل اور بھری ہوئی تھیں اب خالی نظر آ رہی تھیں۔ جہاں بستیاں تھیں وہاں آگ کے جلے ہوئے نشانات تھے۔ ہر ایک ہوا ذہن سوچ رہا تھا کہ کرفیو کے نفاذ سے پہلے جہاں آبادیاں تھیں گھر اور مکانات تھے وہاں کرفیو میں ڈھیل کے بعد راکھ کا ڈھیر کیوں نظر آ رہا ہے؟ یہ جلی اور ادھ جلی لاشیں کن لوگوں کی ہیں؟ ہر بیدار ذہن یہ سوچ رہا تھا کہ کرفیو لگنے کے بعد تو لوگ گھروں میں مقید ہو گئے تھے۔ پھر یہ تباہ کاری کب ہوئی اور کیسے ہوئی؟ یہ سب کس نے کیا؟ کیوں کیا؟

بستی میں شہر کے اس حصے میں لوگ سڑکوں پر کھڑے حسرت و یاس سے ملبوں سے اٹھتے دھوئیں کو دیکھ رہے تھے۔ جہاں دو منزلہ مکانات آباد تھے خوش حال لوگوں کا علاقہ تھا اب وہاں مٹی کا ڈھیر تھا جلے مکانات کے پس منظر میں مسجد کا پرشکوہ گنبد نظر آ رہا تھا جو سر اٹھائے مالک کل سے غالباً اپنی ویرانی کا سبب بتا رہا تھا۔

یکایک لوگ چونک پڑے۔ کچھ کی تو بے ساختہ چیخیں نکل گئیں۔ کئی برسوں سے رات بھٹکا رہنے والا پاگل بوڑھا جسے لوگ مجذوب سمجھتے تھے جلے ہوئے مکانوں کے ملبے کے درمیان سے نکلتا ہوا سڑک کی طرف آ رہا تھا۔ کبھی کبھی وہ جلتے مکانات سے اٹھتے دھوئیں میں چھپ سا جاتا۔ آج بھی اس کے جسم پر حسب معمول بوسیدہ سا لمبا لبادہ تھا لوگوں نے ہمیشہ سے اس بوڑھے کو اسی تین رنگے لبادہ میں ہی ملبوس دیکھا تھا۔ عالم جذب میں ہوتا تو سڑکوں پر دھاڑتا: مجھے دیکھو! میں ماضی، حال، مستقبل، تینوں زمانے کا نمائندہ ہوں۔ میرے لبادہ کا ہر رنگ ایک عہد کی نمائندگی کرتا ہے۔ تم سب آنکھ رکھنے کے باوجود بھی دیکھ نہیں پاتے: اندھے ہو، اندھے رہوگے۔ بوڑھا چلتے چلتے کسی عمارت کی جلتی ہوئی شہتیر سے ٹھوکر کھا کر لڑکھڑایا۔ لوگوں نے اسے لڑکھڑاتے اور سنبھلتے دیکھا۔ اس کے کندھے پر لٹکی چیز تھی لوگ چونک پڑے۔ کیا یہ بوڑھا بھی بلوائیوں کی طرح لوٹ پاٹ میں شامل ہے؟ لیکن راکھ کے اس ڈھیر میں اسے کیا مل گیا جس پر ہمارے حفاظتی دستے کی نظر نہیں پڑ سکی؟ آہستہ آہستہ وہ نزدیک آیا اس کے کندھے پر جھلسی ہوئی ایک لاش تھی۔ آٹھ یا نو سال کے لڑکے کی لاش!! بری طرح جھلسی ہوئی ناقابل شناخت ۔۔۔ اف ننگی ۔۔۔۔ ہمارے اخلاق اور قومی کردار کی طرح ۔۔ لاش کو اس نے زمین پر رکھا اور اپنا لبادہ اتارنے لگا جو گندہ تو بہت پہلے ہو چکا تھا مگر اب جگہ جگہ سے جل بھی گیا تھا۔ اس نے لبادہ اتارا اور لاش کو ڈھک دیا۔ اب وہ خود ننگا تھا۔ زیر جامہ اس کی ستر پوشی کر رہا تھا۔ ورنہ اس لاش کی طرح ہماری اخلاقی اور قومی کردار کی طرح اور ننگا ہو چکا ہوتا۔

چند لمحہ تک خاموش کھڑا جلتی ہوئی آنکھوں سے سامنے کھڑے لوگوں کو گھورتا رہا۔ پھر اس کی بھرائی ہوئی آواز ابھری۔ مجھے بتاؤ یہ کون ہے؟ یہ کس کی لاش ہے؟ رائفل کی گولی نے اس کے سینے کو چھلنی کر دیا ہے۔ مجھے بتاؤ یہ جلتے ہوئے مکان میں جل کر مرا یا گولی کھا کر؟ یہ کون ہے مہاویر، گوتم یا گاندھی؟ یہ کس کی لاش ہے؟ ہندو کی یا مسلمان کی؟ قانون و آئین کی یا انسانی قدروں کی۔ ہندوستان کی عظمت کی یا ہندوستانی

کی رذالت کی ؟

اس نے ایک وحشیانہ قہقہہ لگایا۔ تم نہیں بتاؤ گے میں جانتا ہوں۔ میں والی شہر سے پوچھوں گا۔ حقیقت داروغہ شہر بتائے گا۔ حفاظتی دستہ اس کی شناخت کرے گا۔ اس کے بعد میں یہ لاش اس کے وارثین کے پاس پہونچاؤں گا۔ میں اسے گنگا کی لہروں کے حوالے نہیں کر سکتا۔ میں اسے چیل کوؤں اور کتوں کے رحم وکرم پر بھی نہیں چھوڑ سکتا کیونکہ ان کے پیٹ بھرے ہوئے ہیں۔ لہٰذا اس لاش کو بہت دیر تک انتظار کرنا پڑے گا۔ وہ ڈھلاتا ہوا لاش اپنے کندھوں پر لئے کوتوالی کی طرف بڑھ گیا۔ لوگ مبہوت اسے دیکھتے رہ گئے۔ اسے ٹوکنے یا روکنے کی ہمت کسی میں نہ تھی۔ ان ہنگاموں سے دور بیرک میں چراغاں ہو رہا تھا۔ پٹاخے چھوٹ رہے تھے جیسے شہر اور گاؤں میں بم پھٹتے تھے۔ حفاظتی دستے کے جوان فتح کی خوشی میں سرشار جھوم رہے تھے۔ ایک دوسرے سے چہلیں کر رہے تھے ایک نوجوان نے دوسرے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا" بھگوان کی کرپا آخر مجھ پر ہو ہی گئی۔ رادھا کی شادی صرف جہیز کی وجہ سے نہیں ہو رہی تھی اب میں اس کی شادی اتنی دھوم دھام سے کروں گا کہ سارا شہر دیکھتا رہ جائے گا۔ اتنا جہیز دوں گا کہ دیکھنے والوں کی آنکھیں پھٹی رہ جائیں گی۔ زیور ... اتنے دوں گا کہ سیٹھ کروڑی مل نے بھی اپنی بیٹی کو نہیں دیا تھا۔ شیلا رادھا سے پانچ برس چھوٹی ہے، ابھی اس کی شادی میں دیر ہے۔ کوئی حرج نہیں فساد تو ہوتے ہی رہتے ہیں۔ وقت آنے پر اس کا بھی انتظام ہو جائے گا۔

مخاطب نے اس کی باتوں پر دھیان نہیں دیا وہ تو کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔ اس کی نظروں کے سامنے دوسری گلی کا وہ مکان تھا جس کی چھت پر اس نے کچھ دیر قبل ایک لڑکی کو دیکھا تھا۔ لڑکی نہیں قیامت تھی۔ اس کا سراپا اس کی آنکھوں کے سامنے آگیا۔ اس نے بے چینی سے کلائی کی گھڑی پر نظر ڈالی اور ٹھنڈی سانس لی۔ دو گھنٹوں کے لئے کرفیو ٹوٹا تھا۔ کرفیو لگنے میں کچھ دیر اور تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کچھ دیر بعد پھر کرفیو کا نفاذ ہو جائے گا اور رات بھر کرفیو رہے گا اس نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ ہاتھوں کو جنبش دی۔ کان سے سنایا۔ ٹک ٹک کی آواز آرہی تھی۔ گھڑی کی سست رفتاری پر ... غصہ آگیا۔

بوڑھے مجذوب کے دھاڑنے کی آواز لمحہ بہ لمحہ نزدیک آرہی تھی



شہرِ خیالے

★ مکرمی آداب عرض

"سہیل" کا شمارہ دس ملا جو بظاہر اکتوبر کا پرچہ ہونا چاہیے۔ پرچہ خوب ہے مگر کاغذ اور کتابت اچھی نہیں۔ اگر یہی مشمولات نفیس کاغذ پر آفسیٹ میں چھاپ دیے جائیں تو رسالے کی قدر و قیمت زیادہ معلوم ہو لیکن اردو رسالے کا مدیر یہ سب کیوں کر کر سکتا ہے۔

کرشن مہاری کا [illegible] خوب ہیں۔ معلوم ہوتا ہے ان پر ان کے ہم پیشہ کرشن چندر کا اثر ہے۔ اس پرچے میں [illegible] یادوں کے آئینے [illegible] معلومات افروز بھی ہے، دلچسپ بھی۔

[illegible] کا کوئی حل نظر [illegible] سیاست کے ہاتھ میں [illegible] ووٹ حاصل کرنے مذہب کا [illegible] ایک [illegible] کر سکتے تھا کہ [illegible] ہی۔ جمہوریت کا استحصال ہو رہا ہے [illegible] سیکولرزم لیکن [illegible] سیکولرزم [illegible] کیا [illegible] ہمارے مسعود [illegible] [illegible] مشتاق کا جواب دیا ہے [illegible]

مگر کیا لکھوں؟ اور کس شہر کے بارے میں لکھوں؟ ایک عام قسم کا مضمون لکھنے بلکہ مضامین کا سلسلہ شروع کرنے کی ضرورت ہے جس میں سیکولرزم پر زور دیا جائے کیوں کہ اس کی جڑیں کھودی جا رہی ہیں۔ نہرو کے خواب قتل کئے جا رہے ہیں اور اس کے سیکولرزم کو ڈھکوسلا کہا جا رہا ہے۔

راج بہادر گوڑ

بھائی مسعود منتظر تسلیمات

سال نو کی کیا تہنیت پیش کروں جبکہ گذشتہ سال فرقہ وارانہ ہنگاموں کی نذر ہو گیا مذہبی منافرت اور عصبیت کی آگ نے ساری اخلاقی قدریں، تہذیب، میل ملاپ ایک پل میں خاکستر کر دیا اب بھی کشیدگی برقرار ہے اور فضا سرگرم — بہر حال خدا کے فضل و کرم سے بعافیت ہیں کانپور کا فساد ہے ایک تجربہ اشاعت کے لئے پندار کو بھیجا ہے جس سے آپ کو یہاں کی بربادی کی مختصر روداد مل جائے گی۔ آپ کی عنایت سے سہیل برابر مل رہا ہے۔ کرم فرمائی کے لئے ممنون ہوں۔ اس بار طباعت شمارہ ۱۰ بہتر ہے۔ اور مشمولات بھی معیاری ہیں۔ گوشہ کرشن مہاری نے متاثر کیا اور تسنیم عثمانی کے مقالے کرشن چندر یادوں کے آئینے میں، نے ان کی شخصیت کے اہم گوشوں کو [illegible]

برادرِ محترم   ہدیۂ عقیدت

خدا کرے آپ اچھے ہوں۔

سہیل کا تازہ شمارہ جلد نظر نواز ہوا
بڑا اچھا لگا۔

کرشن مراری صاحب کی شاعری پر برادرم علیم اللہ صاحب کا مضمون اور قیصر عثمانی صاحب کا مضمون کرشن یادوں کے آئینہ میں بہت اچھے ہیں۔ نظموں میں شروتی کمار، ڈاکٹر محمد علی اثر اور ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کی جاپانی ہائیکو کے ترجمے بہت پسند آئے۔ غزلوں میں محترم ابن فیضی، حسن نعیم، حسن نجمی سکندرپوری اور عبدالمتین کی غزلیں خوب ہیں۔ کہانیوں کا حصہ بہت اچھا ہے
محمد مجیب احمد، نسیم احمد نسیم اور سہیل جامعی نے محنت سے کہانیاں لکھی ہیں۔ تنہا تنہا پر بھائی علیم اللہ حالی اور اعنی صدا پتاج پیامی صاحب کا تبصرہ متوازن اور مکمل ہے۔ نمونہ اس شمارے کی جان ہے اسے آپ نے خوب لکھا ہے۔ مبارک ہو۔

سعید عارفی

مکرمی سلام مسنون

سہیل کا شمارہ نمبر ملا۔ میری غزل کی اشاعت کا شکریہ۔ شمارہ ہذا میں شائع شدہ تمام تخلیقات اچھی ہیں مگر بطور خاص عنوان چشتی کی "انتخاب" رؤف خیر صاحب کی دونوں تخلیقات پسند آئیں۔ اعجاز طالب کی دوسری غزل مختلف اقسام کے عیوب سے پُر ہے۔ دوسرا شعر خارج از بحر ہے۔ ایک شعر

آسماں قہقہے لگاتا ہے ؛ جب بھی ہوتا ہے قتل عام مرا

میرا قتل ہونے سے بہتر ہوتا۔ میرا قتل عام ؛ چہ معنی دارد ؟

جب حویلی ہماری اونچی تھی ؛ لوگ [illegible] تھے [illegible]

یہ شعر شتر گربہ کی بہترین مثال ہے۔ مقطع سے پہلے والا شعر غالباً کتابت کا شکار ہو گیا ہے۔

جوگندر پال کے منی افسانے [illegible]

عبدالمتین جامی

جمیل منظر صاحب   آداب

سہیل کا تازہ شمارہ پیش نظر ہے۔ محترم شروَن کمار ورما کی کہانی مجھے بھی پسند آئی۔ واقعی انہوں نے ایک ایسا سوال اٹھایا ہے جو خطرناک تو ہے ہی دلچسپ بھی ہے۔ امید ہے کہ پڑھنے والے اس سوال پر سنجیدگی سے کان دھریں گے۔

ڈاکٹر تارا چرن رستوگی کا مضمون شہنشاہ [illegible] مجروح سلطانپوری [illegible] ایسی باتیں لکھی گئی ہیں [illegible]

سے اختلاف کیا جا سکتا ہے۔

اپنے مضمون میں رستوگی صاحب ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"الغرض مجروح کی ہر غزل وحدت تاثر کی حامل ہوتی ہے اور یہ وحدتِ تاثر کسی ملیانہ منصوبہ بندی سے عبارت نہیں ہوتا" یہاں تک تو ٹھیک بہت ٹھیک۔ لیکن ان کا یہ لکھنا ـــ کیٹس ـــ ([illegible]) اس نوعیت کی شاعری سے نفرت کرتا تھا، میرے خیال میں خارج از مضمون ہے۔ کیونکہ یہ ایک منفی حیلہ ہے اس سے مجروح کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا اور نہ ہی مضمون نگار کو اس سے کوئی تقویت ملتی ہے۔ تو پھر انہوں نے اسے لکھا کیوں؟

آگے لکھتے ہیں" اقبال اس میزان پر کھرے نہیں اترتے" کس میزان پر کھرے نہیں اترتے ـــ؟ کہیں ایسا تو نہیں رستوگی صاحب اقبال کو مجروح کی شاعری کے معیار پر اتارنے کی کوشش کر رہے ہیں اور وہ نہیں اتر رہے ہیں۔ آگے لکھتے ہیں ـ" ان کی (اقبال) شاعری صرف دور وسطیٰ کے تاریخی کردار، فرمانروایان جو بالاتفاق مسلمان تھے سے مطلع ہوتی ہے اور چونکہ مسلم لاشعور پر ان کی گرفت خاصی مضبوط ہے۔ لہٰذا اقبال کی شاعری معیاری معلوم ہوتی ہے" اس اقتباس کو بھی خارج از مضمون قرار دیا جا سکتا ہے۔ کیوں یہاں بھی وہی کچھ ہوا ہے جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے۔" اقبال کی شاعری معیاری معلوم ہوتی ہے" یہ معیاری معلوم ہونا کس چڑیا کا نام ہے ـ؟ بہر حال رستوگی صاحب کسی نہ کسی طرح یہ تسلیم کرتے ہیں کہ اقبال کی شاعری معیاری ہے مگر کیوں؟ اس کا جواز بھی رستوگی صاحب بتاتے تھے جو اوپر درج کر چکا ہوں۔ اب ذرا یہ بھی دیکھئے کہ موصوف نے کیا فرمائے ہیں اقبال کی شاعری کے تعلق" اقبال کے کلام کا کچھ حصہ ہی صحافیانہ [illegible] اور یہ تلخ حقیقت ہے جو بہت کم لوگ جانتے ہیں۔ دیکھا آپ نے موصوف کا دو رویہ اعتراف ـــ اب ذرا موصوف کا یہ جملہ بھی دیکھتے چلیں۔

"تاریخی اسلام اور وہ بھی عہدِ وسطیٰ کے بادشاہوں اور امیروں کا اسلام اقبال کے دل و دماغ پر کابوسانہ طور پر قابض رہا" یعنی موصوف تاریخ اسلام کو کوئی پہیلی سمجھنے والی شے تصور کرتے ہیں۔ تبھی تو انہوں نے لکھا ہے کہ" تاریخی اسلام اور وہ بھی عہدِ وسطیٰ کے بادشاہوں اور امیروں کا اسلام" کیا ایسا نہیں لگتا کہ موصوف یہاں پر مذہب اسلام اور اس کے پیروں کاروں پر طنز کر رہے ہیں کہ وہ اسلام اور اس کے ماننے والے کوئی دوسری مخلوق تھے اور ایک اسلام اور اس کے ماننے والے کوئی اور چیز ہیں۔

اب آخیر میں یہی کہنا چاہوں گا اور ان کے لئے میرا مشورہ ہے کہ وہ ابھی مزید سنجیدگی اور سکون کے ساتھ اقبال کی تمام شاعری کا مطالعہ کریں پھر مجروح کو شہنشاہ غزل بنانے کی سعی لاحاصل کریں۔

محمد خالد عابدی کا انٹرویو خاصے کی چیز ہے۔ انہیں میرا مبارکباد

آپ کا ـــ محمد حامد (دربھنگہ)

مکرمی مسعود منظر صاحب! آداب

سہیل گیا کے شمارہ ۱۱ میں بلراج حیرت صاحب کا ایک مکتوب شائع ہوا ہے جو ان کی بے باکی، حق گوئی اور کمال جرأت کا ثبوت ہے۔ وشو ہندو پریشد اور مفاد پرست مسلم سیاست دانوں کے تعلق سے موجود لوگ اور واضح باتیں انہوں نے لکھی ہیں جزوی اختلاف کے باوجود ہر صحت مند ذہن اس سے ضرور اتفاق کرے گا۔ وشو ہندو پریشد کے بارے میں میرا اپنا ذاتی خیال یہ ہے کہ عالمی [illegible]

تنظیم (W.Z.O) کے راستے پر چل رہی ہے جو اس منطقے کے امن و سالمیت کے لئے انتہائی خطرناک ہے۔ اس تنظیم کی مذہبی جارحیت کو صرف ہندو مسلم کے مشترکہ مرتکز مساعی سے ہی روکا جا سکتا ہے۔

میرے سلسلے میں انہوں نے جو باتیں لکھی ہیں وہ "توجیہ العقول بما لا یرضی بہ القائل" کی بہترین مثال ہے یعنی فیض احمد فیض کے بقول

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا
وہ بات ان کو بہت ناگوار گذری ہے

میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میرے جملوں کے مفہوم کو اس طرح سے سبوتاژ کر کے پیش کیا جائے گا۔ ادیب کی عظمت اور اہمیت کو مذہب سے ماورا ہو کر دیکھنا چاہئے۔ یہی وسیع الخیالی اور وسعت ظرفی ہے۔

گاندھی جی کے تعلق سے وضاحتاً عرض ہے کہ وہ ایک عظیم انسان تھے اور اقبال ان کے مداح اور قدر داں بھی تھے عبد الرؤف عروج کے بقول :- "اقبال کو گاندھی جی کے تصور قومیت اور حصول آزادی کے طریقوں سے اختلاف تھا، لیکن وہ ان کی بے لوثی، وطن دوستی اور پر خلوص جد و جہد کی قدر کرتے تھے۔ ان کو گاندھی جی کے سینے میں ایک پختہ کار، حق اندیش اور با صفا دل دھڑکتا ہوا محسوس ہوتا تھا"
(رجال اقبال ص ۴۰۸)

گاندھی جی کو عرب دنیا میں بھی ایک امتیازی حیثیت حاصل تھی۔ وہ استعماریت و سامراجیت کے خلاف ایک علامت کے طور پر عرب دنیا میں مشہور تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب انہوں نے برطانوی حکومت کے سامنے منصفانہ مطالبات کو تسلیم کئے جانے کی یقین دہانی تک احتجاجاً برت رکھا تو فلسطینی مزاحمتی شاعری (ce. Poetry) کے امام ابراہیم طوقان نے عرب سیاسیین کو اس واقعہ کی یاد دلا کر طنزیہ انداز میں کہا

جنذا لو بصوم منا زعیم
مثل غندی عسی یفید صیام

[کاش گاندھی کی طرح ہمارے یہاں بھی کوئی سیاستداں روزہ رکھتا تو شاید اس سے کوئی فائدہ ملتا۔]

ان تمام تر عظمتوں کے باوجود ایک سیاسی آدمی تھے اور سیاسی عقیدوں میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ ہندوستانی سیاست میں بھی HYPOCRATES کی کبھی کمی نہیں رہی ہے۔ گاندھی جی کو مسلمانوں نے مکمل تعاون دیا اور علماء، ادباء، شعرا نے خراج تحسین بھی پیش کیا مگر جب گاندھی جی نے واردھا تعلیمی منصوبے کو نافذ کیا تو مولانا ظفر علی خان نے (جو پہلے گاندھی جی کی مدح میں رطب اللسان رہتے تھے) نے مخالفت کی۔

میں نے گاندھی جی کی اقلیتوں کے تئیں بے اعتنائی کی جو باتیں کہی ہیں وہی کچھ حمزہ فاروقی نے "سفر نامۂ اقبال" اور مولانا عبد المجید سالک نے "ذکر اقبال" میں لکھا ہے اس کے علاوہ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی، معین الدین عقیل کی کتابوں میں بھی اس کی توثیق ہوتی ہے۔ اب یہ اور بات ہے کہ بہت سے لوگوں کے لئے پرانی باتیں بھی نئے انکشاف کا درجہ رکھتی ہیں۔ وضاحت کے طور پر یہ بھی لکھ دوں کہ اقلیت سے مراد صرف مسلمان نہیں ہیں بلکہ پسماندہ ہندو طبقہ اور یوروپی باشندہ بھی اسی میں شامل ہیں۔

اقبال کی عالمگیریت اور آفاقیت کوئی نیا مسئلہ نہیں ہے۔ بہت سے ایسے نقاد و ادبار جنہیں ہند و پاک کی معاندانہ و متعصبانہ سیاست سے کوئی دلچسپی نہیں انہوں نے اقبال کے کلام کو پڑھ کر عالمگیریت کا سراغ لگا لیا تھا۔

کثیر التصانیف مغربی ادیب و مفکر انور الجندی نے اقبال کا موازنہ معاصر عربی ادب کے تین اہم شعراء احمد شوقی (م ۱۹۳۲ء) حافظ ابراہیم (م ۱۹۳۲ء) اور جمیل صدقی زہاوی (م ۱۹۳۶ء) سے کرتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ "اقبال کے افکار ان کو اپنے دوسرے ہم عصر شعراء کے مقابلے میں بہت بلند اور روشن مقام تک پہنچا دیتے ہیں ان کے تینوں مذکورہ ہم عصر ان کے مقابلے میں عبوری دور کے شاعر نظر آتے ہیں جو ایک تنگنائے خیال میں زندگی بسر کرتے ہیں" (ارمغان اقبال مرتبہ بہار الہ آبادی ص ۳۲۸ - ۳۲۹) عربی ادبیات سے واقفیت رکھنے والے مذکورہ تینوں شعراء کی شاعرانہ قدر و منزلت اور بلند مرتبت سے اچھی طرح واقف ہیں۔ جن میں اول الذکر کو ایک انگریز ناقد ڈزمنڈ سٹوٹرٹ — Desmond Stewart — نے اپنے ایک مضمون "مشکل شاعری" (موقرہ انکاؤنٹر لندن جنوری ۱۹۶۳ء) میں عربی کا پوشکن قرار دیا ہے۔ جو بذات خود احمد شوقی کی عظمت کی دلیل ہے اور اس کے حوالے سے اقبال کی۔ اس کے علاوہ روسی مستشرقہ پولو نسکیا نے بھی اقبال کے کلام کی ہمہ گیریت اور آفاقیت پر روشنی ڈالی ہے۔

ادبا عرب نے بھی ان کی آفاقیت کو جان کر ہی عرب دنیا کو اقبال کے فکر و شوق سے متعارف کرایا تھا جن میں عمر بہار اسا سیری (شام) امیرہ نور الدین (عراق) امین زبیری (یمن) عبدالوہاب عزام (مصر) صاوی شعلان (مصر) حسین مجیب (مصر) کے نام بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ مغربی دنیا میں بھی کلام کے حوالے سے اقبال کے مداح و قدردان موجود ہیں یہ سب جانتے ہوئے اقبال کی عالمگیریت پر منفی نقطہ نظر سے بحث اٹھانا سراسر فضول اور تضیع اوقات کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ اقبال کی عالمگیریت اب مزید بحث و تحقیق کی محتاج نہیں رہی۔ میں یہاں پر صرف نوبل انعام یافتہ رابندر ناتھ ٹیگور (م ۱۹۴۱ء) کا ایک تعزیتی بیان نقل کرنے پر اکتفا کرتا ہوں۔ "ہمارے ادب میں ایک ایسا خلا پیدا ہو گیا ہے جس کے پُر ہونے میں ایک جان لیوا زخم کے مندمل ہونے تک کا عرصہ لگے گا۔ ہندوستان، جس کی آج کی دنیا میں کوئی وقعت نہیں، ایسے شاعر کی وفات سے اور بھی قلاش ہو گیا ہے جس کی شاعری عالمگیر اور آفاقی شہرت کی حامل ہے۔"

نیازمند حقانی القاسمی (علی گڑھ)

بانی :- حافظ محمد عبدالرحمٰن بسمل سنسہاروی ؒ بیادگار :- زین العابدین احمر و ادریس سنسہاروی

ماہنامہ سہیل گیا

مجلس مشاورت

فہرست

نمود ۵
جوگندر پال - محمد علی صدیقی ۶
حمید سہروردی - ابراہیم اختر ۱۳
کپھل - علی عباس ازل ۱۸
منفرد خصوصیات کا شاعر - ڈاکٹر سید ابوالفیض ۲۱
پریم نگر سے خط آیا ہے - مظفر عالم ذوقی ۲۵
غزلیں
شاہد میر، خاور نقیب ۲۸
م۔ ش۔ نجمی، ڈاکٹر حنیف ترین ۲۹
علیم صبا نویدی ۳۰
کلیم حیدر شرر، اختر شاہجہاں پوری ۳۱
لقمان شوق ۳۲
نوشاد احمد کریمی، م۔ ح۔ اشرف، کفیل ؟ ۳۳
افسانے — ناخلف — سہیل جامی ۳۴
" — بات چھوٹی سی - خواجہ عبدالرزاق ۳۸
شہر خیال — ۴۱

شمارہ ۲ جلد ۱۵

بدل اشتراک
فی شمارہ ــــــ ۳/۰ روپے
زر سالانہ ــــــ ۳۶/۰ روپے
لائف ممبری ــــــ ۵۰۱/۰ روپے

• خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ •

ماہنامہ سہیل
ریلور سائڈ روڈ، گیا ۸۲۳۰۰۱
فون نمبر ۲۱۵۷۳

نئی حکومت ـــــ عزم اور ارادے

بہار کی موجودہ حکومت انتظامیہ کے نئے طریقے اور عوام کے مسائل کے تئیں متحرک ہے نئی حکومت صوبہ کے ہمہ طرفہ ترقی اور عوام لوگوں کے حل کے لئے پر عزم ہے۔ صوبائی حکومت کے ان ارادوں نے نئی امیدوں کی کرنیں جگائی ہیں

وزیر اعلیٰ شری لالو پرشاد کی قیادت میں صوبائی حکومت کے کچھ فیصلے

کرپشن کا خاتمہ

انتظامیہ اور سیاست میں موجودہ کرپشن کے خاتمہ کے لئے سرکاری نگرانی مشنری کو زیادہ موثر بنایا جارہا ہے مختلف علاقوں میں موجودہ کرپشن کے ذرائع پر حملہ کیا جائیگا۔ کرپٹ اور نکمے اشخاص کے لئے کوئی جگہ نہیں ہوگی لوک ایوکت کے جانچ کے زمرے میں وزیر اعلیٰ کو شامل کرنے سے متعلق تجویز پر فوراً عمل کیا جائے گا وزراء اور جودھان منڈل کے ممبران کے علاوہ ضلع پریشد کے نمائندے کو اپنی ملکیت کا اعلان کے متعلق قانون پر فوراً عمل کیا جائے۔

کرپشن پر مناسب طریقہ سے قابو کرکے عوامی اعتبار کو حاصل کرنے اور انتظامیہ کی خامیوں کو دور کرنے کے لحاظ سے سخت قانون جلد لاگو کئے جائیں گے ضلعی سطح پر بنائی گئی نگرانی کمیٹی کو مضبوط اور کارگر بنایا جائے گا۔

ایماندار اور اچھے افسران / ملازمین کی حوصلہ افزائی کی جائے گی۔ کرپٹ افسران کے خلاف خاص مہم کے تحت تیز چھاپہ ماری کی جارہی ہے۔ عوام میں ایک نیا اعتبار جاگا ہے۔

آپ کی سرکار ـــــ آپ کے لئے

جاری کردہ، محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ، بہار

P.R.NO 124 (INF-93) 90-91

نمود

حسن نعیم کی یاد میں

حسن نعیم بھی اب ہمارے درمیان نہیں رہے
اردو شعر و سخن کی عمارت کے اس بلند و مستحکم ستون نے غزل کو اپنا وسیلۂ اظہار بنایا تھا، اس کی جڑیں ہماری خوش گوار غزلیہ روایات میں پیوست تھیں ـــــ مگر حسن نعیم نے روایات کے بطن سے ایک بانکے لب و لہجہ، ایک طاقتور آواز، ایک پر اعتماد اور خوددار تیور کی تخلیق کرکے اردو غزل کو نئی تازگی سے ہمکنار کیا ہے۔ انکے کلام میں کہیں میر کی درویشی میں شدید احساس ذات کی کیفیت، کہیں غالب کا فکری رکھ رکھاؤ، کہیں یگانہ چنگیزی کی بے باکی ـــــ اور کہیں ان سبھوں کا امتزاج ایک بالکل نیا رنگ دکھلاتا ہے۔

حسن نعیم نے زندگی، اس کے مسائل اور مصائب کو ایک مخصوص درویشانہ شان سے ٹھوکریں لگائی ہیں۔ اونچے منصبوں پر فائز رہنے والے حسن نعیم نے فکری آسودگی اور روحانی ترفع کے مقابلے میں مادی تن آسانیوں کو کبھی اہمیت نہ دی۔ ان کی مضطرب اور بے چین روح کو جانے کس سچائی کی تلاش تھی ـــــ اور جب شاید یہ سچائی اسے یہاں نہیں ملی تو اس حقیر دنیا کو ٹھکرانے میں بھی اسے دیر نہ لگی۔

حسن نعیم آج ہمارے درمیان نہیں رہے ـــ مگر زندگی گذارنے کا ان کا مخصوص ہنر ہمارے ادراک و احساس کی متعدد طاقیں روشن کرتا ہے۔ اس عارفانہ اور صوفیانہ مزاج کے شاعر نے ہر موقع پر 'سگِ دنیا' کو اس کی اپنی اوقات سے آگاہ کردیا ہے

یاروں کو ہر طرح کا تحفظ عزیز تھا
ہم نے چنی وہ راہ جو مردوں کی راہ تھی
(حسن نعیم)

(ادارہ)

محمد علی صدیقی

جوگندر پال

بے شناختی سے شناخت تک

اُردو افسانہ گذشتہ چالیس سال میں بعض بڑے
ملائی نشیب و فراز سے گذرا ہے۔ سب سے پہلے تو
یہ عرض کروں کہ "انقلابی" سے مفہوم ہر دور میں تبدیل
تے ہوئے خد و خال کا گذشتہ دور کے عباوی
ان کے مقابلے میں اختلافی تیور ہے۔ "انقلابی"
ز سے یہ مطلب نہیں کہ ترقی یافتہ ممالک کے افسانہ
عادی رجحان سے فی الفور مطابقت کا ہدف پورا
یا گیا بلکہ اگر افسانہ نگار نے بیانیہ کی اقلیدس۔
فی۔ پلاٹ، زبان و بیان پر فنکارانہ گرفت کے پہلے
ابعاد کی اہمیت کم کر دی یا یکسر ہی ختم کر دی اور
فنی تیرے "بعد" کی مدد سے مونولاگ کی شکل میں
بے حکایت یا اپنی ذہنی کیفیت رقم کر دی تو یہ
غنی ہے کہ بھارت افسانہ کے مروجہ رجحان سے مختلف
تحال ہو لیکن داستان کی روایت کا ایک حصہ کتنے
با وسعت یہ بظاہر "آگے کی جانب قدم" بھلے ہی کیوں

ہی دلچسپی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ماضی بعید تو ماضی
بعید ہے، ماضیٔ قریب بھی ہمارے قارئین کے ذہنوں
سے محو ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اگر افسانہ اور داستان
کی روایت کو مشترکہ تسلیم کر لیا جائے تو روایت کے تناظر
سے باخبر افسانہ نگار وقت کے مختلف "ڈھانچوں میں سے
روایت کے خزانہ سے اپنی پسند کا "بیانیہ ڈھانچہ"
چن سکتا ہے۔

انتظار حسین نے داستان کی روایت سے فروں
تر بے خبری کے دور میں اپنے قارئین کی لاتعلقی کو جس
انداز میں ایکسپلائٹ کیا ہے اس طرح وہ سماجی و
معاشی پس منظر پر نظریاتی اصرار کے زمانہ میں جدید
قرار دیئے گئے وہ اسی لئے ممکن ہوا کہ فی زمانہ معروف
داستانیں پڑھنا تو کجا، ان کے نام جاننا بھی کلاس
روم سے باہر افتاں و خیزاں زندگی کی ضرورت نہیں
ہے ویسے بھی انتظار حسین کے لئے جو اہم ہے اس کی

اہمیت کا احساس اس کے افسانوں کی صورت میں موجود ہے اور اب بھی احساس داستانوں کا بلکہ داستانوں کی روایت کا قائم مقام ہے اسی مانند شاعری کی نئی اصناف ہی شاعری کا مخصوص چہرہ ہیں اور اس چہرہ پر ازمنی وسطیٰ کے ایران کی بیچ و پیچ کی کمی طعنہ و تشنیع کے بجائے تعریف و توصیف کی متقاضی ہے۔ وہ اس لئے کہ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ سب کچھ بدل جاتا ہے۔ انسان بھی، اور ہمیں اپنے فنون لطیفہ سے اس انسان کی موجودگی کا سراغ لگانا ہوتا ہے جو وقت کا وارث بھی ہے اور وقت کا ناسخ بھی، بلکہ وہ اپنے اجداد اور ان کے "وقتوں" سے اس قدر بدل چکا ہے کہ وہ ایک نوع کی بے شناختگی سے دوچار ہے۔ اپنے امروز کی پیدائش کے لئے وہ اپنے ماضی سے بچھڑ چکا ہے وہ ماضی جو اس حد تک تبدیل ہو چکا ہے کہ اسے اپنی اصل حالت میں دیکھنے کی جستجو کرنے والوں کے چہرے مسخ ہوتے جا رہے ہیں۔ کیا ہمارے افسانے نے آج کے دور کے بے چہرہ اور بے شناخت "خدایان ماضی" کے اندر کی اداسیوں کو جاننے کی ضرورت محسوس کی ہے، وہ جانتے ہیں کہ وقت اس قدر ظالم ہے کہ مکیں تو مکیں، مکان بھی وقت کے ساتھ ساتھ بدل جاتے ہیں۔ ہر مکان زماں و مکاں کے حوالہ سے بامعنی ہوتا ہے اس کا ایک تہذیبی سیاق ہوتا ہے اور وہ اس قدر بامعنی کہ ایک مکان کے ماحول میں جو اشارے اور حوالے سریع الفہم ہوتے ہیں، وہ دوسرے ماحول میں ناقابل فہم نظر آتے ہیں مکان دراصل ایک مخصوص فریم کا نام ہے اور انسان بھی جو اس مکان سے اپنے زماں و مکاں کے فریم کو دوستد

اور رواں کرتا ہے۔

جوگندر پال نے نئی زندگی کے تناظر کو فکر کی جس سطح پر اس طرح محسوس کیا ہے کہ اس کے یہاں ناسٹلجیا اور روئیدگی کی زندگی میں ایک جدلیاتی رجحان ہے ان کے یہاں ماضی پچھتاوا کے ساتھ ایک حقیقت ہے اور ایک ایسی حقیقت جس پر غور و فکر سے تلخی کے بجائے ہمدردی کا سماں بندھنا چاہئے۔ ہماری زندگیوں میں کمپلیکشن کی اس درجہ کمی واقع ہو چکی ہے کہ ہم فکر کے ضابطوں سے تو بھرے ہوئے دکھائی دیتے ہیں مگر "احساس" کی لطافت سے خالی ہو چکے۔

جوگندر پال کے تازہ ترین مجموعے "کھلا" کا عنوان غور طلب ہے۔ اس مجموعے میں شامل افسانوں میں اس عنوان کا کوئی افسانہ بھی نہیں ہے جسے جوگندر پال کی فکر کا استعارہ قرار دیا جا سکے۔ لیکن اس مجموعہ کی کہانیوں کو پڑھتے چلے جائیں تو آپ محسوس کریں گے کہ جوگندر پال کی فکر یا اس کے افسانے کمپلیکشن سے خالی ہیں وہ ایک سامنے کی سی بات کو بھی اس قدر مختلف پیرائے میں بیان کرتے ہیں کہ "نیچر سے دور ہوا انسان یہ محسوس کرتا ہے جیسے جوگندر پال کی زبان کا لہجہ کبھی خود رو ہے۔ وہ جس طرح محسوس کرتا جاتا ہے بیان کرتا جاتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اردو افسانہ کی بیانیہ سطح جس درجہ ارتقا جوگندر پال کے یہاں ہوتی نظر آتی ہے وہ اسے محسوساتی سطح پر اثر پذیر بنا دیتی ہے۔

جوگندر پال روایت سے تہی دامن یا بیزار افراد کے لئے جدید اور جدیدیت ... بیزار یا جدیدیت کی نا فراقی ترجمانی ... [illegible]

کمال ہے کہ ایک ایسے دور میں جب سیاہ و سفید
کے درمیان خاکی رنگ مفقود ہوتا جا رہا ہے ۔۔۔
جوگندر پال نے اپنے لئے ایک ایسا منطقہ تراشا
ہے جہاں کرداروں کی پیش کش اس کے کمیشن سے
طے پاتی ہے ۔ جوگندر پال کے افسانوں میں شعوری طور
پر برے لوگ موجود ہونے پر بھی موجود نہیں ہیں ۔ اس
کے برے سے برے کردار میں بھی کسی نہ کسی وقت انسان
برآمد ہو سکتا ہے ، ایک اجنبی کی طرح ، اور اس طرح
وہ اپنے قارئین کو میلو ڈرامہ کی جانب مائل خواہشات
کا اس انداز میں تہذیب کرتا ہے کہ اس نوع کی کوشش
بھی قدرت کا ہی عطیہ نظر آتی ہے ۔ یوں لگتا ہے کہ
ہم جوگندر پال کے کرداروں میں ۔ خواہ وہ بچپن ، جوانی ،
کہولت اور ضعیفی کے مراحل سے تعلق رکھتے ہوں یکساں
طور پر دلفریب اور مثبتی وصف کی حکمرانی دیکھتے ہیں ۔ وہ
بنیادی طور پر انسان ہوتے ہیں ۔ ان کے بارے میں یہ
حکم لگانا کہ وہ اچھے یا برے ، ان افراد کے لئے ممکن
ہے جو حکم لگانے کے دوران "انسان" کے درجے سے کافی
نیچے آ چکے ہوں ۔ جوگندر پال اپنے کرداروں کی جزئیات
میں اس قدر مگن اور ان جزئیات سے متشکل ہونے
والے رویوں کے بارے میں اس قدر غیر متعلق ہے ۔ جیسے
وہ ان رویوں پر "بند" باندھنے کے خلاف ہو ۔ اگر
اس کے افسانوں میں جاری و ساری رویوں سے اس
کی فکر کا IDENKIT / بنایا جائے تو اس کے ڈکشن
کا قدرتی بہاؤ کرافٹ کی پختگی اور فکری ارتفاع سب
ایک ہی جانب توجہ کرتے ہوئے ملتے ہیں ۔ کہ زندگی
تضادات کے تصفیہ کا نام ہے ۔ متحارب رویوں سے
ایک تضاد نہ سیدھا ، غیر متنازعہ رویہ کی تخلیق کو

فطرت کی زوال فراست کا نام دیا گیا ہے ۔ عینیت پسند
اس نوع کی فراست کو روحانی رویہ خیال کرتے ہیں ۔
ہیگل کی جدلیت کو اس منزل سے جدلیاتی مادیت کی
فکری اساس سمجھنے والے بجا طور پر تضادات کے تصفیہ
کے اصول کا قوانین قدرت اور معاشرہ پر یکساں طور پر
اطلاق کرتے ہیں ۔ ہر دو صورتوں میں تصفیاتی یکجائی کا
اصول کارفرما ہے ۔ اور یہ وہ اصول ہے جو جوگندر پال
کے افسانوں کی صاف اور سیدھی بیانیہ تکنیک میں
ایک لطیف سی پیچیدگی پیدا کرتا ہے تضادات پر
حاوی ہونے کی خواہش فطری ہوتے ہوئے بھی فطری نظر
نہیں آتی اسی لئے جوگندر پال کے افسانوں کا فطری
خمیر بہت زیادہ واضح نہیں ہے ۔ ان کا محبوب مشغلہ
کرداروں کی روح کے اندر جھانکنا ہے اور وہ
اس اہم فریضہ کی ادائیگی پر مجبور ہوتے ہوئے بھی
مختار نظر آتا ہے جب وہ لمحہ آ جائے کہ مجبوری
اختیار نظر آنے لگے تو فنکارانہ التباس ایک مؤثر
قدرتی وصف بن جاتا ہے ۔ جوگندر پال اپنے تازہ
ترین مجموعہ "کھلا" کے بعد ایک ایسے دور میں داخل
ہو چکا ہے جہاں ایک فنکار کو درپیش آواگون کی
صعوبتوں سے مکت قرار دیا جا سکتا ہے ۔ میں نے
قصداً "نروان" کی اصطلاح استعمال نہیں کی
ہے کہ میں جوگندر پال کو ایک ایسا بدھی واستو
دیکھنا چاہتا ہوں جو تخلیق کے کرب سے نجات
نہ پا سکے اور اس طرح ہماری زندگیوں کی بے معنو
کے فنروں تو نجربن کے شاداب جزیروں میں اضافہ
ہوتا ہے ۔ "کھلا" کا پہلا افسانہ "عفریت" درا
جوگندر پال کی افسانوی شعریت کا پہلا شعرہ

بالکل ایسا ہی ہے جیسے غالب نے اپنے دیوان کے پہلے شعر سے

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

کے ذریعہ قدرت کے ساتھ ہم رنگ ہونے کے لئے ایک بلیغ شکوہ کا سہارا لیا ہے۔ ہم سب ہی کاغذی پیرہن پہنے شکائتیں بلند کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ بلکہ اس نے اپنے ماحول کی منافقت کی اس قدر صفاکانہ انداز میں پردہ دری کی ہے۔ وہ سوال کرتا ہے کہ ہم جس 'راون' کو سال بہ سال نذر آتش کرتے رہتے ہیں وہ شاید ہمارے ہاتھوں سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور اس طرح ہم سسی فس کی طرح ایک مسئلہ سے دوچار ہیں جو ہماری تمام تر کاوشوں (باربرداری) کے باوجود موجود رہتا ہے۔

"بو" بھی معاشرے میں انسانی اقدار کے باب میں بڑھتی ہوئی بے حسیت پر گہرا طنز ہے اور یوں لگتا ہے جیسے مردہ پرست معاشرہ خود بھی مردہ ہو چکا ہے۔ وہ حضرات جو جوگندر پال کو معاشرہ کی عکاسی کے بجائے محض ایک تجرباتی افسانہ نگار سمجھتے ہیں اس افسانہ کے ڈاکٹر سروپ کو فراموش نہ کرسکیں گے جو جوگندر پال رسمی طور پر استعاراتی اظہار کا افسانہ نگار نہیں ہے بلکہ وہ پورے افسانہ کو استعارہ بنانے کے فن پر اس درجہ قادر ہے کہ یہ افسانہ "استعارہ" کے ہمہ جہت پھیلاؤ کو "علامت" کی شکل دے دیتا ہے۔ جوگندر پال کے افسانوں کا سماجی سیاق بہت واضح ہوتے ہوئے بھی ادھ کھلا ہوتا ہے اگر سیاق ہی ادھ کھلا ہے تو ہر افسانہ کا سماجی پیغام کس طرح واضح ہوسکتا ہے؟ "ہری کرتن" کے اندر جاری وساری زندگی کس قدر حقیقی ہے لیکن اس افسانہ کا "بڑا بابو" کس درجہ مختلف ہے۔ نالی میں پڑی ہوئی جھوٹ موٹ کی گولیاں دیکھنے کے باوجود بڑا بابو کہتا ہے

" روؤمت بڑی بہو، آؤ میرے گلے لگ جاؤ۔ نہیں روؤمت۔ میرے بعد میرا بیٹا تمہیں کبھی دکھی نہیں ہونے دیگا۔"

جوگندر پال نے کھلا کے پیش لفظ میں لکھا ہے کہ "اپنی یہ نئی کہانیاں مجھ پر اس طرح بیتی ہیں کہ اپنے ان کرداروں پر مجھے اپنے آپ کا بھی گمان ہوتا ہے۔ اور مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں نہیں رہوں گا تو کیا یہ سارے لوگ تو رہ جائیں گے۔ زندگی کا جوہر تو وہی ایک ہے اور اگر وہی ایک ہے تو رفتگاں کہیں بھی جا کے آخر کہاں جاتے ہوں گے۔ بس جی ہی جی میں وہیں گھر کئے رہتے ہوں گے جہاں سے روانہ ہوئے۔ اپنی تخلیق میں منتقل ہو جانے کی جہد ازل سے انسانوں کی اس چاہ سے عبارت رہی ہے کہ وہ اپنی عدم موجودگی میں بھی آئندہ کی برتتی زندگی میں برابر شریک رہیں گے۔

"کھلا" میں وہ سب کچھ ہے جسے جوگندر پال کی ساری عمر کی سوچ سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ جوگندر نے اپنے سماج پر ایک نگاہ مکرر ڈالی ہے۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ "نادیدہ" میں استعارہ کی زبان میں سب کچھ کہہ چکا ہے۔ لیکن یوں لگتا ہے کہ اس نے افسانہ کی "چھوٹی سی دنیا" کے لئے بھی وسیع وعریض کینوس کا ایک حصہ چنا ہے۔

"عفریت" "چور سپاہی" "لو" اور "گاڑی" میں
نسبتاً زیادہ بہت گہرا ہے "عفریت" ایک ایسا
نہ ہے جس میں اس نے "راون" کی سال بہ سال
متی موت کا مذاق اڑایا ہے اور بہت پیار کے
تھ یہ کہنا چاہا ہے کہ ہمارا سماج برائیوں سے
قدر بھرا ہوا ہے کہ یوں لگتا ہے کہ "راون" ہر
مرنے سے بچ جاتا ہے اور ہم اس کی موت کے
لان سے محض بہلتے رہتے ہیں۔ موت کی خوشخبری سے
کا صرف ایک ہی مطلب ہو سکتا ہے کہ ہم
اپنی زندگیوں کی سوہان روح درگت کو قانون
ت کے طور پر قبول کر لیا ہے۔ جوگندر پال نے
ریت" کی علامت کو پورے افسانہ پر پھیلا دیا
۔ "چور سپاہی" سوسائٹی کے منتظمین کے بارے
ہے۔ جب سپاہی یعنی قانون کے رکھوالے ہی
ہو جائیں تو بعض کرداروں کے لئے جیل کے اندر
زندگی جیل کے باہر کی زندگی سے زیادہ دلکش
جاتی ہے۔ جوگندر پال کے کردار اس کہانی میں
زور سے چیخنے اور چلاتے نظر نہیں آتے وہ
قدر حقیقی نظر آتے ہیں کہ انھیں نظریاتی
ید سے اجاگر نہیں کیا گیا ہے، بلکہ ان کے وجود
علی اس درجہ خوفناک ہے کہ ہم علامت کے
یہ سے حقیقت کی عفریت کا اندازہ کر سکتے
"لو" بھی ایک ایسا ہی افسانہ ہے اور یوں لگتا
کہ "مردہ خانہ" بھی ایک استعارہ ہے۔ جو سال
نٹسن کے "کینسر وارڈ" کی طرح پوری فضا پر چھا
تا ہے۔ اب آپ اس کے افسانہ "گاڑی" کا مطالعہ
۔ ہندوستانی جمہوریت پر اس سے زیادہ گہرا

طنز افسانے کی حد تک کا نمونہ نظر نہیں آتا۔ پتہ نہیں کہ
اس گاڑی میں بیٹھے ہوئے مسافر آگے کی سمت جا رہے
ہیں یا پیچھے کی طرف۔ پیچھے کی طرف خطرہ یہ ہے کہ شاید
وہ پل ہی دھماکہ خیز مادہ سے اڑا دیا گیا ہے جس پر
سے گاڑی کو گذرنا تھا۔

یوں لگتا ہے کہ جوگندر پال کے موضوعات
میں "وقت اور موت" کے تصورات بہت اہمیت
اختیار کرتے چلے جا رہے ہیں۔ جوگندر پال کے یہاں
وقت کلینڈر تک قائم نہیں ہے۔ یہاں ماضی حال
اور مستقبل کی حد بندیاں دم توڑ دیتی ہیں۔ وقت
ایک سیل ہے۔ تمام حد بندیوں پر حاوی "بس" دہر
ہے جو پراچین ہند کے فلسفۂ حیات کی بڑی
خوبصورت تفسیر ہے۔ کہیں بھی یہ نظر نہیں آتا کہ
جوگندر پال وقت کے بارے میں خود یارسا ہے۔
وہ وقت کی عملداری کو تیزی سے بدلتی ہوئی زندگیوں
میں سرائیت کئے ہوئے محسوس کرتا ہے۔ ہم وقت
کے ہاتھوں میں کھلونوں کی طرح ہیں اور صرف
ہماری نیکیاں ہی ہمیں برتر زندگی کی طرف لے جا
سکتی ہیں۔

فرو ایام کے ساتھ زمانے کے بارے میں اس
کا نقطۂ نظر بڑی اہمیت کا حامل ہو جاتا ہے —
"باشندے" ایک ایسی کہانی ہے جس میں وقت
کے ساتھ بھگوان بھی بدل جاتا ہے افسانہ کا واحد
متکلم جب اپنے پرانے گھر میں داخل ہوتا ہے تو بھگوان
السلام علیکم کہہ کر نماز پڑھنے چلا جاتا ہے اور اس
نے ایک بڑی صفاتی تبدیلی کو جس خندہ پیشانی کے
ساتھ قبول کیا ہے اس میں تاسف یا ناسمجھیا

کے لئے کوئی گنجائش نہیں تھی۔ "باشندے" بہت اہم افسانہ ہے۔ اس افسانے میں جذباتیت کے بجائے ایک ایسا رویہ ہے جو تبدیلی و تغیر کو بلا چوں و چرا قبول کرنے کا دوسرا نام ہے۔ جوگندر پال نے "کھلا" کے فلیپ پر لکھا ہے: "بہ حیثیت ادیب میں اپنی ذات میں بے شناخت ہوں یا میری شناخت کے نقوش کائنات کے سبھی مظاہر میں ہیں۔ میں جو کچھ دیکھتا ہوں وہی بن جاتا ہوں، یہی میری شناخت ہے۔" یہ رویہ "باشندے" کے کرشن بھگوان کی نئے ماحول میں "باشندگی" سے کسی درجہ مماثل ہے۔ یوں لگتا ہے کہ جوگندر پال اس دنیا کی کمینگیوں اور ناہنجاریوں سے اس درجہ نالاں ہے کہ موت اسے ان ناقابل برداشت مظاہر سے نجات کا وسیلہ معلوم ہوتی ہے۔ جوگندر پال کے افسانوں، آگے پیچھے، اتار، ہری کرتن، انتم پاٹھ، کوئی نجات اور نیرائی کے مطالعہ سے ایک ہی حقیقت سامنے آتی ہے کہ ہر عقدہ لاینحل کا علاج "موت" میں ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جوگندر پال موت کے بارے میں وجودیوں کے فلسفۂ غنیمت کا قائل ہے بلکہ اس کا دُر مقصود ایسی ہر صورت حال سے عمدگی سے عہدہ برآ ہونے میں ہے۔ وہ جس برتر زندگی کا خواب دیکھتا ہے وہ اس دنیا میں ممکن ہے۔ شرط یہ ہے کہ ہم ماضی، حال اور مستقبل کی حد بندیوں سے دور نکل کر ایک ایسے سماج کی تشکیل کے لئے حتی المقدور عمل کریں جس سے "آگے پیچھے، اتار، ہری کرتن، انتم پاٹھ، کوئی نجات" اور نیرائی میں درپیش صورت حال کو پلٹا جاسکے۔

جوگندر پال زندگی کا عکاس ہے، نباض ہے اور اس کے ہر افسانہ میں چھپا ہوا گہرا طنز ہمیں بری طرح جھنجھوڑتا ہے۔ اس کا طنز اصلاح احوال کے لئے ہوتا ہے نہ کہ اس کی اس خواہش کی غمازی کرتا ہے کہ وہ بحیثیت ایک تخلیقی فنکار اپنے کرداروں سے جدا نہیں ہو پا رہا۔ وہ ان کے جبر اور اختیار کی کیفیات کا فنکارانہ چابکدستی کے ساتھ مطالعہ کرتا ہے اور ان کے ساتھ اس طرح یک جان ہو جاتا ہے کہ ہم زندگی کو فطرت کے سہارے سمجھنے کے بجائے خود فطرت کو زندگی کی سان پر رکھ دیتے ہیں۔

"نظریہ" کیا ہے؟ اگر یہ محض انسانی صورتحال سے دور کھڑے رہ کر زندگی کا ادراک ہے تو پھر اس سے زندگی کا عرفان نہیں ہو پاتا ہے۔ یہی وہ بنیادی نکتہ ہے جو دیگر افسانہ نگاروں سے جوگندر پال کو ممتاز کرتا ہے۔ زندگی اور فن کے ساتھ وہ اس درجہ "یک جان" ہو چکا ہے کہ اردو افسانہ کو اس نے واقعتاً ایک بہت ہی ترقی یافتہ صنف بنا دیا ہے۔ جوگندر پال کی یہی وہ بنیادی خوبی ہے جس نے کہانی اور افسانہ کی بحث کو بے معنی بنا کر رکھ دیا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ جوگندر پال نے کہانی لکھنے کے بجائے اپنے کرداروں کی زندگی سے کہانی پڑھی ہے۔ اور بہت غیر جانب انداز میں پڑھی ہے۔ وہ اپنی کہانیوں کے سٹرکچر اور ان کے محسوسات میں آدرشی صورت حال ٹانکنے کی کوشش نہیں کرتا۔ لہٰذا اوقات اس کی اپنی سوچ کہانی سے دور کھڑی نظر آتی ہے۔ کہانی اپنے خیالات کی ترجمانی کروانے کے بجائے وہ صرف کہانی کے کرداروں کا مطالعہ کرتا ہے اور

مطالعہ اس طرح کیا جاتا ہے کہ جیسا ہے اور جہاں
کہیں ہے وہ ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ یقینی طور پر ایک
ترقی یافتہ حسیت کا افسانہ نگار کیمرے کے اس
طاقتور لینز کی طرح ہوتا ہے جو چہرے کی شکنوں
کے درمیان پسینہ کے لرزاں قطرے اور خفیف سی
روئیدگی تک دیکھ پاتا ہے اور اس طرح حقیقت
پسندانہ مرقع نگاری کے ساتھ وجودی فکر کی ایک
ایسی اظہاریت کو کام میں لاتا ہے جہاں گرد چہرے
اور بیلنس کی ایک دوسرے پر منطبق ہو جاتے ہیں۔

ہم عصر اردو افسانہ میں جوگندر پال سے زیادہ
شاید ہی کوئی افسانہ نگار اس درجہ تخلیقی اور فکر
رہا ہے۔ ہر دو پہلوؤں پر گفتگو کرتے ہوئے جوگندر
سے مفر نہیں ہے۔ اس نئے جذب کی پیچیدگی کے لئے
تہہ دار زبان کے استعمال کو رواج دیا ہے اس
سے ایک تخلیقی فنکار کے مشاہدہ اور اس کے بیا
کے جملہ تناؤ اظہار پاتے ہیں۔ اور یہ وہ منفرد خوبی
ہے اور اس خوبی نے اردو کو اس درجہ متمول کیا ہے کہ
ہمارے افسانوی ادب میں صرف اسی بنیاد پر زندہ رہے گا



ابراہیم اختر

حمید سہروردی کا تخلیقی رویہ

اس دور افسانے کے ارتقاء اور زوال پر گفتگو کا آغاز ترقی پسند افسانے کے حوالے سے کیا جائے گا۔ پریم چند ترقی پسند افسانے کے پیرکارواں تھے۔ ان کی تخلیقات نے ترقی پسند افسانے کے لئے پل کا کام انجام دیا۔ یہیں سے اس کے ارتقاء کا آغاز ہوتا ہے۔ ترقی پسند افسانے کی شناخت یہی ہے کہ اس نے ان تمام موضوعات کا احاطہ کیا جن کا تعلق براہ راست انسانی زندگی سے رہا ہے۔ اس میں زندگی کی بھرپور عکاسی اور ترجمانی ملتی ہے۔ اردو ادب میں اس نے ایک تاریخ بنائی ہے۔ "انگارے" کی اشاعت نے تو روح کو تڑپانے اور خون کو گرمانے کا کام کیا۔ ترقی پسند افسانہ نگار کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس کا ذہنی رشتہ قاری سے بہت قریب تھا۔ دوسرا مثبت پہلو یہ ہے کہ ترقی پسند تحریک نے بڑے ادیبوں کے ساتھ بڑے قاری پیدا کئے۔ اردو ادب کی تاریخ ترقی پسند افسانے اور شاعری کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔ اس تحریک کے زوال کے تعلق سے مختلف تاویلات کی جاتی رہی ہیں اور آئندہ بھی کی جائیں گی۔ فی الحال یہاں اس سے بحث مقصود نہیں ہے۔

نئے افسانے کے سفر کا آغاز ابہام، ذہنی پیچیدگی، تنہائی کا المیہ نیز علامتی اور تجریدی اسلوب کی بیساکھیوں کے سہارے سے ہوتا ہے۔ ذات کی تلاش و دریافت نئے افسانہ نگار کا اہم اور بنیادی مسئلہ ہے۔ جدیدیت کے رجحان سے متاثر افسانہ نگار اس فریب میں مبتلا ہے کہ جب تک وہ ذات کی تلاش میں سرگرداں نہیں رہے گا اس کی تخلیق پر فنی نکھار نہیں آئے گا۔ کیونکہ اس کے نزدیک علامتی اور تجریدی اسلوب فن کی کسوٹی ہے۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ فن کی تعریف کیا ہوگی؟ زندگی کے کیف و سرور اور سوز و گداز سے آشنائی کے بغیر فن کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ زندگی بجائے خود خالق کا بے مثل فنی شاہکار ہے۔ اس کے نشیب و فراز اور سود و زیاں سے فرار مریضانہ رجحان ہے۔ ہماری تخلیقات اگر زندگی کی سچائیوں سے گریز کرتی رہیں تو ان کا فنی معیار سوالیہ علامت بن جائے گا۔ فنی اعتبار سے مکمل اور کامیاب تخلیق تو وہی ہوگی جو قاری کے اندر اتر کر اس کے ذہن کو جھنجھوڑ دے۔ اسے کچھ سوچنے پر مجبور کر دے۔ اور اسے یہ محسوس ہو کہ افسانہ جو وہ پڑھ رہا ہے اس کی اپنی زندگی سے کتنا قریب ہے۔ بلکہ اس میں اسے اپنی زندگی سانس

لیتی ہوئی محسوس ہو۔ برخلاف اس کے آج کے فن کار کا المیہ یہ ہے کہ وہ اپنی تخلیق کو قاری کے ذہن سے اوجھل اٹھانے کی کوشش کرتا ہے۔ بقول ڈاکٹر گیان چند جین "جدیدیت کا شاعر ذات کے کرب، شکست و ریخت، فرد کے احساس تنہائی اور غیر محفوظیت کا راگ الاپے گا۔ چاہے وہ کتنا ہی مرفہ الحال ہو، بڑا افسر ہو یا یونیورسٹی میں پروفیسر ہو۔ اس کے ارد گرد مصاحبوں اور حاضر باشوں کا جمگھٹا رہتا ہو، لیکن شاعری میں اسے غیر محفوظ اور تنہا ہی بننا پڑتا ہے۔" میں تو کہوں گا یہ صرف جدید شاعری کا ہی مسئلہ نہیں ہے بلکہ اسی مصنوعی مسئلہ سے جدید افسانہ نگار بھی دوچار ہے۔ پرکاش پنڈت نے اس مسئلہ پر دوسرے نقطہ نظر سے روشنی ڈالی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ "اظہار ذات کسی چکنے گھڑے کا نام نہیں ہے بلکہ اظہار ذات بھی عدم مساوات کا ایک عکس ہے۔ محض اپنی ذات میں قید رہنا کسی پاگل کے لئے تو ممکن ہے لیکن کوئی باشعور شخص خارجی حالات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

حمید سہروردی کو بھی اس کا شدید احساس ہے کہ آج کا افسانہ اپنی شناخت کھو رہا ہے۔ وہ اپنے "دفن ضمیر کا اظہار" "وہ ایک کہانی" میں کرتے ہیں۔ ذات میں گم ہو جانے کا المیہ اشاریہ میں کھو جانے کی بات انھوں نے بڑے سلیقے سے کہی ہے۔ وہ اس طرح کہ کہانی ہمارے اندر مسلسل جی رہی ہے۔ لیکن ہمیں اپنے وجود میں اس کی موجودگی کا احساس نہیں ہے چنانچہ وہ کہتے ہیں: "لکھو ایک کہانی' کچھ نہ کچھ لکھو، جو تم لکھنا چاہتے ہو، کچھ اس طرح لکھو کہ تمہاری ہم سب کی کہانی بن جائے۔ کہانی تمہاری ہماری سمجھ کی ایک ہی ہے۔" "وہ ایک کہانی" کے توسط سے حمید سہروردی نے آج کے افسانے کے تمام تر المیہ کو سمیٹ لیا ہے۔

"لفظوں کی خواہش" داخلی خود کلامی کی ایک اچھی مثال ہے۔ کہانی کار میں کہتا ہے کہ "اب میں بھول جاتا ہوں کہ لفظ ہی نہیں ہے۔ جو کچھ ہم کہتے ہیں اور لکھتے ہیں۔ وہ دراصل ہمارا جذبہ ہے، ہمارا احساس، ہماری فکر ہے لفظوں کی مدد سے ہم اپنے وجود میں پگھلتے ہوئے احساس کو انگلی دیتے ہیں۔" انسان جب زندگی کے بے آب و گیاہ اور لق و دق صحرا میں مختلف حادثات سے دوچار ہوتا ہے تو وہ اپنے گونگے احساس کو الفاظ کی زبان دیتا ہے۔ اور چاہتا ہے کہ اپنے وجود میں پگھلتے ہوئے احساس کو انگلی دے تاکہ ایک نئی کہانی جنم لے۔ نئے الفاظ کا جامہ پہنے۔ وہ لفظ جو احساس کی زبان ہے۔ تاکہ زندگی کے ہر لمحہ زنجیر کو زبان مل جائے۔

"خالی لمحوں کا سفر" ایک ایسے انسان کی کہانی ہے جو بے سمت سفر میں ہے اور بے مقصد زندگی جی رہا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اس کے مسلسل سفر کا کیا مقصد ہے۔ حالانکہ وہ سچائی کی تلاش میں بھٹک رہا ہے جسے پانے سے قاصر ہے کیونکہ سچائی کا کوئی انت نہیں ہے۔ کوئی پیمانہ نہیں۔ اور جب وہ ریلوے پلیٹ فارم پر [illegible] والی عورت کی چھاتی سے چمٹے ہوئے بچے کو دیکھتا ہے جو دودھ کے لئے ماں کے سینے سے سر مار رہا ہے۔ اور وہ عورت اپنے آپ سے دور کسی ذہنی پریشانی میں گھری ہوئی ہے۔ تو وہ کہتا ہے کہ "واقعی سچائی کا کوئی انت نہیں ہے۔"

"نقیضین" ایک ایسی نسل کی کہانی ہے جو اپنے پرکھوں کے ورثہ سے جڑے ہونے پر بھی اس سے کٹی ہوئی ہے وہ اپنے آپ کو زمان و مکاں میں جبر و قدر کے درمیان معلق سمجھتی ہے۔ اس کا عمل جو بظاہر اس کا نہیں۔ ازل کی لامحدود وسعتوں میں اپنی لوح مقسوم کو پڑھنے کے لئے بصارت کو تلاش کر رہی ہے۔ "ایک چیخ/ایک افسانہ"

میں حمید سہروردی اپنے ہم زاد کو تلاش کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وہ ہمزاد کوئی اور نہیں خود ان کی اپنی ذات ہے۔ ذات کی تلاش کے المیہ سے یہ بھی اپنے دوسرے ہمعصروں کی طرح دوچار ہیں۔ کیوں کہ ان کے ہاتھ کی ساری لکیریں غائب ہو چکی ہیں۔ جب اتصال لفظوں اور معنوں میں ناپید ہو جاتا ہے تو ایک مکمل شخصیت ٹوٹ پھوٹ کر رہ جاتی اور بے نامی کا شکار ہو جاتی ہے۔ یہی حمید سہروردی کا المیہ ہے۔ کیونکہ وہ زندگی کی بے سمتی، لاتعلقی اور بے زمینی کے کرب سے بے چین ہیں۔ اور چاہتے ہیں کہ اپنے ہاتھ کی لکیروں کے جال میں گم شدہ انسان کو تلاش کریں۔ ان کی تلاش اپنی ذات سے شروع ہو کر اپنے ہم زاد پر ختم ہوتی ہے۔ "ادھورا حکایتی" میں میں مخفی نہیں ہوں۔ یہ احساس فنکار کے ذہن کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتا ہے۔ جب وہ دیکھتا ہے کہ گدھا کاغذ کھا رہا ہے۔ کاغذ کی قدر نہیں ہے۔ چاہے وہ سفید ہو یا سیاہ، کاغذ اور قلم اپنی قیمت کھو چکے ہیں۔ ذہانت اور دانشوری نااہلوں کی میراث بن گئی ہے سیکل کا بار بار رکنا اس بات کی علامت ہے کہ وقت ٹھہر ٹھہر کر گزر رہا ہے، تاکہ اس کی دھیمی رفتار کا فائدہ اٹھا کر کوئی اسے قید کرے۔ ہر شخص ناہموار راستوں سے گزر رہا ہے۔ ایسے راستوں سے جن کی بظاہر کوئی منزل نہیں ہے۔ کیونکہ جلوس کے بے ہنگم چیخوں کی آواز آرہی ہے مضطرب ہجوم کی یہ چیخیں زندگی کے کرب کی علامتیں ہیں۔ حساس فنکار لاوارث راستوں پر بھٹک رہا ہے۔ ہر طرف انجانا پن ہے۔ زندگی کے آغاز و انجام کی پراسرار گتھیوں کو سلجھانے میں اس کی اپنی شخصیت تحلیل ہونے لگی ہے۔

"نہیں نہیں والے ہاں" نفسیاتی الجھنوں کی کہانی ہے جس میں جنسی گھٹن انسان کے وجود کی دیواروں پہ چپکی چھپکلیوں کی شکل میں نمودار ہوتی ہے۔ اور لذت کوشی کی پہنچ کے اختتام پر انسانی وجود کے کھوکھلے پن کو ظاہر کر دیتی ہے۔ حمید سہروردی اس کہانی کے وسیلے سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ وہ انسان کب پیدا ہوگا جو عشق اا عقل کا وارث کہلائے کیونکہ وہ ابھی دیوار پر رینگنے والی چھپکلی کے سحر سے آزاد نہیں ہوا ہے۔ "چلتے ہوئے قدم" افسانہ نگار کے ذاتی کامپلکس کی کہانی ہے۔ وہ اپنے اس کامپلکس سے یہ کہہ کر پیچھا چھڑانا چاہتے ہیں کہ موت ایک ابدی راحت ہے۔ وہ خود فراموشی کو اس لئے پسند کرتے ہیں کہ آدمی نشے ہی میں اپنے آپ کو اچھی طرح پہچانتا ہے۔ سرخ رنگ سے اس لئے گھبراتے ہیں کہ سرخ رنگ دہشت کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ شاید افسانہ نگار اس حقیقت کو نظر انداز کر گئے کہ سرخ رنگ زندگی کی علامت ہے۔ انسانی جسم میں دوڑنے والے سیال مادے کا رنگ بھی تو سرخ ہوتا ہے۔ زندگی کی بقا بھی اور نیرنگی اسی کی مرہون ہے۔ خون کی سرخی کے بغیر زندگی کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔

"رابطہ" میں شیشے سے بھی نازک دل جذبات کے زخم چھپے ہیں۔ احساس کی شکست اس افسانے کا موضوع ہے۔ نرم و نازک رشتے جن کی کوئی زبان نہیں ہوتی شکست و ریخت کے تناظر میں نرم آنچ کی ہلکی سی تپش بھی کمھلا جاتے ہیں۔ زندگی خوبصورت بھی ہے اور بے چہرہ بھی۔ حمید سہروردی نے اپنے مافی الضمیر کو اس ایک جملے میں ادا کر دیا ہے کہ "خوبصورت چیزوں کا ارمان دل میں پیدا نہ کرو ورنہ زندگی بھر جہنمی عذاب کو برداشت کرنا پڑے گا۔ ہر خوبصورت چیز کا مقدر بدصورتی سے ٹکراؤ اور تصادم ہوتا ہے۔"

کہانی "[illegible]" سے لگتی ہے کہ فنکار نے اپنے ماضی [illegible]

ورق کو بڑی آہستگی اور احتیاط سے الٹ دیا ہے۔ "شکن در شکن" میں سماج کی بے رحمی کے پس منظر میں عدم تحفظ کا احساس شدت سے ابھرتا ہے۔ اخلاقی اقدار کی پامالی سماجی زندگی کا المیہ ہے۔ حمید سہروردی سماج کے اندر جھانک کر دیکھتے ہیں تو انہیں وہاں بے اعتمادی کے الاؤ سلگتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اور وہ اندیشہ ہائے دور دراز کا تشفی بخش جواب نہیں پاتے تو یہ کہہ کر اپنی بکھری سوچوں کو تسلی دے لیتے ہیں کہ "مقدر کا لکھا کون مٹا سکتا ہے۔ خدا کو جو منظور ہے وہی ہوگا۔"

"کرسی میں دھنسا ہوا آدمی" مکر و فریب سے پُر اور جذبات و احساسات سے عاری شہری زندگی کی کہانی ہے۔ زمین پر بڑے بڑے شہر جنگل کی طرح اُگ آئے ہیں۔ اور انسان ان گھنے جنگلوں میں گم ہوتا جا رہا ہے۔ بے اعتنائی، بے رخی، مفاد پرستی، استحصال اور انسان کی انسان سے دوری شہری زندگی کا المیہ ہے۔ ذاتی مفادات کی تکمیل کے لئے ایک انسان دوسرے انسان کو بے رحمی سے کچل رہا ہے۔ مفادات کے تصادم اور ٹکراؤ نے شہری زندگی کو کھوکھلا بنا دیا ہے۔ انسانی اقدار اپنی عظمت کھو رہی ہے۔ اخلاص، مروت، پیار و محبت، ہمدردی، دکھ درد اجنبی الفاظ لگتے ہیں۔ ہر باز بگر اپنے آپ کو کرسی میں دھنسا ہوا سمجھتا ہے اس لئے کہ کرسی ہی سے اس کی شناخت وابستہ ہے۔ ان لئے نا انصافیوں کا شکار، ایک ذہین اور حساس شخص انسانوں کی بھیڑ میں اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتا ہے۔ کیونکہ اس کی ذہنی صلاحیت، مفادات کے ہجوم میں بے وقعت ہو کر رہ گئی ہے۔

"روشن لمحوں کی سوغات" حمید سہروردی کے روحانی کرب کا آئینہ ہے۔ مسلم معاشرہ میں انتشار کی کیفیت افسانہ نگار کو کسی لمحہ کسی کروٹ چین نہیں لینے دیتی۔ اسلام کا شاندار ماضی ان کے لئے عظیم سرمایہ ہے۔ اور حال کی غیر یقینی صورت حال سے حمید سہروردی غیر مطمئن نظر آتے ہیں۔ اخلاقی اور روحانی اقدار کی بازیافت ان کے نزدیک اسلاف کے نشاۃ ثانیہ کی نوید ہے۔ غیر مربوط ترقی کی کوکھ سے سنگین مسائل جنم لے کر مسلم دانشوروں کو دعوت فکر دے رہا ہے۔ اس لئے حمید سہروردی کو روشنی کی تلاش ہے۔ اور وہ علم کی خانقاہوں میں جھلملاتی ہوئی روشنی سے قوم کو روحانی بالیدگی عطا کرنا چاہتے ہیں۔ "عقب کا دروازہ" انسان کی ذہنی غلامی کا تازیانہ ہے۔ چھوٹے چھوٹے مفادات کے لئے انسان دوسروں کے دکھ درد کا کس بے رحمی سے استحصال کرتا ہے۔ اس سانحہ پر حمید سہروردی نے بڑی مہارت سے نشتر زنی کی ہے۔ اندھیرا اجالے کو دبوچ لینا چاہتا ہے۔ دفتروں کی دیواروں میں چنی ہوئی روحیں ماتم کناں ہیں۔ میز پر پڑا ہوا کورا کاغذ زندگی کا استعارہ ہے۔ ان معصوم انسانوں کی زندگی کا حبس کو سجے سجائے آڈیٹوریم میں جبراً مقید کر دیا گیا ہے۔ حالانکہ وہ اس چار دیواری کی فصیل کو توڑنے کے لئے بے چین ہیں۔ لیکن نہیں توڑ سکتے۔ کیوں کہ وہ مجبور ہیں۔ حاکم اور محکوم کی کشمکش کے اشاروں اور کنایوں میں اظہار نے افسانے کی فنی خوبیوں کو دوبالا کر دیا ہے۔ اس افسانے میں حمید سہروردی نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ اپنے آپ کو سنوارنے کے لئے ایک انسان دوسرے انسان کے نازک احساسات کے اضطراب اور استحصال کو بڑی خوبی سے پیش کیا ہے۔ زندگی کا کورا کاغذ فولادی ہاتھوں میں پھنسا ہوا ہے۔ جس کا مستقبل غیر یقینی ہے اور عقب کا کھلا ہوا دروازہ اس بات کی علامت ہے کہ شاید ہوا کا تر و تازہ جھونکا آ کر اندر کے گھٹے ہوئے ماحول کو خنی

فرحت اور تازگی بخش دے۔

حمید سہروردی کے افسانوی مجموعے "عقب کا دروازہ" کو پڑھ کر میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ان کے یہاں توانا سماجی شعور اور بھرپور حسیت ہے۔ ان کے افسانوں میں فنی بالیدگی کا احساس ہوتا ہے۔ چیخوف کے الفاظ میں ان کا فن تخفیف کا فن ہے۔ لینن نے کہا ہے کہ بورژوا آرٹ میں سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ وہ حقیقت کو بگاڑ کر پیش کرتا ہے۔ یہاں میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ ان کے افسانوں میں ایسی کوئی بات نظر نہیں آتی۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ وہ کہانی کو اپنے اوپر طاری نہیں کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی کہانیوں میں بوجھل پن اور تاثر کی کمی محسوس نہیں ہوتی۔ اور وہ اپنی بات کو مختصر الفاظ میں بیان کرنے کی پوری صلاحیت رکھتے ہیں۔ "عقب کا دروازہ" کے فنکار کو جیسا کہ میں نے سمجھا ہے، اپنے خیالات کو آپ کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ ہو سکتا ہے میرے دوسرے دانشور ساتھیوں نے کسی اور زاویہ نگاہ سے ان کے فن کو پرکھنے کی کوشش کی ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میرے اور ان کے نقطۂ نظر میں اختلاف بھی پایا جائے۔ اختلاف کا پایا جانا کوئی بری بات بھی نہیں ہے۔ ایک بات جو میں نے محسوس کی ہے وہ یہ کہ ان کے افسانوں میں کردار الجھے ہوئے اور موضوع پیچیدہ ہوتا ہے۔ لیکن ان کا اسلوب ان کا اپنا ہے۔ جو دور ہی سے پہچانا جا سکتا ہے۔ کیونکہ انہوں نے تمثیل، علامت اور استعارہ کو کچھ اس طرح برتا ہے کہ یہ خوبی ان کے افسانوں کی پہچان بن گئی ہے۔

(بقیہ: خطوط)

بستر پر تنہائی کے عالم میں وہ بند یاد آجاتے ہیں۔ اور بے قرار دل کو اور بھی تڑپا جاتے ہیں۔ بند یہ ہیں

آرزو کے پنچھی رے
یہ اڑان کس لئے
شام عشق ہو گئی
پنکھ کو سمیٹ لے
نا سمجھ لگن تری
نا سمجھ ہے تیری دھن
دل کی دھڑکنیں نہ سن
جال خواب کے نہ بن

گیت کیا ہے آگ ہے آگ! میں نہیں جانتا یہ گیت مجھ کو کیوں از خود رفتہ کر دیتا ہے۔ مگر "پیراہن جاں" میں یہی ایک گیت نہیں ہے جو سوز و گداز اور تاثیر میں ڈوبا ہوا ہے بلکہ "ساقی نامہ" اور اس قسم کی کئی نظمیں بھی ہیں جو بہت ہی کامیاب اور خوبصورت ہیں۔ سید محمد شمیم انجم نثر بھی لکھتے ہیں۔ ان کی "پیراہن جاں" پر اور کچھ لکھنا چاہیے تھا۔

میرا یہ خط اپنی شرعی حدود سے تجاوز کر گیا ہے مگر مجھ کو امید ہے کہ آپ اس کو من و عن شائع کر کے میرے احساسات کی ترسیل کر دیں گے۔

آپ کا مخلص
اویس احمد دوراں

● براہ کرم اپنی تخلیقات صاف اور خوشخط ارسال کریں تاکہ کتابت میں غلطی اور دشواری نہ ہو۔

علی عباس ازل

پھل

آج تو بیر سے کٹھل تک اور گیہوں سے سیب تک جو پھل دل چاہے بقدرِ نصیب کھائیے لیکن سنا ہے کہ ہمارے بابا آدم اور بی بی حوا کے پھل کھانے پر سخت پابندی لگی ہوئی تھی مگر وہ کہ جس نے "آتشِ لذتِ تخلیق سے نمود" پائی ہو اس پابندی کو کیا خاطر میں لاتی پھر "شیطان" یا "سانپ" کی موجودگی بھی ورغلانے کے لئے کافی تھی۔ ثمرِ ممنوعہ کھا ہی لیا۔ نسلِ انسانی کی ابتدا کی یہ غالباً پہلی قدیم توجیہہ ہے۔ یہ تمثیلی کہانی ہزاروں سال پہلے سمیر و بابل والوں نے سنائی تھی۔ جیسا کہ ان قدیم تہذیبوں کے آثار میں پائی جانے والی لوحوں سے معلوم ہوتا ہے۔ پتہ نہیں انہوں نے کس سے سنی لیکن یہ اتنی مقبول ہوئی کہ بعد میں آنے والے تمام سامی مذاہب اسے اپنا اپنا رنگ دے کر سناتے رہے۔ حکمِ خداوندی کی خلاف ورزی کا جو پھل ملا اس کو انسان نے کبھی قابلِ عبرت نہیں سمجھا سوائے عیسائی مذہب کے جس نے اپنے دین و عقیدے کی بنیاد ہی اس "اولین گناہ" پر رکھ دی اور ہمیں یہ سمجھایا کہ چونکہ ہم گناہ سے پیدا ہوئے ہیں اس لئے تمام اولادِ آدم گناہ گار ہے اور اس کی سزا بھگت رہی ہے اور جس کا کفارہ ادا کرنے کے لئے خدا کے بیٹے یسوع کو صلیب پر چڑھنا پڑا۔ افزائشِ نسل کے عمل کو گناہ سمجھنے کا تصور نسبتاً جدید ہے۔ عیسائیت میں یہ خیال اپنے سابقہ مذہب یہودیت کی تکذیب و تردید کے سلسلے میں پیدا ہوا کیونکہ بنی اسرائیل یا یہودی ایک طویل عرصے تک جنسی اعضا کی پرستش کرتے رہے ہیں۔ آج بھی ان کی کئی مذہبی رسوم میں اس کے نشان ملتے ہیں۔ لیکن "یاہوا" (JEHOVA) کے ماننے والے تناسلی اعضاء کی پوجا کر کے کوئی نئی بات نہیں کر رہے تھے۔

ہزاروں سال پہلے سے انسان نے جنسی اعضا کی پرستش شروع کر دی تھی۔ کیونکہ مغربی ایشیا، مصر میں کھیتی کی ابتدا کم از کم چھ ہزار ق۔م ہو چکی تھی۔ عمل تولید کی تثلیث، زراعت میں سورج، زمین اور پیداوار کی تکون سے نمایاں طور پر مماثل ہو گئی تھی۔ اکثر قبائل میں کھیتوں میں جا کر اجتماعی طور سے جنسی فعل ادا

کرنے کی رسم بن گئی تھی۔ دونوں عمل ایک ہی قوت کا اظہار اور مظاہرہ سمجھے جانے لگے تھے۔

اعضائے تناسل کے ساتھ سورج بھی بارآوری افزائش (FERTILITY) کی علامت مانا گیا اور قوت تخلیق کی نشانیاں عبادت کے لائق بن گئیں۔ اس کے شواہد ہمیں قدیم مصر، بابل و نینوا، کنعان، یونان اور ہندوستان میں تو اب تک بہت واضح ملتے ہیں مثلاً یونی اور لنگ پوجا جو پاربتی اور شیو سے منسوب ہے یا ناگ پوجا جس کے لئے ناگ پنچمی کا تیوہار مخصوص ہو گیا ہے اور جو اصلاً لنگ پوجا کی ہی ایک صورت ہے کیونکہ سانپ بہت قدیم زمانے سے دنیا میں عضو تناسل کی علامت مانا گیا ہے۔ ہمارے یہاں یہ پوجا اور تیوہار قبل آریائی ہیں۔ لنگ، شیو اور ناگ تینوں غیر آریائی اور غیر سنسکرت الفاظ ہیں کیونکہ ایران سے آنے والے آریا جب ہند پر کم و بیش 1200 ق م میں حملہ آور ہوئے تو اس وقت وہ چرواہے تھے اور ان کے تمدن میں جنسی اعضاء کی پرستش کی نہ ضرورت تھی نہ اہمیت۔ یہی وجہ ہے کہ رگ وید میں شِشنا پوجا (SEX [illegible] WORSHIP) کی مذمت کی گئی ہے۔

سماجی علوم کی اصطلاح میں یہ پوجا فعل پرستی (PHALLIC WORSHIP) کہلاتی ہے۔ مغربی ایشیا کے ملک فلسطین کی [illegible] میں بھی یہ پرستش ہے [illegible] ق م یہاں ایک سامی [illegible] آباد تھا جو [illegible] کہلاتا ہے۔ ان [illegible] اور پھیلا [illegible] رسم ختم کر دیا۔ [illegible] زبان عبری اور عربی کی

طرح سامی خاندان کی زبان ہے۔ لفظ فلس عربی میں پلش یا پلس ہے۔ عربی نے چونکہ ابتدائے سامی (PROTO SEMITIC) زبان کی لسانی خصوصیات کو دوسری سامی زبانوں کے مقابلے میں زیادہ برقرار رکھا ہے اس لئے یہ لفظ یہاں مادے کی شکل میں فحل / یا فحل مل جاتا ہے جس کے معنی ہیں: نر (MALE) نوزائیدہ بچے کی جنس کی واحد پہچان اعضائے تناسل ہی ہوتے ہیں اس لئے فحل کے بنیادی معنی ذکر ہیں۔ ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ لفظ بہت ہی خفیف تبدیلیوں کے ساتھ ہند یورپی خاندان کی بیشتر زبانوں میں نظر آتا ہے۔ اس سے یہ گمان ہو سکتا ہے کہ یہ ابتدائے ہند یورپی (PROTO INDO-EUROPEAN) کا لفظ ہوگا۔ مگر قدیم سامی زبانوں میں اس کا پایا جانا یہ بتا رہا ہے کہ جس طرح قدیم ہند یورپی زبانوں میں بہت سے الفاظ قدیم سامی سے داخل ہو گئے ہیں اور اب ہند یورپی سمجھے جاتے ہیں۔ مثلاً

۱۔ عربی — عراق۔ جیسے العراق من الظفر۔ ناخون کے گرد کا گوشت

العراق من الاذن۔ کان کا گھیرا

العراق من الدار۔ گھر کا صحن یا COURTYARD

بنیادی معنی وہ شئے جو کسی دوسری شئے کو گھیرے ہوئے ہو، گرد، گھیرا۔

سنسکرت۔ ارگھا [illegible] لاطینی ARCA۔

انگریزی ARC

۲۔ عربی: جد۔ سنسکرت جیشٹھ / جیٹھ۔ روسی [illegible] دید

۳۔ عربی: آبا / ابو — اباجی، عباس۔ لاطینی [illegible]

ـــہ عربی : موت . سنسکرت : مرتیو . لاطینی : مراث
روسی : مرت . فارسی : مرگ
ــے عربی : حی . حیات . حی : حی تار (جانور) .
سنسکرت : [illegible] جیو . جیون . روسی : ژیژن ،
فارسی : زلیست / زندگی سے اردو : جان

اسی طرح لفظ پھل یا فلس بھی ایسے ہی الفاظ میں سے ایک ہے جس نے قدیم ہند یوروپی زبانوں میں مندرجہ ذیل صورتیں اختیار کیں۔

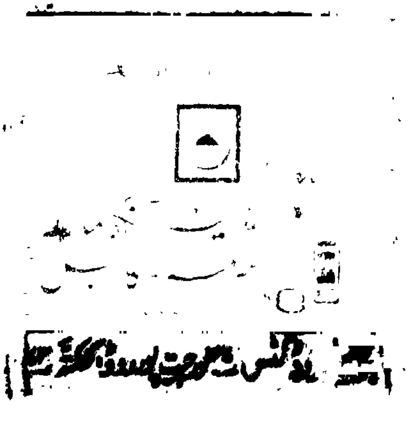
مغربی شاخ کی (۱) یونانی میں یہ مستعار لفظ فیلس تیار ہوا اور پھر اس سے کئی دوسرے لفظ وضع ہوئے مثلاً فیلیں (محبت کرنا) ، فلی (محبت) فلس (ہری شاخ) وغیرہ

(۲) لاطینی میں فیلس یا پیلیس (ذکر) ، پینس (دم) ، پی لم (نوک دار چھڑی)
(۳) جرمن میں فحل (ے ہدہ مرمر (ذکر)
(۴) انگریزی : پائل ے ارم (نوک دار چھڑی ، نیزہ) پائل ے ے ارم (کھمبا ، ستون) پول (بانس) پینس (ذکر)

مشرقی شاخ میں (۵) روسی : پول (جنس - SEX) ، پولی (کھوکھلا ، نلکی دار ، عریاں ، ننگا) پولے (کھیت) پلوت (پھل) ، پالکا (چھڑی ، ڈنڈا)
ــ۶ فارسی : فراز (ذکر) [ر/ل متبادل آوازیں ہیں جیسے زار در میں]
ــ۷ سنسکرت : پھل (ذکر) جیسے پل لنگ میں پُرش (مرد) [پل . اُنثیٰ] پھل کوش (ذکر - خصیہ) ، پھل / پھن (سانپ) پھلانت (بانس) ، پھل پھال (ہل / زمین جوتنے کا آلہ) پھل / پھلا / پھلو (وہ پکا ہوا پھل یا ڈوڈا جو اپنے بیج نکالنے کے لئے تیار ہو)
ــ۸ اردو : پول (کھوکھلا) جیسے پول مٹی ، پول کھلنا ، ڈھول میں پول
پھلی (بانس) ، پھلی جیسے سیم ، مٹر ، املتاس ، سینگھ وغیرہ کی
پھل — نیزے کا پھل ، تلوار کا ، چاقو کا پھل
پھل — درخت کا پھل . ثمر

آخرالذکر دو صورتوں میں مشترک مفہوم یہی ہے کہ ، باہر نکلا ہوا ، شاید اسی لئے لاطینی میں پلس اور دراوڑی زبانوں میں پِلّا بچے (ــ) کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے ۔ اردو میں پِلّا صرف کتے کے بچے کے لئے محدود ہو گیا مگر پھل کے معنی محاورے میں نتیجہ یا کسی کام کے کرنے سے جو برآمد یا حاصل ہو بن گئے مثلاً پھل پانا ، پھل ملنا وغیرہ

اردو کا پھل اپنا شجرہ ڈھونڈتے ہوئے ہندوستان سے ایران (جہاں سے سنسکرت آئی) اور وہاں سے عراق ، کنعان تک پہنچ جاتا ہے لیکن اس کا حسب نسب بیان کرنے سے میرا مقصد یہ ہرگز نہیں ہے کہ آپ جب بھی پھل کھائیں تو ذہن گناہ عظیم کی طرف چلا جائے ۔



ڈاکٹر سید ابوالفیض سیدابادی

منفرد خصوصیات کا شاعر ظفر رضوی کاکوی

صوبہ بہار کے اردو ادب کی کوئی بھی تاریخ اس وقت تک مکمل اور مکمس نہیں ہو سکتی جب تک اس میں کاکو اور نواح کاکو کے اہل قلم حضرات کا تذکرہ نہ ہو۔ نثری ہو یا شعری تحقیقی ہو یا تنقیدی، وہ کون سا صنف ادب ہے؟ جس پر بہار کے کسی ادیب یا شاعر نے خامہ فرسائی کی ہو اور کاکو یا نواح کاکو کا فرزند اس سے بے بہرہ رہا ہو۔ مجھے یہ کہتے ہوئے فخر محسوس ہوتا ہے کہ فرزندان کاکو نے شعری نثری تنقیدی اور تحقیقی صنف ادب کو نئی اصطلاحوں، نئے معنوں اور نئے اشکال سے نہ صرف آراستہ و پیراستہ کیا ہے بلکہ اسے ایک نئی جہت اور نئی سمت عطا کی ہے۔ انہوں نے مختلف اصناف ادب میں ایسے نئے تجربات کئے ہیں جسے ملک اور بیرون ملک کے تمام اہل زبان نے تسلیم کیا ہے۔ یہ وہ مردم خیز قریہ ہے جس نے اردو کے مشہور و مستند شعراء، ادباء، ناقد، محقق اور افسانہ نگار پیدا کئے، جن میں بعض آج بھی بقید حیات ہیں۔ جناب ظفر امام رضوی جنہیں ادبی دنیا ظفر کاکوی کے نام سے جانتی ہے اسی خاک کے گوہر نایاب ہیں۔ شاعری گو عطیہ فطرت ہے مگر ظفر کو یہ عطیہ فطرت کے ساتھ ساتھ اپنے والد رضا کاکوی سے وراثت میں ملا۔

ظفر بنیادی طور پر حزنیہ شاعر ہیں لیکن ان کا کرب و یاس اور غم و الم ان کی آپ بیتی کے ساتھ ساتھ جگ بیتی بھی ہے اور ان کا اور ان کے فن کا یہی وہ کمال ہے جو شہنشاہ الم میر سے انہیں جدا کرتے ہوئے ان کا انفرادی مقام متعین کرتا ہے۔ ان کے حساس دل و دماغ نے جو کچھ دیکھا جن واقعات و حادثات سے دوچار ہوا ہے انہوں نے شعری قالب میں ڈھال کر ہمارے سامنے پیش کیا ہے تاکہ ہم ان واقعات و حادثات اور سانحات سے آشنا ہو کر ان سے مقابلہ کرنے کے لئے عزم جواں پیدا کر سکیں اور اس میں پیدا شدہ حسن اور نغمگیت سے لطف اندوز بھی ہوں۔ جہاں میر شدت غم میں واویلا مچاتے ہیں وہاں ظفر ہماری رگ احساس پر الفاظ کے نشتر مار کر ہمارے احساس غم کو تیز کرتے ہیں۔ ظفر نے غم جاناں

اور غمِ دوراں کو اس طرح پیش کیا ہے کہ ان کا غم، غمِ جاناں، غمِ دوراں اور غمِ حیات و کائنات بن گیا ہے۔ اور ہم اس غم کو دل کی گہرائی سے محسوس کرتے ہیں۔ ان کا احساسِ غم حقیقت پر مبنی ہے اس لئے ہمیں کسی قسم کے بوجھل پن کا احساس نہیں ہوتا۔ مثال کے لئے ان کا یہ شعر ملاحظہ فرمائیے ؎

غم کی پرسش ہے مگر صورتِ تصویر چپ
اتنا مجبور یہ انساں ہے نہ جانے کب سے

غم کی شدت انسان کی زندگی کو اتنا بے کیف بنا دیتی ہے کہ اسے اپنے آپ اور ماحول سے بے گانگی نظر آنے لگتی ہے اس عالم میں وہ بے اختیار یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے ؎

بڑی بے کیف ہو کر رہ گئی ہے زندگی اپنی
نہ دل اپنا نہ غم اپنا نہ اب کوئی خوشی اپنی

اتنا ہی نہیں وہ دوسروں کو بھی اپنے سائے سے جدا رکھنا چاہتا ہے جیسا کہ ظفر کہتے ہیں ؎

گری آہِ رسا پھونک نہ ڈالے تجھ کو
بجلیاں دور ہی رہنا مرے کاشانے سے

لیکن ظفر غم و الام کا صرف رونا ہی نہیں روتے بلکہ اس کے برداشت کرنے کا حوصلہ بھی رکھتے ہیں۔ انہیں اس بات کا یقین کامل ہے کہ غم کے بعد خوشی حاصل ہوگی اور غم کی اس اندھیری رات کے بعد سویرا بھی ہوگا۔ چنانچہ وہ بڑے عزم سے یہ کہتے ہیں ؎

روشنی پھوٹے گی آخر کو سویرا ہوگا
دن بہر حال نکلتا ہے ہر اک رات کے بعد
مٹے گی تیرگی ہر سمت روشنی ہوگی
ہر ایک رات کی آغوش میں سحر بھی ہے

مگر غم کی شدت میں بھی ان کا عزم جوان ہمت نہیں ہارتا اور وہ اپنی تقدیر کی تشکیل آپ کرنے کے لئے اس حالت میں بھی مسکراتے رہنا چاہتے ہیں چنانچہ کہتے ہیں ؎

شدتِ غم میں مسکرانے دو
اپنی قسمت مجھے بنانے دو

ظفر کے یہاں صرف غم و الام کا ہی چرچا نہیں۔ وہ جب عشقیہ شاعری کرتے ہیں تو رنگ تغزل کے ساتھ ساتھ عشق کی سچی کیفیت ان کے یہاں نظر آتی ہے۔ وہ معشوقِ مجازی کو عشق کی والہانہ کیفیت میں اتنا اونچا اٹھا دیتے ہیں کہ وہ معشوقِ حقیقی نظر آنے لگتا ہے اور وہاں ان کی شاعری کو تصوف سے جدا کرنا مشکل امر ہو جاتا ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ ظفر کا تعلق خانقاہ اور شاہی گھرانے سے ہے۔ اس لئے ایسا ہونا لازمی ہے وہ عشق میں اتنا آگے بڑھ جاتے ہیں کہ معشوق کے قدموں تلے سر جھکتے ہی ان کی عبادت ہو جاتی ہے۔ انہیں معشوق کی زلفوں کے دام سے نکلنا تک گوارہ نہیں۔ ملاحظہ ہو چند شعر از خود ملاحظہ فرمائیے۔

قدم ان کا جبینِ شوق میری
نمازِ عشق یوں میں نے ادا کی

سر جھکا ہے آپ کے قدموں تلے
لیجئے میری عبادت ہو گئی

مجھ کو اب اس کے سوا کیا چاہئے
نقش اس کا دل پہ ابھرا چاہئے

اپنی زلفوں سے مت کرو آزاد
عمر بھر زیرِ دام رہنے دو

کھائیے ترکِ ملاقات کی قسمیں لیکن
آپ نے سوچا ہے کیا آپ کی حالت ہوگی

x x x x x x

یہ اسی کے دل سے پوچھو کہ جو تیر کھا چکا ہے
ہے نظر فریب کتنی وہ نگاہ کا فسانہ

محبت رنگ لائے گی کسی دن اے ظفر اپنی
رہے گا وہ بت بیدرد ہم سے بدگماں کب تک

تری مسکراہٹوں پہ ہیں نثار چاند تارے
کہ چمن کی ہر کلی کو یہی شگفتگی ملی

اُنا اردو غزل گو شاعروں کا سرمایہ رہا ہے جو انسانی فطرت کا مقتضا ہونے کے ساتھ ساتھ اس کی اپنی پہچان کے لئے ضروری بھی ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ آغاز شاعری سے لے کر اب تک کے تمام شاعروں کے یہاں یہ کسی نہ کسی صورت میں ضرور موجود ہے۔ ظفر بھی اپنا دامن اس سے نہیں بچا سکے۔ ملاحظہ ہوں ان کے یہ اشعار ؎

منت کشیٔ ساحل نہ سمجھ لیجئے ہم کو
ڈوبیں گے مگر شکوۂ طوفاں نہ کریں گے

ڈوب جائے ظفر مری کشتی
میں نہ احسان لوں گا ساحل کا

سنگدل لوگ ہیں پتھر کے سوا کیا دیں گے
کس کی دہلیز پہ کس در پہ ظفر جاؤ گے

ادب اپنے عہد کا آئینہ ہوتا ہے۔ اسی لئے کسی عہد کو سمجھنے کے لئے اس عہد کے ادب کا مطالعہ ضروری ہے۔ ادیب اور شاعر چونکہ کسی نہ کسی عہد سے وابستہ ہوتے ہیں اس لئے ان کی تخلیقات میں ان کے عہد کے واقعات، سانحات اور حالات کی عکاسی کا ہونا لازمی ہے۔ اس سلسلے میں جہاں تک شاعری کا تعلق ہے اس صنف میں تو ان کی بھرپور عکاسی ہوتی ہے کیونکہ شاعر کا دل پھول کی پنکھڑیوں سے زیادہ نازک اور لاجونتی کے پتوں سے کہیں گنا زیادہ حساس ہوتا ہے۔

ظفر بھی اس سے مبرا نہیں۔ ان کی شاعری میں اس عہد کی سماجی، اخلاقی، اقتصادی اور سیاسی حالات، واقعات اور سانحات کی بھرپور عکاسی ہمیں ملتی ہے۔ اس وقت پھیلی ہوئی فرقہ پرستی، بڑھتے ہوئے فسادات، نفرت، بغض و عداوت، انسانیت اور اس کا بکھرتا ہوا رشتہ۔ ان کے علاوہ سارے مسائل کا احاطہ بڑی خوبصورتی اور جامع انداز میں ہمیں ملتا ہے۔ ملاحظہ ہو چند نمونے از ابن گیہے ؎

دنیا کھڑی ہوئی ہے دھانے پہ آگ کے
بربادیوں کے نام پہ خود ہی ہنسی ہے آگ

وہ کون شخصیت ہے جو پردے میں بیٹھ کر
اس ملک میں فساد کی بھڑکا رہی ہے آگ

جو کبھی جان سے پیارے تھے عزیزان وطن
آج وہی آنکھ چراتے ہیں فسادات کے بعد

کس طرح فرقہ پرستی کی یہاں آگ لگی
یہ مرا شہر ہے تا حد نظر جلتا ہے

قتل و غارت گری و خون کا یارو تم نے
ایسا انبار لگایا ہے کہ جی جانے ہے

صحن و دیوار کا ہر نقش مٹانے کے لئے
اب کے برسات ہوئی خون کی برسات کے بعد

دھوپ کی شدت سے جلتی ہے زمین
کروں اظہار غم کس سے زمانہ میرا دشمن ہے

اس زمانے میں آدمی کا لہو
آدمی کو حلال ہے یارو

جو چلے ارتقاء کے بڑھتے گئے
کوئی انساں مگر خدا نہ ہوا

زمانہ جس کو سمجھتا ہے انقلاب عظیم
مری نظر میں وہی انقلاب ہو نہ سکا

سر کو بچا کے چلنا ذرا رہ روانِ شوق
لٹکی ہوئی ہے وقت کی تلوار دیکھنا

ظفر کے یہاں جینے کا سلیقہ اور پختہ عزم کی بھرپور عکاسی بھی ملتی ہے۔ ملاحظہ ہوں یہ دو اشعار ؎

راہ دشوار ہی لیکن
حوصلے تیز گام رہنے دو

ہم نازشِ یزداں ہو مسجودِ ملائک ہوں
چاہو تو زمانے کی تقدیر بدل ڈالو

المختصر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ظفر ایک کہنہ مشق شاعر ہیں۔ ان کی غزلوں میں لطفِ زبان و بیان حسن و خیال محاورات کی چاشنی، تجربات کی فراوانی اور پھر ان تجربوں کو نئے رنگ و آہنگ اور ساخت کے ساتھ پیش کرنے کا کمال بدرجۂ اتم موجود ہے۔ یہ اپنے گرد و پیش کے واقعات اور سانحات کو عام بول چال کی زبان میں آسان لفظوں کے ذریعہ اس حسن و خوبی سے پیش کرنے کی مہارت رکھتے ہیں کہ ان کا رنگِ تغزل بھی قائم رہتا ہے اور بات بھی بن جاتی ہے۔ ظفر کی شاعری حیات و کائنات کی شاعری ہے جس میں جاناں، غمِ دوراں، احساسِ مایوسی و محرومی، حوصلے کی بلند پروازی، حالاتِ حاضرہ پر گہری نظر، طنز و مزاح، فکرِ ملک و ملت، فلسفۂ حیات و کائنات، فلسفیانہ رنگ، عارفانہ بحثیں، رنگِ تغزل حسن و عشق کی چاشنی اور اس کی حقیقی کیفیت، تجاہلِ عارفانہ، انا، درسِ حیات کے علاوہ فسادات، فرقہ پرستی، پھیلی ہوئی نفرت و حقارت اور حب الوطنی کے جذبات کے علاوہ وہ ساری چیزیں بھی جو ایک بہتر شہری اور بہتر انسان کے لئے ضروری ہے، موجود ہیں۔ شاید ہی حیات و کائنات کا کوئی ایسا گوشہ ہوگا جو ان کے فکر و تخیل اور قلم کی زد میں نہ آیا ہو۔ ظفر کی سب سے اہم اور انفرادی خصوصیت یہ ہے کہ وہ چھوٹی بحروں میں بھی ایسی کامیاب غزلیں کہتے ہیں جو غزل گوئی کے تمام اوصاف سے مرصع، مسجع، اور مرقع ہوتی ہیں۔ ان کے غزلوں کی زبان صاف سلیس رواں اور مترنم ہوتی ہے۔ خیالات کی پیشکش اس سہل انداز میں کی گئی ہے کہ قاری اور سامع کو کسی قسم کی الجھن کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ ہر لفظ مناسب جگہ پر موزوں انداز میں ایک لڑی میں گتھا ہوا معلوم ہوتا ہے یہاں آورد کی بجائے آمد کی کیفیت ہے۔ شعر پڑھئے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ظفر سامنے بیٹھے بات کر رہے ہوں۔ انفرادی رنگ و آہنگ کی یہی وہ خوبیاں ہیں جس نے دورِ حاضر کے شعراء میں ظفر کو ایک منفرد مقام عطا کیا ہے۔

نام لیتے ہیں جس کا لوگ ظفر
ایک گدڑی کا لعل ہے یارو

مشرف عالم ذوقی

پریم نگر سے خط آیا ہے

منڈیروں پر سوکھ رہی ہے تیرے جسم کی خوشبو
تیری آنکھیں عید کی روشن صبح کے جیسی
جھلمل کرتی ہیں
سناٹے میں جاگ گئے ہیں وہ تیرے آوارہ سجدے
کھویا کھویا میرا جب ہے
منڈیروں پر سوکھ رہی ہے تیرے جسم کی خوشبو
گورے گورے ہاتھوں میں کیوں کیسے چبھ جاتی ہے
ٹوٹی چوڑی کی کرچیں
خون بہاتی ہیں
پینٹ کی داہنی جیب میں اب بھی مل جائے گا وہ اجلا رومال
کانپتے ہونٹوں پر چپکے سے میں نے لکھا تھا، بارش موسم
منڈیروں پر سوکھ رہی ہے تیرے جسم کی خوشبو

پریم نگر سے خط آیا ہے
خط میں لکھا ہے
آؤ گے نا......
بولو میرے اچھے بولو

آؤ گے نا.......
آسمان سے میری خاطر چاند ستارے لاؤ گے نا....
پریم نگر سے خط آیا ہے
خط میں لکھا ہے
تین مہینے ہونے آئے
کبھی کہو تم، میری پلکیں دھونے آئے!
یاد کرو نا گیلی آنکھوں پر رکھتے تھے جب جب اپنا ہاتھ
آنکھوں میں شبنم کی جیسی کانپ رہی ہوتی تھیں بوندیں
اپنی ہتھیلی سے بند کرتے تھے میری ہتھیلی
اور بھیگے ہونٹوں پہ دستک دیتے تھے
بھول گئے سب،
یاد کرو نا......
پریم نگر سے خط آیا ہے
خط میں لکھا ہے......

جب جب تیری یاد ستائے
خزاں رسیدہ موسم مجھ کو بھائے
سوکھے پیڑ کی زرد ملی پتی تجھ تک مجھ کو لائے

جب جب تیری یاد ستائے
خزاں رسیدہ موسم مجھ کو بھائے
سوکھے پیڑ کی زرد سی پتی تجھ تک مجھ کو لائے
جب جب تیری یاد ستائے . . .
یہی تو اپنا ساتھی ہے اب یہی تو اپنا یار
جب سے تو پردیس گیا ہے یہی ہے اپنا پیار
سوکھی ندی پیڑ بھی سوکھا اور ٹوٹی پتوار
تجھ سے زیادہ پیارا ہے اب یہ جھوٹا سنسار
جب جب تیری یاد ستائے
خزاں رسیدہ موسم مجھ کو بھائے
چاہت کے وہ گیلے گھروندے تجھ کو یاد نہ ہوں گے
ساحل سے ٹکراتی لہریں، بھیگے بھیگے پیر
تنہائی میں سناٹوں کے ہونٹوں کی لرزش
اور اچانک دو ہاتھوں کے پیروں کا وہ میل
خوشبو مہکتا باب
جینا ایک عذاب
جب جب تیری یاد ستائے
خزاں رسیدہ موسم مجھ کو بھائے

خواہش کے نوخیز بدن کا تنہا تنہا چاند
چپکے چپکے مسکاتا ہے . . . .
میں کچھ کہنا چاہوں تو
شرماتا ہے
خواہش کے نوخیز بدن . . . . . .
ابھی یہ گھنگھرو مت کھولو تم
پرانے ہو جانے دو

صدیوں کی آنکھیں طے کرنے دو
راز پرانے ہو جانے دو
بارش، ریت، اور بھیگی ہتھیلی
اور شرمایا چاند
خواہش کے نوخیز بدن . . . . . .
تنہائی نے پھر اوڑھی ہے تیرے جسم کی چادر
اخباروں سے لپٹ گئی ہے تیرے ہاتھ کی خوشبو
گیلے بستر میں کہیں رکھی ہے تیری حرارت
خواہش کے نوخیز بدن کا . . . . .
میری پیٹھ پہ گرم انگلی سے یاد ہے تم نے
اک دن میرا نام لکھا تھا
پھر وہ انگلی اپنے ہونٹوں پہ رکھی تھی
سہمی سہمی آنکھوں سے پھر مجھ کو دیکھا تھا
بھیگے ہونٹ لرزتی ہتھیلی اور لرزتا چاند
خواہش کے نوخیز بدن کا . . . .
کھوئے سجدے اور ہجرت کے موسم کا عکس
سناٹے کے باغیچے کی پاگل خوشبو
کھو گئی کیوں پازیب کی چھم چھم کہاں وہ تنہا چاند
خواہش کے نوخیز بدن کا تنہا تنہا چاند . . . .

چاہت کے پھولوں کی خوشبو
پیار سے جنتی وادی
لوری گائے لوری سنائے
جب جب یاداں آئے
گل رخ! تو نے ساون کپڑے کیوں پہنے ہیں
پیڑوں کے جھولے، بیتے بچپن سے کہتے ہیں

گل رُخ تو نے......

عمر کے پیروں پیروں چل کر کتنی دور نکل آئے ہم

لیکن گلشن! ہم کو اور ابھی جینے ہیں

گل رُخ تو نے ساون کپڑے کیوں پہنے ہیں

ہر پل مجھ کو ستائے

چاہت کے پھولوں کی خوشبو

پیار سے ہنستی وادی

لوری گائے اور لوری سنائے

جب جب یاداں آئے

بارش کے موسم کا وہ

آدھا گیلا چاند

آدھا سوکھا چاند

ابھی بھیگی باہیں پسارے

مجھ کو گیلا کر سکتا ہے

بارش کے موسم کا وہ آدھا گیلا چاند

آدھا سوکھا چاند

لوری گاتی پروائی اب کیوں کوئل سی کوکے

من کے بھیگے آنگن میں کیوں کوئی پپیہا بولے

سناٹا ہے سناٹے کا چپ چپ ہو تم

اور وہ آدھا چاند

آدھا گیلا چاند

جو بھی چہرہ تیرے آگے رکھ دوں، لگتا ماند

بارش کے موسم کا وہ آدھا گیلا چاند

ہر انگلی میں تین کی پھانکیں

تسبیح کے ہیں پندرہ دانے

مل کر دونوں ہتھیلی بنتے ایک مہینہ

انگلی میں جڑ لو تم اپنے ایک نگینہ

گرم پسینے میں ڈوبے وہ ہاتھ تمہارے

میرا چہرہ تر کر جاتے ہیں

یاد کی اجلی خوشبو مجھ کو

پریم نگر میں لے جاتی ہے

ساون گاؤں کی اس پنگھٹ پر

انتیس روزے جیسا تقدس لے کر چہرے پر

سجدہ کرتی آنکھیں مجھ پر بچھ جاتی تھیں

میرے خدا تم ہو.....!

تم ہی خدا ہو.....!!

کافر ہو گیا، باتیں کیوں تم ایسی کرتی ہو

ہرے بھرے منظر سے تم کفر چراتی ہو

کفر چرا کر میری بنتی ہو

شرم سے مہندی رچی ہتھیلی چہرہ تک لے جاتی

چہرہ ایک قرآن

اللہ تیری شان

ہر انگلی میں تین کی پھانکیں

تسبیح کے ہیں پندرہ دانے

مل کر دونوں ہتھیلی بنتے ایک مہینہ

انتیس روزے جیسا

انگلی میں جڑ لو تم اپنے ایک نگینہ

شاہد میر

دل کی دھڑکن ماتمی دھن سانس کو زنجیر کہنا
کوئی گر پوچھے تو اپنے عہد کی تفسیر کہنا
ہر قدم پہ بندشوں پابندیوں کا ذکر کرنا
اور اس کو نا گمان وقت کی تحریر کہنا
کب تلک معصوم چہروں کو ستم پیشہ لکھو گے
آنکھ کو خنجر بتانا زلف کو زنجیر کہنا
رہ گئے اشعار وہ سارے تو رخصت ہو چکا اب
دھواں کو میراث لکھنا ریت کو جاگیر کہنا
خامشی کا گوہر نایاب رکھنا پاس لیکن
بات کہنے کی اگر ہو تم بھی شاہد میر کہنا

جاگتی آنکھوں سے وابستہ دیا مانگے ہے
وقت، امید بصیرت کی دعا مانگے ہے
گرد آلود فضاؤں میں بھٹکتا موسم
گمشدہ لمحے سے خود اپنا پتا مانگے ہے
عکس در عکس حقیقت کی لکیریں روشن
خواب در خواب کوئی حسن ادا مانگے ہے
اپنی مجروح نگاہوں کا سفر ہے جاری
جستجو کرب مسافت کی دوا مانگے ہے
منصف وقت کی مغرور سماعت، جاوداں
گونگے مجرم سے صداقت کی نوا مانگے ہے

پگھلتی شمع سے میں خود کو بے خبر کر لوں
غزل کو فکر کی حدت سے معتبر کر لوں
سفر طویل ہے لیکن - یوں مختصر کر لوں
میں اپنی دوری منزل کو ہم سفر کر لوں
فسون شب کو نگاہوں سے متصل کر کے
حدود خواب کو وابستۂ سحر کر لوں
فلک پہ چاند ستارے حسد سے جلتے ہیں
میں اپنی قوت پرواز مختصر کر لوں

خاور نقیب

م.ش. نجمی

زخم موسم تیری ہریالی بڑی اچھی لگی
دل جگر میں ٹیس کی موجودگی اچھی لگی
اک خدا اچھا لگا۔ اک بے خودی اچھی لگی
اور اس کے بعد ساری زندگی اچھی لگی
کچھ سمندر تک پہنچنے کی تڑپ باقی تو ہے
ان کو سیرابی ہمیں تشنہ لبی اچھی لگی
اس سفر میں کچھ نشاطِ رہگزر بھی چاہیے
آبلوں سے پاؤں کی وابستگی اچھی لگی
روپ موسم یوں تو ان آنکھوں نے دیکھے ہیں بہت
زندگی مجھ کو تری بے چہرگی اچھی لگی
پھولسی کی کٹیا میں جس نے آنکھ کھولی تھی اسے
جگمگاتے شہر کی آوارگی اچھی لگی
یوں تو کم دلکش نہیں تھی پربتوں کی برف بھی
اپنی مٹی، اپنے پھولوں کی ہنسی اچھی لگی
دھوپ کے ریلے سے لیکر چھاؤں کی دلبستگی تک
مجھ کو تیری جستجو کی ہر کڑی اچھی لگی

ڈاکٹر حنیف ترین

سلگتی یاد سے خوں اٹھ نہ جائے
دھوئیں سے دل کی کھائی پٹ نہ جائے
نئی فکروں سے بھیجہ پھٹ نہ جائے
جو غم میرا ہے سب میں بٹ نہ جائے
سرابوں کو جلائے رکھ کہ جب تک
یہ چیخیں مارتی شب ہٹ نہ جائے
مسلسل بارش افتادِ سحر کر
سڑک پیاسوں کی کٹ نہ جائے
بدن کا گھر بچے دیمک پھیلنے سے
یہ ڈر ہے دل کا روزن چھٹ نہ جائے
صدائے رنگ چھوکر پانیوں کا
گھٹا تخلیقیت کی چھٹ نہ جائے
حنیف آیا ہے تم سے چاند ملنے
درازی دیکھو شب کی گھٹ نہ جائے

خزاں میں اوڑھ کے قول و قرار کا موسم
بہار ڈھونڈ رہی ہے بہار کا موسم
وہ میرے ساتھ نہیں ہیں تو دل کے صحرا پر
ہے بکھیر رہا ہے بہار کا موسم
فریب خود کو نہ دیگا تو ـــــ اور کیا دیگا
نہ راس آئے جسے اعتبار کا موسم
تمہارے قرب کی مدھم سے اک حرارت سے
ہے ڈھیر راکھ تلے، انتظار کا موسم

علیم صبا نویدی

مجھ کو میرا ماضی ہی وسعتوں میں لے آیا
اک جمود تھا طاری، حرکتوں میں لے آیا
خامشی کے نظارے تھے نصیب کے آگے
کھینچ کر اکیلا پن قربتوں میں لے آیا
بادلوں کی چلمن سے ایک جھانکتا لمحہ
زندگی کی انجانی لذتوں میں لے آیا
میں خموش سا برسوں ذات کی صدف میں تھا
وقت مجھ کو جلووں کی صورتوں میں لے آیا
چاہتوں کا سبزہ بھی اگ نہ پایا تھا مجھ کو
آرزو کا اک جھونکا وحشتوں میں لے آیا

خوشی کے سائے میں پل کر جو غم ہوئے روشن
وہ ضو فشاں ہی رہا پھر بھی کم ہوئے روشن
بساط اپنی کھلی ادوار کی تہوں پہ جب
اور اپنے اوج تفکر سے ہم ہوئے روشن
ہماری نارسائی کا معجزہ دیکھو
گواہی دینے کو نقش قدم ہوئے روشن
دگر نہ ان میں کہاں تھی شعاع زیب ورق
ہمارے ہاتھ میں آ کر قلم ہوئے روشن
اب اور ان سے سیہ بادلوں کی آس نہ رکھ
بہت برس کے فضا چشم نم ہوئے روشن

میں جب کبھی اپنے مقدر سے جاگ اٹھوں گا
نئے صدف نئے گوہر سے جاگ اٹھوں گا
جلوس نور سماوات لے کے آنکھوں میں
میں ہر بجھے ہوئے منظر سے جاگ اٹھوں گا
ہر ایک دور میں میں استوا کا قائل ہوں
ہر ایک دور کے محشر سے جاگ اٹھوں گا
وہ لمحہ کتنا حسیں معتبر سا ہوگا جب
میں ہر نگاہ کے اندر سے جاگ اٹھوں گا
میں آج فرش خموشی پہ سو رہا ہوں مگر
وہ دن بھی آئے گا گھر گھر سے جاگ اٹھوں گا

کلیم حیدر شرر

میں کیا کروں کہ میری نظر جوہری نہ تھی
پتوں کا رنگ سبز تھا شبنم ہری نہ تھی
جب تک کسی کے سنگ ملامت پہ دھول تھی
تب تک مرے مزاج میں بھی خودسری نہ تھی
کیا مانگتا خدا سے میں دنیا کی سیر کو
ذہن رسا سے بڑھ کے اڑن طشتری نہ تھی
خواہش جہیوں کی آگ میں ہر لمحہ جل گیا
جینے کی آرزو مری پھر بھی مری نہ تھی
کچھ آئینہ بدن مری وحشت سے ڈر گئے
دست جنوں میں سنگ تو کیا کنکری نہ تھی
آواز میری کل کے تعاقب میں ہے شرر
کل بھی ادب پہ میری نظر سرسری نہ تھی

اختر شاہجہاں پوری

مرے ہمسائے مجھ کو اس طرح ہشیار کرتے ہیں
کہ رہ رہ کر وہ ہنگامہ پس دیوار کرتے ہیں
شکستہ ناؤ ہو باد مخالف کے تھپیڑے ہوں
جو ہیں عزم و عمل والے وہ دریا پار کرتے ہیں
مجھے کیا فرق پڑتا ہے زمانے کے تغیر سے
جو کام احباب کو کرنے تھے اب اغیار کرتے ہیں
جنھیں دعوائے حق گوئی تھا ان سے پوچھ لے کوئی
تجارت جھوٹ کی اب کیوں سر بازار کرتے ہیں
خوشی ہو، غم ہو، الفت ہو کہ نفرت ہو مگر لوگو
جو ہیں باظرف وہ کھل کر کہیں اظہار کرتے ہیں
سروں پر دھوپ سے کر سایا دیتے ہیں مسافر کو
نگاہ غور سے دیکھو جو کام اشجار کرتے ہیں
کسی کے ظلم کے قصے بیاں ہم ہی نہیں اختر
لہو میں تر بہ تر گھر کے در و دیوار کرتے ہیں

نعمان شوق

ایسے بھی یونہی ختم ہوئیں چھٹیاں مری
آنکھیں بچھائے رہ گئیں پگڈنڈیاں مری

جس آدمی سے بھی ملوں وہ دیوتا لگے
مجھ کو ڈبو نہ دیں کہیں خوش فہمیاں مری

سورج تو میرے پاؤں کے نیچے ہے خیمہ زن
اب ڈھونڈو آسمان پہ پرچھائیاں مری

پہلے بھی تیرا نقش ابھارا تو تھا مگر
اتنی لہولہان نہ تھیں انگلیاں مری

تنہائی کے اداس جزیرے میں قید ہوں
لے کر چلا گیا ہے کوئی کشتیاں مری

❀

معجزہ کر گیا یہ درد کا موسم اب کے
اشک برسے مگر آنکھیں نہ ہوئیں نم اب کے
ساتھ تلوار چلانا تو بڑی بات ہوئی
زخم پر بھی کوئی رکھتا نہیں مرہم اب کے
اور کچھ مانگنا لوگوں سے محبت کا ثبوت
جان کا مول یہاں کچھ نہیں جانم اب کے
کام آئے گی نہ شاہوں کی قصیدہ خوانی
ہاتھ آئیں گے نہ دینار نہ درہم اب کے
اپنی آنکھیں تو ہر اک رت میں برس سکتی ہیں
غم نہیں گر نہ ملا ابر کا موسم اب کے

❀

نوشاد احمد کریمی

میری گردن پہ کس کا چہرا ہے
اس لئے یہ آئینہ بھی جھوٹا ہے
رات پلکوں پہ دستکیں دیگی
خواب لگتا ہے اپنا سچا ہے
بستی بستی اداسیاں ہیں یا ؟
میرے اندر ہی کوئی روتا ہے
مسئلہ پیش ہے اصولوں کا
لیک سکہ ہے وہ بھی کھوٹا ہے
رات بے وجہ کیسے روئے گی
کوئی تارا ضرور ٹوٹا ہے

م۔ ح۔ اشرف

آنکھیں ہیں، حیرانی کیسی
صحرا میں ویرانی کیسی
گڑیوں سے جب دل بہلانا ہے
چینی اور جاپانی کیسی
تکتا ہے لہروں کو ساگر
ندیا ہے دیوانی کیسی
روتے آنا روتے جانا
جگ میں یہ مہمانی کیسی
خود ہی جب بیگانے ٹھہرے
راہیں پھر انجانی کیسی
موند ہی لیں جب آنکھیں اپنی
سانسوں پر نگرانی کیسی

کفیل انور

ہر لمحہ جیسے صدیوں کی بس پیاس سا لگا
تیرے بغیر سبز شجر گھاس سا لگا
کرتی ہیں گشت اس کی صدائیں مجھی میں کیا
میرا سوال اس کو مگر قیاس سا لگا
فردا کی اس سلگتی ہوئی دھوپ میں مجھے
ننگا شجر بھی ٹوٹی ہوئی آس سا لگا
صحرا میں بسنے والوں کی حالت پہ کیا کہوں
انور خود اپنا گھر مجھے بن باس سا لگا

سُہیل جامعی

ناخلف

بستر پر لیٹتے ہی پھر مجھے مونس کی یاد ستانے لگی اور بار بار میرے سامنے اس کا معصوم چہرہ گھومنے لگتا کتنا سمجھایا تھا صبح میں نے لیکن میری ایک نہ مانا اور دوستوں کے ساتھ ایسے حالات میں گھر سے باہر نکل گیا۔ میں سوچتا رہا کہ شاید میری پرورش میں ہی کوئی کمی رہ گئی۔ جب تو وہ ایسا نکل گیا، پتہ نہیں آج وہ کہاں کہاں ؟؟ کیا کیا گل کھلائے ؟؟ اور میری بنی بنائی عزت میں داغ لگائے — میری تو کچھ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ میں اس سلسلے میں کیا فیصلہ کروں ؟

ابھی میں انہی باتوں میں الجھا ہوا تھا کہ میرے خیالات گذرے ہوئے کل کی طرف بھاگنے لگے کتنی منتوں کے بعد مونس کا وجود ہماری خوشیوں کا دامن بھر سکا تھا اور رعنا کی خوشیوں کی تو کوئی انتہا نہ تھی — ہماری دس سالہ شادی شدہ زندگی میں سینکڑوں بار رعنا نے دوسری شادی کی تجویز رکھی لیکن مجھے اپنے مالک پر بھروسہ تھا۔ جبھی تو میں ہمیشہ تسلی دیا کرتا: "رعنا! اس مالک پر بھروسہ رکھو۔ وہ ہمیں مایوس نہ کرے گا"

آخر دس سالوں بعد خدا نے ہماری سن لی اور مونس کی شکل میں ایک خوبصورت لڑکے سے نوازا — اس وقت ہماری خوشیوں کا کوئی ٹھکانا نہ تھا اور گھر وا... نہ سمارہے تھے لیکن رعنا کو یہ خوشیاں زیادہ ر... آئی اور وہ دو سالہ مونس کو ہمارے بیچ چھوڑ کر ا... جہان فانی سے کوچ کر گئی۔ جہاں میں تنہا اپنے آپ کو محسوس کرنے لگا۔ لیکن مونس کی موجودگی نے کچھ سوچنے ہی نہیں دیا۔ جبھی تو دوستوں کے مشور... باوجود میں نے تنہا رہنا بہتر سمجھا اور وقت کا ز... تر حصہ مونس کی پرورش میں ہی گزارتا رہا اور ہر... کے وجود سے چمٹا رہا...

ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ رات کے س... میں یکایک دروازہ کھٹکھٹانے کی گونجتی ہوئی آوا... دی تو میں بری طرح چونک گیا اس لئے کہ کئی دنو... شہر میں کرفیو لگا ہوا تھا — دوبارہ جب در... کھٹکھٹانے کی آواز آئی تو میں خود ہی اٹھ کر درو... پہنچ گیا۔

اور جونہی دروازہ کھولا سامنے ایک عورت کو... ابھی میں اس سے کچھ پوچھتا کہ اس نے بلا جھجک... میں داخل ہو کر دروازہ بند کر لیا اور میرے س...

بلک کر رونے لگی۔

"کسی طرح میرے شوہر کو بچا لیجئے۔ پلیز میری مدد کیجئے۔"

"کیا ہوا آپ کے شوہر کو اور کہاں ہیں وہ۔ کچھ تو بتائیے؟"

"میرے شوہر زخمی حالت میں اُدھر جھاڑیوں کے پاس پڑے ہیں اس نے اشارہ سے بتایا۔

"بیٹی، گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔"

"انکل! پہلے انہیں لے آئیں۔ مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔ کہیں کوئی آ نہ جائے۔" اس کی گھبراہٹ بجا تھی اور میں بھی یہی سوچ رہا تھا کہ کہیں مونس آ نہ جائے کیوں کہ میں جانتا تھا کہ وہ بھی بلوائیوں کے گروپ میں شامل ہو گیا ہے۔

کچھ دیر میں کھڑا سوچتا رہا—— پھر اس کے ہمراہ دروازہ کھول کر باہر نکل گیا اور اس جگہ پہنچ کر اس کے شوہر کو سہارا دیکر کمرے میں لے آیا وہ پوری طرح زخمی تھا۔ اور اپنے ہوش و حواس کھوئے ہوا تھا میں نے اسے پہلے بستر پر لٹا دیا اور پھر اس کی مرہم پٹی کرنے لگا جب اس کی مرہم پٹی کر چکا تو میں اس عورت سے مخاطب ہوا—— گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے تمہارا شوہر ٹھیک ہو جائے گا۔"

"انکل! میرے شوہر ٹھیک ہو جائیں گے نا؟"

اس کی اس آواز کے ساتھ پہلی دفعہ اس عورت کا بھرپور جائزہ لیا تو پتہ چلا کہ وہ نو عمر تھی، زیادہ سے زیادہ بائیس تیئیس سال کی ہوگی۔ ساڑی میں تھی اور جو چیز مجھے زیادہ پریشان کئے ہوئے تھی وہ یہ تھی کہ وہ حاملہ تھی۔

میں پھر اس عورت سے مخاطب ہوا۔ "آپ نے بڑی ہمت کی جو یہاں آ گئیں —— آپ نے کیسے یقین کر لیا کہ آپ کو یہاں پناہ مل جائے گی۔"

"مجھے معلوم ہے کہ آپ کون ہیں—— کئی سال تک آپ بالموں میں ہمارے پڑوسی تھے۔ پچھلے ہفتہ میں یہاں آئی ہوں جب سے آپ سے ملنا چاہ رہی تھی لیکن ملنے سے پہلے ہی ان کے آفس پر حملہ ہو گیا۔ جس میں وہ شدید زخمی ہو گئے۔ وہ تو ان کے ڈرائیور کی مہربانی تھی کہ اس نے کسی طرح انہیں بچا کر اپنے گھر میں محفوظ رکھا۔ پھر اندھیرا ہوتے ہی اس نے ہمارے کہنے پر یہاں تک پہنچا دیا—— اور اب میں انکل آپ کے سامنے ہوں۔ شاید آپ نے اب تک مجھے پہچانا نہیں —— رحمٰن انکل—— میں آپ کی بیٹی آشا ہوں۔"

اتنا سنتے ہی میں نے اسے سینے سے لگا لیا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا "اری تو ہو گئی بٹیا! میں نے تو تجھے پہچانا ہی نہیں۔ بیٹھو بیٹھو، آرام سے بیٹھو۔"

پھر اسی اثنا میں مجھے یاد آ جاتا ہے کہ شاید یہ لوگ صبح سے بھوکے ہوں۔ اس لئے آشا سے مخاطب ہو کر بولتا ہوں۔ تم آرام سے یہاں بیٹھو میں تمہارے لئے کھانے کا کچھ بندوبست کرتا ہوں۔ اور ہاں اندر سے دروازہ بند کر لو اور جب تک میری آواز نہ ملے دروازہ نہ کھولنا۔

اتنا سنتے ہی وہ گھبرا کر بولی۔ "کوئی آنے والا ہے کیا؟"

"نہیں —— کوئی نہیں۔ ہو سکتا ہے مونس لوٹ آئے۔"

"ارے مونس بھائی —— تب تو میری پریشانی یونہی دور ہو جائے گی۔" اور میں دل ہی دل میں سوچنے لگا کہ اسے کیسے بتاؤں کہ مجھے اس وقت خطرہ مونس سے ہی ہے جو خوف مونس سے ہے۔ اور دل ہی دل میں دعا کرتا ہوں خدایا! اس وقت مونس نہ پہنچے۔ پتہ نہیں اس وقت وہ کہاں اور کیا کر رہا ہو۔

میں انہیں خیالوں میں الجھا ہوا باورچی خانہ کی طرف

بڑھ جاتا ہوں۔ جہاں کرفیو میں ڈھیل کے درمیان لائے ہوئے چند بریڈ اور انڈے پڑے ہوئے تھے۔

ابھی میں آملیٹ بنا ہی رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہونے کی آواز سن کر بالکل گھبرا گیا اور اس سے پہلے کہ مونس دروازہ کھٹکھٹائے میں نے دروازہ کھول دیا۔

"کیا بات ہے بابا! آپ بہت زیادہ پریشان نظر آرہے ہیں۔" مونس نے اندر داخل ہوتے ہی مجھ سے پوچھا۔

"نہیں مونس ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ تمہارے سارے دن گھر سے غائب رہنے کی وجہ سے فکرمند تھا۔

اور شاید یہی وجہ ہے کہ آپ اپنے روم کی لائٹ آوف کرنا بھول گئے۔ پتہ ہے سارا شہر کرفیو کی وجہ سے سنسان پڑا ہے۔ ہر طرف صرف ملیٹری بوٹ کی آواز ہی سناٹے کو چیرتی ہوئی کانوں کو سنائی پڑتی ہے۔ اچھا پہلے میں آپ کے روم کی لائٹ اوف کردوں پھر باتیں کریں گے۔"

اور وہ جونہی باورچی خانہ کی طرف بڑھتا ہے میں لپک کر دروازے پر آواز دیتا ہوں۔ "آشا بیٹی دروازہ کھولو" اور جونہی آشا دروازہ کھولتی ہے اس سے پہلے کہ میں روم میں داخل ہوتا۔ مونس تیزی سے پلٹ کر دروازے کا دونوں پٹ کھول میرے سامنے کھڑا ہو جاتا ہے۔ "تو یہ بات ہے بابا! — آپ نے کافروں کو یہاں چھپا رکھا ہے۔"

اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا۔ بیچ میں آشا ہی بول پڑی۔ "ارے مونس بھائی! آپ نے مجھے پہچانا نہیں میں آپ کی بہن آشا ہوں۔"

"میری کوئی بہن وہن نہیں۔ میں اس دنیا میں اکیلا ہوں اور پھر تم کافر کی اولاد میری بہن کیسے ہو سکتی ہو" اور پیچ کر مجھ سے مخاطب ہوتا ہے۔ "پاپا! آپ نے اپنے گھر میں ایک ہندو کو پناہ دے کر اچھا نہ کیا، میں انہیں زندہ نہیں

چھوڑوں گا پاپا:" اور ریوالور جیب سے نکال کر میرے سامنے کھڑا ہو گیا۔ یہ دیکھ کر آشا کے منہ سے چیخ نکل گئی اور وہ بھاگ کر میرے پیچھے چلی آئی۔

اور میں مونس کے سامنے گڑگڑانے لگتا ہوں

مونس اس نے تمہاری ماں کے کوکھ سے جنم تو نہیں لیا۔ لیکن اس کا سارا بچپن میری ہی گود میں گزرا ہے، اسے میں نے اپنی بیٹی ہی سمجھ کر پالا تھا۔"

"کچھ بھی ہو پاپا! یہ ہے تو ایک ہندو کی اولاد جس نے مرادآباد، احمد نگر، ملیانہ، میرٹھ، علی گڑھ، جمشید پور اور بھاگلپور جیسے بے شمار شہروں میں میرے بھائیوں کا بے دریغ خون بہایا ہے، ان کی دولتوں کو دونوں ہاتھوں سے لوٹا ہے۔ میں اسے کیسے زندہ چھوڑ سکتا ہوں پاپا—!"

"فضول کی باتیں مت کرو مونس۔ دیکھتے نہیں ا[س] کا شوہر زخمی ہے؟ اور آشا کی حالت بھی دیکھو؟ یہ تو تمہارے مذہبی نقطۂ نظر سے بھی قابلِ رحم ہے، ا[ن] لوگوں پر تم رحم کھاؤ:" میں نے دوسرے پیرائے سے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

نہیں پاپا! اس سے پہلے کہ اس دھرتی پر ا[یک] اور ہندو جنم لے، میرے قوم کا ایک اور قاتل پیدا [ہو] میں اس کا وجود ہی مٹا دوں گا۔ پلیز پاپا—! آپ سامنے سے ہٹ جائیں:"

اب تک آشا! میرے پیچھے تھر تھر کانپ ر[ہی تھی] میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ ایک طرف اکلوتی [اولاد] اور دوسری طرف میرے اصول اور آدرش کھڑے۔ میرے دل و دماغ میں ایک ہلچل سی مچی ہوئی [تھی] میں ایک بار پھر — مونس کو سمجھانے

کرتا ہوں۔" مونس ! اگر انہیں مارنا ہے تو مجھے مارو کیونکہ میں نے تحریک آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ تقسیم ہندوستان پر گھنٹوں آنسو بہائے تھے اور پورے خاندان کے پاکستان چلے جانے کے باوجود میں اپنی مٹی سے چمٹا رہا۔ مونس مجھے اپنی دھرتی ماں سے بہت پیار ہے رے — میں نے ہندوستان اس لئے نہیں چھوڑا کیونکہ میں دلوں کا بٹوارہ مذہب کی بنیاد پر نہیں چاہتا تھا۔ مجھے ہندو مسلمان یکساں عزیز ہیں۔ یہی تعلیم میں نے تمہیں بھی دی ہے لیکن نہ جانے میری پرورش میں کہاں کمی رہ گئی کہ تمہارے جینے کا نظریہ ہی بدل گیا۔"

میری اتنی بات سن کر وہ سکتے میں آگیا۔ لیکن تھوڑی دیر بعد مجھے یوں محسوس ہوا کہ اس کی دیوانگی میں کمی نہیں آئی اور نہ ہی اس کے عزائم پست ہوئے۔ پھر نہ جانے مجھ میں کہاں سے ایک طاقت سی پیدا ہو جاتی ہے اور اس سے پہلے کہ مونس کچھ کر بیٹھے میں لپک کر اس کے ہاتھ سے ریوالور چھین لیتا ہوں اور اس کے سامنے کھڑا ہو کر ایک عزم کے ساتھ اس سے مخاطب ہوتا ہوں۔" مونس — آشا کو اگر ہاتھ بھی لگایا تو آج مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔"

مونس میری بات سن کر ایک زوردار قہقہہ لگاتا ہے —" تو کیا آپ ایک ہندو کو بچانے کی خاطر اپنے اکلوتے بیٹے پر گولی چلائیں گے" — اور پھر وہ ہنسنے لگتا ہے۔" یہ تو آپ کر ہی نہیں سکتے، اور میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

یہ کہتے ہوئے وہ آہستہ آہستہ آشا کی طرف بڑھا۔ " ریوالور آپ کے پاس ہے تو کیا ہوا، میں اسے تو اپنے دونوں ہاتھوں سے مار سکتا ہوں" اور جونہی مونس آشا کی طرف لپکا میں نے ریوالور کی لبلبی دبا دی اور اس سے پہلے کہ وہ آشا کو ہاتھ لگاتا ایک مردانہ چیخ گولی کی آواز کے ساتھ گونج اٹھی۔ اور دوسرے ہی لمحے مونس چکرا کر میرے قدموں میں گر پڑا۔

چند لمحہ میں وہیں خاموش کھڑا اس کی خون میں لتھڑی لاش کو دیکھتا رہا پھر بولا —

" آشا بیٹی ! دنیا میں جو انسانیت کا سبق نہ سیکھ سکے، جو ایک دوسرے کے کام نہ آسکے، ایسی اولاد سے بے اولاد رہنا بہتر ہے۔ پھر میں مونس کی لاش پر تھوک کر آشا کے ہمراہ اپنے کمرے میں چلا گیا۔

—

بقیہ :- بات چھوٹی سی

کام نہیں کیا ہے، اپنے گھر کی عزت اور وقار کو برقرار رکھنے کی ہر امکانی کوشش کی ہے۔ پھر وہ فوراً جا کر باورچی خانے سے اپنے حساب کی کاپی اٹھا لائی اور ریاض کے سامنے پھینک دی اور بھیگی آواز میں کہا۔" لو، دیکھ لو۔" اس کا گورا چہرہ غصہ کی تمازت سے گلنار ہوگیا۔

ریاض ایک محاسب کی طرح کاپی کے تمام اوراق الٹنے پلٹنے کے بعد سوچ رہا تھا۔ اتنے میں جمیلہ نے گروی رکھے ہوئے زیورات کے کاغذات اور کپڑوں کی خریداری کے حساب کی رسیدیں اس کے سامنے رکھ دیں۔

جمیلہ کے غصہ سے تمتماتے ہوئے رعب دار چہرے پر درد، نفرت، کشمکش اور کرب ناک تاثرات کو دیکھ کر ریاض کی آنکھیں دھواں دھواں ہوگئیں۔

—

جواب کے لئے ڈاک ٹکٹ ضرور بھیجئے

خواجہ عبدالرزاق

بات چھوٹی سی

زندگی میں کبھی ایسا وقت بھی ہوتا ہے جس کو انسان عمر بھر نہیں بھولتا۔ ایک سال بعد بھی اس کا غصہ کم نہیں ہوا تھا۔ وہ کسی بھی بات کا جواب نہایت محتاط انداز میں دیا کرتی تھی۔

چھ بج چکے تھے، شام کے ملگجے سائے اپنے پاؤں پھیلائے جا رہے تھے وہ دروازے پر کھڑی اضطراب کے عالم میں دور دور تک نظریں دوڑا رہی تھی۔ اس کے بچے ابتک اسکول سے نہیں آئے تھے۔ اس کے دماغ میں مختلف وسوسے تڑپا رہے تھے۔ گھر میں کوئی تھا بھی نہیں جسے پتہ لگانے اسکول بھیجا جاتا۔ وہ بری طرح بےقرار ہو رہی تھی۔

اتنے میں ریاض اپنی سائیکل گھسیٹتا ہوا دفتر سے پیدل آتا دکھائی دیا۔ راستہ میں اس کی سائیکل پنکچر ہو گئی تھی، وہ جمیلہ کو خلاف معمول دروازے پر کھڑی دیکھ کر چونکا، قریب آکر پوچھا۔ "کیا ہوا، کیوں کھڑی ہو؟"

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد جمیلہ نے گلوگیر آواز میں کہا۔ "بچے اسکول سے ابتک نہیں آئے۔"

"بچے اب تک نہیں آئے؟" ریاض ایکا ایکی بدحواس ہو گیا۔ اور سائیکل پٹخ کر الٹے پاؤں بھاگا۔ مشکل سے بیس قدم بھی نہیں گیا ہوگا کہ بچوں کا رکشا آتا دکھائی دیا۔ رکشا گھر پر پہنچا تو جمیلہ نے رکشا والے سے پریشانی کے عالم میں پوچھا:

"اتنی دیر کیوں ہوئی رکشے والے؟"

اس سے قبل کہ رکشا والا کچھ کہتا۔ بچوں نے رکشے سے اترتے ہوئے کہا۔

"آج کارپوریشن کے میئر صاحب اسکول کا معائنہ کرنے آئے تھے اس لئے چھٹی دیر سے ہوئی امی۔"

بچوں کا جواب سن کر جمیلہ کے دل کی دھڑکنیں کچھ کم ہوئیں تو جھٹ دونوں بچوں کو اپنی ممتا بھری باہوں میں لپیٹے اندر چلی گئی۔

ریاض سگریٹ پیتے ہوئے کل کا اخبار دیکھ رہا تھا۔ اور کبھی کبھی جھجکتی نظروں سے جمیلہ کی طرف بھی دیکھ لیتا تھا جو چائے بنانے میں مصروف تھی۔ چنداں توقف

ے بعد اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا: "جمیلہ کل ہم لوگ فلم
یکھنے چلیں گے؟" کچھ دیر رک کر اس نے پھر کہا: "سنا تم نے؟"
"سُن رہی ہوں۔"
"کریم ٹاکیز میں پاکیزہ چل رہی ہے۔ سارے شہر میں
ں کا چرچا ہے۔"
"لیکن میں نہیں جا سکوں گی۔ تم جانا چاہو تو ہو آؤ۔"
ں کے سنجیدہ چہرے پر اندرونی کشمکش کے تاثرات
یاں تھے۔ اسے دراصل اپنی حق تلفی کا شدید احساس
تھا۔

اس کا روکھا جواب سن کر ریاض کا دل پانی میں
ٹے کی طرح بیٹھ گیا۔ چند لمحوں کے بعد وہ نہایت
شکستہ لہجہ میں بولا۔
"جمیلہ، ایک سال کے بعد بھی تمہارا مزاج نہیں بدلا۔
تم کسی بات کو کب تک گرہ باندھ کر رکھو گی۔ میں
تمہارے وقار کے خلاف کوئی بات نہیں کہی تھی۔"
جمیلہ نے کوئی جواب نہیں دیا مگر اس کی جھیل
سی آنکھوں میں آنسو تیر گئے۔
ریاض گہری سوچ میں پڑ گیا کہ شاید اس نے
سی میں کوئی بات کہہ دی ہو جسے وہ برداشت
ہ کر سکی۔ وہ میز پر اخبار رکھ کر بوجھل قدموں
آہستہ آہستہ جمیلہ کے پاس آیا اور نہایت
یف لہجہ میں کہا۔
"جمیلہ یقین مانو، میرا کوئی برا خیال نہیں تھا، وہ
عام بات تھی۔ تم نے فضول اس کا برا اثر لے لیا۔ پھر
بھی بات واپس لیتا ہوں۔ تم بھی اس کو اپنے ذہن
نکال دو۔"
چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اس نے پھر انتہائی شکستہ
لہجہ میں کہا۔ "خیر اب تو میرے ساتھ فلم دیکھنے چلو گی نا؟"
"نہیں ــــ میں نہیں جا سکوں گی۔" دراصل
وہ ریاض کی شکی طبیعت سے خائف تھی۔ اس کا دماغ
مفلوج ہو چکا تھا۔
جمیلہ کی ہٹ دھرمی پر ریاض غصہ سے تلملا
اٹھا۔ اس کے اندر غیر شعوری طور پر انتقامی جذبا ابھرنے
لگا لیکن وہ کچھ نہیں کہہ سکا چپ چاپ جا کر پلنگ پر لیٹ
گیا۔

ہڑتال کی وجہ سے فیکٹری اور تمام دفاتر کوئی
دو مہینے سے بند تھے۔ انتظامیہ اور ملازمین کے درمیان بحث و
مباحثہ کے کئی دور ہوئے لیکن کوئی خاطر خواہ حل نہیں نکل
سکا۔ دونوں حریف اپنے اپنے رویے میں ذرا بھی لچک
پیدا کرنا نہیں چاہتے تھے۔ انتظامیہ نے ہڑتال توڑنے کے
لئے دلالوں کو بھی استعمال کیا لیکن اس میں بھی کوئی کامیابی
نہیں ہوئی بلکہ معاملہ اور الجھ گیا۔ آخر کار سرکار کو اس معاملہ
میں مداخلت کرنا پڑی۔ کافی جد و جہد کے بعد کچھ دو اور کچھ لو
کی بنیاد پر دونوں کے درمیان سمجھوتہ ہو سکا۔ انتظامیہ نے
فیصلہ میں احتیاطاً کچھ ضروری شرائط بھی رکھی تھیں۔ جن
کی رو سے لیڈر ٹائپ ملازمین جو ہڑتال کے دوران پیش
پیش تھے۔ انہیں مزید ایک مہینہ کے لئے معطل کر دیا گیا۔
اس زمرے میں ریاض کا بھی نام تھا۔
ویسے شروع ہی سے ریاض کو ہڑتال کی مصروفیتوں
کا مطلق احساس نہیں تھا اور ہوتا بھی کیوں۔ اس کی بیوی
ایک باشعور اور سلیقہ مند خاتون تھی۔ گھر گرہستی
معاملات میں وہ اچھی خاصی مہارت رکھتی تھی۔ ہڑتال کی
ساری مدت میں اس نے اپنی ضروریات زندگی کو کسی گوشے

سہارا سہیل گیا۔

میں فرق آنے نہیں دیا۔ معمول کے مطابق وہ صبح سویرے اپنے بچوں کو تیار کر کے ان کو ٹفن کے ساتھ اسکول روانہ کر دیتی۔ ادھر ریاض ناشتہ کر کے صبح جاتا تو شام کو آتا۔

جمیلہ اکیلی گھر کے تمام کام کاج کا نپٹارہ کر کے پلاننگ اینڈ ڈیولپمنٹ سنٹر چلی جاتی، جہاں وہ لڑکیوں اور عورتوں کو کشیدہ کاری، موتیوں اور تاروں سے زیورات بنانے کے علاوہ کپڑوں کی کٹنگ اور سلائی بھی سکھاتی تھی۔ اس کو سرکار کی طرف سے ماہانہ تنخواہ ملتی تھی۔ مگر جو تنخواہ اس کو ملتی تھی اس سے گھر کے اخراجات پورے نہیں ہو پاتے تھے۔ اسے بعض اوقات قرض بھی لینا پڑتا تھا۔ کیونکہ اس کے دونوں بچے انگلش میڈیم اسکول میں پڑھتے تھے۔ ان کے اسکول کی فیس کے علاوہ کتابیں، کاپیاں، پین، پنسل وغیرہ کے اخراجات بھی تھے۔ اس کے علاوہ اس نے اپنے زیورات بھی گروی رکھ دیئے تھے۔

معطلی کی مدت ختم ہو چکی تھی۔ ریاض اب دفتر جانے لگا تھا ایک دن جب وہ دفتر سے آ رہا تھا تو راستہ میں چودھری مہاجن مل گیا۔ اس نے سلام بجا لا کر کہا۔

"ریاض بابو، آپ کی پتنی سونے کی دو انگوٹھیاں گروی رکھ کر گئیں تھیں اور یہ کہہ گئی تھیں کہ پندرہ دن بعد چھڑا لوں گی مگر دو مہینے ہو گئے وہ اب تک نہیں لے گئیں۔ آپ انہیں ذرا یاد دلا دیجیے گا۔"

ریاض نے جواب میں کچھ نہیں کہا۔ صرف اثبات میں سر ہلا کر چل دیا۔

گھر آ کر دفتر کے کپڑے اتارے بغیر اس نے جمیلہ کو آواز دی۔ اس وقت جمیلہ بچوں کے کپڑے اتار رہی تھی۔ اس نے مصروفیت میں کہا۔ "آ رہی ہوں۔"

بچوں کو ناشتہ دے کر وہ ریاض کے پاس گئی ریاض کا موڈ الجھا ہوا دیکھ کر اس نے کہا: "کیا تم خفا"

چودھری مہاجن کی بات اس کو بار بار کچوکے لگا رہی تھی۔ اس نے بے ضبط ہو کر سخت لہجہ میں کہا۔

"جانتی ہو آج چودھری مہاجن نے راستہ میں بے عزت کر دیا۔ بتاؤ، تم نے کیا کیا زیورات کس کس کے یہاں گروی رکھے ہیں؟"

"آج تم کو اس کا احساس ہو رہا ہے۔ پچھلے مہینے کس طرح گذرے کبھی پوچھا تھا؟ گھر کے اخراجا کس طرح پورے ہوتے ہیں؟ آج تمہارے دل میں اٹھ رہا ہے۔"

"دیکھو میں فضول باتیں سننا نہیں چاہتا، میں کا حساب چاہتا ہوں۔"

"کیوں، تم کو کس بات کا شک ہے؟"

"گھر کے خرچ کا حساب، جس دن سے تم نے خا سنبھالی ہے۔"

جمیلہ کے سنجیدہ چہرے پر یکلخت حقارت تاثرات پھیل گئے۔ اس کے لب بردہ ہونٹ کچھ کہنے کپکپا اٹھے لیکن اس سے قبل کہ وہ کچھ کہتی۔ ریا اٹھا۔

"دیکھو، اپنی چالاکی رہنے دو، مجھے حساب چ روزانہ خرچ کا حساب۔"

جمیلہ کچھ دیر تک خاموش رہی اس کے سراپا کو گھور کر دیکھ پھر بے قابو ہو کر بولی۔ کیا تمہیں علم نہیں کہ تمہارا مہینے کی بے کاری میں گھر کے اخراجات کس طرح چل رہے ہیں؟ اگر کچھ اور کہنا ہو تو کھل کر کہو، میں نے کہا

شہرِ خیال

● مسعود منظر صاحب تسلیم و تکریم!

ادھر عرصے سے علیل ہوں، اسی حال میں فشار معیشت سے بھی نمٹ رہا ہوں۔ آپ کے ماہنامہ سہیل شمارہ ۱۱۔ جلد ۳۰ میں بزرگ ادیب و دانشور جناب تاراچرن رستوگی صاحب نے میری غزل میں نہ جانے ایسا کیا دیکھا کہ وہ کچھ لکھا جس کا مستحق میں اپنے آپ کو نہیں سمجھتا۔ لیکن اگر میرے بارے میں ان کی یہی رائے ہے تو ایک نیاز مند کی طرح ان کا شکریہ ہی ادا کر سکتا ہوں۔ لکھنا یہ ہے کہ بھائی آپ کے یہاں پروف ریڈنگ نہیں ہوتی کیا؟ تین جگہ تو صرف میرے اشعار میں غلطیاں ہیں۔ ۳۰ پر پہلا درست مصرعہ، میں جسے چھوتا گیا وہ جاوداں بنتا گیا' میں "جاوداں" کو "داستاں" اور ۳۰ پر غزل کے پہلے ہی مصرعے۔ مجھ سے کہا جبریل جنوں نے، میں "جبریل جنوں" کو "تخلیق جنوں"، اور ۱۲ پر "ہم ایکبار تری آرزو بھی کھو دیتے" میں 'کھو دیتے' کی جگہ خدا جانے کیا۔ اور ۱۲ پر "آنکھیں کھلی تھیں آئے تھے وہ بھی نظر مجھے" کی جگہ "آنکھیں تھیں اور آئے تھے وہ بھی نظر مجھے۔" لکھ دیا ہے۔ خدا کے لئے جو لوگ شاعری کو انتہائی سنجیدہ عمل سمجھتے ہیں ان کے ساتھ تو ایسا نہ ہونے دیجئے۔ کرم ہوگا۔

والسلام۔ دعاگو۔ مجروح سلطانپوری

ڈیر مسعود منظر صاحب: سلام و دعا

میں آپ کے اداریے "نمود" کو بغور پڑھتا ہوں۔ یہ بڑے کام کے ہوتے ہیں۔ مختصر مگر جامع ہو کر بھی فکر و نظر کے دروازے کھول دیتے ہیں۔ "قیصر عثمانی" کے نام موجودہ شمارہ "سہیل" کو ابھی میں نے سوائے "نمود" کے پڑھا نہیں ہے۔ دو تین دنوں کے بعد پڑھوں گا اور اپنی حقیر رائے سے آپ کو آگاہ کر دوں گا۔ فی الحال مجھ کو ماہنامہ "سہیل" کے متعلق چند باتیں لکھنی ہیں اور اس لئے لکھنی ہیں کہ آپ ان کو پڑھیں اور چھاپ دیں۔

"سہیل" برسوں سے پابندی وقت کے ساتھ نکل رہا ہے۔ آپ کے والد محترم ادریس سنہاروی صاحب مرحوم سے لے کر آپ دونوں بھائیوں تک یہ ادبی ماہنامہ چپ چاپ بغیر کسی شور شرابہ کے ادبی خدمات انجام دیتا چلا آرہا ہے۔ آپ نے مجلس مشاورت میں ڈاکٹر تاراچرن رستوگی، ڈاکٹر قمر رئیس، اصغر علی انجینئر، قیصر عثمانی، شاہد احمد شعیب، ڈاکٹر محمد مثنیٰ، ڈاکٹر علیم اللہ حالی جیسے معتبر اور سلجھے ہوئے افکار و خیالات رکھنے والے لوگوں کو رکھ کر "سہیل" کو ایک بہت بڑی ادبی ذمہ داری سونپ دی ہے۔ یہ سارے نام موجودہ دور کے روشن ستارے ہیں۔ ان میں بعض تو بہت ہی قد آور ہیں اور یہ سب کے سب میرے چہیتے فنکار ہیں۔ معاونین میں شکیل احمد جمالی اور عبدالقیوم ابدالی ایسے لوگ ہیں جن کی قدر و منزلت میرے دل میں بہت زیادہ ہے۔ مگر یہ دیکھ کر دل کا خون ہو جاتا ہے کہ "سہیل" کی کتابت طباعت کافی خراب ہوتی ہے۔ بعض اوقات تو کچھ ادبی نگارشات اچھی طرح پڑھی نہیں جا سکتیں۔ کتابت کا مسئلہ

لاینحل ہے۔ یہ ایسا ہی لا علاج مرض ہے جس کا شاید کوئی علاج نہیں۔ میں خود کئی بار اس لاینحل مسئلہ سے دوچار ہو چکا ہوں۔ کاتبوں نے میرے مجموعہ مضامین کا بھی خون کر دیا ہے۔ لیکن اگر ہوشیاری برتی جائے اور کاتب صاحب پر مسلط رہا جائے تو کتابت کی غلطیاں کم ہوں گی۔ زیر نظر شمارہ کے "نمود" میں بھی "قعر دریا" کو "قصر دریا" کر دیا گیا ہے اور "دامن تر مکن شہیار باش" لکھ دیا ہے۔ چھپائی اب پہلے سے اچھی ہونے لگی ہے مگر آپ لوگ تھوڑی سی توجہ اور دیں تو یہ قیمتی ادبی ماہنامہ "سہیل" زیادہ سے زیادہ خوبصورت اور جاذب نظر ہو جائے گا۔ بڑے ادیبوں کی ایک کہکشاں مجلس مشاورت میں ہے۔ اکثر ڈاکٹر جگن ناتھ آزاد جیسے بڑے فنکار اور ناقد کی ادبی نگارشات سہیل میں چھپتی ہیں۔ ان سے اور دیگر ممتاز فنکاروں سے ادبی تخلیقات منگوا کر "سہیل" کے معیار کو اور اونچا کیجئے۔ بہار میں نئی نسل کے بعض شعراء بہت ہی طاقتور اپیل رکھنے والی شاعری کر رہے ہیں۔ مثلاً خورشید اکبر، منظر سلطان، قیصر جمال وغیرہ (اور بھی بہت سے ایسے نام ہیں) ان سب کی شاعری سے میں متاثر رہا ہوں۔ رؤف خیر انڈلوں خوب لکھ رہے ہیں اور اچھا لکھ رہے ہیں۔ ایک بہت ہی اچھے شاعر ظفر گورکھپوری ہیں۔ ان سب کی تخلیقات سے "سہیل" کو مزین ہوتے رہنا چاہئے اصغر علی انجینئر صرف نام کے ہی بڑے نہیں بلکہ ان کے کام بھی بڑے ہوتے ہیں۔ ان کا مضمون برابر شائع ہو تو اچھا ہے۔ اس سے "سہیل" کا ادبی وقار بلند ہوگا۔ وہ اپنے ادبی مضامین میں نہ صرف ملکی سیاست بلکہ عالمی سیاست کو بھی بڑی خوبصورتی سے پیش کرنے کا فن جانتے ہیں۔ کافی پر از معلومات مضامین لکھتے ہیں جنھیں میں نے اکثر "سہیل" میں بھی پڑھا ہے۔

"سہیل" کا ایک شمارہ ہے شمارہ ۱۱ جلد ۲ اس میں ڈاکٹر تارا چرن رستوگی کا مجروح کی شاعری پر ایک عمدہ مضمون ہے۔ میں نے اسے بڑے غور و انہماک اور لطف و لذت کے ساتھ پڑھا۔ مجروح کی شاعری واقعی دل کے تاروں کو چھو لینے والی شاعری ہے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے لیکن اپنا مضمون جلد ختم کر دیا۔ حدیث یار دیر تک سننی اور سنانی چاہئے۔ شمارہ ۱۱ سے قبل ڈاکٹر تارا چرن رستوگی ہی کا ایک مضمون اقبال پر پڑھا تھا۔ وہ بھی بہت جاندار تھا۔ اس شمارہ کو میں ڈھونڈ رہا ہوں لیکن نہیں مل رہا ہے۔ پتہ نہیں کہاں کھو گیا۔ سہیل کے شمارہ ۱۱ میں سید احمد شمیم کا ایک مضمون ہے "جینے کی ادا کا شاعر" میں نے اس مضمون کو بھی بڑے ذوق و شوق سے پڑھا۔ "پیراہن جاں" کا شاعر کوئی معمولی شاعر نہیں ہے۔ "پیراہن جاں" میں جو شاعری ہے اس میں بڑی لطافت اور نرمی ہے۔ سوز و گداز ہے۔ ایک رومانی کسک ہے۔ ایک ستم کا جنون ہے جس کا میں شروع سے عاشق و دلدادہ ہوں۔ سرمایہ دارانہ نظام کے تحت اگر انسان انسان کا خون نہیں چوستا، اگر دنیا جبر و استحصال، ظلم و تشدد اور خونریزی سے پاک ہوتی تو میں صرف اور صرف رومانی کسک اور ٹیس والی شاعری کرتا میرا ہی ایک شعر ہے۔

میں نرم لہجہ کا، دھیمے سروں کا شاعر تھا
زمیں پہ ظلم بڑھا دھن بدل گئی میری

منظر شہاب صاحب نے اپنا ایک گیت برسوں پہلے غالباً ۱۹۵۶ء وغیرہ میں یا اس کے کچھ ہی بعد سنایا تھا۔ اس گیت کے دو بند مجھے زبانی یاد ہیں۔ اکثر راہ چلتے یا

(بقیہ ص ۱۷ پر)

بانی :- حافظ محمد عبدالرحمٰن بسمل سنہاروی

بیادگار :- زین العابدین احمد و ادریس سنہاروی

ماہنامہ سُہیل گیا

مجلسِ مشاورت

چیف ایڈیٹر :- مسعود منظر
ایڈیٹر :- جمیل منظر
معاونین :- شکیل احمد جبلی، عبدالقیوم ابدالی
• کتابت :- سید عبدالاحد گیاوی •

شمارہ ۱۲ جلد ۱۵

بدلِ اشتراک

فی شمارہ .... ۴ روپے
زرِ سالانہ .... ۴۰ روپے
لائف ممبری .... ۵۰۱ روپے

فہرست

نمود ۵
غزل — فضا ابن فیضی ۷
تسنیم فاروقی کی غزل گوئی، ڈاکٹر سعید عارفی ۸
تلمیذِ داغ — حقانی القاسمی ۱۴
کیوں میں قلمکار لکھوں، رضا اشک ۲۰
ضمیر، منصور اعجاز ۲۱
غزلیں، حلیم صبا نویدی، عبدالوہاب تاج ۲۲
غزلیں، اویس احمد دوراں، ستیہ پال ملہوترہ عارف ۲۳
غزلیں، ملک زادہ جاوید، اختر شاہجہاں پوری ۲۴
غزلیں، شرون کمار ورما، عبدالسلام کوثر ۲۵
غزلیں، ڈاکٹر امام اعظم، ضمیر احمد قرار ۲۶
غزلیں، اطہر نیر، اعجاز طالب ۲۷
کٹھ پتلا۔ نسیم احمد نسیم ۲۸
شکست — محمد مجیب احمد ۳۲
نئی کتابوں کا تعارف، ڈاکٹر محمد علی اثر ۳۴
شہرِ خیال ۳۷

• خط و کتابت و ترسیلِ زر کا پتہ •

ماہنامہ سُہیل

ریور سائیڈ روڈ، گیا - ۸۲۳۰۰۱

فون نمبر ۲۱۵۷۳

شذرات

الوداع ! راجیو گاندھی

راجیو گاندھی نہیں رہے ۔
نہ جانے کیوں ان کی آخری رسوم کا منظر دیکھ لینے کے بعد بھی یہ یقین نہیں ہو پا رہا ہے
۴۷ سالہ اس نوجوان رہنما کے اس طرح سے جانے کا نہ تو یہ کوئی وقت
تھا اور نہ ہی موقع
راجیو گاندھی کے قتل کے لئے جو طریقہ اختیار کیا گیا اس نے نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام جمہوری ملکوں
کے دلوں کو بھی دہلا کر رکھ دیا ہے
راجیو گاندھی کی مقبولیت عالمی برادری میں کس قدر تھی اس کا اندازہ صرف ایک حقیقت سے لگایا جا سکتا
ہے کہ ان کی آخری رسوم میں ۴۶ ملکوں کے نمائندے شامل تھے ۔ اور یہ عالم تب تھا جب راجیو گاندھی
ہندوستان کے وزیر اعظم کی کرسی پر فائز نہیں تھے ۔
راجیو گاندھی کا قتل کس نے کیا ؟ اور اس کے پیچھے قاتل کا مقصد کیا تھا ؟
ان سوالوں پر سے تو پردہ اٹھے گا ہی ۔
لیکن ایک بات تو طے ہے کہ جس نے بھی یہ خونی کھیل کا انجام دیا ہے ۔ اس نے دراصل راجیو کے
سینے میں ہی خنجر نہیں گھونپا ہے بلکہ اس نے ہندوستان کی یکجہتی اور سالمیت کے سینے پر بھی بھرپور وار کیا ہے ۔
بے شک ! راشٹر پتا مہاتما گاندھی ہوں یا سابق وزیر اعظم محترمہ اندرا گاندھی ہوں یا سابق وزیر اعظم
راجیو گاندھی سب کے قاتل ایک ہی ہیں جو ہمارے قومی رہنماؤں کا ہی قتل نہیں کر رہے ہیں
بلکہ
وہ اس ملک کی روایت ، یکجہتی ، سالمیت اور جمہوری قدروں کے قتل کی سازش کر رہے ہیں ۔
افسوس کا مقام ہے کہ
۴۴ برسوں کی آزادی کے بعد بھی وہ وچار دھارا ابھی تک ہمارے ملک میں نہ صرف زندہ ہے بلکہ
پروان چڑھائی جا رہی ہے ۔

اس کی زندہ مثال
پونہ کے ایک جلسۂ عام میں شیوسینا کے چیف بال ٹھاکرے نے راشٹرپتا مہاتما گاندھی
کے قاتل گوڈسے کی تعریف کرتے ہوئے کہا
کہ
"گوڈسے کا یہ کارنامہ ہمارے لئے باعث فخر ہے"
بال ٹھاکرے کو یہ ہمت کیوں کر ہوئی
اور
کس نے عطا کی ؟
آیئے ! راجیو گاندھی کو سچی خراج عقیدت تبھی ہوگی جب ہم
ان ملک دشمن طاقتوں کو شکست فاش دیں جو ہمارے
جمہوری قدروں کو پامال کرنے کی کوشش میں لگا ہے اور
جو ہمارے
ملک کی فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور سماجی انصاف کی لڑائی کو پیچھے لے جانا چاہتا ہے
(ادارہ)

غزل

فضا ابن فیضی

گذرتی عمر کی یلغار، میرے سامنے تھی
وہی گرتی ہوئی دیوار میرے سامنے تھی

تحفظ کے لئے اپنے، کسے آواز دیتا
کہ خنجر پشت پہ تلوار میرے سامنے تھی

کہیں نزدیک، شاید شہر کوئی جل رہا تھا
دھوئیں کی اک سیہ دیوار میرے سامنے تھی

لہو کی چیخ، لٹتی عصمتیں، عریاں جنازے
ابھی وہ سرخیٔ اخبار میرے سامنے تھی

میں خود کو ریزہ ریزہ جمع کرنے میں رہا گم
بہا انگیزیٔ اغیار، میرے سامنے تھی

بہت محتاط ہو کر، زندگی کرنا تھا مجھ کو
لباس شیشہ کردار، میرے سامنے بھی تھی

تھا سے، تو پیچھے مڑ کر میں نے دیکھا
کہ اپنے عہد کی رفتار میرے سامنے تھی

مدلنے کو تو بدلا، آئینے کا زاویہ بھی
مگر صورت وہی، ہر بار میرے سامنے تھی

میں کس کس کو دکھاتا، زخم اپنی آگہی کے
بڑی مشکل، بس اظہار میرے سامنے تھی

مجھے بھی سہل انگاری کے ڈھب آتے ہیں لوگو!
مگر، حد بندی معیار میرے سامنے تھی

ڈاکٹر سعید عارفی

تسنیم فاروقی کی غزل گوئی

ادب کو ہر عہد اور ہر زمانے میں معاشرے کا آئینہ قرار دیا گیا ہے اور جو ادب اس اصول کی نفی کرتا ہے اسے بے وقت کی راگنی کا نام دیا جاتا ہے مگر ادب کے تخلیقی عمل کے دوران کبھی کبھی ایسا وقت بھی آجاتا ہے جب زندگی اور معاشرے کو آئینہ تو دکھاتا ہے اور اس کی متضاد تصویریں بھی پیش کرتا ہے مگر صرف ایک خاموش تماشائی کی حیثیت سے، لیکن تسنیم فاروقی کی شاعری سماج کو آئینہ دکھانے اور اس کی ناہمواریوں کی مختلف کیفیات کو پیش کرنے کے ساتھ ساتھ تخلیقی عمل کی کچھ ایسی منزلوں سے بھی گذرتی ہے جو ہمیں تعمیری جد و جہد کی سمت میں بھی لے جاتی ہے۔

تسنیم فاروقی اردو کی نئی نسل کے شعرا میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔ ان کی شاعری کئی اعتبار سے ہمیں مختلف زاویوں اور محوروں پر سوچنے اور غور کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ ان کی شاعرانہ آواز اپنے ہم عصر شعراء میں ایک علیحدہ شناخت رکھتی ہے وہ اپنے لہجے کی انفرادیت کو اپنی کوششوں سے ہر منزل پر قائم رکھتے ہیں۔ کسی شاعر کے لئے یہ بات بڑی اہم ہوتی ہے۔

تسنیم فاروقی نے بنیادی طور پر غزل کو اپنے اظہار کا وسیلہ بنایا ہے اور قدیم و جدید کے امتزاج سے ایک نئے شعری اسلوب اور لہجے کے ساتھ غزل کہنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ ان کی شاعری میں روایت کا احترام رپاس داری بھی ہے اور اس سے انحراف کی خواہش بھی، غزل کی رہگذر ممکن ہے کسی شاعر کے لئے آسان ہو مگر میرے خیال میں ہر اچھے اور ہوش مند شاعر کے لئے اردو کی تمام تر شعری اصناف میں غزل تنہا ایسی صنف ہے جس کی رہگذر سب سے زیادہ مشکل، پیچیدہ اور خار دار ہے جس پہ چلتے ہوئے ہر لمحہ عقل و ہوش کے دامن کو ہاتھوں سے تھامے رہنا پڑتا ہے۔ یوں تو غزل میں اظہار خیال کے لئے وسعت اور قوت بہت ہے مگر کبھی کبھی شاعر کو تنگی داماں کی شکایت بھی ہوتی ہے لیکن تسنیم فاروقی کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہوئے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اس راہ سے بڑی ہی سبک روی سے گذر جاتے ہیں۔ ان خوبیوں کو دیکھتے ہوئے تسنیم فاروقی سے یہ امید کی جا سکتی

ہے کہ وہ آنے والے وقتوں میں اپنی غزلوں سے اردو کے شعری سرمائے میں گراں قدر اضافہ ضرور کریں گے۔

تسنیم فاروقی شاعری کے عصری تقاضوں سے پوری طرح واقف اور باخبر ہیں اس کا احساس ان کی غزلیں پڑھتے ہوئے قدم قدم پر ہوتا ہے۔ ان کی غزلوں میں ہمیں ایسے اشعار بھی ملتے ہیں جن میں چونکا دینے والی کیفیت ہوتی ہے کہیں کہیں اشعار کے لہجے میں نشتریت اور تیکھاپن بھی ہے۔ یہ بات، یہ انداز، اور یہ کیفیت ان کی شاعری میں ماحول اور حالات کے شکنجے میں جکڑی ہوئی زندگی اور تیزی سے تبدیل ہوتی ہوئی انحطاط پذیر معاشرتی و تہذیبی قدروں کی بدولت پیدا ہوئی ہے۔

صنعتی، سائنسی اور تکنیکی زندگی و عمل کے فروغ نے آج شاعری کو صرف متاثر ہی نہیں کیا ہے بلکہ اسے ایک کھلے ہوئے چیلنج کا درجہ بھی عطا کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے کو وقت کی ضرورتوں سے ہم آہنگ کر کے آگے بڑھ رہی ہے جس طرح زندگی کے دوسرے شعبوں میں تجربے ہو رہے ہیں اور ذہن نئے افق سے آشنا ہو رہا ہے اسی طرح شاعری کا مزاج اور انداز بھی مسلسل تبدیل ہو رہا ہے اور ارتقائی منزلیں طے کر رہا ہے۔ اسی لئے آج جو شاعر وقت کی ضرورتوں اور تقاضوں کو نظرانداز کر کے آگے چلنے کی کوشش کرتا ہے اس کی آواز بھیڑ میں گم ہو کر رہ جاتی ہے اور وہ اپنی ہلکی پھلکی شناخت کو بھی گنوا بیٹھتا ہے مگر یہ بات ہمیں تسنیم فاروقی کی شاعری میں نظر نہیں آتی۔

تسنیم فاروقی نے اپنی شاعری میں زندگی کے کڑوے کسیلے، تلخ اور سچے تجربات و مشاہدات کو شعری پیکر عطا کرنے کی کوشش کی ہے وہ زندگی کی بے لباس حقیقتوں اور سچائیوں کا اظہار بڑی ایمانداری سے کرتے ہیں۔ اس طرح تسنیم فاروقی کی تاریکیوں کے خلاف جہاد جو کہ ابھرتی ہے جس میں ٹوٹتی ہوئی عہد کی معاشرتی زندگی کی ناہمواریوں اور تضادات و نابرابری کی تصویریں ہیں۔

حیات کربِ مسلسل کا نام ہے اے دوست
یہ کم نہیں ہے کہ ہنس کر گزار دی میں نے

زندگی ایک عدالت کے سوا کچھ بھی نہیں
مجھ کو ہر وقت مرے ہاتھ بندھے لگتے ہیں

میں اپنے تجربوں کی روشنی میں یہ سمجھتا ہوں
مجھے نقصان پہونچاتی رہیں سچائیاں میری

بچھی ہیں جال کی صورت لہو کی تحریکیں
وطن بھی اب مرے دل کی طرح دھڑکتا ہے

کسی درخت سے میں نے پناہ کیوں مانگی
مرے حریف جو آرے تلاش کرتے ہیں

صبحیں ترے بغیر ہیں شامیں ترے بغیر
یہ زندگی نہیں ہے، گناہِ عظیم ہے

زندگی خود ایک مرض مستحق العلاج
موت تک مجھ کو دوائیں بے کستیں

ایک بے چراغ شب تھی مری زندگی مگر

میں اشکوں کو شمع کی صورت جلائے تھا

ہر سانس میری ایک سپاہی کا قرض تھی
میں زندگی کی جنگ میں خیمہ لگائے تھا

تسنیم فاروقی کی شاعری میں جو الفاظ اور علامتیں استعمال میں لائی گئی ہیں وہ سیدھی سادی اور قابل فہم ہیں جس کی وجہ سے ان کے خیال کی تہہ تک آسانی سے پہونچا جا سکتا ہے۔ ان کی شاعری میں کسی قسم کی ترسیل کا المیہ نہیں ہے موجودہ زندگی کی تیز رفتاری کی زد میں ہماری تمام تر تہذیبی قدریں آ چکی ہیں۔ روایات کے حصار ٹوٹ رہے ہیں۔ انسان کا قدر روز بروز گھٹتا اور چھوٹا ہوتا چلا جا رہا ہے اور انسانیت کے مقدس جذبے ختم ہوتے جا رہے ہیں، ان متضاد اور مخالف حالات کے اندر رہنے والے آدمی کے احساسات اور جذبات کی باہمی کشمکش اور تصادم کی مکمل آواز ہمیں تسنیم فاروقی کے کلام میں سنائی دیتی ہے۔ عقائد و اقدار کی اس شکست و ریخت کے ماحول میں تنہا رہتے ہوئے بھی تنہائی نے تسنیم فاروقی کو سب سے جدا نہیں کیا ہے۔ بلکہ اور بھی جوڑنے کا کام کیا ہے۔ اسی لئے تسنیم فاروقی ٹوٹنے اور ریزہ ریزہ ہو کر بکھرنے کے عمل سے دوچار ضرور ہوتے ہیں مگر کسی عالم میں زندگی سے راہ فرار اختیار نہیں کرتے۔ یہی ان کی شاعری کی وہ منزل ہے جہاں وہ سب سے جدا اور الگ تھلگ نظر آتے ہیں۔ تسنیم فاروقی غالباً اس راز سے بخوبی واقف ہیں کہ زندگی کے ردعمل اور شاعری کے ردعمل کے درمیان کہیں نہ کہیں کوئی گہرا رشتہ ضرور ہے۔

کاغذی ہیں در و دیوار میں کیا رکھا ہے
سب تو خود مجھ میں ہے سنسار میں کیا رکھا ہے

چائے اچھی نہیں لگتی ہے ہمیں اے تسنیم
ورنہ اس صبح کے اخبار میں کیا رکھا ہے

ہم قید مصوری میں بہت خوش ہوئے لیکن
خوشبو کا کوئی عکس نہ تصویر نہ چہرا

شام کا سورج سویرے کے آئے گا مگر
ان گنت جلتے چراغوں کو بجھا دینے کے بعد

کوئی جنبش نہ توازن نہ جسارت کوئی
ہم وہ کاغذ ہیں جو آندھی میں اڑے جاتے ہیں

میں دنیا بھر میں ڈھونڈ آیا ہنسی سچی نہیں ملتی
جہاں جو قہقہہ اٹھتا ہے غم کا خاندانی ہے

ایک لطیف رشتہ ہے نور کا سیاہی سے
ہر چراغ کی لو سے کچھ دھواں نکلتا ہے

آپ اور ہم دونوں پیچھے رہ گئے
فاصلے طے کر گئیں رسوائیاں

خدا رکھے مری تنہائیوں کو
در و دیوار سے باتیں ہوئی ہیں

سب اندھیرے میں جدا ہو جائیں گی
روشنی کی دوست ہیں پرچھائیاں

تسنیم فاروقی کی شاعری میں جو عصریت پائی جاتی ہے اس کا انداز بھی موجودہ شاعری میں پائی جانے والی عصریت سے کافی مختلف ہے۔ یہاں بھی ان کے جمالیاتی احساس کو ان کے فن پر سبقت حاصل ہے۔ اسی لئے ان کی شاعری قاری کے ذہن کو زندگی کے عصری تقاضوں اور مسائل سے ہم آہنگ کرنے کے ساتھ ساتھ ایک خاص قسم کے جمالیاتی کیف سے جوڑ دیتی ہے۔ وہ اپنی شاعری میں جمالیات کے لیے جو خمیر تیار کرتے ہیں اس میں معاشرتی زندگی کے جدوجہد کے ساتھ سماجی تصادم بھی شامل ہوتا ہے اور تصادم کے بغیر حسن و جمال کی حقیقت بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے، کیونکہ تصادم ہی زندگی کو نکھارتا اور سنوارتا ہے۔ اس کیفیت نے تسنیم کی شاعری میں ایک قسم کا سماجی شعور اور وقار پیدا کر دیا ہے۔

کچھ رہبروں نے شمع کی زبانیں تراش لیں
ان شعلوں کا اب بھی دھواں ہے فضاؤں میں

برفیلے محلوں کے مکینو! اپنی اپنی فکر کرو
ہم کو تو فنا ہی ہو جانا ہے ہنستے ہوئے انگاروں میں

ہم خون میں نہا کے بھی مجرم کہے گئے
وہ شخص قتل کر کے بھی قاتل نہیں رہا

اندھیری رات میں خود کو صدا دیتے گزر جاؤ
سہاروں کا بھروسہ کیا سہارے ٹوٹ جاتے ہیں

یہ واردات ہر اک سنگِ میل پر لکھ دو
لہو کے داغ ملے رہنما کے دامن میں

دل میں برسوں بعد آئی ان کی یاد
ایک پردیسی کو گھر یاد آ گیا

ایک مصرعے سے بھی مفہوم ادا ہوتا ہے
ہم جسے چھو نہ سکیں اس کو خدا کہتے ہیں

اپنے کردار کو موسم سے بچائے رکھنا
لوٹ کر پھول میں واپس نہیں آتی خوشبو

ہمیں تسنیم فاروقی کی غزلوں میں انسانی زندگی کی ضرورتوں، خواہشوں، آرزوؤں، تمناؤں اور حقیقتوں کے رشتوں کو تلاش کرنے کا رجحان بھی ملتا ہے۔ وہ ان چیزوں کو اپنے ارد گرد اور آس پاس کے ماحول و زندگی میں دیکھنے و تلاش کرنے کی فکر میں غلطاں نظر آتے ہیں۔ اسی لئے ان کی غزلوں میں کہیں کہیں ہم کلامی و خود کلامی کا میلان پیدا ہو گیا ہے۔ یہ خوبی جدید اردو شاعری اور خصوصاً جدید اردو غزل کی ایک اہم خوبی ہے۔ اس رویے اور فکری اسلوب نے ان کی غزلوں میں تفکر اور تمکنت کا رنگ نمایاں کر دیا ہے۔ تسنیم فاروقی کے اندر کا شاعر سچے انسانی جذبوں کی سرحدوں تک ایک نادر تحفے کی مانند پہنچانا چاہتا ہے اور وہ اپنی کوشش میں کافی حد تک کامیاب سمجھے

ہیں۔ جدید حزن نما بہ سکا لماتی انداز ہمیں قدیم غزلوں میں دیکھنے کو کم ملتا ہے یتسیم فاروقی کی شعری زندگی اور انسانی رشتوں پر ان کے گہرے اور مکمل یقین کی علامت ہے۔

رہنا ہے چمن میں تو خوشبو کی طرح رہیئے
سوکھے ہوئے پتوں کو سب لوگ کچلتے ہیں

آدمی فکر زندگی میں رہے
ناؤ کو چاہیئے ندی میں رہے

اے شمع تیرا چہرا ہم صبح کو دیکھیں گے
تو جس پہ چمکتی ہے مانگے کا اجالا ہے

جسم کا روح سے رشتہ بھی عجب رشتہ ہے
عمر بھر ساتھ رہا پھر بھی تعارف نہ ہوا

خوش نہ ہو جلوں لگا پتھر پھینک کر
آدمی ہوں میں کوئی شیشہ نہیں

دیر سے ہم جو کبھی گھر میں قدم رکھتے ہیں
ماں کے دو ہاتھ دعاؤں کا بھرم رکھتے ہیں

بہت آساں ہے جس کی کو سے شہروں کو جلا دینا
مزہ جب ہے کہ وہ شعلہ کسی قندیل تک پہنچے

تیر کتنی ہی کمانوں پہ کھنچے ہیں منتظر!
امن کا پیغام سنتے ہیں کبوتر لائے گا!

کبھی کبھی یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ کوئی معمولی سے معمولی واقعہ، خیال اور جذبہ شاعر کے ذہن کے تاروں اور اس کے تخلیقی شعور کو بیدار و متحرک کر دیتا ہے۔ اور شاعر اپنے اشعار میں فکر و خیال کی ایک دنیا سمیٹ لیتا ہے جبکہ ظاہر میں اس خیال، جذبے اور واقعے میں کوئی ایسی خاص بات نظر نہیں آتی، مگر شاعر کا ذہن، شعور اور اس کا تخیل حقیقت کی تہہ تک پہونچ کر اس کے اندر پوشیدہ حقائق اور معاملات کو پوری طرح اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ ایسی بہت سی مثالیں ہمیں فاروقی کے کلام میں دیکھنے کو ملتی ہیں جہاں انہوں نے معمولی سمجھے جانے والے واقعات اور معاملات کو شعری پیکر عطا کر کے انہیں اہم بنا دیا ہے۔

سوچ کر کوئی بات لکھئے گا!
لوگ رکھتے ہیں مفلسی کے خطوط

یہاں کے خار بھی پھولوں سے کم نہیں تسنیم
اسی لئے تو ہمارے وطن کی شہرت ہے

تیرے دیوانے گذرے ہیں یہاں بھی دیپ جلائے
جیسے آوارہ پھرتے ہیں جگنو ساری رات

اٹھ کر ابھی گئے ہیں وہ میرے قریب سے
محسوس ہو رہا ہے کہ صدیاں گذر گئیں

وہ تو کہیئے سارے پتھر میرے دشمنوں نے روکے
میرے دوست چاہتے تھے مجھے سنگسار کرنا

بہت مشکل ہے نازک جسم والو سب کو خوش رکھنا
کئی ہاتھوں میں رہنے سے کھلونے ٹوٹ جاتے ہیں

جسے کتاب سے نسبت نہیں وہ کیا سمجھے
کتب فروش کو تعلیم یافتہ سمجھے

خط اسے لکھ کے یوں بھی پڑھتا ہوں
میرے خط کا جواب ہو جیسے

تسنیم اپنی غزلوں میں زندگی کے ٹوٹتے اور بکھرتے ہوئے لمحوں اور رشتوں کا اظہار تو کرتے ہی ہیں اور ان تضادات کا بھی ذکر کرتے ہیں جو موجودہ سماجی زندگی کا حصہ بن گئے ہیں۔ مگر اس کے باوجود وہ اپنے شعری لہجے میں تلخی، تندی اور تیزی نہیں آنے دیتے۔ اس کیفیت اور انداز کی وجہ سے کبھی کبھی ان کا شعری لہجہ غیر فطری اور غیر مانوس لگنے لگتا ہے کیونکہ زندگی اور حالات کی سنگینی لہجوں میں تغیر پیدا کر دیتی ہے۔ اسی طرح ان کی شاعری میں ایک اور بات جس کا شدت سے احساس ہوتا ہے وہ یہ کہ زبان و بیان کے سلسلے میں اپنے تعلق اور رشتے کو قدیم شعری روایات سے مکمل طور پر توڑ نہ پاتا، جس کی وجہ سے انہیں پوری طرح سے قدیم شعری لب و لہجے سے نجات نہیں مل پائی ہے۔ اگر تسنیم ان حد بندیوں کو توڑ کر باہر نکل آئیں تو ان کی شاعری کا کینوس اور بھی وسیع ہو جائے گا۔ شرط صرف یہ ہے کہ وہ اپنے افکار کے پرندے کو نئی شعری فضا میں نئی کے ساتھ اڑنے کی اجازت دیدیں۔

موجودہ تہذیب کے وجود پر جو بیماری چھا گئی

ہوا ہے۔ اس نے بھی تسنیم فاروقی کے دل و دماغ اور اعتبار و عقائد کو مجروح کیا ہے۔ زندگی کے کھوکھلے پن، مصلحت پسندانہ رویے اور مٹتی ہوئی صالح قدروں کا درد بھی ہمیں ان کی شاعری میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ عصری زندگی میں وجود کی بے ثباتی اور رشتوں کے تقدس کی پامالی نے بھی انہیں متاثر کیا ہے۔ تسنیم کی شاعری پڑھتے ہوئے ہمیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ اس عہد کی ہر شئے کو شکوک نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔ ان کے سامنے سے گذرنے والی ہر چیز ان کے لئے اجنبی ہے۔ شک اور اجنبیت کی اس فضا نے ان کی شاعری میں ایک مخصوص قسم کی کسک اور میٹھا میٹھا درد پیدا کر دیا ہے جسے لہجے کی جاذبیت اور تازگی نے اور بھی پر اثر اور پر وقار بنا دیا ہے۔ ان کی اس تکنیک نے کہیں کہیں ان کے لہجے کو تیکھا اور پر اسرار بھی بنا دیا ہے۔

ہم محافظ ہیں مسیحا ہیں نئی نسلوں کے
ہم نے ایک سڑتی ہوئی تہذیب کا سر کھولا ہے

دیکھنا ہے تو کسی دم گئے ہوئے کھیت کو دیکھ
دانے دانے کی یہ خواہش ہے کہ باہر نکلے

میری نگاہ اسے چھونے گئی تو دور
وہ روشنی کے بنا تا ہوا حصار گیا

کبھی ہواؤں کے سنگ کون پڑھے گا ان کو
دو سطر ریت پہ لکھے ہیں فسانے میرے

آخری زینے پہ جو ٹھہرا ہے نشان
جس کو چھینا ہو وہ چاہت کا سلسلہ

حقانی القاسمی
(ریسرچ اسکالر)

تلمیذ داغ

ناطق گلاوٹھی کی شعری دنیا

شعر گوئی نئے انداز کی تجدید خیال　　دیکھنا چاہے تو ناطق میرا دیوان اٹھا

(ناطق گلاوٹھی)

ناطق گلاوٹھی کا تعلق ممتاز خانوادہ سے ہے۔ ان کے جدّ اعلیٰ مولانا سید منہاج الدین احمد شاہ ابدالی کی فوج کے ساتھ بھارت میں آکر مقیم ہوگئے تھے۔ ان کے جدّ امجد سید غلام غوث وکالت کرتے تھے اس لئے ایک مدت تک میرٹھ میں اقامت پذیر رہے پھر گلاوٹھی میں مستقل سکونت اختیار کرلی۔ ان کے والد ماجد سید ظہور الدین گلاوٹھی میں تجارت کرتے تھے وہیں ۱۱ نومبر ۱۸۸۶ء میں ناطق پیدا ہوئے۔ ابوالحسن ناطق نے مبادیات کی تعلیم گھر پر حاصل کی اس کے بعد ۱۸۹۶ء میں گلاوٹھی کے مدرسہ منبع العلوم میں کچھ دنوں تعلیم حاصل کرنے کے بعد ازہر ہند دارالعلوم دیوبند تشریف لے گئے اور یہاں پر ممتاز اساتذہ علوم و فنون، صنادید فقہ و حدیث اسیر مالٹا شیخ الہند مولانا محمود الحسن (۱۲۶۸ - ۱۳۳۹) مولانا عبد اللہ انبیٹھوی (م ۱۳۴۲ھ) خلیل احمد سہارنپوری (۱۲۶۹ - ۱۳۴۶ھ) احمد حسن مرادآبادی (م ۱۳۳۰ھ) ماجد علی جونپوری کے سامنے زانوئے علم و ادب تہہ کیا۔ دوران طالب علمی میں تصوف سے گہرا لگاؤ پیدا ہوگیا تھا اس لئے حضرت قطب الارشاد مولانا رشید احمد گنگوہی (۱۲۲۸ - ۱۹۰۵ء) کے حلقۂ ارادت میں شامل ہوگئے۔ دوسری طرف سیاست سے بھی دلچسپی پیدا ہوئی کیونکہ ناطق کا خاندان بھی سیاسی امور میں گہری دلچسپی لیتا تھا گویا سیاست انہیں وراثت میں ملی تھی۔ ان کے عم محترم سید عنایت اللہ ۱۸۵۷ء کی تحریک میں حصہ لینے کے جرم میں برطانوی ظلم و تشدد کے شکار ہوئے۔ انگریزوں نے انہیں سولی پر لٹکا دیا۔ ناطق بھی اس وقت کی سیاسی سرگرمیوں میں دلچسپی لیتے رہے۔ کانگریس اور تحریک خلافت میں آگے آگے رہے۔ سیاست میں عملی طور پر آگئے تھے اس لئے ناگپور میونسپل کمیٹی کے ۱۹۲۱ء سے ۱۹۵۰ء تک ممبر رہے ۱۹۴۶ء میں مرکزی اسمبلی کے لئے بھی منتخب ہوئے تھے۔ بہت دنوں تک شعر و ادب کی خدمت کرتے رہے مگر ۲۶ مئی ۱۹

کی رات میں اللہ کو پیارے ہو گئے ۔ میونسپل کارپوریشن نے یادگار کے طور پر ، مولانا ناطق روڈ ، اور ، مولانا ناطق چوک ، بنوائے۔ ناطق طالب علمی ہی کے زمانے سے شعر و ادب سے دلچسپی اور شغف رکھتے تھے ۔ یہ شوق بہت تیزی سے ابھرتا رہا ۔ اس نے حضرت یزدانی اور سید محمد مرتضیٰ بیان میرٹھی (۱۸۵۰ ـ ۱۹۰۰ ء) سے مشورہ سخن کے آرزومند ہوئے مگر چند ماہ کے بعد انتقال کی وجہ سے استفادہ کا سلسلہ منقطع ہو گیا ۔ اس کے لئے مختلف اساتذہ کے دواوین کا مطالعہ کیا اور بقول مالک رام :

" اتفاق کی بات کہ کہیں سے داغ کی دو دیوان یادگار داغ اور آفتاب داغ ان کے ہاتھ لگ گئے ۔ انہیں دیکھا تو یہ داغ کے ایسے گرویدہ ہوئے کہ تھوڑے دن بعد خط و کتابت کے ذریعہ ان کا تلمذ اختیار کر لیا "

ان کی یہ سرگرمیاں جاری رہیں اور نظمیں اور غزلیں اس وقت کے متعدد رسائل مخزن لاہور اور سہیل لاہور میں چھپتی رہیں ۔ ابتدائی نظموں کا مجموعہ "نطق ناطق" کے نام سے شمس المطابع میرٹھ سے ۱۹۱۳ء میں چھپا اور ایک طویل مکتوب پر مشتمل کتابچہ "کلیں میں غلیل" ۱۹۵۰ء میں شائع ہوا ۔ جو مولانا الطاف حسین حالی (۱۸۳۷ء ـ ۱۹۱۴ء) کے درج ذیل شعر کے مفہوم اور اس کی تشریح سے متعلق ہے ۔

حالی اب آؤ پیروی مغربی کریں بس اتباع مصحفی و میر کر چکے

ادبی نوعیت کے مضامین اور مکاتیب پر مشتمل "سبع سیارہ" نامی کتاب فیض عام پریس لکھنؤ سے ۱۹۶۰ء میں شائع ہوئی جو بہت ہی مقبول اور مشہور ہیں ۔ ممتاز ادیب اور سخت گیر ناقد ڈاکٹر عندلیب شاداں (جنھوں نے حسرت ، فانی ، اصغر اور جگر کی شاعری کا مذاق اڑایا ہے) نے اس کتاب کو مولانا کی متبحر علم کا آئینہ دار قرار دیا ہے ۔

" مولانا نے اس میں بہت سے لطیف نکتے نہایت حسن و خوبی کے ساتھ بیان فرمائے ہیں ، کلام پر جو تبصرہ فرمایا ہے وہ لائق تحسین فکر انگیز اور ادب آموز ہے ۔ انتقاد نہایت صحیح اور نقاد کے تبحر علمی کا آئینہ دار ہے "

اس کے علاوہ دیوان غالب کی شرح جو سابقہ شرحات کے مختلف انداز میں لکھی گئی تھی ، "کنز المطالب" کے نام سے ۴۲ برس کے بعد مکتبہ دین و ادب لکھنؤ سے ۱۹۶۸ء میں شائع ہوئی ۔ مولانا کا شعری مجموعہ شاگرد رشید عبدالحلیم صاحب نے اکتوبر ۱۹۷۶ء میں شائع کیا ہے جو ۲۲۴ صفحات پر مشتمل ہے ۔ میرے پیش نظر یہی دیوان ہے ۔

ناطق نے بہت اچھا شاعری کی ہے ۔ بنیادی طور پر کلاسیکی شعری روایت کے دلدادہ تھے ۔ انہوں نے مختلف شعری اسالیب سے استفادہ کے باوجود اپنی انفرادیت کو برقرار رکھا ہے ۔ عروض سے مکمل آگہی کی وجہ سے شاعری کے اسرار و رموز اور محاسن اور معائب پر گہری دسترس رکھتے تھے ۔ ان کے اشعار کے مطالعہ کے دوران ان کے شعری رویے کا اندازہ ہو جاتا ہے ۔ ذوق ، شاہ نصیر ، مومن ، غالب اور میر تقی میر بہادر شاہ ظفر کے رنگ میں شعر کہتے رہے اور عمر بھر ان کے عاشق اور شیدائی رہے ۔ ناطق کی شاعری میں خاص طور پر جو چیز نظر آتی ہے وہ غالب کا سا انداز بیان ہے ۔ ان کے بہت سے اشعار ان کی زمین میں ہیں اور فکر و خیال بھی ملتے جلتے ہیں ۔ صرف طرز بیان کا

تھوڑا سا فرق ہے۔ اس لئے ناطق کے یہاں غالب کا ذکر بار بار ملتا ہے۔

شاعری جس کی ہو انداز سخن میں ناطق، دوسرا کون ہے غالب کے سوا میرؔ کے بعد
واہ رے حسنِ بیان، اللہ رے اندازِ کلام میرزا غالب ہے ناطق یوسف ثانی مجھے
مومن پہ بھی ایمان ہے غالب پہ بھی ناطق ہم ذوق کے انداز میں رہتے ہیں مگن اور

اس کے علاوہ بھی مختلف اساتذہ سخن کے اسالیب و اظہارات سے استفادہ کیا ہے جس کے واضح اشارے ان کے شعروں سے ملتے ہیں۔

تمہارا نام آنے تک رہے دھوکے میں اے ناطق ہم ان شعروں کو سمجھے کلیات میرؔ کے ٹکڑے

مگر غالب سے فنی اور فکری استفادے کی جھلک مجھے ان کی پوری شاعری میں نظر آتی ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ غالب کی تفہیم میں انہوں نے اپنی عمر کا ایک حصہ گذارا ہے اور اس کی شرح بھی لکھی ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ان کے تلامذہ نے ان سے اصرار کیا کہ اساتذہ کے رنگ میں شعر کہیں تو انہوں نے ایسے شعر کہے کہ ایک دیوان مرتب ہو گیا اس کا اعتراف حضرت آسی نے اپنے ایک مضمون مشمولہ رسالہ سخن در ۱۹۳۴ء میں کیا ہے۔

ان کی شاعری میں ان کی زندگی اور شخصیت کے مختلف رنگ و روپ نظر آتے ہیں۔ ان کے جذبات اور محسوسات ان کی غزلوں میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ سادہ اور پرکار زبان میں باتیں کہنے کا ہنر انہیں خوب آتا ہے۔

تنہائی، اداسی، بے چینی اور خود شکستگی کا کرب شاعروں کا مقدر ہے۔ ایسے حالات میں شاعر خود کو بھلا دیتا ہے۔ پھر یاد نہیں رہتا کہ اس کا وجود ہے یا نہیں اور پھر جب کبھی خیال آ جاتا ہے تو اپنی گم شدہ شخصیت کی تلاش میں نکل جاتا ہے۔ اس طرح کے جذبے کی عکاسی اس شعر میں دیکھئے۔

نظر آتا نہیں اب وہ بھی اف رے تنہائی اک آئینہ میں پہلے آدمی تنہا میری صورت کا

زمانے کے پریشان کن حالات شاعر کو اس قدر مجبور کر دیتے ہیں کہ اپنی صورت بھی پہچانی نہیں جاتی۔ کیونکہ زندگی بہت حد تک بدل جاتی ہے۔ پہلی جیسی بات نہیں رہ جاتی۔ زندگی ایک خواب پریشان بن جاتی ہے اور خوشیاں محرومیوں میں بدل جاتی ہیں۔ ایسے میں شاعر صرف افسوس کر سکتا ہے۔

ہر خوشی، ہم سے گریزاں، کبھی ایسی تو نہ تھی سر خوشی، خواب پریشاں کبھی ایسی تو نہ تھی

مگر شاعر ہے کہ مشقتیں برداشت کئے جاتا ہے۔ زندگی کی دھوپ میں تپ کر اس کی شخصیت اور نکھر جاتی ہے رنج کا خوگر ہونے کی وجہ سے اب یہ مشکلات بھی آسان ہوتی نظر آتی ہیں اس کے لئے شاعر گویا ہوتا ہے:

مشکلوں نے ہمیں اتنا تو سکھا رکھا ہے ہم سکھا دیتے ہیں مشکل کو بھی آساں ہونا

شاعر کے پاس دل بھی ہوتا ہے جس میں زندگی کے غم کے ساتھ ساتھ جاناں کا غم بھی لاحق ہو جاتا ہے اس لئے وہ دوہری مشکل میں ہوتا ہے۔ غم سے چور، رنجور کہ جیسے انسان کی زندگی میں لطف و مسرت کہاں، اس کی تو زندگی عذاب کی ما

ہوتی ہے۔ رسوائیاں، ذلّتیں، طعنے اور دشنام طرازیاں ہی ان کی زندگی کا نصیب اور مقدر ہوتی ہیں۔ اس پر مستزاد معشوق کی بے وفائی، ناز و غرور جب اس کو محفلِ جاناں سے اٹھا دیتا ہے تو اس کے بجھے ہوئے دل سے ایک دھواں سا اٹھتا ہے اور زبان پر یہ شکایت ہوتی ہے۔

نہیں معلوم، تری بخشش بیجا کا علاج | کیا بتاؤں کہ مرے دکھ کی دوا کونسی ہے
تم ہو مختار، تمہارے لیے بیجا ہے کیا | میں ہوں مجبور، مری بات بجا کونسی ہے

اس کار و بار شوق و جنوں میں ایسے مقام سے بھی انسان گذرتا ہے کہ اسے اپنی چاک داماں بھی اچھی لگتی ہے اور رفوگر کو وہ اپنا رقیب سمجھنے لگتا ہے:

اے رفوگر ڈالتا ہے کیوں پھٹے میں پاؤں تو | رہنے دے اچھی ہے مری چاک دامانی مجھے

اور اب زندگی اور دکر کاٹنے کا خیال دل میں جگہ پالیتا ہے۔ کیونکہ معشوق کی جفاؤں سے دلِ شاعر تنگ آجاتا ہے اور یہ طریقۂ زندگی اپنا کر اپنی زندگی کے بقیہ ایّام گذارنا چاہتا ہے۔

ہنس کے نہیں تو رو کے ہی عمر گذر ہی جائے گی | آج سے خیر یوں ہی سہی، مجھکو خیال تھا کہ یوں

شاعر کو بے وطنی، بے گھری، یا گھر کی ویرانی اور وحشت کا خیال بار بار آتا ہے اور خوف و اداسی میں اضافہ کر جاتا ہے:

کئی جنگل ہیں دیوانے کے گھر میں | ضرورت کیا ہے دیوانہ کو گھر کی،
گئے ہیں جب سے وہ، اپنے بھی آئے، غیر بھی آئے | سب آئے بھی گئے بھی، گھر کی ویرانی نہیں جاتی

اور اس ویرانی کا احساس جنوں و دیوانگی کی وجہ سے بھی ہوتا ہے:

دشت وحشت میں ہوا تھا ساتھ جب مرحوم کا | مجھ سے مجنوں نے کہا تھا، تو بڑا دیوانہ ہے
اے جنوں باعث بدحالی صحرا کیا ہے | یہ مرا گھر تو نہیں تھا کہ جو ویران ہوتا،
خواب وخستہ تھیں آج ہیں کہیں کل ہیں | پتانہ پوچھ ہمارا، ہمارا کہیں قیام نہیں

ناطق جب کبھی اپنے وطن کی یاد میں کھوئے ہوئے نظر آتے ہیں تو دل میں ایک تڑپ اور کسک پیدا ہوتی ہے۔ اپنے اقربا کی جدائی اور اپنے بچوں کی موت کا صدمہ صفحۂ ذہن میں ابھرتا ہے اور پھر آنسوؤں کی شکل میں ڈھل کر لفظوں کا روپ دھار لیتا ہے۔ سوز و گداز کی کیفیت ان شعروں میں ظاہر ہوتی ہے:

مدتوں بعد ملا حال وطن غربت میں | کوئی باقی نہ رہا ہم کو خبر ہونے تک
آہی جاتا ہے برے وقت میں اپنوں کا خیال | کوئی ہوتا ہمارا بھی تو پرسان ہوتا
رونے والوں کو تو تقدیر سے رو بیٹھے تھے | اے اجل کون ہمارے لیے گریاں ہوتا

ناطق ایک عظیم شاعر تھے۔ مگر دوسرے ادبا و شعرا کی طرح اپنے اہلِ وطن کی بے قدری کے شکار تھے۔ جس کا اظہار ان کی شاعری سے ہوتا ہے:

میں بھی کوئی چیز تھا لیکن نہ پہچانا مجھے بندہ پرور، قدر ہی تم نے نہیں جانی مری

مضامین ہائے نو پیدا بہت ہو جائیں گے ناطق مجھے یہ فکر ہے کہ پہلے پیدا قدرداں کر لوں

ناطق کی شاعری سہل ممتنع کی شاعری ہے۔ سادہ اور سلیس انداز میں شعر کہے ہیں۔ خود ناطق صاحب نے اپنے اشعار میں شعری رویے کے بارے میں واضح اشارے کئے ہیں:

شعر گوئی نئے انداز کی تجدید خیال دیکھنا چاہے تو ناطق میرا دیوان اٹھا

شعر ہیں ناطق کے اب وارستہ انداز نظم شاعری گم کردہ ہے، آواز بہترائی ہوئی

زبانِ داغ و شانِ ذوق کچھ اس میں نہیں ناطق اسے یہ کیا ہے تو ہو ائے نوح و سائل تھا

ممتاز ناقد و ادیب علامہ نیاز فتح پوری نے ناطق کی شاعری کے بارے میں اپنے گہرے تاثرات کا اظہار ان الفاظ ذیل جملوں میں کیا ہے:

" ناطق گلاوٹھی تغزل کے دیرینہ گرفتار ہیں اور باوصف کسی خاص اسکول کے پابند نہ ہونے کے ان کا انداز بیان ہمیں اساتذہ دہلی کی یاد دلاتا ہے۔ یہ معاملات حسن و عشق کو اس زبان میں ادا کرتے ہیں جو تغزل کے لحاظ سے معیاری چیز سمجھی جاتی ہے اور بعض اوقات یہ اپنے خیال کو ایسے پہلو سے پیش کرتے ہیں کہ سننے والا دفعتہً چونک پڑتا ہے۔ ان کے کلام میں ایک خاص تیکھا پن پایا جاتا ہے جو پرانی بات میں بھی نئی کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔ سلاست و روانی جو تغزل کی جان ہے ان کے کلام میں ہر جگہ پائی جاتی ہے۔"

ناطق کی شاعرانہ عظمت کے معترف علامہ سیماب اکبرآبادی، تلمیذ داغ احسن مارہروی، سائل دہلوی، حضرت بیخود دہلوی اور علامہ اقبال جیسے مشاہیر ہیں۔

ناطق نے بہت سے شاگرد پیدا کئے۔ جو ادبی دنیا میں خاصی شہرت رکھتے ہیں۔ امیر حسن امیر گلاوٹھی، عبدالباری آسی، (۱۸۹۳ء - ۱۹۴۶ء) غضنفر حسین شاکر ناطقی (۱۸۹۴ء - ۱۹۶۷ء) نفیس بنگلوری، اظفر ناگپوری، سلیم احمد زخمی، غلام حسین منصور سورتی، ڈاکٹر ممتاز احمد خان خوشتر کھنڈوی اور کامل بہزادی جیسے لوگ ناطق کے حلقہ تلامذہ میں ہیں۔ موخر الذکر دو نام جدید شعری دنیا میں بھی خاصی اہمیت رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر ممتاز احمد خوشتر کے بارے میں ڈاکٹر مظفر حنفی لکھتے ہیں:

"——— موصوف کے مجموعہائے کلام "گل افشانیاں" اور "افکار خوشتر" ۱۹۶۷ء میں مکتبہ دین و ادب لکھنؤ نے بڑے اہتمام سے شائع کئے تھے جن کے لئے پیش لفظ اور دیباچہ ماکھن لال چترویدی، ناطق گلاوٹھی اور دوسرے کئی اکابرین ادب نے اپنے تاثرات لکھے تھے، ڈاکٹر خوشتر نہ صرف پرگو شاعر تھے بلکہ کھنڈوہ میں شعر و ادب کا ذوق عام کرنے میں ان کا بھی ہاتھ رہا ہے ——— مرحوم کو جانشین داغ مولانا ناطق گلاوٹھی سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ بلا مبالغہ سینکڑوں غزلیں اور قطعہ ہائے تاریخ کہے

کلام میں پختگی اور سلاست میں کمی نہ تھی۔ یہ اشعار دیکھیے :

کشتِ امید پر نہ ہوئی بارشِ کرم / اب کے برس بھی جشنِ بہاراں نہ ہو سکا

جب سے خفا ہوئے ہیں وہ گیسو شباب مٹ گیا / روٹھ گئی ہے فصلِ گل مجھ سے بھری بہار میں

کامل بہزادی بھی مدھیہ پردیش کے ممتاز شاعر اور حضرت ناطق کے شاگردِ خاص ہیں۔ مظفر حنفی ان کی شاعرانہ عظمت کے بارے میں

" مدھیہ پردیش کی مشاعروں کی دنیا کامل بہزادی کو ایک خوش فکر اور خوش گلو شاعر کی حیثیت سے خوب پہچانتی ہے اس علاقے میں عام طور پر کامل بہزادی کی شمولیت کسی بھی مشاعرے کی کامیابی کی ضمانت سمجھی جاتی ہے۔ کامل نے ناطق گلاؤٹھی جیسے استادِ فن سے اکتسابِ فیض کیا ہے۔ ناطق صاحب کی شاگردی نے جہاں انہیں سخن گوئی کے رموز سے آگاہ کیا وہیں روایت پسندی کی ایک ایسی چھاپ بھی ان کے مزاجِ شعر پر ثبت کر دی جس کی جھلک ان کی غزلوں میں اکثر نظر آتی ہے۔ ان کے موضوعات اور فکر کا دائرہ عام طور پر قدما، متوسطین اور متاخرین شعرا کی پیروی تک محدود ہے لیکن ان پرانے موضوعات کو اپنے برتاؤ اور طرزِ اظہار سے جدید نما بنا دینا کامل بہزادی کا فن ہے۔ ان کے کلام کی نغمگی، لہجے کی مٹھاس، اور بیان کی شائستگی پڑھنے والوں کو بے ساختہ اپنی جانب متوجہ کرتی ہے۔

دلہن نکل آئی ہے آکاش کے ماتھے پہ دھنک / بام پر جیسے کوئی شوخ نہا کر آئے

جانے کیا بات ہوئی سایۂ شامِ غم میں / درد بھی ٹھہر رہا آپ بھی کم یاد آئے

ہم جس کی جستجو میں سویرے سے چل پڑے / وہ چاند شام ہی سے نقابوں میں بند ہے۔

ناطق نے جب اتنے عظیم ادبی رجال اور شعری اشخاص پیدا کیے تو ان کی عظمت اس طور پر بھی مسلم ہو جاتی ہے کیونکہ انہوں نے فکر و فن کی شمع کو اپنی ذات تک محدود نہیں رکھا بلکہ اس کے دائرے کو وسیع سے وسیع تر بنانے کے لئے طالب علموں کی رہنمائی کی اور شاعری کے رموز و اسرار سے آشنا کیا۔

حوالے :

۱۔ عابد رضا بیدار : "جدید غزل گو" (پٹنہ ۱۹۸۴ء) ص ۲۴۱ - ۲۴۵

۲۔ عنوان چشتی : "مکاتیبِ احسن" (اردو سماج دہلی ۱۹۷۷ء) ص ۸۶

۳۔ مظفر حنفی : "تنقیدی ابعاد" (دہلی ۱۹۸۷ء) ص ۱۴۲ - ۱۴۳ و ۱۱۹ - ۱۲۰

۴۔ عبد الحلیم : "دیوانِ ناطق" (ناگپور ۱۹۷۶ء)

۵۔ نیاز فتح پوری : "نگار مشاہیر نمبر" جنوری، فروری ۱۹۴۱ء

۶۔ مالک رام : "ناطق گلاؤٹھی" مشمولہ سہ ماہی "تحریر" دہلی جلد ۳ اکتوبر - دسمبر ۱۹۶۹ء ص ۲۳۲ - ۲۳۴

۷۔ حسینہ جمال : "ناطق گلاؤٹھی" مشمولہ "آج کل" دہلی اکتوبر [illegible]

کیوں میں قلمکار لکھوں ؟

رضا اشک

شاعری گھر تہہ افلاک نہیں دے سکتی
شاعری روح کی خوراک تو ہو سکتی ہے
شاعری جسم کو پوشاک نہیں دے سکتی
شاعری جینے کا ادراک نہیں دے سکتی
دل کو یہ حسرت بلقیس تو دے سکتی ہے
تخت اور تاج سلیمان نہیں دے سکتی
شاعری ہاتھ میں تیشہ تو تھما سکتی ہے
قصر پرویز مری جان نہیں دے سکتی
کون پوچھے یہ بھلا تربت فردوسی سے
شاعری دولت سلطان نہیں دے سکتی
بستر مرگ پہ جو ٹھوکر کے مر جانے تک
یہ کوئی جینے کا سامان نہیں دے سکتی

شاعری عظمت شہکار تو ہو سکتی ہے
شاعری رفعت گفتار تو ہو سکتی ہے
شاعری پھول اور تلوار تو ہو سکتی ہے
شاعری ٹیپو کی للکار نہیں ہو سکتی
شاعری رانا کا ہتھیار نہیں ہو سکتی

ہاں میں یہ قوم کی قسمت کو بدل دے تو کہوں
فکر و فن کا یہ نیا تاج محل دے تو کہوں
برف میں آگ اور شعلوں میں غزل دے تو کہوں
شاعری جنگ کا تازہ کوئی حل دے تو کہوں

بات جب یوں ہے تو میں کیوں بھلا اشعار لکھوں
غالب و میر کا میں خود کو پرستار لکھوں
مردہ شاہوں کے قصائد سر دربار لکھوں
کیا ضرورت ہے کہ میں خود کو قلمکار لکھوں
کیوں بھلا کس کے لئے اشک میں فنکار لکھوں

منصور اعجاز

ضمیر

میرے محبوب، میرے داتا
جان سے بھی عزیز تھا مجھکو
میں بہت اس کو پیار کرتا تھا

اس کے احساس، اس کی خودداری
اس کی غیرت سے تنگ آ کر بھی ....
اپنی مجبوریاں مٹانے کو
حاجتوں کی صلیب سے ڈر کر
چند سکوں کی چاہتوں کے عوض
میں نے نیلام اس کو کر ڈالا

لاکھ میں نے اسے یہ سمجھایا
میرے اس دور میں ترا کردار
خودکشی ہے اور کچھ بھی نہیں
وہ مگر پھر بھی مجھ سے روٹھ گیا

میں جب اس کی تلاش میں نکلا
ساری دھرتی ہی چھان ڈالی مگر
مجھ کو ہونے لگا کچھ ایسا گماں
بیش قیمت ہے، لاجواب ہے یہ
اس کی قیمت ادا کریں گے وہی
وہ جو موقع شناس ہوتے ہیں

سینکڑوں تھے چہرے اس کے لاکھوں روپ
گاہ ثروتوں کی قربتوں میں شریک
گاہ مذہب کی آبرو کی نقیب
کبھی ایوانِ مملکت کی زینت

بس مرا جرم ایک بار کا تھا
میں نے تو بے بسی کے عالم میں
ایک ہی بار اس کو بیچا تھا
یہ مگر بار بار بکتا رہا
بکتے رہنے کا یہ عمل لیکن
صرف کوٹھوں پہ ہوتا رہتا تھا
فرق اتنا ہے اس کے سودے میں
فیض دلال ہی کو ہوتا رہا
اس پہ یہ بھی کہ تھک تھکا کے وہی
انہیں کوٹھوں پہ جا کے سوتا رہا

غزلیں

علیم صبا نویدی

میرے اندر میرے باہر کا سفر
فکر و فن کا جوہری نکلا سفر

ایک عالم میں رہا میرا وجود
سات عالم میں رہا میرا سفر

سلسلہ در سلسلہ راہوں کے بیچ
منزلوں کا پیش خیمہ تھا سفر

ایک قطرے میں ہیں سمندر کے بھید
آخری حد چھو گیا پہلا سفر

وہ بھی میری سوچ پہ تھا معترض
جس نے میرے بھاگ میں لکھا سفر

عمر میری ساتھ دینے سے رہی
طے کیا میں نے مگر لمبا سفر

مارستھل میں بھی اٹھائے ناگ ہیں
ختم کرے بھی صبا اپنا سفر

عبدالوہاب تابش

نظامِ زیست ہی بدلا ہوا لگے ہے مجھے
ہر ایک شخص پریشاں سا لگے ہے مجھے

وہ سخت جاں ہوں کہ مرتا ہوں اور نہ جیتا ہوں
دعا لگے نہ کوئی بد دعا لگے ہے مجھے

زمانہ دل جسے کہتا ہے تو کہے لیکن
یہ آرزوؤں کی جلتی چتا لگے ہے مجھے

علاجِ دردِ محبت نہ ہو گا چارہ گرو
یہ وہ مرض ہے کہ جو لا دوا لگے ہے مجھے

وہ درد تھا جو مرے دل کے پاس رہتا تھا
قریب آیا تو پھر فاصلا لگے ہے مجھے

قریب سے کبھی دیکھا ہے تاج کو تم نے
وہ بد نصیب کا اک دل جلا لگے ہے مجھے

اویس احمد دوراںؔ

نہ جانے کون سی شے مجھ میں ہے جبھی ایسی
جہاں جہاں میں گیا حاسدوں کی فوج ملی
ترے غرور کا مجھ کو جواب دینا تھا
وگرنہ میری طبیعت انا پسند نہ تھی
میں برہم لہجہ کا دھیمے سروں کا شاعر تھا
زمیں پہ ظلم بڑھا دھن بدل گئی میری
کچھ آج ہی نہیں صدیوں سے بے اماں ہے
اگرچہ کہنے کو عالم پناہ ہے دلی
ہزاروں وار ہوئے تجھ پہ قبل بھی لیکن
دکھی سماج تو اتنا کبھی نہ تھا زخمی
فسادیوں کا جلوس آ رہا ہے رک جاؤ
شرارت آگ کے گولے ضرور پھینکے گی
بڑا اداس بہت سوگوار ہے موسم
کئی دنوں سے لبوں پر ہنسی نہیں آئی
دعائیں کیوں نہ دوں گلشن کے حکمرانوں کو
انہیں کے حکم سے اردو زبان قتل ہوئی
نشان ڈھونڈ رہا ہوں مگر نہیں ملتا
یہیں کہیں پہ مری پیاری ماں کی تربت تھی
یہ غمزدوں کی ہیں تاریک بستیاں دوراںؔ
دکھائی دیتی ہیں شمعیں جو ڈوبی ڈوبی سی

ستیہ پال ملہوترا عارفؔ

میرا گھر وہ ہے جس میں بن رہے اپنا ٹھکانہ ہے
رہوں گا عمر بھر جس میں وہ گھر میرا نہیں ہوگا
مرا تجھ سے تو جسم و جاں کا رشتہ ہے مگر پھر بھی
رہے گا پاس تو میرے مگر میرا نہیں ہوگا
بہت ہے جو گھڑی بھر روشنی آ کر مرے گھر میں
میں سمجھا تھا کبھی نور سحر میرا نہیں ہوگا
محبت تخم تمنا بو دیا گلزار ہستی میں
نمود برگ تو ہوگی ثمر میرا نہیں ہوگا

غزلیں

ملک شہزادہ جاوید

اداس لوگوں سے مل کر خوشی نہیں ہوتی
مجھے دلیروں سے کبھی دشمنی نہیں ہوتی

کہاں چھپے گا گئے موسموں کا پیلا پن
کوئی بھی شاخ مکمل ہری نہیں ہوتی

سفر میں خوف زبانوں کو بند رکھتا ہے
کسی سے ریل میں اب دوستی نہیں ہوتی

تعلقات کی ان منزلوں پہ ہیں ہم لوگ
جہاں پہونچ کے کبھی مایوسی نہیں ہوتی

یوں ہی نگاہ تری سمت اٹھ گئی ہوگی
شریف لوگوں کی نیت بری نہیں ہوتی

سبھی جماعتیں کرتی ہیں امن کی باتیں
کسی کے لہجے میں سنجیدگی نہیں ہوتی

وہ انتشار کا عالم ہے ان دنوں جاوید
کہ دوستوں سے بھی ملکر خوشی نہیں ہوتی

اختر شاہجہاں پوری

جب بھی وہ میرے ہم زباں ہوئے
لفظ جذبوں کے ترجماں ہوئے

خوف، تنہائی اور ویرانی
ہم بھی چھوڑا ہوا مکاں ہوئے

وہ جو کل تک تھے میرے زیرِ قدم
وہی ذرّات آسماں ہوئے

اے خدا کتنے دن جیوں گا اور
دوست پھر مجھ پہ مہرباں ہوئے

آئینہ دیکھنے کی خواہش میں
سب کے چہرے لہولہان ہوئے

ہم سے رہ رَو کبھی نہ رستے ہیں
آرزو مند سائباں ہوئے

جب برے دن ہمارے تھے اختر
ہم بھی کس کس کے مہماں ہوئے

غزلیں

شہروز کاروروما

بھٹک گیا تھا جو وہ بھی کسی پناہ میں تھا
کہ منزلوں کا تصور بھی گرد راہ میں تھا

ہٹا دیا کوئی سلسلے مکمل آئے
تکلفات کا پتھر ہماری راہ میں تھا

عجیب جنگ تھی وہ بھی کہ جیت کر ہاری
میں اپنے سامنے لائی گئی سپاہ میں تھا

تمام عمر ہم اپنے حریف بن کے رہے
یہ حوصلہ بھی ہمارے دل تباہ میں تھا

سبک اشک ندامت نے کہہ دیا آخر
جو میرے دل میں، تری خود بھی نگاہ میں تھا

برس رہی تھی گھٹا تیری چاہتوں کی ابھی
لیا عجیب سا منظر مری نگاہ میں تھا

عبدالسلام کوثر

شگفتہ گل کسی بھی شاخ پر دیکھا نہیں جاتا
گلستاں پر بہاروں کا اثر دیکھا نہیں جاتا

نہ ہونٹوں پر خموشی ہے نہ چہرے پہ اداسی ہے
مری چاہت کا ان پہ کچھ اثر دیکھا نہیں جاتا

مقابل حسن کو یا سامنے کی دھوپ ہو جیسے
ہے دل میں تاب نظارہ مگر دیکھا نہیں جاتا

یہ دنیا ہے تعصب کی یہاں مطلب پرستی ہے
وفاؤں کا یہاں کوئی ثمر دیکھا نہیں جاتا

تری محفل میں آتے ہیں فنا ہنس کر تو مل ہم
یہ تیور اور یہ انداز نظر دیکھا نہیں جاتا

کسی فنکار کی اب قدر افزائی نہیں کوثر
زمانہ ہو گیا ہے حسن اس قدر دیکھا نہیں جاتا

ڈاکٹر امام اعظم

غزلیں

وقت اور حالات کا کب تک گلہ کرتے رہیں
زندگی کا قرض ہم ہنس کر ادا کرتے رہیں
اس طرح رسم محبت کی کریں ہم پیروی
وہ جفا کرتے رہیں اور ہم وفا کرتے رہیں
ہم نے جینے کے لئے خود ہی نکالی راہ تو
چھیڑ کر کیوں قصۂ غم دل برا کرتے رہیں
کیا الگ رستوں پہ چل کر منزلیں ملتی نہیں؟
کس لئے ہم پیروی قافلہ کرتے رہیں!
اپنا چہرہ بھی یہاں جب گم غباروں میں ہوا
کیا خود کو گر ہم آئینہ کرتے رہیں

اپنے دشمن کو بھی اس دور میں اپنا کہنا
لوگ پیتل بھی دکھائیں اسے سونا کہنا
ٹھیک ہے اعظم کا کوئی چیز نہیں کم ہوگی
تم کو قطرہ بھی نظر آئے تو دریا کہنا
دل کی کیا بات ہے نادان ہے مچل جاتا ہے
ضد پہ اڑ جائے تو اس دل کو بھی بچہ کہنا
آئینہ سچ بھی دکھلائے تو نہ ممکن اس کو
آئینہ دیکھ کے آئینے کو جھوٹا کہنا
وہ تو دلی سے بھی سندر نظر آتا اعظم
کوئی آسان نہیں اس پہ کویتا کہنا

شبیر احمد قرار

بشر میں شر ہے اکثر بولتا ہے — مگر بہروپ بھر کر بولتا ہے
ہمارا حال پوچھا ہے کسی نے — خدا چاہے تو پتھر بولتا ہے
اندھیروں سے کبھی بیعت نہ کرنا — زباں چپ ہے مگر سر بولتا ہے
کہاں تک مصلحت پہونچی ہے دیکھو — خدا چپ ہے پیمبر بولتا ہے
مجھے معلوم ہے کیا ہے زمانہ — مگر اللہ اکبر بولتا ہے
سہلا یہاں کتنے وار جیسے — میں چپ ہو جاؤں تو گھر بولتا ہے
وہی جنگل وہی گندم کی چسکی — وہی آسیب گھر گھر بولتا ہے
کہاں تک امن کا خیمہ سنبھالیں — انا الحق ہر کبوتر بولتا ہے
ندی نالوں کی فطرت کیا بتاؤں
ہمیشہ کب سمندر بولتا ہے

غزلیں

اظہر نیّر

شہر میں ظالموں کے رہتے ہیں
حق نے ظلم و جور سہتے ہیں
دشت و دریا کو پی گئے لیکن
العطش العطش ہی کہتے ہیں
حادثہ ہوتا رہتا ہے لیکن
ہم کھلونوں میں الجھے رہتے ہیں
ہم سمندر بھی پی گئے لیکن
ہر گھڑی ہونٹ خشک رہتے ہیں
نیّر ایسے بھی دوست ہیں جن کی
آستینوں میں سانپ رہتے ہیں

اس شہر نو میں طرز رہائش عجیب ہے
کوئی رفیق ہے نہ ہمارا رقیب ہے
مسعود جسم و جان سے رشتہ عجیب ہے
وہ مجھ سے دور رہ کے بھی کتنا قریب ہے
حالات نے بدل دئے اس کے مرے خیال
دشمن تھا جان کا وہ مگر اب حبیب ہے
میں جب انا پرست تھا تنہا تھا شہر میں
ٹوٹی ہے اب انا تو وہ میرے قریب ہے
میری کہانیاں نہ کبھی جائیں گی نصیب
میرے لئے نہ تیشہ نہ کوئی صلیب ہے

اعجاز طالب

مدتوں کے بعد جب پہونچا وہ اپنے گاؤں میں
جھریاں چہرے پہ تھیں اور آبلے تھے پاؤں میں
اب تو شاید گر گیا ہوگا وہ پیپل کا درخت
بچپنے میں ہم ملا کرتے تھے جس کی چھاؤں میں
کون آئے گا میری دہلیز پہ برسوں کے بعد
آج ہم پھر کھو گئے کوّے کے کاؤں کاؤں میں
تاکہ مجھ پہ شہر کی عریانیاں غالب نہ ہوں
اپنی آنکھیں چھوڑ آیا ہوں میں اپنے گاؤں میں
ایک سنسان سا کو تھا موجب نہ طالب کر [illegible]
[illegible]

نسیم احمد نسیم

کٹھ پُتلا

"اے مسٹر جلدی سے تیار ہو جاؤ، آج تمہاری پیشی ہے"

ان جملے طور پر میری نگاہ اس پر جم گئی۔ پچکا ہوا گال، ہونٹ کے نیچے دبائی ہوئی کھینی، منہ میں دونوں طرف سے داخل ہوتی ہوئی مونچھیں، سراپا آبنوس کا کندہ، یہ سب دیکھ کر مجھے گھن سا آگئی۔ اور میں نے جان بوجھ کر کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ چند ثانئے رکا رہا، اور پھر مجھے گھورتا ہوا جدھر سے آیا تھا ادھر چلا گیا۔ اسے دیکھ کر مجھے وارڈن مسٹیر کی یاد آگئی۔ کانفرنس کی طرح بڑی بڑی چپت کبری مونچھیں منہ میں بھری ہوئی پان کی پیک، آنکھوں میں ڈھیر ساری مکاری، اور اس پر ہمہ وقت کی بے تکی مسکراہٹ ——

مجھے ان دونوں میں کچھ زیادہ فرق نہ لگا ————

ایک دفعہ ہم چند جونیر لڑکے کمرے میں بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے کہ وہ بلا دستک اندر گھس آیا۔ مجھے اس کی وضع قطع سے ذرا نہ لگا کہ وہ ہمارا وارڈن ہے کھیلنے اچھلنے میں صرف اتنا کہہ دیا کہ وہ ہمارے یہاں سب ٹھیک ہے بازو والے کمرے میں شاید میرِ خزانہ ہے"، اس وقت تو وہ چلا گیا۔ لیکن کچھ دیر بعد جب آفس کا ہرکارہ مجھے بلانے آیا تو میری جان ہی نکل گئی۔ میں وہاں پہونچا تو یہ راز کھلا کہ وہ کوئی ایکسٹرا شیئن بلکہ ہمارا نیا وارڈن ہے۔ میری اس معمولی بھول کے مجھے کلرکوں کے سامنے ذلیل کیا گیا۔ اس دن سے اس کی صورت یا اس کی جیسی صورت والوں سے نفرت ہو گئی۔

دسمبر کی سرد رات تھی۔ میں اپنی سائیکل ایرکوٹ کی طرف تیزی سے بڑھتا ہوا چلا جا رہا تھا جان لیوا ٹھنڈک میں باہر نکلنے کا کوئی تک نہ تھا کلاس سے لوٹتے وقت ہی میں نے مصمم ارادہ کر لیا کہ آج ایرکوٹ کی مشہور بریانی کھاؤں گا۔ اور ائیرکنڈیشنڈ ہال میں نائٹ شو پکچر دیکھوں گا۔ جب بڑھتا ہوا کنٹھ پلے پر پہونچا تو مجھے سرد ہوا کے جھونکے نے چاروں طرف سے آلیا۔ میں تیزی سے آگے بڑھ جاتا تھا کہ اچانک سڑک سے متصل فٹ پاتھ پر نظر گئی۔ میں نے اپنی سائیکل روک لی احساس ہوا

جیسے کیچیز دی آس پاس بوروں میں دبکے پڑے تھے۔ اور جب تک گرنے رہے تھے۔ میرا جسم گرم کپڑوں سے پوری طرح ڈھکا ہوا تھا۔ پھر بھی میں ٹھنڈ سے ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔ مجھے اپنے اندر کچھ کمی کا احساس ہونے لگا۔

میں ان پر رشک کرنا چاہتا تھا کہ ان بوروں میں سے دو بچے روتے ہوئے اٹھ بیٹھے۔ اور زور زور سے رونے لگے۔ اس پر فوراً ہی بڑبڑاتے ہوئے کئی لوگ اٹھ کر بیٹھ گئے۔ انہوں نے روتے ہوئے بچوں کو اپنے اپنے طور پر ڈھیروں گالیاں دیں۔ لڑکے پھر بھی نہیں مانے۔ بالآخر انہوں نے اپنے اپنے سروں کو بوروں میں چھپا لیا۔ لڑکوں کی ماں لگاتار انہیں پیٹے جا رہی تھی اور کہے جا رہی تھی، "حرامی کے پلے! چین سے سونے بھی نہیں دیتے۔ صرف کھانے کی بات کرتے ہیں" یہ سن کر بھی وہ خاموش نہ ہوئے عورت نے ایک دفعہ اچھی طرح دھنائی شروع کر دی۔ یہ سب دیکھ کر مجھے ایسا لگا کہ میں چوری کی نیت سے نکلا ہوں اور بہت سی نظریں میرا تعاقب کر رہی ہیں میں کچھ سوچ کر پلٹا اور ہاسٹل کی جانب چل پڑا۔

خلاف معمول آج صبح میری آنکھیں ذرا دیر سے کھلیں۔ پھر بھی بہت دیر تک میں یوں ہی بستر پر پڑا رہا۔ جبکہ میرے روم پارٹنرز تیار ہو کر کلاس کو جا چکے تھے۔ میں ابھی بستر چھوڑنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ دروازے پر زوردار دستک ہوئی۔

"گیٹ اِن" میں نے کہا۔

اب میرے سامنے وارڈن بشیر اپنی مکار مسکراہٹوں کے ساتھ حاضر تھا۔ جیسے جیسے اس کی منحوس صورت دیکھ کر طبیعت مکدر ہو گئی۔ اس کی ذلیل آنکھیں مجھے گالیاں دیتی ہوئی لگیں۔ اس کے منہ میں گھستی ہوئی مونچھیں دیکھ کر میں نے نفرت سے اس کے سامنے پڑے ہوئے اگلدان میں کئی بار تھوکا۔ لیکن وہ اپنی تمام تر غلاظتوں کے ساتھ میرے سامنے بیٹھا رہا۔

"مسٹر نسیم! ہاسٹل کے سارے لڑکے مل کر آج رات ڈنر کرنے جا رہے ہیں۔ ۲۵ روپے کنٹری بیوٹ کرنے ہیں۔ یا تو آپ سینئر بادس کو دیدیں یا پھر مجھے دیدیں۔"

بستر سے اٹھتے ہی پیسے کا مطالبہ اور وہ بھی وارڈن بشیر سے۔ مجھے بڑا تاؤ آیا۔ میں نے صاف کہہ دیا "سر میرے پاس پیسے نہیں اور مجھے ڈنر وِنر سے دلچسپی بھی نہیں۔"

اس پر وارڈن بشیر کی مونچھیں کھڑی ہو گئیں۔ اس کی مکار آنکھیں اپنے گڑھوں سے نکلنے کو بے تاب ہو گئیں لیکن اس نے کہا کچھ نہیں۔ اور پیر پٹکتا ہوا میرے کمرے سے نکل گیا۔

شام کو مجھے ایک دوست کی دعوت پہ پارٹی میں شامل ہونا تھا۔ میں تیار ہو کر نکلا بھی، لیکن غیر ارادی طور پر میری سائیکل کٹھ پلے کی طرف بڑھتی چلی گئی۔ جس وقت میں وہاں پہونچا تو وہ سارے کے سارے سو چکے تھے۔ میں نے ان کی طرف ایک بھرپور نگاہ ڈالی۔ لیکن معمول میں کچھ فرق نہ محسوس ہوا۔ کچھ دیر تک یوں ہی کھڑا رہا اور پھر واپسی کے لئے اپنی سائیکل کی طرف بڑھا۔ تبھی بوروں کے ڈھیر میں ایک جگہ کچھ حرکت محسوس ہوئی۔ میرے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے۔ دو شخص ایک ساتھ سوئے تھے ان کے اوپر چینی کا ایک کھلا ہوا بورا پڑا ہوا تھا۔ ایک بورا اوڑھتا تو دوسرے کا آدھا جسم

کھل جاتا۔ پھر جب اپنی طرف کھینچ لیتا تو اس کا سا ستی
ننگا ہو جاتا۔ بہت دیر تک میں یہ کھیل تماشہ دیکھتا رہا
آخر میں ان لوگوں نے [illegible] کر لڑنا شروع کر دیا۔ اور پھر
دیکھتے دیکھتے سات لوروں کے منہ کھل گئے۔ اور
ڈھیروں گالیاں پے در پے باہر گرنے لگیں۔ میں اپنے
آپ کو وہاں اور نہ روک سکا۔ اور واپس ہاسٹل چلا آیا
میں اپنے بستر پر لیٹا تھا کہ بغل کے کمرے
والے شناسا آدھمکے۔ وہ سب ٹی میٹنگ ہال جا رہے
تھے۔ انہوں نے مجھے بھی ساتھ چلنے کو کہا لیکن میں نے
تھوڑی دیر میں آنے کا بہانہ کر کے انہیں چلتا کر دیا۔ ان
کے جاتے ہی غوری آ گیا۔ نہایت آوارہ گرد، ایک نمبر کا
چین اسموکر۔ ادھر کمرے میں آئے ادھر سگریٹ جلاؤ
اور پھر پیسے ختم ہوتے ہی بیڑی پر آ جاتا۔ اس سے میری
شناسائی صرف اس کی خوش مزاجی کی وجہ سے تھی۔ لیکن
کبھی کبھی اس کا ہونٹ مجھے بری طرح کھلتا اور جی چاہتا
کہ اس کے کھلے ہوئے منہ میں پیپرویٹ گھسیڑ دوں ———
بہرحال اس نے آتے ہی سگریٹ کی بو میں بسی ہوئی انگلیاں
میری طرف بڑھائیں۔ میں ہاتھ بڑھانا نہیں چاہتا تھا۔
لیکن روز روز کے اس بے معنی معانقے سے مجھے کوفت سی
ہو چلی تھی۔ پھر بھی میں نے بے دلی سے اپنا ہاتھ اس کے
حوالے کر دیا۔ اس کی پیشانی پر بنتی ہوئی شکنیں مٹ
گئیں۔ اور وہ خوش ہو کر بولا ———

"یار چند دنوں کے لئے اپنی پانی والی لحاف دیدو
میرا جب ختم ہوا تو تمہیں واپس کردوں گا"

چونکہ ہمیشہ ہی میں نے اس کی خواہشوں کی تکمیل
کی تھی اور مجھ پہ تکیہ کیا تھی اس لئے اس نے مجھے تختۂ مشق
بنا رکھا تھا۔ لیکن آج میں اسے اپنے دوسرے تیور
دکھانا چاہتا تھا۔ اس لئے بغیر کسی لاگ لپیٹ کے
دو ٹوک کہہ دیا۔

"دیکھو زبیدو! تم مجھے تنگ نہ کیا کرو، میں تمہیں
لحاف نہیں دے سکتا۔" میری اس غیر متوقع بے رُ
اسے ایسا لگا کہ میں نے ذہنی توازن کھو دیا ہو وہ مجھے
زخمی نگاہوں سے دیکھتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

دسمبر کا آخری ہفتہ تھا سردی نقطۂ انجماد
پر پہنچنے والی تھی۔ شام ہوتے ہی کہیں آنا جانا دو بھر
تھا۔ پھر بھی ضروری اشیا کے لئے شمشاد مارکیٹ جانا
پڑتا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ مجھے ملیریا نے آ دبوچا
میں اپنے دوستوں کے ذریعہ ہیلتھ سینٹر پہنچا دیا گیا
دو روز بعد بحال طبیعت ہوئی اور میں اپنے کمرے پہ چلا آیا
ساتویں روز غسل صحت کے بعد اچانک دو
کٹھ پلے کی طرف گیا۔ حالانکہ ڈاکٹر نے شام کے بعد
سے نہ نکلنے کی پوری ہدایت کر رکھی تھی لیکن میری
طبیعت نے آن واحد میں اپنا فیصلہ سنا دیا۔ اور
تیار ہو کر کٹھ پلا کی اور چل پڑا۔ راستے میں کئی دوست
اپنی اپنی سائیکلوں پر سوار مسکراتے ہوئے مجھے منہ
کرنا چاہا لیکن میں انہیں نظر انداز کرتے ہوئے آگے
بڑھتا رہا۔ جس وقت کٹھ پلا پر میری سائیکل پہونچی، وہاں
لوگوں کی بھیڑ دیکھ کر میرا کلیجہ دھک سا رہ گیا۔ کہیں
میں سے کوئی مر تو نہیں گیا؟ لیکن معاملہ مرنے
کا تھا، بلکہ مار نے پیٹنے کا تھا ——— ایک کاف
لیک ہونے والے کو اپنے چھکتے ہوئے ڈنڈے
سے بے تحاشا پیٹے جا رہا تھا۔ اور پیٹنے والا مار کھا

بار بار اس کے قدموں پر گرتا تھا۔ اور کہے جا رہا تھا۔
حضور! آپکی ہفتہ سارا حساب چکتا کر دوں گا۔
معاف کر دو مائی، باپ اب غلطی نہیں ہوگی۔ لیکن کانسٹبل اب اسے پوری مستعدی سے اپنے بوٹوں تلے روند رہا تھا ——— میں بہت کچھ چاہتے ہوئے بھی کچھ نہ کر پایا۔ میری پیشانی بھیگ گئی۔ اور دونوں ہتھیلیاں گیلی ہونے لگیں۔ میں وہاں سے فوراً ہی واپس چلا آیا۔

کئی دنوں تک مجھے اس بوڑھے والد کی دل خراش چیخ سنائی دیتی رہی۔ پھر کئی دنوں تک میں کٹہرے کی طرف جانے کی ہمت نہ کر سکا۔ مجھے ایسا لگتا کہ میں ہی کٹہرے پر لوگوں کے جم غفیر میں پولس والے سے پٹ کر آیا ہوں۔ اور سرِ عام مجھے ہی ننگا کیا ہے۔

ایک روز میں کلاس سے واپس لوٹ کر ہاسٹل آ رہا تھا کہ مجھے وارڈن بشیر کے کمرے سے اس کے دہاڑنے کی آواز سنائی دی۔ میں تیز تیز چلتا ہوا اس کے کمرے کے نزدیک پہنچا تو دیکھا کہ ہاسٹل کا بوڑھا صاحب جی پارس بھیگی بلی بنا کھڑا ہے۔ اور وارڈن بشیر اپنے گالیوں سے اسے شرابور کئے جا رہا ہے۔ یہ دیکھ کر میرا خون کھول گیا۔ پارس کا قصور صرف اتنا تھا کہ اس نے وارڈن کے کمرے میں جھاڑو لگانے میں تھوڑی دیر کر دی تھی۔ اتنی سی بات پر وہ آپے سے باہر ہو گیا اور جب گالیوں سے اس کا جی نہ بھرا تو اس نے پارس کی گردن میں ہاتھ ڈال کر اسے زور سے دھکا دیا۔ وہ میرے نزدیک آ کر پکی زمین پر منہ کے بل گرا۔ اس کے ہونٹ پھٹ گئے اور خون رسنے لگا۔ یہ دیکھ کر میری جلتی ہوئی پیشانی پر پسینے کے قطرے جمع ہونے لگے۔ میری ہتھیلیاں گیلی ہونے لگیں۔ میں اور اپنے آپ کو قابو میں نہ رکھ سکا۔ اور وارڈن بشیر کا گریبان جا کر پکڑ لیا۔ اور پوری قوت سے اس پر گھونسے برسانے لگا۔ اس کے منہ سے خون ابل پڑا۔ ا اس کے پیر لڑکھڑانے لگے۔ وہ جب ادھ مرا ہو گیا تو میں اسے چھوڑ کر اپنے کمرے میں چلا آیا۔ افسانے کے ساتھ تھوڑی ہی دیر بعد ہارن بجاتی ہوئی پولس کی گاڑی آئی اور مجھے اپنے ساتھ لے گئی۔

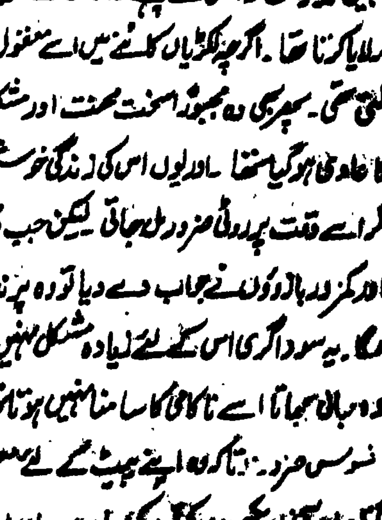
جیل جانے کا یہ میرا پہلا تجربہ تھا پھر بھی میں بہت ہی پرسکون اور مطمئن تھا۔ اور ہر وقت کٹہرے کے متعلق سوچا کرتا تھا کہ چھوٹتے ہی سیدھے وہاں جاؤں گا ان سے بات کروں گا اور .....

تبھی ایک کرخت بارعب اور مکروہ آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ اور میری سوچ کا سلسلہ منقطع ہو گیا "ارے ابھی تک تم تیار نہیں ہوئے۔ پتہ نہیں آج تمہاری پیشی ہے"۔ کانسٹبل میرے روبرو میرے سلاخوں کے باہر کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر غصہ اور حیرت کے ملے جلے اثرات واضح تھے۔ جبکہ میرے ہونٹوں پر ایک پرسکون سادہ سی مسکراہٹ تھی۔

محمد مجیب احمد

شکست

اسے پرندے فروخت کرتے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گذرا تھا۔ اس سے پہلے وہ جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لایا کرتا تھا۔ اگرچہ لکڑیاں کاٹنے میں اسے معقول آمدنی نہیں ملتی تھی۔ پھر بھی وہ مجبوراً سخت محنت اور مشکلات سہنے کا عادی ہو گیا تھا۔ اور یوں اس کی زندگی خوشحال نہیں مگر اسے وقت پر روٹی ضرور مل جاتی۔ لیکن جب ڈھلتی عمر اور کمزور بازوؤں نے جواب دے دیا تو وہ پرندے پکڑنے لگا۔ یہ سوداگری اس کے لیے زیادہ مشکل نہیں تھی جب وہ جال بچھاتا اسے ناکامی کا سامنا نہیں ہوتا تھا۔ لیکن افسوس ضرور ہوتا کہ وہ اپنے پیٹ کے لیے معصوم بے گناہ اور آزاد پرندوں کو قید کرتا ہے۔ اور ان کی ہنستی
اگر میں
یتا۔ جس
پڑتا ہے۔
۔ مگر پہلے
سایہ دار



... کسی کی ہلاکت
... ہے۔ وہ اس کی قدر ... کرتا

خوش نوا اور خوش رنگ پنچھیوں کو گرفتار ہوتے دیکھ کر اسے مسرت ہوئی۔ لیکن فوراً ہی گوشۂ دل سے صدا آئی۔ "یہ تو نے اچھا نہیں کیا۔ اس کا بدلہ تجھے ضرور ملے گا ـــــ تو کب تک بھولے بھالے پرندوں کو جھکمہ دیتا رہے گا۔ یہ آنکھ مچولی زیادہ دن تک نہیں چلے گی" اس کا ضمیر طنزیہ قہقہے لگاتا۔ اس وقت اس کی حالت غیر ہو جاتی۔ اسے محسوس ہوتا کہ وہ مفلوج ہو گیا ہے اور اس کی روح زخمی ہو گئی ہے۔ ان جان لیوا ساعتوں کے بعد وہ بڑی مشکل سے سنبھل پاتا۔ پھر مصمم ارادہ کر لیتا کہ آج ہی اس تجارت کو خیرآباد کہہ دیگا۔ آئندہ کوئی پرندہ نہیں پکڑے گا۔ لیکن اس کے بعد ذریعۂ معاش کیا ہوگا ـــــ مشکلات کا سمندر اس کے آگے ٹھاٹھیں مارتا دکھائی دیتا ـــــ بھیک مانگنا اسے ناگوار گذرتا تھا۔ دوسرے روز پیٹ کے ہاتھوں مجبور ہو کر اپنا کیا ہوا عہد توڑ دیتا اسی کشمکش میں اس نے زندگی کا حصہ بسر کر دیا تھا۔

ایک دفعہ بہیلیوں نے اسے ایسا فریب دیا کہ وہ دیکھتا ہی رہ گیا۔ انہوں نے شکاری کو شکست دے کر کے متعدد ساتھیوں کا تعاقب کیا تھا ...

وہ بہت خوش ہوا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شکاری کے بوسیدہ جال پر
کچھ زیادہ ہی پنچھی دانہ چگنے گئے تھے۔ جب وہ انہیں
پکڑنے کے لئے آگے بڑھا تو سارے پرندے دقّت کے
بغیر جال کو ساتھ لئے اڑ گئے۔ تھوڑا اوپر اڑنے کے بعد
وہ بالکل آزاد ہو گئے اور اس کا پرانا پھندہ زمین پر آگرا۔
یہ منظر اسے بہت پسند آیا۔ اس نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔
بلکہ کسی بھی طرح کی کوشش فضول تھی۔ پرندوں کی اس
چالاکی پر وہ حیران بھی ہوا۔ پھر اسے بچپن میں پڑھا ہوا
قصہ یاد آ گیا کہ پنچھیوں نے ایک شکاری کو ایسا ہی سبق
سکھایا تھا۔ شاید وہ واقعہ خیال ہو۔ مگر اس کے پیش تو
حقیقت تھی۔ اس رات وہ خالی پیٹ ہی سو گیا۔
اسے ذرا بھی بھوک کا احساس نہیں ہوا۔ اس دوران
اس کے سامنے اڑتے ہوئے پرندے اور جال کا نظارہ
چھایا رہا۔ اس تصور کے ساتھ اسے ایک سرور اور
لذت کا احساس بھی ہونے لگا تھا۔

نیا اور مضبوط جال لائے اسے دو روز کا عرصہ
ہوا تھا۔ لیکن یہ اتفاق ہی تھا کہ ابھی تک کوئی بھی پنچھی
اس کے دام میں پھنسا نہ تھا۔ آخر پرندے بھی کب تک
دھوکے کھاتے رہیں گے۔؟ وہ سوچنے لگا۔ اس عرصہ
میں اسے پیٹ بھر کھانا نصیب نہ ہوا۔ وہ آس لگائے بیٹھا
رہا۔ مگر کوئی پرندہ نظر نہ آیا۔ تیسرا روز بھی تقریباً گذر
چکا تھا۔ بوڑھا شکاری مایوس ہو گیا۔ لیکن یہ نامرادی
اس وقت امید میں تبدیل ہو گئی جب شام ڈھلنے سے
پہلے ایک پرندہ اس کے پھندے میں پھڑپھڑانے لگا۔
وہ بڑی محبت سے پرندہ لئے بازار کی طرف چل پڑا۔
شام کا دھندلکا گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ وہ قدم تیزی
سے آگے بڑھانے لگا۔ اسے بازار بند ہونے سے پہلے
پہنچنا تھا۔ اور اس کے عوض ملنے والی رقم سے روٹی کا
بندوبست کرنا تھا۔ وہ بے جان نیم مردہ پسینے میں شرابور
تیز سانسیں لئے جیسے ہی بازار پہنچا۔ اس کے سوکھے
ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے دیکھا کہ سیٹھ
کی دکان کھلی ہوئی ہے اس سے سیٹھ پرندے لے کر
خواہش مندوں کو اپنی مرضی کے مطابق قیمت پر بیچا
کرتا تھا۔ جیسے ہی وہ پرندے کو لئے آگے بڑھا۔ پرندہ
ایک جھٹکے سے پنجرے سے نکل کر فضا میں اڑ گیا۔ اور وہ
بوڑھا شکاری بے بس دیکھتا رہ گیا۔

"کیوں بابا جی! آپ کچھ پریشان سے ہیں؟"
سیٹھ نے اسے بدحواس دیکھ کر پوچھا۔

"کیا کہوں سیٹھ جی کوئی دو روز بعد ایک پنچھی ہاتھ
آیا تھا وہ بھی آپ کے حوالے کرنے سے پہلے ہاتھ سے چھوٹ
گیا۔" اس کے ہونٹ تھرتھرانے لگے وہ آگے کچھ بھی نہ
بول سکا۔

"آئندہ سے سنبھال کر لایا کرو بابا جی! زمانہ ٹھیک
نہیں ہے جانور بھی بہت چالاک ہو گئے ہیں" سیٹھ
اس کی حالت [illegible] ہوا مسکرا کے کہنے لگا۔

بوڑھا صدمے سے حیرت بنا کھڑا رہا۔ وہ سوچنے لگا
کہ کاش وہ اس پیشہ کو اپنانے سے بہتر تھا کہ بھیک
ہی مانگ لیا کرتا۔ شکاری آج پھر فریب کھا گیا تھا۔
مگر اس کا صدمہ اتنا گہرا تھا کہ وہ سنبھل نہ سکا۔ اور چکرا
کر وہیں ڈھیر ہو گیا۔ سیٹھ کی دکان بند ہوئے بہت دیر
ہو چکی تھی۔

———— ○ ————

نئی کتابوں کا تعارف

(تبصرہ کے لئے کتابوں کی دو جلدیں آنا لازمی ہے)

نام کتاب :- "ن" نعتیہ مجموعۂ کلام
تخلیق کار :- علیم صبا نویدی
ضخامت :- ۸۸ صفحات
قیمت :- تیس روپے مجلد
مبصرہ :- ڈاکٹر محمد علی اثر

نعت عربی زبان کا لفظ ہے۔ جس کے معنی ایسی نظم کے ہیں جس میں حضور سرور کائنات پیغمبر اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی مدحت وثنا کی جائے۔

نعت گوئی کے لئے سرور عالم سے صرف ایک عقیدت واحترام کا اظہار ہی کافی نہیں ہے بلکہ شاعر کا عشق محمدی اور محبت رسول سے سرشار ہونا بھی اشد ضروری ہے۔

نعت کا لفظ عموماً وصف کے مترادف کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے لیکن معنی ومفہوم کے اعتبار سے دونوں الفاظ ایک دوسرے کے مترادف نہیں ہیں۔ وصف مدح وذم اور خوبی وخامی دونوں معنوں میں مستعمل ہے جبکہ نعت میں صرف وصف مدح وثنا اور خوبیاں ہی بیان کی جاتی ہیں۔

نعت گوئی کے لئے کوئی صنف سخن مخصوص نہیں۔ ہر صنف شعر، قصیدہ، غزل، مثنوی، مسدس، قطعہ، رباعی وغیرہ نعتیہ شاعری کا بیش بہا سرمایہ موجود ہے طویل نظموں اور دواوین میں بالعموم حمد کے بعد نعتیہ اشعار شامل کئے جاتے ہیں۔

نعت گوئی کا آغاز عربی زبان میں ہوا۔ بعد کو عربی شاعری کی تقلید اور تتبع میں فارسی اور اردو زبان میں بھی نعتیہ شاعری کو قبول عام حاصل ہوا۔ دیگر اصناف شاعری کی طرح اردو میں نعت گوئی کی ابتدا دکن میں ہوئی۔ دکنی دور میں مثنوی کی صنف تمام اصناف شعر پر چھائی رہی۔ اس صنف سخن میں دکنی شاعروں نے اپنی بہترین تخلیقی اور فنکارانہ صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا ہے۔ دکن کی تمام مثنویوں میں حمد کے بعد نعت گوئی ایک جزو لاینفک کے طور پر نظر آتی ہے۔ [illegible] اردو کی پہلی تصنیف فخر الدین نظامی بیدری کی مثنوی "کدم راؤ پدم راؤ" [illegible] اردو میں سب سے پہلے نعتیہ اشعار کہنے کا اعزاز حاصل ہے۔

موجودہ عرصہ میں ادھر جدید شاعروں نے نعت گوئی کی طرف خصوصیت کے ساتھ توجہ کی ہے۔ ہندوستان اور پاکستان کے ادبی رسالوں میں نعتیہ شاعری کے اعلیٰ نمونے دیکھنے کو مل رہے ہیں۔ ان دنوں نعتیہ شاعری کے مجموعے بھی منظر عام پر آ رہے ہیں۔ جدید نعت گو شعراء میں علیم صبا نویدی کا نام بطور خاص اہمیت کا حامل ہے۔

علیم صبا نویدی ساتویں دہائی میں جنوبی ہند کی سرزمین تامل ناڈو سے نمودار ہونے والے ایک درخشاں اور منور روشن ستارے کا نام ہے۔ جس نے ایک مختصر سے عرصے میں اردو کے نئے شعری افق پر اپنی سب سے الگ پہچان بنائی ہے۔ صبا نے اپنی مخصوص تخلیقی اور فنکارانہ صلاحیتوں کے ذریعے اردو شاعری کو نئے تیور، نئے رنگ و آہنگ اور نئی فضا سے آشنا کیا ہے۔ ان کی ایک درجن سے زائد شعری اور افسانوی تصانیف شائع ہو کر مقبول ہو چکی ہیں۔ علیم صبا ایک جدید تخلیقی فنکار ہیں۔ انہوں نے جدید اصناف شعر خصوصاً ہائیکو، سانیٹ، بلانک ورس وغیرہ میں اپنے مخصوص آہنگ اور منفرد لب و لہجہ کے نقوش ثبت کر دیے ہیں۔ گذشتہ چند برسوں سے وہ نعت گوئی کی طرف بطور خاص متوجہ ہوتے ہیں۔ اور شاعری کی مختلف ہیئتوں میں ایک سچے عاشق کی حیثیت سے اپنے مخصوص لہجے میں آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور گلہائے عقیدت پیش کر کے نہ صرف اپنی بخشش کا سامان مہیا کیا ہے بلکہ [illegible]

[illegible]

اب تک ان کے تین شعری مجموعے "مرآۃ النور" "نور السموات" اور "نورات" منظر عام پر آ چکے ہیں۔ "نورات" علیم صبا نویدی کا تازہ مجموعہ نعت ہے جس میں ایک نعت دو سلام اور باون نعتیں شامل ہیں۔

نعت گوئی کا فن بظاہر آسان معلوم ہوتا ہے لیکن یہ بہت ہی نازک فن ہے۔ جس سے عہدہ برآ ہونا بڑا مشکل کام ہے علیم صبا نویدی نعت گوئی کی تمام باریکیوں سے بخوبی واقف ہیں۔ اس لئے ان کا یہ کہنا درست ہے کہ ؎

نعت گوئی کے مبارک شہر میں
چار سو فکر صبا مشہور ہے

تو نے نعت محمدی میں صبا
خود کو اونچا بہت اٹھایا ہے

بقول مولانا راہی فدائی علیم صبا کی نعتیہ شاعری کا کلیدی لفظ "نور" ہے۔ انہوں نے اس لفظ کے متعلقات، مترادفات اور تلازموں کا بڑا دلکش، خوبصورت اور فنکارانہ استعمال کیا ہے ؎

موجودگی میں آپ کی انوار کی بہار
اور آپ کے بغیر اجالا سیاہ ہے

خوش نصیب کہ نور محمدی کے طفیل
[illegible] روشن

حلقۂ نور محمدی ہی سے روشن ہے جہاں
[illegible]

علیم صبا کا نعتیہ کلام "ف" "جذبۂ عشق محمدی کے اجالے"، کے ساتھ ساتھ "شاہ امم کی کی عطائے انسانی"، "گیسوئے مصطفےٰ کی مہک"، اور "خورشید محمد کے اجالے" سے لبریز ہے۔

کیوں کر نہ لیں لوبدی معطر نصیب کو
جب چار سو مہکتے ہیں گیسوئے مصطفےٰ

جس میں خوشبوئے محمد کا خزانہ ہے بھرا
عشق احمد میں گرفتار وہ سر بافضل ہے

چار سو عکس تجلی کی مہک
وسعت دل میں معطر ہیں نبیؐ

ہم کیا تصورات محمد میں کھو گئے
سایہ بھی عطر بیز ہے زلف سیاہ کا

پیش نظر تصنیف میں علیم صبا ابتدا سے آخر تک حب نبی اور عشق محمدی میں سرمست و سرشار، اپنے جذبات و محسوسات کی گل افشانی کرتے نظر آتے ہیں۔ غرض "ف"، نہ صرف علیم صبا نویدی کی نعتوں کا ایک قابل قدر گلدستہ ہے بلکہ اردو کی نعتیہ شاعری میں ایک خوبصورت اضافے کی حیثیت بھی رکھتا ہے۔

بقیہ:- تسنیم فاروقی کی غزل گوئی

قرض میں نے وقت سے پہلے ادا کیوں کر دیا
صرف اتنی بات پر مجھ سے زمانہ جل گیا

اجالا ہو اگر مرے قبضہ پائیں سر اٹھانے کا!
اندھیرے روشنی کی اوٹ میں پوشیدہ رہتے ہیں

تسنیم فاروقی کی غزلیہ شاعری سے گذرنا دردر کے ایک ایسے جنگل سے گذرنے کا عمل ہے۔ جہاں گھنے درختوں اور خاردار جھاڑیوں نے بہاستے کو مسدود کر رکھا ہے۔ ان درختوں کے سائے میں ہمیں سکون تو ملتا ہے مگر آگے بڑھنے کے لئے جہاں پیر اٹھتے ہیں وہیں کو نوکیلا کانٹا انہیں زخم زخم کر دیتا ہے۔ البتہ درد کی ایک مخصوص قسم کی لذت میں کھو کر سفر کی ساری کلفتوں کو بھول جاتے ہیں۔

شہرِ خیال

سہیل کے حالیہ شمارے جس میں فضا ابن فیضی پر میرا مضمون شامل ہے۔ چند کتابت کی غلطیاں در آئی ہیں۔ بہر کیف قارئین کو میرے مدعا تک پہنچنے میں زیادہ دشواری نہیں ہوگی۔

جہاں تک کرشن مراری کی شاعری پر کرشن موہن صاحب کے اثر کا سوال ہے، اثبات و نفی دونوں میں جواب دیا جا سکتا ہے۔ کرشن مراری نے کرشن موہن سے مشورہ سخن کیا ہے باایں ہمہ دونوں کی شاعری میں نمایاں و واضح فرق بھی ہے۔ کرشن موہن کا شمار اساتذہ میں ہوتا ہے اور وہ فی الواقع صاحب فکر و نظر ہیں لیکن اب ان کی شاعری فکر و نظر زدہ ہو کر رہ گئی ہے کیونکہ فکر و نظر کی کشید جذبات میں ہونا چاہئے ورنہ شعر بے نمک ہو جاتا ہے۔ کرشن مراری کے یہاں غنایت بہت ہے اور وہ غنایت سادہ سیدھے جذبات سے عبارت ہے۔ دونوں انکم ٹیکس سے وابستہ رہے ہیں۔ میرٹھ کے دیپک قمر آج کل خوب کہہ رہے ہیں اور ان کی شاعری فی الواقع مقام مرتبہ کی حامل ہے۔ کرشن موہن صاحب تجربات کے گورکھ دھندوں میں پھنس کر رہ گئے ہیں وہ اب تک ۲۳ شعری مجموعے پیش کر چکے ہیں۔ اب ان کے یہاں شعریت کی کمی واقع ہو گئی ہے۔

کم پڑھے لکھے لوگ اقبال کے بارے میں مزخرفات کو خردمندی سمجھ لیتے ہیں۔ شاعر بمبئی اقبال نمبر ۱۹۸۹ اقبال اور اقبالیات پر ایسا وار ہے کہ اقبالیئے دم بخود ہو کر رہ گئے ہیں ماسٹر اختر ملیحہ حیدرآبادی کا پردہ چاک کر چکے ہیں اور یہ ثابت ہو چکا ہے کہ ٹیگور کا نام نہاد تعزیتی پیغام جعلی ہے۔ اقبال عہدِ وسطیٰ کی مسلم تاریخ کے شاعر ہیں۔ اسلام کے نہیں۔ یہ بات تو نیاز فتح پوری کا ہی نے اقبال نمبر (نگار لکھنؤ) ۱۹۶۲ء کے اداریے میں لکھی ہے۔ فروری ۱۹۸۷ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں عالمی سیمینار کا انعقاد ہوا تھا۔ میری کیا کارکردگی تھی ولی کرمانی یا کسی اور سے رجوع کرنے پر معلوم ہو سکتی ہے۔ ماہ جون ۱۹۹۱ء میں میری تصنیف — IQBAL IN — FINAL COUNTDOWN مارکیٹ میں آجائے گی جس میں ہر زاویہ سے دیکھا گیا ہے۔ اقبال اسلامی روایت میں اچھے شاعر تھے مگر فلسفہ سے بالکل ناآشنا تھے۔ تفصیلات میری تصنیف میں پیش ہیں۔

میں تو آخری منزل میں ہوں۔ ۸۲ سالہ کینسر میں مبتلا ہونے کے باوجود اتنا مطالعہ کر سکتا ہوں۔ افسوس ہوتا ہے کہ اردو والوں میں خردمندی کے لئے کوئی جگہ نہیں رہی ہے، جذبات کی رو میں بہنا نازیبا بھی ہوتا ہے اور بیوقوفی کا غماز بھی۔

● تارا چرن رستوگی، گوہاٹی

۹

عزیز گرامی سدا سلامت رہو

سہیل کا شمارہ ۱ جلد ۱۵ ملا۔ اس میں میرے خط کے جواب میں جناب حقانی القاسمی صاحب کا خط بھی

شائع ہوا ہے۔ اسے پڑھ کر میں نے پرانے شمارے تلاش کئے لیکن وہ شمارہ جس کا تعلق میرے خط سے تھا۔ وہ شمارہ تو نہ مل سکا جس میں موصوف کا خط شائع ہوا تھا چنانچہ جو کچھ لکھ رہا ہوں اس کا انحصار میرے پہلے خط اور جناب حقانی القاسمی صاحب کے جواب پر ہے۔

میں نے ان کے گذشتہ خط کے حوالے سے عرض کیا تھا کہ یہ میرے لئے ایک انکشاف ہے کہ مہاتما گاندھی نے گول میز کانفرنس میں اقلیتوں کے تئیں بے اعتنائی کا مظاہرہ کیا۔ کیا انہوں نے اپنے خط میں یہ نہیں لکھا تھا اور میں نے ان کے جملوں کو سبوتاژ کر کے پیش کیا تھا؟ اگر حقانی القاسمی صاحب کے جملے کا یہ مطلب نہیں تو دوسرا کیا مطلب تھا۔ موصوف نے سیاست دانوں کے متعلق میرے بیان سے جزوی اختلافات کی بات بھی کہی ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ جزوی اختلافات ہی مکمل اختلافات کی بنیاد بن کر اولاد کو والدین سے اور بھائی کو بھائی سے بیگانہ بنا دیتے ہیں۔ اس لئے میں گذارش کروں گا کہ ان جزوی اختلافات کا برملا ذکر کریں۔ اور انہیں یہ یقین دلاتا ہوں کہ اگر وہ صحیح ہوئے تو میں ان کا ہم خیال ہو جاؤں گا۔ جہاں تک ادیب کی عظمت کا تعلق ہے اس سلسلے میں صرف ادب کو مدنظر رکھنا چاہئے۔ مثلاً رام چرت مانس میں تلسی داس نے ایک ایسی پرانی کہانی کو دہرایا ہے جسے تلسی داس سے پہلے بھی بے شمار شاعر و ادیب مختلف زبانوں میں رقم کر چکے تھے۔ نیز تلسی داس نے اپنی تخلیق کو ایک علاقائی بولی میں لکھا اور رام کو خدا بھی تسلیم نہیں کیا بلکہ صرف مریادا پرشوتم بتایا لیکن ان کی شاعری اتنی عظیم ہے کہ وہ لوگ بھی جو اس بولی سے ناواقف ہیں اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

فیض کے شعر کا اس سلسلے میں حوالہ مجھے بالکل بے محل لگا۔ شعر کے نقائص سے قطع نظر موصوف نے اس بات کا ذکر کیا جو بغیر کہے سامع یا قاری کے ذہن کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے اور ایسے شعر کو اعلیٰ مقام نہ دینا سامع یا قاری کا کی بدذوقی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ نثر میں یہ بات کم پیدا ہوتی ہے۔ اور یقیناً حقانی القاسمی صاحب کے خط میں کوئی ایسی بات نہیں تھی جو ان کہے رہ جانے کے باوجود قاری کے ذہن کو اپنی طرف متوجہ کر لے۔ اب ذرا گاندھی جی اور حضرت اقبال سے متعلق حقانی القاسمی صاحب کے بیان پر تھوڑی سی روشنی۔ اول تو گاندھی جی کے بارے میں یہ کہنا ہی غلط ہے کہ وہ ایک سیاسی آدمی تھے۔ بنیادی طور پر موصوف حق گو، مساوات کے قائل اور عدم تشدد کے علمبردار تھے۔ اس کے علاوہ وہ سخت مذہب پرست بھی تھے لیکن اس امتیاز کے ساتھ کہ ہر مذہب کو انسانی بہبودی کا وسیلہ سمجھتے تھے۔ وہ نہ اکثریت کے دلال تھے نہ اقلیتوں کے نمائندہ بلکہ سب کی برابری اور بہبودی کے خواہاں تھے انہیں اصولوں پر کام کرنے سے انہیں سیاسی رہنما تسلیم کر لیا گیا لیکن عدم تشدد کی بات پر انھیں ۱۹۳۶ء کانگریس سے استعفیٰ دینا پڑا۔ اس کے بعد انھوں نے کوئی دوسری سیاسی جماعت بھی نہ پیدا کی اور نہ اپنائی اور آخر میں انسان دوستی کے نام قربان بھی ہو گئے۔ انھوں نے زندگی بھر کوئی کام اس غرض سے نہیں کیا کہ اقبال ان کے مداح اور قدرداں بنیں اور عرب دنیا میں انہیں کوئی امتیازی حیثیت حاصل ہو۔ ان کے برخلاف محمد علی جناح صاحب جنھیں قائد اعظم کا لقب بھی گاندھی جی نے ہی دیا ایک سیکولر سیاست داں تھے جو کچھ مفاد پرست اور خود غرض رہنماؤں کے چنگل میں پھنس گئے

ہاذ کم سری پکاسا صاحب نے جو پاکستان میں ہندوستان
پہلے سفیر تھے تو یہی بتایا کہ ان کے پوچھنے پر کہ قیام
ستان کے بعد ان کا مقصد حیات کیا ہوگا تو وہ بولے
اقلیتوں کے مفاد کی ذمہ داری۔ جیسا کہ میں نے گذشتہ
ط میں لکھا تھا حقانی القاسمی صاحب اقبال صاحب
بکلام میں ان عناصر کی توجیہہ فرمائیں جن کی بنا پر وہ
بال صاحب کی عظمت کے قائل ہیں اقبال کے مداحوں
فہرست تو کوئی بھی بتا سکتا ہے۔ مذہب کو مدنظر
ھتے ہوئے ادیب و شاعر کی اہمیت کا قائل میں نہیں
ں۔ حقانی القاسمی صاحب نے بھی اپنے پہلے خط میں
ے اہمیت دی تھی۔ اپنے خط کی پشت پناہی میں
وف نے جو نام لکھے ہیں انہیں معتبر نہیں سمجھتا۔
ان تک عربی دنیا کا سوال ہے تو یہ عرض کر دینا
ہے کہ محترم علی میاں کے ترجموں سے پہلے وہاں
لے اقبال کا نام کبھی نہیں سنا تھا۔

● بلراج حیرت ، دہلی

محترم ! سلام مسنون
ایک مدت کے بعد "سہیل" دیکھ کر واقعی بے
رت ہوئی۔
"سہیل" کا معیار برسوں کا منتخب شدہ معیار
ہو آج بھی قائم ہے۔ آپ اس ادب کش دور میں
جاری رکھے ہوئے ہیں یہی بڑی بات ہے۔ جہاں تک
کی طباعت کا تعلق ہے تو مجھے اندازہ ہے کہ بیتو پیر
ے والے جرائد کا کیا حشر ہوتا رہتا ہے، سو میں اس
باعت کو ناقص نہیں کہہ سکتا البتہ پریس والے
تب حضرات اگر زیادہ توجہ دیں تو طباعت کے
کے حسن کو دوبالا کیا جا سکتا ہے۔ مگر یہ آپ کے بس
کی بات نہیں ہے۔
بنگلہ دیشیوں سے متعلق آپ نے جن برادرانہ
خلوص و محبت بھرے جذبات کا اظہار فرمایا ہے اس
کے لئے تہ دل سے آپ کا اور ادارہ سہیل کا ہم سب
شکر گذار ہیں۔

جو طوفان گذر چکا ہے وہ بنگلہ دیش کی تاریخ میں
ہمیشہ غم و اندوہ کی لرزہ خیز داستان بن کر رہے گا۔ اس
سے قبل اتنی بڑی تباہی کبھی نہیں ہوئی۔ گاؤں کے گاؤں
میدان بن چکے ہیں۔ لاکھوں جانیں تلف ہو گئیں۔ چاٹگام
بری طرح متاثر ہوا۔ اب چند احباب و عزیز سے متعلق
ہم تشویش میں مبتلا ہیں۔ نہ جانے ان پر کیا گذری آیا
وہ زندہ ہیں بھی یا ـــــ اللہ رحم فرمائے۔
ڈھاکہ خدا کے فضل و کرم سے اب تک محفوظ ہے
اور آپ احباب کی دعاؤں کے طفیل ہم بخیر ہیں۔ دعا کریں
کے اللہ تبارک و تعالیٰ متاثرین کو حوصلہ دے اور انہیں
دوبارہ زندگی شروع کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

● ایوب جوہر، ڈھاکہ

برادرم دعائیں
اس سے قبل ایک خط خیریت دریافت کرنے
کے لئے لکھا تھا۔ اب یہ دو غزلیں بھیج رہا ہوں، شاید
ان کے واسطے سے آپ کی خیریت ملے۔ حالات دن بدن
بدتر ہی ہوتے جا رہے ہیں۔ کیا تاریخ کا وہ بھیانک
باب جو فاشسٹ جرمنی میں لکھا گیا تھا یہاں بھی دہرایا
جائے گا؟ میرا خیال ہے کہ ایسا ہوگا کیونکہ جب
مسائل کا کوئی حل نہیں ملتا تو ہم غیر فطری قوتوں۔

کی طرف دیکھتے ہیں اور انہیں منانے کے لئے بلی بھی پڑھاتے ہیں۔

● علی عباس ازل ، بمبئی

مکرمی جمیل مظہر صاحب! تسلیمات

تازہ شمارے میں فضا ابن فیضی کی شاعری پر ڈاکٹر تارا چرن رستوگی صاحب کا مختصر تجزیاتی مضمون شوق سے پڑھا۔ ان کا خیال بہت حد تک صحیح ہے کہ "فضا ابن فیضی کی شاعری میں فلسفہ حیات بھی ہے اور مابعد الطبیعات فرد و معاشرہ بھی ہے۔" کچھ اسی قسم کی رائے کا اظہار ڈاکٹر ابوالفیض سحر نے اپنے مضمون "فضا ابن فیضی شاعر نیم سوز و مشعلہ" "تناظر اور تجزیے" میں بھی کیا ہے۔

فضا ابن فیضی واقعتہ اردو کے چند اہم شاعروں میں سے ایک ہیں۔ اور ادبی دنیا میں بہت ہی فعال اور حرکی شخصیت ہیں۔ میں نے اب تک جتنے مقتدر رسائل دیکھے ہیں ان میں فضا ابن فیضی کے اشعار ضرور نظر سے گزرے ادبی عظمتوں کے باوجود وہ نوجوان نسل میں شعر کہنے کا جذبہ بیدار کرتے ہیں۔ اور ان کی رایوں کو قدر کی نگاہ سے بھی دیکھتے ہیں۔ اس کا اندازہ مجھے اس طرح ہے کہ جب ۱۹۸۵ء میں، میں نے انہیں ایک خط لکھا تو ان کا یہ شفقت بھرا جواب ملا۔" عزیز مکرم! دعائیں ——
خط ملا — یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ شعر و ادب سے عملی دلچسپی رکھتے ہیں اور مجھ ناچیز سے مشورۂ سخن کے آرزومند ہیں۔ اس خصوص میں یہ عرض ہے کہ بہ تقاضائے عمر اب صحت متاثر رہنے لگی ہے مسائل حیات کے الجھاوے الگ۔ تاہم آپ کی خاطر سے کوشش کروں گا کہ حسب توفیق آپ کے لئے کچھ نہ کچھ کرسکوں۔ اپنا کلام بھیجئے۔
آپ نے میری شاعری اور فکر و اسلوب کے بارے میں جن نیک خیالات کا اظہار کیا ہے وہ آپ کی محبت و عقیدت ہے اور شعر فہمی و شستہ مذاقی کی دلیل۔ ان جملوں سے انا کے فن کو تسکین ملی۔ اور کیا کہوں — خوش رہئے۔ امید ہے آپ کے افراد خانہ بخیر ہوں گے۔ دعا گو۔ فضا ابن فیضی۔"

فضا صاحب کی شاعری پڑھنے کے بعد جو میں سمجھ سکا ہوں وہ یہ کہ فضا مینارہ عاج — (IVORY TOWER) میں مقید نہیں ہیں بلکہ معاصر انسانی صورت حال سے آگہی رکھتے ہیں۔ اس لئے ان کی شاعری میں درد پنہاں اور داخلی کرب کا احساس ملتا ہے۔ وہ پاکستانی شاعر عبدالعزیز خالد سے بھی مماثلت اس معنی میں رکھتے ہیں کہ دونوں ہی مختلف زبانوں سے واقف ہیں اور نئے شعری تراکیب وضع کرنے میں استادانہ مہارت بھی ان دونوں کو حاصل ہے۔ فضا، نوبل انعام یافتہ ناول نویس ولیم فاکنر ۱۸۹۷ء-۱۹۶۲ء (WILLIAM FAULKNER) کی طرح اسلوب کے اعتبار سے مشکل پسندی کے باوجود اردو دنیا میں مقبول ہیں۔

شمارے کے افسانوں میں "اسرار و آگہی" (نورالحسنین) تاریکیاں (ویریندر پٹواری) اور "شناخت" (ایم عارف) پسند آئے۔ غزلیں بھی بہت اچھی اور معیاری ہیں۔

نہ جانے کس جرم کی پاداش میں آپ نے خاص شمارہ "قیصر عثمانی کے نام" ارسال نہیں کیا۔ میں نے اپنے ایک کرم فرما سے لے کر پڑھا۔ اکابر ادب کے تاثراتی مضامین آپ نے اکٹھا کر دیئے ہیں جس سے عثمانی صاحب کی فنکارانہ شخصیت کی تفہیم میں کافی مدد ملے گی۔ "پرچھائیوں کا دیس" یہ آپ

ہت سارے مضامین لکھوائے ہیں مگر یہ تخلیق شامل رہ نہیں ہے جس سے ان لوگوں کو یقیناً دقت ہوگی جن نظر سے پہلے یہ تخلیق نہیں گذری ہے۔ اتنا خوبصورت سالہ نکالنے پر مبارکباد قبول فرمائیے۔

● حقانی القاسمی، علی گڈھ

بھائی مسعود منظر! تسلیمات

"سہیل" کا "قیصر عثمانی" نمبر نظر نواز ہوا۔ دیکھنے تو بڑا دیدہ زیب شمارہ ہے۔ ضخامت بھی تشفی بخش ہے عثمانی کی شخصیت، سیرت اور عظمت کے تعلق سے مضامین ست بظاہر لمبی چوڑی دکھائی دیتی ہے لیکن ہر مضمون جگہ بڑی اہمیت اور افادیت کا حامل نظر آتا ہے۔ جو عثمانی کی زندگی کے تہ در تہ گوشوں کی عکاسی بہ نفس ی کرتا ہے۔ اور ہر گوشہ کی بے نقابی سے صاف نمایاں ہوتا ہے کہ قیصر عثمانی گمنامی میں بھی اس مقام کے حق دار نظر آتے ہیں جو بقول "ادارہ سہیل" بڑے فنکار کی نہیں سچے فنکار" کی ضمانت کا پتہ دیتا

قیصر عثمانی بنیادی طور پر ایک شاعر ہیں۔ یہ دوسری ہے کہ پیشے کے اعتبار سے انہیں فلم انڈسٹری میں بحیثیت Publicity [illegible] کے کام کرنا پڑا ہے۔ اسی سے منسلک ہو کر اگرچہ انہوں نے منظوم شاعری کی بہت کم توجہ کی ہے لیکن جو کچھ انہوں نے ادب کو دیا بہت کم غزلیں اور نظمیں لکھی ہیں۔ وہ ان کے ذاتی تجربوں انہوں کا موثر ردعمل ہیں۔ یعنی ان کے یہاں احساسات بات میں افراط و تفریط کا کوئی گزر نہیں۔ بلکہ ایک شاعر کی مانند انہوں نے ہمیشہ Quality کو ملحوظ نظر رکھا ہے نہ کہ Quantity کو۔ یہی سبب ہے کہ وہ اردو شعر و ادب کو "پرچھائیوں کا دیس" ناولٹ اور طوفان تھم گیا، حدیث دل شعری مجموعہ اور صرف چند چیدہ چیدہ غزلیں ہی دے سکے ہیں۔

یہ بات قابل غور ہے کہ فلمی دنیا کی گہما گہمی اور مینا بازاری کے باوجود بھی قیصر عثمانی ہمیشہ اپنے اندر کے انسان کو زندہ، فعال اور محور پالیا کرتے ہیں۔ اس بات کا ثبوت زیر نظر شمارہ کی ہر بڑی اور چھوٹی تحریر میں ملتا ہے۔ سماج میں رہ کر فنکار کو ہمیشہ سماج کے مخصوص اصولوں اور ضوابط کے تحت چلنا پڑتا ہے۔ قیصر عثمانی کا سماج فلمی اور ادبی سماج تھا۔ وہ فلم اور ادب کے سنگم پر کھڑے تھے۔

لیکن یہ ان کی انفرادیت کا اعجاز ہی تو ہے جو ان کے قدم کبھی بھی ڈگمگاتے ہوئے نظر نہیں آتے ہیں۔ یعنی انہوں نے ادبی اور فلمی شعبوں کا کوئی مخصوص رویہ یا رجحان اپنے اوپر حاوی ہونے ہی نہیں دیا۔ غالباً انہیں یقین تھا کہ رویے اور رجحانات وقت کی لپیٹ میں آکر بدل جاتے ہیں۔ پرانے ہو جاتے ہیں اور پھر نئے جنم لیتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ نام کے اعتبار سے وہ اگرچہ گمنام ہی سہی۔ مگر اپنی شان اور آن کے مالک نظر آتے ہیں۔

بے شک "پرچھائیوں کا دیس" قیصر عثمانی کی فلمی زندگی کی تلخ ترین حقیقتوں کا شاعرانہ اظہار ہے جن حقائق کے تعلق سے زیر نظر شمارے میں ایک سے بڑھ کر ایک موضوعات پڑھنے کو ملتے ہیں۔ لیکن اسی شاعر کا کتاب "حدیث دل" پر کوئی مفصل مضمون پڑھنے کو نہیں ملتا۔ جس کی اشاعت کی مخصوص رقم

ہیں گا
...ب کے دوستوں، واقف کاروں اور عزیزوں کو کتاب
...خریدار بن کر پیش کرنا پڑتا ہے۔ اس لحاظ سے تحدیث
...پر کسی موضوع کی کمی نہایت ہی کھٹکتی ہے۔ اس کمی
...وجود قیصر عثمانی نمبر کا ہر موضوع موافق اور مصداق
...ان کی اس شخصیت کا۔ جو اپنے اندر صد رنگ
...ے رکھتی ہے۔ چونکہ یہ رنگ اس قدر گہرے اور تہ
...نظر آتے ہیں کہ شمارے کے ہر مقالہ نگار نے ان کی
...تحریروں میں ڈوب کر قیصر عثمانی کی سیرت اور انسانیت
...ایسے حد نایاب ڈھونڈ نکالے ہیں کہ ان کی چمک
...ے زیر نظر شمارے کے ورق ورق ہمیشہ روشن
...ں گے کیونکہ اس میں ادب نوازوں کو ادیب و شعری
...ق رکھنے والوں کو شاعر اور انسانیت نوازوں کو
...نسان ملتا ہے اور اردو زبان سے والہانہ محبت
...رکھنے والوں کو اردو زبان کا سچا پرستار دیکھنے کو ملتا
...ہے۔ یقیناً یہ شمارہ ہر باذوق کی تسکین کا سامان فراہم
...کرتا ہے۔ آخر میں میرے جیسی کوئی ادبی قاری یہ باور
...کئے ہوئے ہے گا۔ کہ قیصر عثمانی نام سے نہیں بلکہ اپنے
...چیدہ چیدہ کارناموں کی وجہ سے زندہ و جاوید ہیں۔
...ان کے یہاں کارناموں کی کثرت نہیں ملتی لیکن
...زیادہ دکھائی دیتا ہے کہ قیصر عثمانی وحدت میں کثرت
...سموئے ہوئے ہیں۔ یہی ان کی عظمت اور عظمت کی
...ضمانت ہے۔ زیر نظر شمارہ ایسی ضمانت کا ضامن
...ہے۔ جو ہر اعتبار سے لائق ستائش ہے اور ادبی
...حلقوں میں پذیرائی کا مستحق بھی۔ مختصراً یوں کہ قیصر
...عثمانی نمبر — ایک اچھی اور عمدہ کاوش ہے۔ ادبی
ستاروں کے جھرمٹ میں بے نام ستارے کی بازیافت کرنے کی۔

• فریدہ کول، کشمیر

مکرمی! السلام علیکم

امید ہے مع الخیر ہوں گے۔ شمارہ مل گیا ہے
سابق وزیر اعظم اور کانگریس کے صدر راجیو گاندھی کی جبری موت نے پورے ملک کو ہلا کر رکھ دیا آج وہ سارے انسان جو ذات پات اور مذہب کے نام سے سیاست کرنے والوں نے دنگے فساد کروا کر مارے یاد آرہے ہیں۔ ایسے ہزاروں معصوم بے گناہوں کی ناگہانی موت پر ہندوستانی اقوام کی خاموشی نے قاتلوں کے حوصلے ہی بڑھائے ہیں۔ آج راجیو گاندھی کو موت کے گھاٹ اتارنے کی ہمت بھی یہ قاتل کر چکے۔

مہاراشٹر میں شیو سینا چیف بال ٹھاکرے نے مہاتما گاندھی کے قاتل گوڈسے کی پونہ میں ایک الیکشن میٹنگ میں تعریف کرتے ہوئے کہا کہ گوڈسے کا یہ کارنامہ ہمارے لئے باعث فخر ہے یہ حوصلہ بھی بال ٹھاکرے کو ہندوستانی عوام کی خاموشی نے عطا کیا جب بال ٹھاکرے کھلے عام مسلمانوں کو، ان کے مذہب اور قرآن کو پچھلے دس بیس برسوں سے برا بھلا کہتا رہا تب کسی نے بھی بال ٹھاکرے کی گوشمالی نہیں کی نہ عوام اور نہ ہی ملک کے قانون نے۔ اب بال ٹھاکرے راشٹر پتا مہاتما گاندھی کی مذمت پر اتر آیا ہے۔ کیا یہ سب ہندوستانی جمہوریت میں جائز ہے۔ یہ ساری بداخلاقیاں، بدتمیزیاں یہ ذلیل حرکتیں ہندوستانی قوم اور اس کے بعد اس کے دستور کی آنکھیں کھولنے کے لئے کافی نہیں ہیں۔ کب ہندوستانی قوم باعمل با اخلاق اور باکردار بنے گی۔ افسوس کرنے اور سوچنے کا وقت نہیں ہے آگے بڑھ کر عمل کرنے کا وقت آگیا ہے۔ ممکن ہے آگے حالات بدلیں۔

منصور اعجاز، ایوتمل

▲ براہ کرم تخلیقات صاف اور خوشخط ارسال کریں ▲

بانی :- حافظ محمد عبدالرحمٰن بسمل سہسرامی ❀ بیادگار :- زین العابدین احمر و ادریس سہسرامی

سہیل گیا

ماہنامہ

فہرست

نمود ۴
فرقہ وارانہ فسادات ، اصغر علی انجینئر ۵
مجاز ایک تاثر ، ڈاکٹر سید حامد حسین ۱۴
عجب با عزیز مرحلہ تھا ، ساجدہ زیدی ۲۰
سحر ہونے تک ، رضا اشک ۲۱
تلاشیاں ، شردن کمار ورما ۲۱
غزلیں :- فضا ابن فیضی ، ڈاکٹر مغنی تبسم ۲۲
غزلیں :- احسان دربھنگوی ، جرار چھولسی ۲۳
غزلیں :- نوشا کریمی ، خالد عبادی ، فرحانہ شاہین ۲۴
غزلیں :- محمد علی تاج بھوپالی ۲۵
ندامت ، تبسم فاطمہ ۲۶
پیاس ، نسرین ترنم ۳۲
تبصرہ :- رؤف جاوید ۳۵
شہر خیال ۳۷

مجلس مشاورت

ڈاکٹر راما چرن رستوگی
ڈاکٹر قمر رئیس
اصغر علی انجینئر
قیصر عثمانی
شاہد احمد شعیب
ڈاکٹر محمد محسن
ڈاکٹر عظیم اللہ حالی
سید احمد قادری

چیف ایڈیٹر :- مسعود منظر
• ایڈیٹر :- جمیل منظر
معاونین :- شکیل احمد جمالی ، عبدالقیوم ابدالی
• کتابت :- سید عبدالاحد گیاوی •

شمارہ ۷ جلد ۱۵

بدل اشتراک ....
▲ فی شمارہ .... ۴/- روپے
▲ زر سالانہ .... ۴۰/- روپے
▲ لائف ممبری .... ۵۰۱/- روپے

• خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ :- •

ماہنامہ سہیل گیا
ریور سائیڈ روڈ ، گیا - ۸۲۳۰۰۱
فون نمبر ۲۱۵۷۳

نمود

ادب اور سمت

شعر و ادب مہذب انسانی معاشرہ کی ایک توانائی ہے اور ظاہر ہے کہ ہر توانائی کچھ خاص مقاصد کے حصول کا ذریعہ ہوتی ہے، اس لئے جو لوگ ادبی تخلیق کے غیر شعوری ہونے اور (اس) کے خود بخود اور بے مقصد ہونے کی بات کرتے ہیں وہ ایک طرف تو شعر و ادب کی اہمیت کے منکر ہیں اور دوسری طرف ہماری اجتماعی زندگی کو ایک توانائی سے محروم کرنے کے درپے ہیں۔

ہم اس امر کا اعادہ کریں تو غلط نہ ہوگا کہ جیوں جیوں ہمارے مسائل پیچیدہ ہوتے جائیں گے اور مسائل میں تہہ داری ہوتی جائے گی اسی قدر شعر و ادب کی افادیت بھی بڑھتی جائے گی ہم شاعری کو میجک لالٹین MAGIC LANTERN نہیں سمجھتے کہ یہ محض تاریکیوں اور ظلمتوں ہی میں روشنی دے سکے۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ سماج کی بالیدگی کے ساتھ ساتھ ادب و شعر سے زندگی کا علاقہ مضبوط ہوتا جاتا ہے۔

لیکن اس اعتراف سے مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ اس حقیقت کے عرفان کے ساتھ ہمارے اوپر کچھ مزید ذمہ داریاں عاید ہو جاتی ہیں۔ سب سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ اس توانائی سے مثبت کام لینے کے لئے ہمیں اس کی سمت کا تعین کرنے کی ضرورت ہے۔ ہم کیا لکھ رہے ہیں؟ کس کے لئے لکھ رہے ہیں؟ ہماری تحریروں سے معاشرہ پر کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں؟ —— یہ اور ایسے سوالات پر غور کئے بغیر ہماری تخلیقات کی معنویت نہیں بنتی ۔ شعر و ادب کی تخلیق بظاہر ایک اضطراری عمل دکھائی دیتی ہے مگر اپنی انتہا میں یہ شعوری ہے۔ اس لئے کہ ہم اپنے اردگرد اور دور دراز کے واقعات سے غیر معلوم اور غیر محسوس طور پر اثرات اخذ کرتے رہتے ہیں۔ اور یہی وقوعے ہماری جذباتی دنیا میں ابال پیدا کرتے ہیں۔ نتیجہ میں فنکار تخلیق کی صورت میں اپنا ردعمل پیش کرتا ہے۔

لہٰذا ہمیں تخلیقی مواد کے حصول کی مدت میں زندگی اور ادب کے رشتے پر غور کرنا ضروری ہے۔ اس لئے کہ اس سے ادب و شعر کی سمت متعین ہوتی ہے۔

(ادارہ)

اصغر علی انجینیئر

فرقہ وارانہ فسادات کا نظریہ — اس کے کچھ نازک اور غیر مرئی پہلو

فرقہ واریت ایک نہایت پیچیدہ مسئلہ ہے اور اس کے مرئی اور غیر مرئی، واضح اور غیر محسوس کئی پہلو ہیں کچھ پہلو نہ صرف واضح ہوتے ہیں بلکہ ان پر اکثر بحث ہوتی رہتی ہے لیکن دوسرے پہلو ایسے ہیں جو بڑے غیر محسوس ہیں۔ اور ہم شعوری طور پر اس کا احساس بھی نہیں کر پاتے۔ اول الذکر مذہبی، سماجی، سیاسی اور معاشی قسم کے ہوتے ہیں اور موخر الذکر کا تعلق ایسے رجحانات سے ہوتا ہے جن سے ہم شعوری طور پر واقف نہیں ہوتے اور کئی معنی میں ایسے غیر شعوری رجحانات فرقہ واریت کو ہوا دینے میں معاون ہوتے ہیں۔ ہم اس مضمون میں ایسے ہی رجحانات پر روشنی ڈالیں گے۔

اکثر سماجی رجحانات اپنی ابتدا اور ساخت کے لحاظ سے بڑے پیچیدہ ہوتے ہیں اور ان کا اظہار دوسرے مذاہب، فرقوں، تہذیب اور نسلوں کے لوگوں کی طرف تعصب اور STERREO TYPES کی شکل میں ہوتا ہے۔ یہ بھی یاد رکھنا ضروری ہے کہ یہ رجحانات اور رسمی تصورات صدیوں کے باہمی تعامل کے نتیجے میں وجود میں آتے ہیں اور ایک بار وجود میں آنے کے بعد ایک طویل عرصے تک باقی رہتے ہیں اور ہمارے دوسرے مذہبی گروہوں کی طرف رویوں کو غیر شعوری طور پر متاثر کرتے رہتے ہیں۔ یہی رجحانات کئی مختلف طریقوں سے ظاہر ہوتے رہتے ہیں۔ اور ان کے اظہار کی شناخت کو اتنی آسان نہیں ہوتی کیونکہ یہ رجحانات شعوری کم اور غیر شعوری زیادہ ہوتے ہیں۔ وہ لوگ بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہیں جو شعوری طور پر سیکولرزم کے حامی ہوتے ہیں۔ یہ فرقہ وارانہ یا ذات پات پر مبنی لطیف اور غیر محسوس رویے چاہے بلاواسطہ فرقہ وارانہ فسادات بھڑکانے کے ذمہ دار نہ ہوں لیکن یہ فرقہ وارانہ فضا بنانے میں ضرور معاون ہوتے ہیں۔ اس لئے ان پہلوؤں اور رجحانات پر روشنی ڈالنا فرقہ وارانہ فسادات کے نظریے کو سمجھنے کے لئے بہت ضروری ہو جاتا ہے۔ یہاں یہ بات بھی مدنظر رکھنا چاہئے کہ نفسیاتی اعتبار سے کسی

ت کو قبول کرنا یا نہ کرنے کا بھی بڑا دارومدار پہلے سے شدہ انہیں رویوں پر ہوتا ہے

ہمارا ہندوستانی سماج کئی مذہبوں، تہذیبوں اور لسانی گروہوں کا سماج ہے۔ کچھ لوگ تو اب بھی اس کی قومی وحدت کے قائل نہیں ہیں اور اسے کثیر الاقوام — (MULTI-NATIONAL) سماج قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ میں اس بات سے اتفاق نہیں کرتا۔ عام طور پر کثرت میں وحدت کی بات کہی جاتی ہے۔ (اس میں شک نہیں اس بات میں کچھ بنیادی سچائی ہے) لیکن ایک ایسے سماج میں جو سماجی اور معاشی تبدیلی کے عمل سے گذر رہا ہو، سماجی وحدت یوں بھی زد میں آجاتی ہے اور اگر اس کی ساخت میں کثیر الاقسام گروہ شامل ہوں تو چیلنج اور بھی شدید ہو جاتا ہے۔ آج ہمارے سماج میں ہر مذہبی گروہ، دوسرے مذہبی گروہ کی طرف چند طے شدہ رویے اور رجحانات رکھتا ہے یہاں خاص طور پر ان رویوں اور رجحانات کا جائزہ لینا ضروری ہے جس کا شکار اقلیتی گروہ اور خصوصاً مسلمان ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن ایک لمحے کے لئے بھی یہ سوچنا غلط ہوگا کہ مسلمان یا دوسرے اقلیتی گروہ اکثریت کی طرف ایسے رجحانات نہیں رکھتے۔ چونکہ پچھلے چند سالوں میں فرقہ وارانہ فسادات کے شکار اکثر مسلمان، عیسائی اور ہریجن رہے ہیں اس لئے ہم اس مضمون میں پہلے ان رجحانات اور رویوں کا ہی جائزہ لیں گے جو اکثریتی فرقے کے لوگ اقلیتی فرقوں اور خصوصاً مسلمانوں کی طرف رکھتے ہیں میں نے چونکہ جائے وقوع پر جاکر کئی فسادات کی تحقیقات کی ہیں اس لئے ان رویوں سے مجھے اکثر سابقہ پڑا ہے

مسلمانوں کی طرف ان غیر شعوری رویوں میں ایک عام رویہ یہ ہے کہ مسلمان ہمیشہ جارحانہ رجحان رکھتا ہے اور جارحیت کے ارتکاب میں پہل کرتا ہے اور اپنے ہم مذہبوں کی جانب اس کا جذبۂ اتحاد بڑا شدید ہوتا ہے اور جبکہ ہندو امن پسند، تشدد کا مخالف، قوت برداشت کا حامل اور اپنے ہم مذہبوں کی طرف قطعاً جذبۂ اتحاد نہیں رکھتا۔ یہ جتانا غیر ضروری ہے کہ نہ تو مسلمان ہمیشہ جارحیت کا حامل ہوتا ہے نہ ہندو ہمیشہ امن پسند اور قوت برداشت کا حامل۔ لیکن یہ رویہ بڑا عام ہے بلکہ ایسے لوگ جو اپنے آپ کو لبرل اور سیکولر قرار دیتے ہیں مسلمانوں کی طرف ایسے رویے کو اپنی تحریروں کے ذریعہ برابر پروان چڑھاتے رہتے ہیں۔ مثلاً گری لال جین، ٹائمز آف انڈیا کے مدیر اپنے ایک مضمون میں رقمطراز ہیں

مسلمانوں میں ہندوؤں کے مقابلے میں قومی جذبہ بڑا مضبوط ہے لیکن شاید سکھوں سے زیادہ مضبوط نہیں۔ دونوں (سکھ اور مسلمان) اقلیت میں ہیں اور اقلیتوں میں، خارجی جارحیت سے نمٹنے کے پیش نظر داخلی ہم آہنگی، اگر اس کا ان کے جذباتی ردعمل سے اندازہ لگایا جائے، زیادہ ہی پائی جاتی ہے"

لیکن یہ فیصلہ حقیقت سے زیادہ افسانے پر مبنی ہے۔ واقعات کی روشنی میں دیکھا جائے تو مسلمانوں کی طرف یہ رویہ صحیح ثابت نہیں ہوگا۔ مسلمان اور سکھ میں بھی اتنی ہی باہمی گروہ بندیاں اور تفرقہ آرائی ہے جتنی کے ہندوؤں میں ہو سکتی ہے۔ یہ تفرقے نہ صرف طبقاتی ہوتے ہیں بلکہ لسانی اور تہذیبی اور نسلی بھی۔ اس کے ثبوت میں کافی تجربی حقائق موجود ہیں۔

ہندوؤں نے عام طور پر یہ بھی مان لیا ہے۔ خاص طور سے ہندو دانشوروں نے۔ کہ مذہبی اعتبار سے ہندو مذہب میں زیادہ برداشت اور دوسرے مذاہب کے طور طریقوں کو جذب کرنے کی قوت پائی جاتی ہے جبکہ مسلمان یا تو راسخ الاعتقاد ہوتا ہے یا جنونی اور مذہب اسلام میں جذب

ہونے کی قطعاً قوت نہیں ہے۔ نفسیاتی اعتبار سے قوت برداشت یا شدید عصبیت کوئی آخری اور قطعی چیز نہیں ہیں اس کا بہت کچھ تعلق معروضی حالات اور فرد یا قوم کی سماجی سیچویشن پر ہوتا ہے۔ جب قومیں ترقی کی راہ پر گامزن ہوں اور خوشحال ہوں تو اس میں مذہبی اور قومی عصبیت کا جذبہ قدرے کمزور ہوتا ہے۔ حالات ناسازگار ہوں اور خارجی جارحیت کا سامنا ہو تو تحفظ اور عصبیت کا جذبہ زیادہ شدید ہو جاتا ہے۔ اسلام عباسی دور میں، جب مسلمان ایک ترقی یافتہ قوم تھے اور خوشحالی کا دور دورہ تھا۔ دنیا کے تمام علوم کو جذب کر رہا تھا وہ چاہے ایرانی علوم وفنون ہو یا یونانی فلسفہ یا ہندی تفکر ان تمام اثرات کو اسلامی تھیولاجی نے اپنے اندر جذب کئے اور تمام ترقی یافتہ علوم کی حفاظت کی اور انہیں پروان چڑھایا۔ نہ صرف یہ بلکہ برصغیر ہند میں بھی اسلام نے مقامی اثرات قبول کئے۔ اور یہ مقامی اثرات آج بھی ہندی اسلام میں اہم حیثیت رکھتے ہیں۔ ماضی میں بھی صوفیائے کرام نے ان مقامی اثرات کو جذب کر کے اسلامی تبلیغ کو زیادہ سے زیادہ پر اثر بنانے کی کوشش کی مختلف علاقوں میں مقامی مذہبی اور تہذیبی محاوروں (IDIOMS) کے نمایاں اثرات کو صوفی لٹریچر میں نمایاں طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔

ہر نظام تفکر میں چاہے وہ اعتقادی (DOC-TRINAIRE) ہو یا نہ ہو، تشکیل اور روبہ زوال حالات میں لبرلزم پر راسخ الاعتقادی غالب آ ہی جاتی ہے۔ اس عمل سے ہندوازم مستثنیٰ ہے نہ اسلام نہ عیسائیت۔ دراصل اسی تناظر اور نفسیاتی کیفیات کی روشنی میں ہم صحیح معنی میں لبرلزم، وسیع النظری اور راسخ الاعتقادی کے رول کو سمجھ سکتے ہیں۔ بذات خود نہ شدت پسندی کے کچھ معنی ہیں نہ لبرلزم کے۔ افراد اور اقوام کے لئے یہ اضافی ذہنی کیفیات ہیں۔ اس کے لئے آج ہم ہندوازم اور سکھ مت کی مثالیں بھی دے سکتے ہیں۔ سکھ قوم میں آج ہم مذہبی جنونی کیفیت کے آثار محسوس کر رہے ہیں۔ حالانکہ یہ عام طور پر خوش باش اور خورد و نوش میں مشغول لوگ خیال کئے جاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ آج ان کے چند معاشی بنیادی مسائل کا تشفی بخش تصفیہ نہ ہونے کی وجہ سے اپنی خوشحالی کے لئے خطرہ محسوس کر رہے ہیں۔ دوسری طرف آر۔ ایس۔ ایس اور وشو ہندو پریشد کے ہندو لیڈر نچلے متوسط درجے کے ہندوؤں کو مسلمانوں کی "بڑھتی ہوئی تعداد" اور عرب پٹرو ڈالر سے خوفزدہ کر کے ان میں جنونی کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

ہندوؤں کی قوت برداشت یا ہندو مذہب کا لبرلزم کوئی ابدالآباد کے لئے طے شدہ امر نہیں ہے بلکہ حالات کے ساتھ بدلنے والی کیفیات کا مظہر ہے۔ ترقی پذیر سماج میں جب مختلف مذہبی گروہ یا ذات پات پر مبنی گروپ، معاشی اور سماجی ترقی کے عمل میں ایک دوسرے سے متصادم ہوتے ہیں تو لبرلزم اور راسخ الاعتقادی ایک اضافی شے بن کر رہ جاتی ہے نہ مطلق راسخ الاعتقادی کے کوئی معنی ہیں نہ مطلق لبرلزم کے۔ ہندوازم کو لبرل اور اسلام کو راسخ الاعتقادی مذہب قرار دیتے وقت ہمارے اکثر دانشور حالات کے ٹھوس سیاق و سباق کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ سماجی، معاشی ارتقا کے ثمر کی تقسیم جتنی غیر متوازی ہوگی بین اقوامی تصادم اتنا ہی شدید ہوگا۔

ار پھیل گیا

محروم گروہوں کی قومی یا تہذیبی اور لسانی عصبیت
ظاہرہ کبھی اتنی ہی شدت اختیار کرتا جائے گا۔

مندرجہ بالا وضاحت کے بعد یہ بات محض افسانوی
ہے کہ ایک مذہبی گروہ اپنی داخلی نظری ساخت
بنا پر قوت برداشت کا حامل قرار دیا جائے اور دوسرا
بیج فرقہ جنونی کیفیت کا حامل۔ کوئی نہیں جانتا کہ
ین مذہب میں عدم تشدد پر زور انتہا پسندی کی حد
ہے یہاں تک کہ غیر مرئی جراثیم کی حفاظت کا بھی
تمام کیا جاتا ہے۔ لیکن ہم آج دیکھتے ہیں کہ بہو بالی کے
مقام پر ایک طرف جینی مذہب کے دو فرقوں میں
یک دوسرے کے مندروں کی مورتیوں کو توڑنے
ک نوبت پہنچ چکی ہے۔ اور دوسری طرف جینیوں اور
راٹھوں کے درمیان آپسی جھڑپیں ہو رہی ہیں —
مندروں کو توڑنے کا الزام عصبیت کی بنا پر آج
ک مسلمانوں پر بھی عائد کیا جاتا رہا ہے لیکن آج یہی
ظر ہم مہاراشٹر میں بہو بالی کے مقام پر جینیوں اور
راٹھوں کے درمیان دیکھ رہے ہیں۔ دراصل مطلق
منی میں نہ مسلمان جارحیت پسند ہیں نہ ہندو۔ جارحیت
ور امن پسندی کے رجحانات پیدا کرنے میں معروضی
حالات کا بڑا دخل ہوتا ہے۔

تاریخ کی شہادت بھی اس سلسلے میں موجود ہے۔
ماضی میں بھی ہر حالات میں ہندو ہمیشہ لبرل اور امن پسند
نہیں رہے ہیں۔ گیفے اور سلوریا اپنی کتاب ۔ THE
LONG READ OF TIME ۔ (وقت کا طویل سفر)
میں لکھتے ہیں۔

" ہندو جنگجو سپاہیوں نے احمد نگر میں جو
شہد تباہی کی اس سے دور دور تک دکن سلطنت میں غصے

کی لہر پھیل گئی۔ مسجدوں کو مسمار کر کے اصطبلوں میں
تبدیل کر دیا گیا۔ دیہاتوں کو جلا کر خاک کر دیا گیا، امیروں
علاقے برباد کر دیے۔ عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کا بلا
امتیاز قتل عام کیا گیا۔" (بحوالہ این سی سکینہ "
سیکولرزم اور ہماری درسی کتابیں) یوپی کے اسکولوں
کی درسی کتابوں پر روشنی ڈالتے ہوئے سکینہ لکھتے ہیں:

" بدقسمتی سے ہندوستانی تاریخ نویسی کے پیچھے
فرقہ وارانہ نظریہ کام کرتا رہا ہے۔ اسکولوں میں تاریخی درسی
کتابوں کی صورت میں جو تاریخ پڑھائی جاتی ہے وہ تفرقہ
آرائی اور فرقہ وارانہ تعصب سے مغلوب ہے۔ ہیروؤں
کا انتخاب صرف ایک مذہبی گروہ سے کیا جاتا ہے۔ اور
یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ وہی مسلم حکمراں
اچھے تھے جو ہندوں سے نرمی کا برتاؤ کرتے تھے۔ میں
بات یوپی میں چھٹے، ساتویں اور آٹھویں درجے میں
پڑھائی جانے والی کتابوں کی بنیاد پر کہہ رہا ہوں جو
حکومت کی طرف سے منظور شدہ ہیں۔

نیم سچائی اور دیومالائی باتیں جو عمر کے نیم پختہ دور
میں بچوں کے ذہنوں میں پیوست کر دی جاتی ہیں ان
سے عمر بھر نجات حاصل کرنا مشکل ہو جاتا ہے اور انہی
باتوں سے دوسرے مذہبی گروہوں کی طرف ہمارے ذہنی
رجحانات بنتے ہیں اور ہماری لاشعور کی گہرائیوں میں
اس طرح پیوست ہو جاتے ہیں کہ ہمیں ان کا شعور
نہیں رہتا۔ فرقہ واریت سے شعوری نجات حاصل کرنے
کے بعد بھی یہ رجحانات ہمارے لاشعور میں رچے بسے رہتے
ہیں۔

ہ:ساک اوپر بتایا گیا ہے معروضی حالات کے سا
نہ صرف افراد کی بلکہ قوموں کی ذہنی کیفیت بدلتی ہے اور "

قوت برداشت اور عصبیت کا درجۂ حرارت بھی کم زیادہ ہوتا رہتا ہے۔ جب عالم اسلام میں پیٹرو ڈالر کی بہتات سے یک طرف خوشحالی آئی اور دوسری طرف اسلامی تاسیت نے زور پکڑا تو آر۔ ایس۔ ایس اور وشو ہندو پریشد نے چلے درمیانی طبقے کے ہندوؤں میں جذبۂ اتحاد پیدا کرنے ے لئے فضا سازگار پائی۔ میناکشی پورم میں تبدیلیٔ مذہب ے واقعے نے ہندوؤں میں اسی رجحان کو اور مضبوط بنایا۔ ن فرقہ پرست تنظیموں نے اسلام کے بڑھتے ہوئے رجحان ے خلاف جارحانہ پروپیگنڈا شروع کیا اور "ہندو یکتا" پر ور دینے کی کوشش کی۔ جب ہندوؤں نے ان بدلتے ہوئے حالات کے تحت خطرہ محسوس کیا یا کرایا گیا تو ان کی وت برداشت پر زبردست دباؤ پڑا۔ اور جگہ جگہ فسادات پھوٹ پڑے۔

آر۔ ایس۔ ایس اور وشو ہندو پریشد کی اس قدر بے امیابی کے پیچھے عام ہندوؤں کے وہ پرانے غیر محسوس اور لاشعوری رجحانات بھی کام کر رہے تھے جن کا ذکر اوپر یا گیا: "مسلمان جارحیت پسند ہوتا ہے۔ اسلام اپنے نے والوں میں جنونی کیفیت پیدا کرتا ہے۔ اسلام دوسرے مذاہب کے ساتھ پرامن باہمی بقا کا قائل نہیں بلکہ انہیں مٹانے پر آمادہ رہتا ہے۔" "مسلمان اپنی آبادی میں تیزی سے اضافہ کر رہا ہے۔" وغیرہ وغیرہ۔ ایکاتمتا یگیہ کے دوران اس قسم کا پروپیگنڈا کرتے ہوئے کئی پمفلٹ تقسیم کئے گئے تھے۔ ان پمفلٹوں میں ہندو مذہب کی روایتی لبرلزم اور قوت برداشت کا کہیں دور دور تک پتہ نہیں۔ مسلمان اس کے خلاف ہے۔ ایک پمفلٹ میں تو ایک ہندو جوڑا دکھاتے ہوئے لکھا گیا ہے "ہم دو اور ہمارے دو" اور ایک مسلمان کو دکھاتے ہوئے لکھا گیا۔ "ہم پانچ اور ہمارے پچیس"۔

سماجی علوم کے جدید ماہر بھی اکثر اقلیتوں پر لکھتے ہوئے ایسے ہی رجحانات اور غیر شعوری احساسات کا شکار ہو جاتے ہیں۔ بچپن سے اقلیتوں کے برتاؤ کا ان پر خاص قسم کا تاثر طاری ہو جاتا ہے اور یہی تاثر بالواسطہ یا بلاواسطہ ان کی تحریروں میں جھلکتا رہتا ہے۔ مثلاً سماجی علوم کے ماہروں کا ایک طبقے کا جن کی دانشورانہ سربراہی اے۔ بی۔ شاہ کرتے تھے، یہ خیال ہے کہ مسلمانوں کا برتاؤ بنیادی طور پر مذہبی تعلیمات سے طے ہوتا ہے۔ شاہ کا خیال تھا کہ سیاسی علیحدگی (POLITICAL SEPARATISM) اسلام کا جزو لاینفک ہے اور مسلمانوں کی شدید علیحدگی اسی کا نتیجہ ہے۔ شاہ اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں کہ: "اگر مسلم علیحدگی پسندگی اپنی پیداوار آپ ہے۔ (یعنی معروضی حالات نہیں بلکہ اسلامی تعلیمات کا نتیجہ ہے) تو ہمیں اس کی (مذہبی) جڑوں کا پتہ لگانا ہوگا۔"

یہ قطعاً سطحی بات ہے۔ علیحدگی پسندگی جس کا نتیجہ تقسیم وطن کی شکل میں ظاہر ہوا، مذہبی تعلیمات کا نہیں، معروضی، سیاسی، سماجی اور معاشی حالات کا نتیجہ تھا۔ اگر سیاسی اور سماجی مانگوں پر کانگریس اور مسلم لیگ میں سمجھوتہ ہو جاتا تو نہ علیحدگی پسندی کی تحریک مضبوط ہوتی نہ وطن تقسیم ہوتا۔ علیحدگی پسندگی کا تعلق مذہب سے محض علامتی طور پر ہے نہ کہ قلبی طور پر۔ اقلیتوں میں شکایتوں کا احساس جتنا بڑھے گا علیحدگی پسندگی کی شدت میں اتنا ہی اضافہ ہوگا۔ لیکن عام طور پر یہ احساس پایا جاتا ہے کہ مسلمان علیحدگی پسند اور وہ قومی دھارے سے بھی الگ تھلگ رہتا ہے۔ آج پنجاب میں جو کچھ ہو رہا ہے [illegible] اس سلسلے میں بڑا سبق آموز ہے۔

سکھ ہندو قوم کا ہمیشہ جزو لاینفک سمجھے گئے ہیں اور اسی لئے دستور کی دفعہ ۲۵ میں انہیں ہندو میں شمار کیا گیا ہے لیکن آج سکھ آئین کی دفعہ ۲۵ میں ترمیم کرنے کی مانگ کر رہے ہیں اور اپنی الگ شناخت پر زور دے رہے ہیں لونگوال جو انتہا پسند نہیں ہیں وہ بھی سکھ کو الگ قوم قرار دیے جانے پر مصر ہیں۔ پنجاب میں ان باتوں کو لے کر کچھ تشدد ہو رہا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے تقسیم وطن سے پہلے ہوا تھا۔ کیا اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا صحیح ہوگا کہ سکھ علیحدگی پسند قوم ہے۔ اور یہ کہ علیحدگی پسندگی سکھ مذہب کا اٹوٹ حصہ ہے؟ اب تک کسی ماہر سماجی علوم نے ایسی بات نہیں کی ہے۔ لیکن مسلمانوں سے متعلق یہ بات آج بھی بڑی آسانی سے کہہ دی جاتی ہے۔ اگر بفرض محال علیحدگی پسندی اسلامی تھیالوجی کا اٹوٹ حصہ ہے تو تجربی حقائق (EMPIRICAL FACTS) کی روشنی میں ہمیں یہ بھی ماننا پڑے گا کہ کسی فرد یا قوم کا برتاؤ محض تھیالوجی مکمل طور پر طے نہیں کرتی بلکہ معروضی حالات کا بھی اس میں بڑا رول ہوتا ہے۔ خود تھیالوجی ان حالات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ عباسی دور کی اسلامی تھیالوجی اس بات کا بین ثبوت ہے۔

یہاں ہمیں اس بات کو بھی سمجھنا ہوگا کہ جو رجحانات اور تاثرات تصادم کی حالت میں (IN CONFLICT SITUATION) پیدا ہوتے ہیں وہ عام حالات میں سچائی کے حامل نہیں ہوتے لیکن یہ رجحانات ہمارے جذباتی ساخت کا حصہ بن کر عام حالات میں بھی ہمارے برتاؤ کو متاثر کرتے رہتے ہیں یا ایک پر تصادم حالت سے دوسری پر تصادم حالت کی طرف منتقل ہو جاتے ہیں۔ مسلمانوں سے متعلق اکثریتی فرقے کی رجحانات کی بھی یہی تاریخ ر[illegible] ہے۔ جنگ آزادی کے دوران ہندو اور مسلم چنندہ طبقوں (ELITE CLASSES) میں جو ٹکراؤ ہوا اور اس تصاد[illegible] کے دوران جو رجحانات اور تاثرات ایک دوسرے [illegible] متعلق پیدا ہوئے آزادی کے بعد بھی مختلف تصاد[illegible] حالات (مثلاً فرقہ وارانہ فسادات یا خارجی سطح پر ہند پاک اختلافات کی شدت) کی اور خود بخود منتقل ہو[illegible] ہیں اور تصادم کی نوعیت کو زیادہ دیرپا اور سنگی[illegible] بنا دیتے ہیں۔ اسلامی تھیالوجی میں جہاد پر زور بھی ا[illegible] تصادم کا نتیجہ ہے۔ جو اس ابھرتے ہوئے مذہب کو طاق[illegible] مخالفوں کی طرف سے مکہ اور مدینہ میں درپیش تھا۔ ق[illegible] مجید کا بغور مطالعہ سے یہ بات صاف سمجھ میں آجاتی[illegible] کہ جہاد پر زور اسی تصادم کا نتیجہ تھا ورنہ اسلام اتنا[illegible] امن پسند مذہب ہے جتنا کوئی اور مذہب ہو سکتا[illegible]

اسی طرح دار الاسلام اور دار الحرب کا نظ[illegible] طور پر غلط سمجھا گیا ہے۔ اس سے عموماً سیاق و س[illegible] سے الگ کر کے دیکھا جاتا ہے۔ اور یہ نتیجہ اخذ کر لیا[illegible] ہے کہ جس ملک یا خطے میں اسلامی حکومت نہ ہو وہ[illegible] کے لئے دار الحرب کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ بات سرا[illegible] ہے۔ اس کا دارومدار بھی بڑی حد تک آس پاس کے[illegible] پر ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں کہیں بھی یہ نہیں کہا گیا ہے ک[illegible] سلامتی، امن اور مساوی حقوق کی صورت میں مسا[illegible] دوسروں کے ساتھ اقتدار میں برابر کا شریک نہ[illegible] ہو سکتا۔ شاہ عبد العزیز نے تو مراٹھا اقتدار کے ہندوستان کو دار الامن قرار دیا تھا۔ حالانکہ ا[illegible] پدر عزیز شاہ ولی اللہ رحمتہ اللہ علیہ نے مختلف[illegible] ہی مراٹھا اقتدار کے خلاف احمد شاہ ابدالی کو ہند[illegible]

پر حملہ آور ہونے کی دعوت دی تھی۔ پھر شاہ عبدالعزیز نے انگریز حکمرانوں کی طرف پہلے مخالفانہ رویہ اختیار کرتے ہوئے برطانوی حکومت کے تحت ہندوستان کو دارالحرب قرار دیا لیکن چند سالوں کے بعد اس موقف کو نہ بدلتے ہوئے بھی مسلمانوں کے لئے انگریزی حکومت کی نوکری کو جائز قرار دیا اور سید احمد شاہ اور اسمٰعیل شہید نے جہاد کا رُخ سکھوں کے خلاف موڑ کر ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف ہمدردانہ رویہ اختیار کیا۔ شاہ عبدالعزیز نے انگریزی تعلیم کو بھی جائز قرار دیا تھا۔ جبکہ ان کے وارثوں نے انگریزی اقتدار کے تحت ہندوستان کو پھر دارالحرب قرار دیتے ہوئے ان کے خلاف جہاد کو مسلمانوں کے لئے فرض قرار دیا۔ نصرت الاحرار کے فتوے اس کے گواہ ہیں۔

کہنے کا مطلب یہ ہے کہ دارالحرب اور دارالاسلام ہونے کا دارومدار حالات کے تقاضوں پر منحصر ہے۔ اور اس سلسلے میں خود علماء میں اختلاف پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ بات بالکل غلط ہے کہ جہاں اسلامی حکومت نہ ہو اسے مسلمان دارالحرب قرار دیدیں۔ یہ بات نہ صرف غلط بالکل مہمل بھی ہے۔ لیکن پھر بھی عام طور پر بدقسمتی سے مسلمانوں سے متعلق ایسا ہی سمجھا جاتا ہے۔

دوسرا رجحان جو مسلمانوں سے متعلق عام طور پر پایا جاتا ہے یہ ہے کہ وہ کثرت الازدواج کو لازمی اور خاندانی منصوبہ بندی کو حرام سمجھتا ہے اور کثرت سے اولاد پیدا کرتا ہے۔ یہ خیال مسلمانوں سے متعلق اتنا عام ہے کہ اس کی طبقاتی اور معاشی حیثیت کو بھی اس سلسلے میں نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ اوپر ہم اس پمفلٹ کی طرف اشارہ کر چکے ہیں جس میں مسلمانوں سے متعلق کہا گیا ہے کہ ہم پانچ ہمارے پچیس۔ اسلام میں بیشک کثرت ازدواج کی اجازت ہے اور مسلمان اس میں کسی قسم کی قانونی مداخلت کے بھی سخت خلاف ہے لیکن یہ قطعاً غلط ہے کہ عام طور پر مسلمان ایک سے زیادہ شادیاں کرتا ہے۔ اس میں اس کی طبقاتی اور معاشی حیثیت کو خاصہ دخل ہے۔ یوپی میں ایک سروے کے مطابق یہ نتیجہ اخذ کیا گیا کہ ہندوؤں میں پولی گیمی مسلمانوں کے مقابلے میں زیادہ رائج ہے اور مہاراشٹر میں ایک سروے کے ذریعہ جو اعداد و شمار سامنے آتے ہیں اس کے مطابق مسلمانوں میں کثرت ازدواج ۴.۵ فیصد ہے جبکہ جینیوں میں ۶.۵ فیصد دلتوں میں ۷ فیصد اور قبائلیوں میں ۸ فیصد سے زیادہ۔

مسلمانوں سے متعلق یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ فیملی پلاننگ کے مخالف ہیں اور اپنی تعداد تیزی سے بڑھانا چاہتے ہیں۔ مہاراشٹر میں ۱۹۸۲ء میں پتت پاون اور مراٹھا مہاسنگھ نے اس سلسلے میں بڑی مہم چلائی تھی اور عام ہندوؤں کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی تھی کہ ۲۰ سال کے اندر اندر اس ملک میں مسلمانوں کی اکثریت ہو جائے گی کیونکہ ایک طرف وہ کثرت ازدواج کے قائل ہیں اور دوسری طرف خاندانی منصوبہ بندی کے شدت سے مخالف۔ اس کے نتیجہ میں پونا، شولاپور، اور چندرپور میں فرقہ وارانہ فسادات ہوئے اور کچھ جانیں تلف ہوئیں۔ تعجب کی بات تو یہ ہے کہ ان باتوں پر تمام اعداد و شمار موجود ہونے کے باوجود اعتماد کیا جاتا ہے اور اس کی وجہ وہی رجحانات ہیں جن سے ہم اس مضمون میں بحث کرتے آرہے ہیں۔

فیملی پلاننگ کو قبول کرنے یا اس سے انکار کرنے کا تعلق عام طور پر طبقاتی اور سماجی حیثیت سے ہوتا ہے دوسرے طبقے کے مسلمان جو شہروں میں رہتے ہیں

...ہو سکتا

...مسلمانوں کے مقابلے میں جو قصباتی علاقوں میں رہتے ہیں
...خاندانی منصوبہ بندی یا ضبط تولید کو زیادہ آسانی
...سے قبول کرتے ہیں۔ دستکار، کاشتکار وغیرہ ضبط تولید
...آسانی سے قبول نہیں کرتے۔ وہ چاہے مسلمان ہوں یا
...غیر مسلمان کیوں کہ ایسے طبقوں کے لئے ضبط تولید معاشی
...اعتبار سے زیادہ سودمند ثابت نہیں ہوتی۔ تیسری دنیا
...یا، پہلی اور دوسری دنیاؤں کے مقابلے میں آبادی زیادہ
...تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ کیونکہ یہاں غربت اور پچھڑاپن زیادہ
...ہے۔ اقوام متحدہ کے اعداد وشمار بھی بتاتے ہیں کہ غربت اور
پچھڑاپن جتنا زیادہ ہوگا فیملی پلاننگ کی قبولیت اتنی
...ہی زیادہ کم ہوگی۔ اس کا تعلق مذہبی تعلیمات سے کم اور
...معاشی حالات سے زیادہ ہوتا ہے۔

اس سلسلے میں جو سروے کئے گئے ہیں ان سے بھی
یہ بات ثابت ہوتی ہے۔ کانپور کے مسلم علاقے میں کیا گیا
سروے اس بات کا ثبوت ہے۔ ایم۔ای۔ خان صاحب
نے یہ سروے کیا۔ اعداد وشمار کے ذریعے یہ ثابت کرتے ہیں
کہ مسلمانوں کے ان طبقوں میں جو موروثی دستکاری
طبقوں سے تعلق رکھتے ہیں خاندانی منصوبہ بندی ان طبقوں
کے مقابلے میں جو غیر موروثی ہیں (یعنی وکیل، انجینئر،
ڈاکٹر، منیجر وغیرہ) زیادہ مقبول ہے۔ موخرالذکر طبقے
زیادہ تعلیم یافتہ اور ذرائع رسل ورسائل کے ذریعے
خاندانی منصوبہ بندی کے مقاصد سے بہتر آگاہ ہوتا ہے۔
اور اس لئے ان میں اس کی مقبولیت زیادہ ہوتی ہے۔
جہاں تک موروثی دستکاروں کا سوال ہے بچے معاشی اعتبار
سے بوجھ بننے کے بجائے مزید آمدنی کا ذریعہ سمجھے جاتے ہیں
ہندوستان میں چونکہ زیادہ تر مسلمان ان طبقوں سے
تعلق رکھتے ہیں اس لئے ان میں خاندانی منصوبہ بندی اور...

کے مقابلے میں کچھ کم رائج ہے۔ یہ بھی عام طور پر مان لیا
جاتا ہے کہ مسلمان تبدیلی اور جدیدیت کو قبول کرنے
کے لئے آمادہ نہیں ہوتا۔ کیوں کہ یہ ان کے مذہب کے
خلاف ہے۔ یہ بھی قطعاً غلط تصور ہے۔ یہ خیال اس
وقت قبولیت حاصل کرتا ہے جب ایک فرقے کا اعلیٰ
سماجی حیثیت رکھنے والا طبقہ دوسرے فرقے کے کم سماجی
حیثیت رکھنے والے طبقے سے رابطے کی بنیاد پر کوئی رائے
قائم رکھ لے۔ چونکہ ہندوستانی مسلمانوں میں متوسط
طبقہ کی تعداد بہت کم ہے اور کمزور بھی، ہندو اکثریت
مسلمانوں سے متعلق رائے، نچلے سماجی طبقوں کے مشاہدے
کی بنیاد پر قائم کرکے اسے عمومی حیثیت دیدیتے ہیں۔ ...
نچلے سماجی طبقوں کے لئے تبدیلی اور جدیدیت کوئی ...
اہمیت نہیں رکھتی۔ اس لئے وہ ان باتوں کو زیادہ اہمیت
نہ دیتے ہوئے قدیم روایتوں پر قائم رہتے ہیں۔ اور اس
سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ مسلمان آسانی سے تبدیلی
قبول نہیں کرتا۔ متوسط طبقوں اور سرمایہ داروں
تبدیلی اور جدیدیت کی ضرورت عملی طور پر محسوس ہو
ہے۔ اور وہ اسے اسی ضرورت کے تحت اپنا لیتے ہیں۔ ...
ضرورت کے تحت مسلمان بھی تبدیلی اور جدیدیت کو اتنی
سرعت سے قبول کرتا ہے۔

یہ بھی صحیح نہیں ہے کہ مسلمان تمام سیاسی اور ...
معاملات میں مذہب کا دخل ضروری سمجھتا ہے۔ مسلمانوں
کی بڑی تعداد مذہب کو ذاتی معاملات تک محدود رکھتی
دیتی ہے۔ سنٹر فار اسٹڈی آف ڈیولپنگ سوسائٹیز
دہلی کی طرف سے کئے گئے ایک سروے کے اعداد وشمار
مطابق ۱۸ سے ۲۵ سال کی عمر کے ... فیصد مسلمان
۲۶ سے ۳۵ سال کی عمر کے ۶۵.۰ فیصد اور ۴۶...

ہ سال کی عمر کے ۰۶ ۵۸ فیصد مسلمان مذہب کو
ماذاتی معاملہ سمجھتے ہیں ۔ یہ اعداد و شمار بڑے اہم
، اور انہیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے ۔

فرقہ داریت کا مقابلہ کرنے کے لئے یہ بھی بہت ضروری
کہ مختلف فرقے ایک دوسرے کی طرف صحیح ، معروضی اور
ینٹفک رویہ قائم کریں ۔ بدقسمتی سے آج ایسا نہیں
۔ ہندو اکثریت میں مسلمانوں کی بڑی غلط تصویر پائی
تی ہے کہ وہ مذہبی جنون سے مغلوب ، ہر تبدیلی سے
ر کرنے والا ۔ مذہب اور سیاست کے اٹوٹ رشتوں
مائل ، خاندانی منصوبہ بندی کا منکر اور وطن کی طرف
شکوک وفاداری رکھنے والا ہوتا ہے ۔ یہ رویہ تجربی حقائق
ہیں بلکہ اوپر بتائی گئی وجوہات کی بنا پر پیدا شدہ غلط
نات اور تاثرات پر مبنی ہیں ۔ فرقہ واریت کی فضا
لڑنے میں فرقہ پرست طاقتوں کو ان رجحانات
بڑی مدد ملتی ہے ۔ اس لئے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ
غلط رجحانات کا جلد از جلد سدباب کرنے کی پوری
کوشش کی جائے ۔

ہم آئندہ ہندوؤں کی طرف سے مسلمانوں میں پائے
جانے والے رجحانات پر بھی روشنی ڈالیں گے ۔

بقیہ تبصرہ

منزل دیکھیے ۔

کرتے تھے بڑے دعوے وہی لوگ سفر میں
دو گام مرے ساتھ کبھی چل کر نہیں آئے

کچھ لیلیٰ کے خانۂ شش کھڑا سوچ رہا ہوں
کیا بات ہے سر پر مرے پتھر نہیں آتے

شب خوں نہ مار پائی سیہ رات میں جو فوج
وہ کیا لڑے گی دن میں اجالوں کے خوف سے

غم سے ہو جائے نہ واقف کہیں دنیا ساری
اپنے ہر غم کو تبسم میں چھپائے رکھئے

غزلوں کے علاوہ نظموں اور افسانوں میں بھی سیفی کی نگاہ
دنیا اور زندگی کی حقیقتوں پر تیز اور گہری دکھائی دیتی ہے
حقائق پر یہی گرفت سیفی کے روشن مستقبل کی ضامن ہے

(رؤف جاوید)



ڈاکٹر سید حامد حسین

مجاز۔ ایک تاثر

میں ہوں مجاز آج بھی زمزمہ سنج و نغمہ خواں
شاعرِ محفلِ وفا، مطربِ بزمِ دلبراں

آج بھی خار زارِ غم خلد بریں مرے لئے
آج بھی رہ گزرِ عشق میرے لئے ہے کہکشاں

آج بھی اشکِ خوں مرا قشقۂ جبینِ ناز کا
آج بھی خاکِ دل مری سرمۂ چشمِ گل رخاں

یہ البیلی مستی، یہ زمزمہ سنجی، اور نغمہ نوائی ہمارے عہد کے شعراء میں صرف ایک شاعر کے حصے میں آئی تھی اور وہ تھا اردو کا جوانمرگ شاعر اسرار الحق مجاز۔ مجاز جواں تخیل کے ساتھ زندہ رہا اور جواں آرزوؤں کے ساتھ مرا۔ اس کی شاعری اس کے جواں دل کی آواز ہے جو اس کے جواں خوابوں سے کیف و جمال کی دولت حاصل کرتی ہے۔

مجاز کی ۵ر دسمبر ۱۹۵۵ء کو موت ہوئی۔ چوالیس سال قبل اکتوبر ۱۹۱۱ء میں مجاز یوپی کے ایک شائستہ خاندان میں پیدا ہوا تھا۔ [illegible] میں پرورش ہوئی۔

ابتدائی تعلیم کے دوران ہی اپنی ذہانت کے [illegible] پہنچائے۔ علی گڑھ کی تعلیم کے دوران شاعری سے شغف ہوا اور پھر شاعری ہی وظیفۂ حیات بن گئی۔ [illegible] کی ذاتی زندگی میں محرومیوں کے سائے رفتہ رفتہ گہرے ہو گئے۔ یہاں تک کہ اس سے اس کی زندگی کا طور غیر متو[ازن] ہوا۔ ذہنی اور جذباتی زندگی کا توازن بگڑا اور بالآ[خر] نے بھی روح کا ساتھ چھوڑ دیا۔

مجاز کی شاعری کے عروج کا زمانہ ترقی پسند [illegible] کے عروج کا زمانہ تھا۔ مجاز کے سارے دوست [illegible] پسند تھے اور مجاز کی پہچان بھی ترقی پسند شاعر کی حیثیت سے قائم کرنے کی کوشش کی گئی۔ تحریک [illegible] کا جس طرح [illegible] ہوتا ہے اسی طرح زوال بھی ہوتا ہے اور [illegible] کوں کے والا بھی وقت کے ساتھ ساتھ زوال آشنا ہو[illegible] مجاز بھی تحریک کے ادیبوں کے ساتھ لپٹ کر وقت کے [illegible] میں بند ہو گیا اور ہم بھول گئے کہ مجاز نسیم سحری کا جھونکا تھا جس نے بہت سی کلیوں کو دعوتِ تبسم دی، چمنستانِ ادب کو نئی نکہت و رنگ سے آشنا کیا۔ مجاز کا شعری امتیاز حسن کی ادا شناسی

ہاسے عبادت ہے۔ اس جیسا مطرب بزم دلبراں پھر نہیں
ھا اور نہ اس جیسا مغنی کیفیت شناس اس کے بعد پیدا
ا۔

نہ ہم آہنگ مسیحا۔ نہ حریف جبرئیل
تیرا شاعر کہ ہے زندانی گیسوئے جمیل

کس طرف جائے، کہاں جائے بتا دو کوئی
زلف پرخم کا گرفتار، نگاہوں کا قتیل

اف یہ طوفانِ نشاط اور مری طبع حزیں
آہ یہ یورشِ ناز اور میں مجروح و علیل

کے کلام کی بے پناہ تاثیر اسی طوفان نشاط، رموز جذبات
نشریت تجلیات کی رہین منت ہے۔ مجاز کے تخیل میں
نی مجسمہ سازوں جیسی جمال آفرینی ہے۔ وہ حسن
یک ایک ادا کو صوت و صدا کے جادو سے نغمہ میں ڈھالنے
درت رکھتا ہے۔ "بتان حرم" کی تصویر کشی سے مجاز ہی
اکنہ تراش سکتا ہے۔

کیا کہوں میں رات کس محفل میں تھا گرم نوا
نغمہ و نکہت کا وہ طوفان، وہ ٹھنڈی ہوا

وہ حسیں پیشانیاں، آئینۂ تمکین ناز
وہ رسیلی مد بھری آنکھیں وہ مژگان دراز

وہ سبک چاندی سے پیکر، وہ جوانی کا نکھار
آذر فطرت کی صناعی کے زندہ شاہکار

رخ پہ شادابی، لبوں میں رس، تبسم برق پاش
چست پیراہن، نمایاں جسم سیمیں کی تراش

آہ وہ دوشیزہ لب، گلریز لب، گلنار لب
آہ وہ لب آشنا لب، شوخ لب، خونبار لب

وہ سمٹنے کی ادا، طوفان رعنائی کے ساتھ
ذوق خود بینی، مذاق بزم آرائی کے ساتھ

عارضوں پر اک گلابی پن سا، ماتھوں پر دمک
انکھڑیوں میں ایک سرور فتح مندی کی جھلک

مجاز کو ایک ایک لمحے سے فراخ کیفیات وصول کرنا آتا ہے وہ ریزہ ریزہ تجلیات سے اپنے نہاں خانۂ خیال کو سجانے کا فن جانتا ہے۔

آ ہی گیا وہ میرا نگارِ نظر نواز
ظلمت کدے میں شمع فروزاں کیے ہوئے
اک اک ادا میں سینکڑوں پہلوئے دلدہی
اک اک نظر میں پرسش پنہاں لیے ہوئے
ملتی ہوئی نگاہ میں، بجلی بھری ہوئی
کھلتے ہوئے لبوں میں گلستاں لیے ہوئے
یہ کون ہے مجاز سے سرگرم گفتگو
دونوں ہتھیلیوں پہ لیے ہوئے

مجاز کی شاعری کی اصل شناخت اس کی نغمگی اور آہنگ ہے۔ مجاز نے الفاظ کو بے کا لوچ ہی نہیں دیا۔ انھیں رقص کی تھاپ سے بھی روشناس کیا ہے۔ اس کے اشعار میں جھنکار اور حرکت دونوں کی کارفرمائی ہے۔ مجاز شعر کو جادو بنانے کے فن سے فطری مناسبت رکھتا ہے۔ اس کی شاعری جو دھنی جبر کی جیسی آہنگ کی پیداوار ہے۔ اس کی غزلیں غنائی فن کا ایک نادر روزگار نمونہ پیش کرتی ہیں۔

تسکینِ دلِ محزوں نہ ہوئی، وہ سعیِ کرم فرما بھی گئے
اس سعیِ کرم کو کیا کہئے، بہلا بھی گئے، تڑپا بھی گئے
ہم عرضِ وفا بھی کر نہ سکے، کچھ کہہ نہ سکے، کچھ سن نہ سکے
یاں ہم نے زباں ہی کھولی تھی، واں آنکھ جھکی، شرما بھی گئے
رودادِ غمِ الفت، ان سے ہم کیا کہتے، کیوں کر کہتے
اک حرف نہ نکلا ہونٹوں سے اور آنکھوں میں آنسو آبھی گئے
یہ رنگِ بہارِ عالم ہے کیوں فکر ہے تجھ کو اے ساقی
محفل تو تری سونی نہ ہوئی، کچھ اٹھ بھی گئے کچھ آبھی گئے

مجاز کی شاعری ایک سیلِ رواں ہے جو ایک سبک رفتار دریا کی طرح اپنے اندر ایک باطنی توانائی لئے ہوئے۔ ردیف اور قافیہ، ہیئتی تقاضوں اور عروضی پابندیوں کے اندر سے پیراستہ اس طرح پیدا کرتی ہے گویا یہی اس کی فطری راہ ہے۔ مجاز کی یہ فنکارانہ قدرت اس کی قادر الکلامی کی دلیل فراہم کرتی ہے۔ اس نے کئی طویل نظمیں مختلف قسم کے ہیئتی سانچوں میں تخلیق کی ہیں۔ لیکن اس کا زور طبیعت اس کے تخلیقی عمل پر آوارہ کا الزام آنے نہیں دیتا بارہ بندوں کی ایک نظم "اندھیری رات کا مسافر" کے یہ تین بند ملاحظہ ہوں۔

جوانی کی اندھیری رات ہے، ظلمت کا طوفاں ہے
مری راہوں سے نورِ ماہ و انجم تک گریزاں ہے
خدا سویا ہوا ہے، اہرمنِ محشر بداماں ہے
مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں

غم و حرماں کی یورش ہے، مصائب کی گھٹائیں ہیں
جنوں کی فتنہ خیزی، حسن کی خونیں ادائیں ہیں
بڑی پرزور آندھی ہے، بڑی کافر بلائیں ہیں
مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں

فضا میں موت کے تاریک سائے تھرتھراتے ہیں
ہوا کے سرد جھونکے قلب پر خنجر چلاتے ہیں
گزشتہ عشرتوں کے خواب آئینہ دکھاتے ہیں
مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا

مجاز اردو کے ان چند شاعروں میں سے ہیں جنھوں نظم کی ہیئت کو ایک مکمل وحدت کی شکل میں اپنا کلیم الدین احمد نے اردو کے بیشتر شعرا کو نظم میں بھی کے تحت تحت اشعار کی روایت سے متاثر ہونے کی بجا پر شکایت کی ہے۔ اردو کے چند ہی شاعروں نے نظ خیال کے تدریجی ارتقا کے لئے وسیلۂ اظہار بنا مجاز نے نظم کو ایک فطری اسلوب کے طور پر اپنایا ایک چھوٹی سی نظم "مہمان" ایک اچھی مثال ہے۔

آج کی رات اور باقی ہے
کل تو جانا ہی ہے سفر پہ مجھے
زندگی منتظر ہے منہ پھاڑے
زندگی، خاک و خوں میں لتھڑی
آنکھ میں شعلہ ہائے تند لئے
دو گھڑی خود کو شادماں کر لیں
آج کی رات اور باقی ہے
پھر کہاں یہ حسین سہانی ر
یہ فراغت، یہ کیف کے لمح
کچھ تو آسودگیِ ذوق نہ
کچھ تو تسکینِ شورشِ جذ
آج کی رات جاوداں کر لیں
آج کی رات اور آج کی رات

مجاز کا یہ شعر اکثر اس کی پہچان سمجھا جاتا ہے

دیکھ شمشیر ہے یہ، ساز ہے یہ، جام ہے یہ
تو جو شمشیر اٹھا لے تو بڑا کام ہے یہ

اور یہ خیال کیا جاتا ہے کہ مجاز کی شاعری کے اجزائے ترکیبی بھی شمشیر، ساز اور جام ہیں۔ مجاز کی شاعری رومان اور انقلاب کا ایک حسین امتزاج ہے۔ مجاز نے رومان کی وارفتگی کے وسیلے سے انقلاب سے جذباتی وابستگی پیدا کی ہے اور انقلاب کے تصور میں رومان کی مدد سے رنگ بھرا ہے۔

مجاز کی انقلابیت کو اسی بنا پر فیض نے عام شاعروں سے مختلف بتایا ہے۔ "عام انقلابی شاعر انقلاب کے متعلق گرجتے ہیں، للکارتے ہیں، سینہ کوٹتے ہیں، انقلاب کے متعلق گا نہیں سکتے ... مجاز انقلاب کا ڈھنڈورچی نہیں۔ انقلاب کا مطرب ہے۔ اس کے نغمہ میں برسات کے دن کی سی سکون بخش خنکی ہے اور بہار کی رات کی سی گرم جوشی تاثر آفرینی" مجاز کی نظم "مجھے جانا ہے اک دن" کا انقلابی آہنگ ملاحظہ ہو۔

مجھے جانا ہے اک دن تیری بزم ناز سے آخر
ابھی پھر درد ٹپکے گا مری آواز سے [illegible]
ابھی پھر آگ اٹھے گی شکستہ ساز سے آخر
مجھے جانا ہے اک دن تیری بزم ناز سے آخر

ابھی ہیں شہر کی تاریک گلیاں منتظر میری
ابھی ہے اک حسین تحریک طوفاں منتظر میری
ابھی شاید ہے اک زنجیر زنداں منتظر میری
مجھے جانا ہے اک دن تیری بزم ناز سے آخر

ابھی ہر دشمن نظم کہن کے گیت گانا ہے
ابھی ہر لشکر ظلمت شکن کے گیت گانا ہے
ابھی خود سر فروشان وطن کے گیت گانا ہے
مجھے جانا ہے اک دن تیری بزم ناز سے آخر

اپنے تخیل کے موسوی عصا سے مجاز نے فکر کی کئی چٹانوں سے چشمے نکالے ہیں۔ مجاز کی نمائندہ نظموں میں سے ایک "خواب سحر" ہے۔

مہر صدیوں سے چمکتا رہا افلاک پہ
رات ہی طاری رہی انسان کے ادراک پر
اک نہ اک مذہب کی سعی خام بھی ہوتی رہی
اہل دل پر بارش الہام بھی ہوتی رہی
ابن مریم بھی اٹھے، موسیٰ عمراں بھی اٹھے
رام و گوتم بھی اٹھے، فرعون و ہاماں بھی اٹھے
اہل سیف اٹھتے رہے، اہل کتاب آتے رہے
این جناب اٹھتے اور آنجناب آتے رہے
آدمی منت کش ارباب عرفاں ہی رہا
درد انسانی مگر محروم درماں ہی رہا

اسی انقلابی فکر کے سائے میں مجاز جب غزل تخلیق کرتا ہے تو اس میں ایک عجیب قلندرانہ کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ غم روزگار اور سوز دل کی آمیزش سے ایک نئی فضا کی ترکیب ہوتی ہے اور لگتا ہے کہ غزل کی روایتی چاردیواری میں ایک نئی کھڑکی کھل گئی ہو۔

کچھ تجھ کو خبر ہے ہم کیا کیا، اے شورش دوراں بھول گئے
وہ زلف پریشاں بھول گئے۔ وہ دیدۂ گریاں بھول گئے
اے شوق نظارہ کیا کہئے۔ نظروں میں کوئی صورت ہی نہیں
اے ذوق تصور کیا کیجئے۔ ہم صورت جاناں بھول گئے
اب گل سے نظر ملتی ہی نہیں، اب دل کی کلی کھلتی ہی نہیں
اے فصل بہاراں رخصت ہو، ہم لطف بہاراں بھول گئے
سب کا تو مداوا کر ڈالا۔ اپنا ہی مداوا کر نہ سکے
سب کے تو گریباں سی ڈالے اپنا ہی گریباں بھول گئے

مجاز لفظوں کا ایک صاحب نظر کاریگر ہے۔ لفظ اس کے لئے صرف معنی کا قالب نہیں وہ اس کے لئے ساز بھی ہیں، آواز بھی، رنگ بھی اور لہجہ بھی اور اس کا منتہائے

ا سہپن گیا

لیتی معنی کی سیدھ میں دوڑ لگانا نہیں بلکہ سازو آواز
تواز ن سے پیدا ہونے والے آہنگ کو اپنے اظہار کی دھڑکن
آتا ہے۔

مجاز کے اسلوب کی خصوصیت اس کی شائستگی اور
شگفتگی ہے۔ یہ شائستگی اس کی جمال پرستی کو رکاکت
ب اور رومان کو لذتیت میں بدلنے نہیں دیتی۔ اور اس
ی شگفتگی اس کے اظہار کو بہ ہیئت کی گھٹن سے آزادی
دلاتی ہے۔ مجاز کی ترشی ہوئی تراکیب اور طبعزاد تشبیہات و
تمثیلیں اس کے ترقی یافتہ جمالیاتی شعور کا مظہر ہیں اور
اس کے کلام کی دلآویزی کا راز دراصل اس کی خلاقانہ پیکر
سازی میں پنہاں ہے۔ مجاز کی لفظیات جدید اردو
شاعری کے توانا ترین اظہاری سرچشموں میں سے ہے۔

مجاز ان شاعروں میں سے ہے جو جیتے جی ایک
داستان بن جاتے ہیں۔ مجاز کی ذہانت، اس کی شوخی،
جنت طرازی، فکری شگفتگی، رنگین نوائی اور خوش بیانی
اور پھر اس کا لاابالی پن، سرمستی، اندر ہی اندر گھلنا، غموں
کا رمایوسیوں کا شکار رہنا، ان سب نے مجاز کو اپنے ہی عہد
میں ایک عجیب قسم کی مقناطیسی شخصیت کا مالک بنا رکھا تھا۔
آج ہم چاہے مجاز کی انقلابی شاعری کو بھول جائیں لیکن
اردو کے رومانی شاعروں کی محفل میں وہ ایک طرحدار ادا
شناس اور سحر کار پیکر تراش کی شکل میں ہمیشہ سب سے
الگ پہچانا جا سکے گا۔ مختصراً مجاز کی شاعری تہذیب فکرو
نظر اور نازک احساس جمال کے ربط سے وجود میں آنے والا
ایک بے مثل کا فرادا نقش ہے۔

جوابی کے لئے ڈاک ٹکٹ ضرور ارسال کریں
(ادارہ)

بقیہ: پیاس

اپنی اپنی جان بچانے کے لیے بھاگ رہے تھے۔ شیوا
بھی گھبرا گیا۔ اس نے ممی کو دیکھا جو روتی ہوئی کہہ رہ
تھیں۔ نیلو! ہائے میری بچی اندر رہ گئی۔ کوئی اسے
بچاؤ ــــ بچاؤ ــــ شیوان نے ایک پل کی دیر نہ کی۔ آگ
کے شعلوں میں کود پڑا۔ ممی کو سکتہ لگ گیا۔ شیوا
کے کاندھوں پر نیلو تھی۔ اس نے آہستہ سے نیلو کو لٹ
دیا۔ ممی پاگلوں کی طرح شیوان کے جلے ہوئے جسم کو
رہی تھیں ــــ رو رہی تھیں۔ نیلو بھائی کے کاندھے
سے لگ کر سسک رہی تھی۔ چھوٹا بھائی شیوا
کے قدموں میں جھک گیا۔ بھیا تم کتنے اچھے ہو بھیا
نے تمہیں نفرت کے سوا کچھ نہ دیا۔ اور تم قدم قدم
ہماری خوشیاں ہمیں سونپتے رہے۔ اب ہمیں تمہا
ضرورت ہے بھیا۔ لیکن شیوان یہ پیار کے منظ
زیادہ دیر تک نہ دیکھ سکا۔ وہ تیورا کر گر پڑا ہمیش
خاکی سے اس کی روح پرواز کر چکی تھی۔ اس کی
آنکھیں حیرت سے دنیا کو دیکھ رہی تھیں شاید
کہہ رہی ہوں۔

بقیہ: ندامت

روبی نے افروز کی جانب دیکھا
محسوس ہوا کہ ایک طویل مدت کے بعد اس کے پنکھ اسے واپ
گئے ہوں اور وہ تنگ نظری کی قید سے آزاد ہو کر ہوا کے د
پر فلک کی جانب پرواز کر رہی ہے۔
اور دوسرے دن عشو ہر کا ابارشن کر
ہوئے اس کے سوکھے ہونٹوں پر ایک فا
مسکراہٹ رقص کر رہی تھی۔

عجیب بلاخیز مرحلہ تھا

ساجدہ زیدی

عجیب سفر تھا
عجیب پراسرار مرحلہ تھا
عجیب ہنگامِ رہ نوردی
عجیب شوقِ جہاں نما تھا
نہ کوئی صوتِ درا صدائے رحیل تھی
اور —— نہ کوئی منزل نہ کارواں تھا

عجیب خونے سفر تھی
جو —— زادِ راہ تھی
ہم سفر تھی
رہبر تھی
راہبر تھی

نہ دل میں اندیشۂ مراحل
نہ خوفِ جادہ
نہ انتظارِ سوادِ منزل
ہراس طوفان و باد و باراں
نہ پائے رہ آفریں میں لغزش
نہ راہ گم کردگی کا صدمہ . . . .
بس ایک بے باک حوصلہ تھا
جو ساری ہستی پہ چھا گیا تھا

کہ جانِ محشر بدست تھی
پیچ و خم رہِ پرخطر کے عقدہ کشا تھے
. . . . . . دل فارغِ خطر تھا

کہ دور تک
سرحدِ افق تک
سمندر و سبزہ زار وادی و کوہ و صحرا و دشت و دریا تھے
اور میں تھی
مسافرت تھی
سفر بنائے سفر تھا
اک پیاس کا سمندر تھا
جو رگِ جاں میں موجزن تھا

وہ عرصۂ معتبر تھا
یا عہدِ مختصر تھا
وہ جو بھی تھا
اک عجیب سفر تھا
عجیب بلاخیز مرحلہ تھا

سحر ہونے تک

رضا اشک

اس سے پہلے کہ خاک ہو جاؤں
حصۂ ارض پاک ہو جاؤں
قبر مالک پہ بن نویدہ کا
نوحۂ درد ناک ہو جاؤں
زندگی میں ہلاک ہو جاؤں
بھڑکوں ظلمت میں یوں شرر بنکر
منظر تابناک ہو جاؤں
اس سے پہلے کہ خاک ہو جاؤں
دیمکوں کی خوراک ہو جاؤں
بن کے مقتول میں فریدوں سا
یاد ظلم ضحاک ہو جاؤں
درشنی چار واک اپنا کر
عظمت بانزاک ہو جاؤں
اس سے پہلے کہ خاک ہو جاؤں
جنگ سے میں وناش ہو جاؤں
جسم یہ قاش قاش ہو جائے
ٹوٹ کر پاش پاش ہو جاؤں
بنا اک اتہاس ہو جاؤں
کہ نئے یگ کا میں کتھا لکھ کر
المیکی، بیاس ہو جاؤں

۱؎ معروف عربی شاعر جس نے اپنے بھائی مالک کا
دردناک قصیدہ لکھا ہے۔

ثلاثیاں

شرون کمار ورما

اب نہ موسیٰ ہیں نہ جلوہ طور پر
چند اینٹوں، چند کھمبوں کے لئے
ہو رہا ہے روز بلوہ طور پر

مسئلہ ہو جائے گا اس بار حل
ملک میں امن و اماں کے واسطے
ہر منسٹر جا رہا ہے ٹور پر

گر گیا تو کیا قیامت ہو گئی
گھر پرانا تھا چلو اچھا ہوا
دو دعا مالک کو خطرہ ٹل گیا

دور سناٹے میں گونجی ایک چیخ
جھاڑیوں میں اک دوپٹہ رہ گیا
پھر منڈیروں کو کہانی مل گئی

کیوں کسی دستک پہ در کھلتے نہیں
دن ڈھلے کیوں بند ہو جاتے ہیں لوگ
خون سے لکھا ہے ہر دیوار پر

فضا ابن فیضی

دہلیز و در، خاک اُڑ رہی ہے
اندر باہر، خاک اُڑ رہی ہے
آنکھوں میں ہے گرد کن خوابوں کی
منظر منظر، خاک اُڑ رہی ہے
برسات، اور شہر کا یہ موسم
دروازے پہ خاک اڑ رہی ہے
آندھی تو گزر چکی ہے لیکن
اب تک گھر گھر خاک اڑ رہی ہے
ہے یہ نواحِ دجلہ یا دشت
خیمہ، لشکر، خاک اڑ رہی ہے
ڈیوڑھی پر ہے جشنِ رنگ برپا
گھر کے اندر، خاک اڑ رہی ہے
نیچے نیچے، سلگ رہے ہیں دوزخ
اوپر اوپر، خاک اڑ رہی ہے
دھندلا ہوا، شناخت نامہ سب کا
ہر چہرے پر، خاک اڑ رہی ہے

ڈاکٹر مغنی تبسم

میری آواز کو مٹی میں ملا دے
پھر کہیں دور سے تو مجھ کو صدا دے
یہ عجب کھیل ہے اک نقش بنا دے
اور اس نقش کو پھر خود ہی مٹا دے
اپنے ہونے کا یہ احساس برا ہے
کوئی اور کڑی مجھ کو سزا دے
ہے عجب وہم تجھے دیکھ رہا ہوں
میری آنکھوں سے یہ پردہ تو اٹھا دے
دے پتہ اپنا، مجھے اپنا پتہ دے
کھول دے بھید، پھر اک بھید مٹا دے

احسان دربھنگوی

سخن سنجو مری جادو بیانی دیکھتے جاؤ
فروزاں لفظ میں شمع معانی دیکھتے جاؤ

نقوشِ نقشِ اول، نقشِ ثانی دیکھتے جاؤ
مصور کے قلم کی گلفشانی دیکھتے جاؤ

وفا کوشی مری فطرت حفاظت ہی مرا ایماں
میں ہوں تہذیب ماضی کی نشانی دیکھتے جاؤ

یہ بیڑی ہے، یہ زنجیریں ہیں، یہ ہم ہیں اور یہ زنداں
ہے فصلِ گل کی کیا کیا مہربانی دیکھتے جاؤ

تم اپنی تیغ براں پہ نہ اتراؤ ذرا ٹھہرو
مری شمشیر کا بھی کھردرا پانی دیکھتے جاؤ

کہاں تم جا رہے ہو چھوڑ کر تاریخ صدیوں کی
ذرا مڑ کر بزرگوں کی نشانی دیکھتے جاؤ

سوائے اک عقیدت کے ہے اس میں فرق کیا آخر
یہ زمزم کا یہ گنگا کا ہے پانی دیکھتے جاؤ

کہیں تصویر دوراں ہے کہیں تصویر جاناں ہے
مرا یہ گھر ہے یا ارژنگ مانی دیکھتے جاؤ

توارد ہے نہ سرقہ ہے مرا یہ رنگ اپنا ہے
یہ سب ہے لکھا ہوا دیوانِ فانی دیکھتے جاؤ

مرصع ہے غزل احسان کی مطلع سے مقطع تک
ترنم دیکھتے جاؤ، روانی دیکھتے جاؤ

جرار چھولسی

اپنی روداد وفا اشک بہا لوں تو کہوں
دل سنبھالوں تو کہوں ہوش میں آ لوں تو کہوں

کس طرف رخ ہے قدم سوچ سمجھ کر رکھنا
آنکھ میں گردش دوراں سے ملا لوں تو کہوں

عزم و ہمت ہی سے ہر منزل دشوار ہے سر
اپنی کشتی کو تلاطم سے بچا لوں تو کہوں

پردۂ غیب میں پنہاں تو سحر ہوتا ہے
ان کے چہرے سے میں زلفوں کو ہٹا لوں تو کہوں

پیار کی راہوں سے بچ کے نکلتے کیوں ہو
دشمن جاں کو بھی سینے سے لگا لوں تو کہوں

گو نہ ٹوٹ سکے یہ زنجیر محبت کی صدا
پہلے ٹوٹی ہوئی کڑیوں کو ملا لوں تو کہوں

پگڑیاں جس میں اچھلتی نہیں بازاروں میں
آج دستار کہاں سر کو بچا لوں تو کہوں

دور الزام تراشی میں ہر اک دل کا عکس
اپنے دامن کو بھی شعلوں سے بچا لوں تو کہوں

کون ہوں، کیا ہوں، یہ تم آ کے بتا کیا معلوم
شاعری ہی کو میں اعزاز بنا لوں تو کہوں

نوشاد احمد کریمی

مشکل ترین راہ میں کوئی شجر تو ہو
اپنا بھی اس جہان میں چھوٹا سا گھر تو ہو

اک روز ٹوٹ جائے گی اس کی بھی جستجو
پہلے خود اپنے آپ کی مجھ کو خبر تو ہو

خوابوں میں گھنگھروں کی صدا ہے سبھی یہاں
تعبیر ساتھ آئے گی پہلے سحر تو ہو

ساحل کی تشنگی پہ سمندر کو وار دوں
یہ شرط پہلے خشک سمندر پہ تر تو ہو

الفاظ کے حصار میں آئے گا وہ مگر
پہلے ہماری بات کا اس پر اثر تو ہو

کھینچے دلوں میں لکیریں حیات کی
لیکن تمہارا ساتھ ذرا معتبر تو ہو

٭

خالد عبادی

سارا منظر دھند میں لپٹا لپٹا ہے
جس کے پاس ہیں آنکھیں وہ بھی اندھا ہے

طوفانی راتوں میں پاگل موسیقی
جیسے میرے اندر کوئی چیختا ہے

پانی کو بے رنگ نہ لکھا جائے گا
تن میں جب تک خون کا ایک قطرہ ہے

میری دنیا ہی تو میرا سب کچھ ہے
میرا سب کچھ ہی تو میری دنیا ہے

کون سا موسم ہونے کو ہے دشمن جاں
صرف مجھے معلوم ہے یا وہ جانتا ہے

امریکہ ہو روس کہ چین، ہندو پاک
ہم کو نہ ان سے خطرہ تھا اور خطرہ ہے

فرحانہ شاہین

گلشن عالم میں آئی دیکھیے کیسی بہار
گل پہ قرباں خار ہیں اور خار پر گل ہیں نثار

اے دل ناشاد کیوں مغموم ہے، ہو اب شاد ہو
اس نئے موسم میں پھر آباد ہو گا یہ دیار

ہو رہی ہے برق باری خرمن اخلاص پر
ایسے طوفاں میں سنبھلا ہے کون کس کا غمگسار

عصر حاضر تجھ سے پوچھا مری حالت نہیں
کیا بتاؤں تجھ سے کیوں رہتی ہیں آنکھیں اشکبار

اس جہاں کو اب نہ دے لے تیغ تقویٰ کا غرور
ہو چکی تیری حقیقت اس جہاں پر آشکار

اپنی یادوں کی سنہری چادریں مجھ سے نہ چھین
میں نے تو رکھے ہیں سجا کر سب ترے نقش و نگار

کہہ رہے ہیں لوگ شاہین کہ رنگ شاہین کا کلام
رنگ ہے استاد کا اس میں غزل ہے پائدار

٭

محمد علی تاج بھوپالی

کوئی اس زلف کا جاگا ہوا جادو دیکھے
میری آنکھیں جسے مل جائیں وہ خوشبو دیکھے

کبھی گھر کو، کبھی خود کو کبھی پہلو دیکھے
تیرے بن میں نے جو دیکھا ہے وہی تو دیکھے

ساغرِ دل میں سجے ہیں جو بہائے نہ گئے
کوئی سینے میں اتر جائے تو آنسو دیکھے

دہر میں ایک جگہ تیری شباہت نہ ملی
کہیں آنکھیں، کہیں ابرو، کہیں گیسو دیکھے

لیجئے یہ شہرِ حرم ہے شہرِ غزالاں، اس میں
تیر جو ہم پہ چلاتے ہیں وہ آہو دیکھے

ہر در سے باندھے ہوئے رشتہ کوئی گزرے
قاصد کوئی گزرے نہ مسیحا کوئی گزرے

وہ تشنگیٔ جاں ہے کہ صحرا کو ترس آئے
اب ہونٹوں کو چھوتا ہوا دریا کوئی گزرے

ان سے کبھی علاجِ غمِ پنہاں نہیں ہوگا
کہہ دیں یہ اگر ان کا شناسا کوئی گزرے

آئینہ ہر راہ گزر بن گئیں آنکھیں
اک عمر سے بیٹھے ہیں کہ تم سا کوئی گزرے

تبسم فاطمہ

ندامت

عالم نے آفس سے لوٹتے ہی روبی کو بتایا کہ آج اس کی ایک کلاس میٹ ملی تھی۔ جو کالج کے زمانے میں اس کے بہت قریب تھی۔ اور پھر عالم روبی کو اپنے کالج کے زمانے کے بڑے دلچسپ قصے سناتا رہا۔ اپنی کتنی ہی گرل فرینڈسوں کے بارے میں بتاتا رہا۔ اور عالم کی باتوں پر روبی ہنستے ہنستے دوہری ہوئی جا رہی تھی۔ اور پھر اسے بھی کتنے چہرے یاد آتے چلے گئے۔ افروز، عاصم، شاد، رینو جانے کتنے چہرے ذہن کے پردے پر اپنے خوبصورت لفظوں کی پٹاریاں لئے آ کھڑے ہوئے۔ کتنے خوبصورت تھے وہ دن بھی۔ کیسا مزہ آتا تھا۔ اس نے خوش ہو کر سوچا۔ میں اور رینو جو میری سب سے عزیز سہیلی تھی اور میری طرح فرینک بھی۔ ہم دونوں مل کر کتنا بیوقوف بنایا کرتے تھے ساری کلاس کو۔ اُف بے چارہ افروز۔ پڑھنے میں جتنا تیز اتنا ہی بیوقوف اس کا کمپٹیشن بھی وہی تھا جو ہم دونوں کا تھا۔ اور نتیجے میں سارے نوٹس بغیر محنت کے حاصل ہو جاتے۔ بس جب افروز کہتا "رینو تم بہت اچھی ہو" اور روبی تمہاری ذہانت کا تو جواب نہیں —— تو روبی دل ہی دل میں اس کی بے وقوفی پر ہنستی ہوئی لیکن بظاہر آنکھوں میں مصنوعی معصومیت سجائے کہتی۔ "افروز تم واقعی بہت اچھے ہو" اور افروز اس کے اس جملے پر بے انتہا خوش ہو جاتا۔ اور عاصم اسے تو روبی کے بولنے کا انداز پسند تھا۔ اور شاد جو روبی کی خودداری اور ذہانت سے بے حد متاثر تھا۔ کہتا۔ جانتی ہو روبی۔ اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ اس دور میں تم نے کسی کو معصومیت کے لبادے میں چھپتے ہوئے دیکھا ہے تو بخدا میں تمہارا نام لوں گا۔" اور روبی بے اختیار ہنس پڑتی "واہ کیا خوب کہا شاد تم نے۔ تم تو کسی شاعر کے خاندان سے لگتے ہو۔" یہ سچ ہے کہ روبی کے نزدیک ان کی باتیں حماقت کے سوا کچھ نہ تھیں۔ روبی ایک ترقی پسند لڑکی تھی۔ اسے اپنے شہر کے افلاس زدہ ذہن کے لوگوں سے سخت نفرت تھی اور وہ ہر پل اس بیمار سماج میں تبدیلی کی خواہش مند تھی۔ اس نے اپنے محلے کی دوسری لڑکیوں کی طرح اپنے اوپر جھوٹی شرم و حیا کا نقاب نہ ڈالا۔ بلکہ ان کو

ہوں میں ایک ہیچے شرم کا نقاب تھا۔ جو بے تکلفی کی ہوا سے
نہیں اڑتا۔ جنہیں بے تکلف کی شدید سے شدید آندھی
الٹ نہیں سکتی۔ بلکہ وہ اسے اور بھی جامد کر دیتی ہے اور
یں الٹنے کی کوشش کرنے والے ہاتھ خود ہی اس آندھی کی
ہو جاتے ہیں۔ اور یہی کچھ روبی کے ساتھ بھی تھا۔ روبی
قی پسند ذہن، دوسری لڑکیوں کی طرح خاموشی سے خود
روایات کی نذر کر دینا اپنی بزدلی سمجھتی تھی اور اس نے خود کو
یت کی نذر نہ کر کے پڑھائی کے علاوہ دوسری تمام ایکٹیویٹیز
لڑکوں کے ساتھ ساتھ حصہ لیا۔ اور ہر قدم پر اپنی ذہانت
سکہ جماتی رہی۔ اور بہت جلد اس نے دوستوں کا وسیع
ہ بنا لیا۔ جن میں لڑکیوں کے ساتھ کچھ لڑکے بھی شامل تھے
بغیر کسی الجھن ہی اور معذوریت کے یہ ہر کسی دنا کسی سے خوش
اخلاقی سے ملا کرتی۔ لیکن اس کی یہ خوش اخلاقی، اس کے
کی مفلس زدہ قوم کے نزدیک ایک گناہ بنتی گئی۔ اور کچھ
ہی از بان والے لوگوں نے اس کی بے تکلفی کو جانے کتنے نام
دیئے۔ حالانکہ اسے اس کی قطعی پرواہ نہیں تھی اور نہ ہی
ں کے گھر والوں کو۔ کیونکہ روبی کا ذہن مطمئن تھا کہ وہ
ط نہیں ہے اور جب اپنا آپ غلط نہ ہو تو جانے کیوں کچھ
ں غلط نہیں لگتا۔ وقت گذرتا رہا اور روبی ترقی کی راہ
مزن رہی۔ اور کبھی اس کی ماں جو ایک روایتی خاتون
، کہنے لگتیں "بیٹا تو اب پڑھائی چھوڑ کیوں نہیں دیتی۔
سا جانے کیا کیا کہتے رہتے ہیں"۔ تب روبی مسکرا کر کہتی کہ
ی اماں گئے ہیں۔ یہ دنیا اپنی سمجھ کی نہیں سمجھاتی۔ آپ
تی کیوں نہیں کہ جو لوگ میرے بارے میں جانے کیا کیا الٹی
سیدھی باتیں کہتے ہیں یہی لوگ ایک ایک کرکے میں
یا مسعود دکھ رہا جاتے ہیں۔ لیکن مجھے ان کی قطعی پرواہ
تھی۔ کیونکہ روبی کے بے نام چہرے جو مہر ثبت جاتے

کہاں دفن ہو جاتے ہیں۔ کون جانتا ہے انہیں! ان سے
الگ اپنی شناخت قائم کرنی ہے ننا۔ ہمیں بھی اپنا حق
پانا ہے۔ کیوں کہ۔۔۔۔۔"

"بس بابا! چپ ہو جا۔ میں تجھ سے بحث میں نہ جیتنے
والی۔ ننا ہار مان کر اسے پیار کرنے لگتیں۔

اور آخر وہ وقت بھی آیا جب روبی نے ایم۔بی
بی۔ ایس کرکے اپنی ایک شناخت قائم کرلی۔ اور اب وہ
ایک کامیاب لیڈی ڈاکٹر تھی۔ انہیں دنوں روبی کی
زندگی میں ڈاکٹر عالم ٹھنڈی مسیحی آنجو بن کر داخل ہو گئے
تھے۔ اور ہمیشہ کے لئے اسے اپنی باہوں میں قید کر لیا۔ عالم کو
پاکر روبی کی زندگی کی ساری خوشیوں کی جیسے تکمیل ہی ہو گئی
وہ سحر زدہ لمحے جن پر روبی کی آنکھیں وفور محبت سے بھیگ
جاتیں۔ جب عالم اس کے سانولے سلونے چہرے کو دونوں
ہتھیلیوں کے درمیان لے کر اپنے خوبصورت جذباتی ہونٹ
اس کے ہونٹوں پر پیوست کرتا ہوا کہتا۔ "روبی اگر خالق
کائنات نے مجھ سے پوچھا ہوتا کہ زندگی گذارنے کے لئے کیا
چاہتے ہو تم؟ تو میں جواب دیتا میرے اللہ! ایک تو یہ
حور زمیں میری روبی جسے تو نے میری کسی نیکی کے عوض مجھے
دیا ہے اور دوسرا میرا یہ کمرہ جسے میں "فردوس بر روئے زمیں
است" کہوں تو بیجا نہ ہوگا۔ کیونکہ میں اپنی حور زمیں کے
ساتھ اس کمرے میں زندگی کے خوبصورت لمحات گذارتا ہوں
اس کے بدلے میرے مالک تیری جنت نہ لوں گا میں۔" عالم کے
ہونٹ روبی کے چہرے پر دیوانہ وار رقص کر رہے ہوتے۔
اور وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتی۔ اور بس انہیں لمحے
اسے محسوس ہوا کہ کاش! یہ لمحے یہیں ٹھہر جاتے کبھی نہ
جانے کے لئے۔ لیکن وقت کو کس نے روکا ہے۔ اکثر دونوں
اسی طرح فرصت کے لمحے میں اپنے کالج کا زمانہ یاد کیا کرتے

اور پہلے اپنے دوستوں کے بارے میں بتاتے ۔ روبی تو خوب ہنس ہنس کر عالم کو افروز، عاصم وغیرہ کے قصے سنایا کرتی کہ یہ اور رینو کس طرح ان لوگوں کو بے وقوف بنایا کرتی تھیں ۔ اور عالم بھی اپنی گرل فرینڈس کے بارے میں بڑے دلچسپ قصے سناتا ۔ اسی طرح وقت گذرتا گیا۔ عالم اور روبی اپنی ازدواجی زندگی سے بے حد مطمئن تھے۔

اور آج جب آفس سے لوٹتے ہی عالم نے روبی کو اپنی کلاس میٹ شازیہ کے بارے میں بتایا تو روبی کو بھی انجانے میں سب یاد آتے چلے گئے ۔ اور رات گئے کتنی دیر تک یہ دونوں ماضی کے اوراق الٹتے رہے ۔ پھر ننھی ایرم کے رونے پر ان کی باتوں کا سلسلہ ٹوٹا تھا ۔ اپنی چھ ماہ کی بچی پر جھک گئے دونوں ۔ روبی کی گود میں آتے ہی ایرم سو گئی ۔ اور اپنی خوبصورت آنکھوں میں بے پناہ شرارت لئے عالم نے سرگوشی کے لہجے میں کہا۔

"روبی! ایرم تو سو گئی!!" اور عالم کا مطلب سمجھتے ہی روبی شرم سے دوہری ہو گئی ۔

وقت نام کا جہنم اپنے شعلوں میں سب کچھ بھسم کرتا رہا اور گذرتے وقت کے ساتھ ان دونوں میں کافی تبدیلی آگئی تھی ۔ دبلی پتلی شوخ سی روبی بھاری بھرکم جسم والی ایک سنجیدہ عورت میں تبدیل ہو گئی تھی ۔ بالوں میں چاندی کے تار صاف دکھائی دے رہے تھے ۔ اور روبی کی بات بات پر قہقہے لگانے والا عالم بھی ایک جوان لڑکی کا باپ دکھنے لگا تھا

ایک شام ڈاکٹر خورشید کے یہاں پارٹی پر جو عالم کے بہت قریبی دوست تھے عالم کے ہمراہ جیسے ہی ان کی کوٹھی میں داخل ہوئی اس کی نظر سامنے بیٹھے افروز پر پڑی ۔ افروز کے چہرے پر بھی بڑھتی عمر کا فرق صاف دکھائی دے رہا تھا

لیکن اس کے باوجود بھی روبی نے اسے فوراً پہچان لیا۔ افروز کو دیکھتے ہی اس سے جڑی کالج کی جانے یادیں سمٹ آئی تھیں ۔

پتہ نہیں لوگوں نے محسوس کیا ہو یا نہیں۔ لیکن میں نے محسوس کیا کہ جب یادیں مجھ پر حملہ آور ہوتی ہیں ۔ وہ یادیں ۔ جیسی ۔۔۔ جس شخص سے جڑی ۔۔۔ جہاں اور جس وقت کی ہوتی ہیں میں نے خود کو ہمیشہ ہی ان کا فر لمحوں میں محسوس کیا ہے ۔ ۔ ۔ حالانکہ وہ وقت اور حالات سب بدل چکے ہوتے ہیں ، اس شخص اور ہمارے درمیان ایک دیوار حائل ہو چکی ہوتی ہے ۔ لیکن یادوں کے درمیان کبھی کوئی دیوار حائل نہیں ہوتی ۔ وقت اور حالات کا کوئی تقاضہ نہیں ہوتا ۔۔۔ [illegible] ہوا ۔

اور یہی روبی کے ساتھ بھی ہوا ۔ افروز پر نظر پڑتے ہی روبی نے خود کو انہیں لمحوں میں محسوس کیا اور اس کے قدم خود بہ خود افروز کے جانب بڑھ گئے ۔

"آپ کا نام افروز ہے نا؟" اس نے افروز کے قریب پہنچتے ہی بڑی خوش دلی سے پوچھا تھا ۔

"ہاں ۔ لیکن آپ مجھے کیسے ۔ ۔ ۔" افروز کے لہجے میں حیرت تھی جو بھاری بھرکم جسم والی روبی کو پہچان نہ سکا ۔

"آپ پٹنہ کالج میں ۔"

"ہاں ہاں ۔ لیکن میں آپ کو پہچان نہیں پا رہا ہوں" اس نے روبی کی بات کاٹتے ہوئے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا ۔

"آپ روبی کو جانتے ہوں گے ؟" اور روبی نے محسوس کیا کہ اس کے اس سوال پر اس کے ماتھے پر جانے کتنی سلوٹیں پڑ گئی تھیں ۔ اور لہجے میں بے پناہ نفرت لئے وہ کہنے لگا ۔ اور روبی کو محسوس ہوا کہ جیسے کسی نے فلک کی بلندی سے زمین پر پھینک دیا ہو ۔

" روبی .... وہ تو کافی بدنام لڑکی تھی۔ پتہ نہیں میرے کتنے دوستوں سے اس کا ... " اور اچانک رک کر اس نے گہری نظروں سے روبی کی جانب دیکھا جیسے انجانے میں کہہ گئے جملوں کے تاثرات روبی کے چہرے پر ڈھونڈنے کی کوشش کر رہا ہو۔ اور روبی اس کے بیمار ذہن کو اپنی شناخت کا کوئی تلخ کیپسول دیئے بغیر ہی تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے آگے بڑھ گئی۔

اور پیچھے سے افروز اسے بار بار آواز دے رہا تھا۔

" بہن سنئے۔ آپ روبی کو کیسے جانتی ہیں؟" لیکن روبی نے اپنے قدم اور تیز کر دیئے۔

افروز سے روبی کے متعلق پوچھتے ہوئے اس کے ذہن میں کتنے خوبصورت خیالات تھے کہ روبی کا نام سنتے ہی افروز کتنا خوش ہو جائے گا۔ اس کی تعریف کے پل باندھنے لگے گا۔ مگر یہاں تو معاملہ ہی الٹ گیا۔ خوبصورت خیالات تعریف کے بدلے ماضی کے تھپیڑے بن کر اس کے ضمیر پر پڑے اور سارا وجود لہولہان کر گئے۔ افسوس تو اس بات کا زیادہ تھا کہ اپنے ذہن کو وسعت دینے والا افروز اتنی بیمار ذہنیت کا مالک ہو گا۔ اس نے کبھی خواب میں بھی نہ سوچا تھا۔ گھر لوٹتے ہی نہ جانے کس جذبے کے تحت وہ رو پڑی تھی۔ وہ خود بھی نہ جان سکی کہ یہ آنسو کیوں بے اختیار بہہ چلے تھے خود کو غلط سمجھے جانے کے احساس سے یا اپنی بدنامی کے خوف سے۔

گزرتے وقت کے ساتھ روبی اور عالم کچھ زیادہ ہی سنجیدہ ہو گئے تھے۔ ایرم بی۔ اے کر رہی تھی۔ ایرم کی عمر کچھ زیادہ نہ تھی لیکن روبی کو اس کی شادی کی فکر پریشان کرنے لگی۔ ہر ماں کی طرح وہ بھی جلد سے جلد اس فرض سے سبکدوش ہو جانا چاہتی تھی۔ اور آخر کافی دوڑ دھوپ کے بعد ایک معقول رشتہ مل گیا۔ لڑکا امریکہ میں انجینئر تھا خاندان بھی کافی اعلیٰ تھا۔ لڑکے اور لڑکی کی ماں نے ایرم کو کالج میں دیکھ لیا تھا۔ انہیں ایرم بہت پسند آئی تھی ساری بات جا کر عالم طے کر آئے تھے اور لڑکے کی ماں نے آ کر تاریخ بھی مقرر کر دی تھی۔ شادی کو کل دو ماہ رہ گئے تھے۔ روبی کو ساری تیاری تنہا ہی کرنی پڑی تھی۔

اور ایک رات جب ایرم کے لئے ساڑیوں کا پیکٹ لئے روبی گھر لوٹ رہی تھی۔ اس کا رکشہ بورنگ روڈ کی سنسان روڈ پر تیزی سے دوڑتا جا رہا تھا لیکن سامنے سے ایک ٹرک آتا دیکھ رکشے والے نے رفتار دھیمی کر دی اور رکشے کو سڑک کی ایک جانب موڑ لیا۔ ٹرک ابھی کچھ دوری پر تھا تبھی روبی نے دیکھا کہ ایک سایہ تیزی سے سڑک کے دوسرے کنارے سے آگے بڑھا اور بیچ سڑک پر آ کر جھک گیا۔ اندھیرے کی وجہ کر روبی یہ نہ دیکھ سکی کہ وہ بیٹھا ہے یا لیٹ گیا۔ لیکن اب روبی پورے طور پر سمجھ چکی تھی کہ اس کا ارادہ خودکشی کا ہے۔ وہ تیزی سے رکشے سے کود پڑی اور لگ بھگ دوڑتی ہوئی سایہ کے قریب پہنچی۔ اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی جانب کھینچ لیا۔ اگر روبی ایک پل بھی دیر کرتی تو اسے ٹرک کی پہیوں میں آنے سے بچا نہیں پاتی۔ روبی اندھیرے کی وجہ سے اس کی شکل تو نہ دیکھ سکی لیکن یہ سمجھ گئی تھی کہ یہ کوئی لڑکی ہے جو کسی وجہ سے خودکشی کرنا چاہتی ہے۔ اور وہ لڑکی بھرائی بھرائی آواز میں خود کو روبی کی گرفت سے آزاد کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

" نہیں... نہیں... مجھے چھوڑ دو، میں مرنا چاہتی ہوں"

وہ دبی دبی بھرائی آواز میں چیخ اٹھی۔

" تم نہیں جانتی ہو کہ خودکشی کتنا بڑا جرم ہے۔ میں تمہیں مرنے نہیں دوں گی۔ یہ کیا حماقت ہے" روبی کی کچھ بھی سمجھ میں نہ آئی

"میں سب جانتی ہوں۔ لیکن اب مجھے اس دنیا میں جینے کا کوئی حق نہیں اس کلنک کے ساتھ... میں اپنے والدین کی عزت کو مٹی میں نہیں ملا سکتی۔ نہیں... نہیں.... مجھے مرنے دو۔" وہ روبی کی بانہوں پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

"نہیں بیٹی ایسا نہیں کہتے" روبی نے پیار سے اسے سمجھایا۔ اور اس کے گھر کا پتہ پوچھ کر رکشے کی جانب اسے لے کر بڑھ گئی۔

"رکشے والے راجندر نگر چلو" رکشہ والا جو اب تک حیرت و تعجب سے یہ منظر دیکھ رہا تھا روبی کی آواز پر چونک کر ہینڈل تھام لیا۔

روبی بڑی مشکل سے لڑکی کو سمجھاتی ہوئی اسے گھر لانے میں کامیاب ہوئی تھی۔ لیکن دروازے پر پہنچ کر اندر سے آتی ہوئی تیز مردانہ آواز سنے لڑکی کے قدم خوف سے لرزنے لگے اور اس کے ساتھ روبی بھی وہیں ٹھٹھک گئی۔

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو توبیہ۔۔ صنوبر ماں بننے والی ہے اور وہ بھی اس معمولی سے کلرک امجد کے بچے کی ماں، یہ بات سن کر مجھ کو... نہیں.. نہیں... یہ کبھی نہیں ہو سکتا" مردانہ آواز غصے سے کانپ رہی تھی۔

"ابھی یہ سب سوچنے کا وقت نہیں ہے۔ پلیز کچھ کیجئے اور اسے جلد سے ڈھونڈ کر لائیے ورنہ ہم کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔ دو مہینے رہ گئے ہیں بیٹے کی شادی کو۔ ہم ان لوگوں کو کیا منہ دکھائیں گے" سسکتی ہوئی نسوانی آواز تھی

"اگر مرنے کے ارادے سے گئی ہے تو اچھا ہے مرنے دو اسے.... میں نے اسی دن کے لئے اسے ضرورت سے زیادہ آزادی نہیں دی۔ اس کے باہر آنے جانے پر ہمیشہ پابندی رکھی اسے دوسری لڑکیوں کی طرح فرینک نہیں ہونے دیا... اس نے میری اتنی سخت پابندی پر بھی..... مر جانے دو ایسی اولاد کو۔"

باہر کھڑی لڑکی خوف سے تھر تھر کانپ رہی تھی۔ روبی کی بھی ہمت نہ تھی کہ آگے بڑھے۔ اس نے دھیرے سے پردے کے کنارے سے اندر جھانکا۔ عورت کا چہرہ تو وہ نہ دیکھ سکی کیونکہ اس کی پیٹھ اس کے جانب تھی۔ لیکن مرد کے چہرے پر نظر پڑتے ہی اس کے اندر ایک شعلہ سا لپکا۔ اور وہ لڑکی کو لگ بھگ کھینچتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔

"روبی بہن" توبیہ حیرت سے اسے تکنے لگی۔ لیکن اس بات کا کوئی جواب دیئے بغیر روبی افروز کے پاس آکر ٹھہر گئی۔

"معاف کیجئے گا افروز صاحب... آپ کی اسی بے جا مداخلت نے اسے گناہوں کے دلدل میں ڈال دیا۔ اگر دوسری فرینک لڑکیوں کی طرح جو آپ کے نزدیک بدچلن ہیں، اگر آپ نے اسے بھی آزادی دی ہوتی تو شاید صنوبر بھی ان لڑکیوں کی طرح محض فرینک ہی ہوتی اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ کیونکہ فرینک لڑکیوں کے ذمہ خود ان کو اپنی ہی عزت کی ذمہ داری نہیں ہوتی بلکہ سارے خاندان کی عزت و وقار کی ذمہ داری ان کے ہاتھ ہوتی ہے۔ اور یہی ذمہ داری ان کے اندر ایک خود اعتمادی پیدا کر دیتی ہے.... لیکن...."

"روبی پلیز!" افروز بیچ میں چلا پڑا... لہجے میں بے پناہ ندامت تھی۔

"افروز میں سب کچھ کہہ کر اپنی کوئی صفائی دینا نہیں چاہتی، اور نہ ہی یہ چاہتی ہوں کہ تم مجھے سچا سمجھو

ہو۔ لیکن مجھے کہنے دو افروز کہ فرینک لڑکیاں اتنی بری نہیں ہوتیں جتنا غلط انہیں سمجھا جاتا ہے۔ کیونکہ مسٹر افروز جب آپ کسی سے پہلی بار ملتے ہیں یا کبھی کبھی ملتے ہیں تو اس شخص کے لئے تمہارے ذہن میں ایک جھجک ہوتی ہے۔ لیکن جب اس شخص سے تم بار بار ملنے لگتے ہو تو یہ تمام جھجک ختم ہو جاتی ہے۔ تمام فرق مٹ جاتے ہیں۔ وہ کوئی بہت اہم چیز نہیں لگتا یہی بات بالکل فرینک لڑکیوں کے ساتھ ہوتی ہے۔ جیسے تنگ ذہن کے لوگ گناہ بنا دیتے ہیں۔ آزاد خیال لڑکیوں کے ذہن میں تو گھر کی چہار دیواری میں بند لڑکیوں کی طرح جن کے ذہن میں مردوں کا ایک خاص تصور ہوتا ہے یا یوں کہلو کہ بیمار ذہنیت انہیں ایسا سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔ وہ خاص تصور ان کے یہاں نہیں ہوتا بلکہ مردوں کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلتے ہوئے ان کے اندر کی خود اعتمادی، مرد اور عورت کے فرق کو مٹا دیتی ہے۔۔۔ میں مانتی ہوں کہ مغربی ملکوں میں مٹتے ہوئے فرق کے ساتھ گندگی بھی شامل ہوتی ہے لیکن ہندوستانی عورتیں ہزار آزاد خیال ہونے کے باوجود بھی اپنی ہندوستانی تہذیب و تمدن کا دامن کبھی نہیں چھوڑتیں اور یہی وجہ ہے کہ انہیں اپنی اور اپنے خاندان کی عزت و وقار کی پاسداری انہیں خود اعتماد بنا دیتی ہے اور یہی خود اعتمادی ان کے قدم کبھی ڈگمگانے نہیں دیتی۔۔۔ لیکن۔۔۔"

"روبی پلیز، مجھے معاف کر دو۔ میں نے تمہیں سمجھنے میں غلطی کی تھی۔ مجھے اور شرمندہ مت کرو۔" افروز کے لہجے میں جہاں بھر کی شرمندگی سمٹ آئی۔

"روبی بہن! صنوبر آپ کو کہاں ملی؟" ثوبیہ لینی مسز افروز اب تک حیرت زدہ سی ان کی گفتگو سن رہی تھیں بول پڑی۔

اور روبی نے تمام حالات بتا دیئے۔ اور صنوبر کو اندر دوسرے کمرے میں بھیج کر ثوبیہ اور افروز سے اس کو اور کچھ نہ کہنے کی التجا کرنے لگی۔ دونوں شرم سے کٹے جا رہے تھے۔

"ایرم! کیسی ہے بہن؟" ثوبیہ نے روبی سے پوچھا تو افروز چونک پڑا۔ اس سے پہلے کہ روبی کوئی جواب دے افروز بول پڑا۔ "ایرم تمہاری کون ہے روبی؟"

"ایرم بدقسمتی سے اسی آزاد خیال یعنی بقول تمہارے بدچلن اور بدنام عورت کی بیٹی ہے اور تمہاری ہونے والی بہو تھی۔" روبی نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔

"تھی کا مطلب؟" ثوبیہ نے التجائی نظروں سے روبی کی جانب دیکھا۔

"کیونکہ یہ جاننے کے بعد کہ ایرم میری لڑکی ہے شاید افروز صاحب کو یہ رشتہ پسند نہ ہوگا۔۔۔ اور اگر میں ندیم سے نہ ملی ہوتی تو شاید مجھے بھی یہ رشتہ پسند نہ ہوتا کیونکہ میں ہرگز نہیں چاہتی کہ میری پھول سی بچی کسی تنگ نظری کا شکار ہو۔"

"روبی پلیز۔ مت کہو مجھے اور شرمندہ۔۔۔۔ مجھے میری تنگ نظری کی سزا مل چکی ہے۔ میں خود کو اسی دن بہت خوش نصیب سمجھوں گا جب تم جیسی عظیم ماں کی بیٹی اس گھر کی بہو بنے گی۔ روبی۔ اس رشتے سے انکار مت کرنا۔"

بار بار معافی مانگ کر مجھے شرمندہ مت کیجئے مسٹر افروز۔ مجھے خوشی ہے کہ آپ نے ندیم کے ذہن میں تنگ نظری کے جراثیم نہ ڈالے ورنہ جانے خود اس کے ساتھ کتنی کسی کے وجود پر زخم بن کر لگ گئے۔۔۔ مجھے فخر ہے کہ میرا ہونے والا داماد ایک وسیع خیالات کا مالک ہے۔"

"روبی!" افروز کے چہرے پر ایک اطمینان بخش مسکراہٹ ابھری اور اس کے ساتھ ہی اس کا سر ندامت سے جھکتا چلا گیا۔

باقی صفحہ ۔۔۔ پر

نسرین شبنم

پیاسے

سورج ڈھلتا جا رہا تھا۔ اس کی زرد شعاعیں شیوان کے جسم پر آزردگی اور مایوسی کے نشتر لگا رہی تھیں وہ سوچ رہا تھا آخر میری تقدیر میں تنہائی کا درد، آنسوؤں اور آہوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ کیوں ہے۔ کیوں نارسائی اور محرومی کے شعلے میری ہتھیلیوں کا مقدر ہیں۔ اس کی سوچوں کو اچانک جھٹکا لگا۔ شیوان بیٹے! تیرے ڈیڈی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ وہ ہسپتال میں موت و حیات کی کشمکش میں پڑے ہیں۔ تیری ممی آئی تھیں۔ تو انہیں جا کر دیکھ آ بیٹے!

ماما! میرے نڈھال وجود پر احساسات کی برچھیاں نہ چلاؤ۔ میرا کوئی ڈیڈی نہیں۔ میری کوئی ممی نہیں۔ تم اور بابا کے سوا میری سوچوں کے حصار میں کوئی نہیں۔ وہ اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گیا

اس وقت انہیں تمہاری ضرورت ہے بیٹے۔ شاید تمہاری قربت کا اعجاز انہیں زندگی کی مسیحائی بخش دے۔ جاؤ بیٹے۔ ماما کی آنکھوں میں پیار کی قندیلیں جل رہی تھی۔ وہ انسانیت کے معراج تھے۔ محبت کے مسیحا لمحوں کے پاس سسکنے لگے۔ وقت کا چراغ محروس فضاؤں تلے دم توڑنے لگا۔ سورج کی پگھلتی فضائیں اس کے تخیلات کی دیواروں پر دستک دینے لگیں۔ ذہن کے کینوس پر یادوں کے نقوش ابھرنے لگے۔

بمبئی شہر میں نیاز صاحب کا نام بچہ بچہ جانتا تھا ان کے کپڑے کی کئی ملیں تھیں۔ ان کا کاروبار پورے شہر میں پھیلا ہوا تھا۔ بنگلہ، کاریں۔ اچھا خاصا اسٹیٹس تھا ان کا۔ وہ بڑی ڈیشنگ پرسنالٹی کے مالک تھے۔ قدرت نے انہیں ہر خوشی سے نوازا تھا۔ بیوی بھی نہایت حسین ملی تھی۔ ان کی خوشیوں کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا جب ان کے دشت حیات میں ان کے پیار کا پہلا پھول کھلنے والا تھا۔ بیگم نرسنگ ہوم میں ایڈمٹ تھیں۔ کئی کئی ڈاکٹر لگے ہوئے تھے۔ بچہ ہوا۔ شاید قدرت ان کا امتحان لے رہی تھی۔ بچہ نہایت بدصورت تھا۔ نیاز صاحب نے دیکھتے ہی نفرت و حقارت سے ابل پڑے۔ وہ تیزی سے ڈاکٹر کی طرف بڑھے۔

ڈاکٹر... ڈاکٹر۔ بیگم کے ہوش آنے سے قبل بچہ کو کہیں ٹھکانے لگا دو۔ مجھے یہ بچہ نہیں چاہیے۔

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں نیاز صاحب؟" ڈاکٹر کی آنکھیں
ے پھٹی رہ گئیں۔
ڈاکٹر: تم میرے دوست ہو۔ یہ بچہ میری حسین بیوی
کلنک ہوگا۔ کل اس کو لے کر میری ناموس کی
لے گی دنیا۔ میں اس کا گلا گھونٹ دوں گا۔ ڈاکٹر
کی کرختگی دیکھ کر بولا۔ "ٹھیک ہے۔"
اور وہ بچہ اشوک کی کھولی میں پہنچ گیا۔ اولاد
میرا نے شیوان کو قدرت کا عطیہ سمجھ کر اپنی
یا چھپا لیا۔ معصوم بچہ بے خبر تھا۔ وہ کون ہے۔
ے آیا۔ کس گلشن کا آفریدہ ہے۔ غلاظتوں
بتوں کی ایک لمبی قطار میں اس کا بچپنا گزرا۔
اشوک کھیتوں میں کام کرنے والے مزدور تھے۔
بہ ہوتا۔ شیوان کے چھوٹے بھائی بہن عیش و
پل رہے ہیں اور ادھر تنگدستی اور کلفتیں اس
بن گئی ہیں۔ وہ بھی مجبور تھے۔ اس کے جنم
لوں نے ہی اس کے لئے سارے دروازے
ئے تھے۔ جیسے جیسے شیوان بڑا ہوتا گیا اشوک
مذہب کی طرف رغبت دلائی۔ اس کی شخصیت
لایا۔ اسے اتنا خود اعتماد بنادیا کہ وہ ابھرا ہوکر
سامنے ایک ستون بن سکے۔ دھیرے دھیرے
حقیقت ظاہر ہوگئی کہ اس جہد حیات میں وہ بھی
اں ہوں جس کی چھاؤں کہیں نہیں۔ میری زندگی راستے
ہے جس کی تقدیر میں بکھر جانا لکھا ہے۔ کبھی کبھی
اسے ایک اجنبی چہرہ جھکتا ہوا نظر آتا
دھندلکوں میں گم ہو جاتا۔ ماں جو کتنے کرب سے
سینے تخلیق کرتی ہے کیا اسے پچھلے سوچ
تلے گھس جانے کو چھوڑ دیتی ہے۔ تب اسے

ماما کی آغوش میں پناہ لینی پڑتی۔ آنسوؤں کے لاتعداد
بگولے اس کی آنکھوں کے ویران قبرستانوں میں چکرانے
لگتے۔ ماما اسے بھینچ کر خوب پیار کرتی۔ اس کی آنکھوں سے
درد کے پیمانے چھلک پڑتے۔ شیوان نے اپنی تنہائیوں
سے سمجھوتہ کرنے کے لئے آرٹ کا سہارا لیا۔ وہ ایک
فنکار تھا۔ اپنے اردگرد پھیلے ہوئے رستے تڑپتے زخموں کی
کہانی کو کاغذ پر بکھیر دیتا۔ شیوان کی تصویروں نے اسے
شہرت کی بلندیوں تک پہنچا دیا۔ ملک کے کونے کونے سے اس
کے پاس خطوط آتے۔ ستائش کے۔ محبت کے۔ وہ ان کے خلوص
کے ہجوم میں گھرا سرشار رہتا۔ ان ہی خطوط میں ایک گیت
کا بھی خط ہوا کرتا تھا۔ تعریف کے مرصع الفاظ سے
شروع ہوتا ہوا خطوط کا سلسلہ پیار تک آپہنچا۔
گیت نے اسے جیون ساتھی بنانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔
شیوان کبھی کبھی بالکل بجھ جاتا۔ وہ پگلی جو ساری
زندگی کا ساتھ مجھ سے چاہتی ہے شاید مجھے دیکھ کر اس
کی چاہت کے سب رنگ بادلوں کی طرح فضا میں منتشر
نہ ہو جائیں۔ اور اس کے سامنے صرف دھوئیں کی لکیریں
رہ جائیں۔ اس نے گیت کو لکھا۔ وہ کوئی بھی فیصلہ
مجھ سے ملنے کے بعد کرے۔ گیت مقررہ وقت پر اس سے
ملنے آن پہنچی۔ شیوان دھڑکتے دل سے اس کے سامنے
آیا۔ "میں شیوان ہوں گیت۔"
گیت ایک لحظہ چونک اٹھی۔ اسے لگا کسی نے
زوردار تھپڑ مار کر بیدار کر دیا ہو۔ وہ رک نہ سکی۔ اتنی
خوبصورت تصویروں کا خالق اتنا کریہہ اور بدصورت
ہوگا۔ نہیں — نہیں میں نے نہیں سوچا تھا۔ وہ ہذیانی
انداز میں بولتی ہوئی چلی گئی۔ شیوان کے وجود میں
اضطراب و انتشار کی آگ لگا کر۔ اسے ایسا محسوس

مہکتا آسمان کے سفید و شفاف جسم پر ایک اکیلا
تنہا ستارہ ٹمٹما رہا ہو ازل سے ۔ اس کے چہرہ پہ
جو کہ سیاہی پھیل گئی ۔ وقت کی گردشوں سے کون
بچ کر نکل سکا ہے ۔ برسوں کی طرح وقت کے پیرہن بھی
بدلتے رہے ۔ اس کے جنم دینے والوں نے اسے تنہائی
کا زہر پینے پر مجبور کیا ۔ خلوص کے صلہ میں بے اعتنائی
وفا کوشی کا درد ملا ۔ ستمگر حالات نے اسے اتنا مضطر
اور بے سکون کیا کہ وہ منجمد ہو کر سرد سا لاش بن گیا ۔
تنہائی کے اس لق و دق صحرا میں وہ تشنہ لب تشنہ کام جیتا
رہا ۔ اچانک ڈیڈی کے ایکسیڈنٹ کی خبر نے اس کے دل
میں ہلچل مچا دی ۔

" شیوان بیٹے ! تم کیا سوچنے لگے ؟ ایسا نہ ہو کہ
وقت بیت جائے اور تمہاری ہتھیلیاں پچھتاوے کی آگ
سے سدا جلتی رہیں ۔ دیر نہ کرو ۔ جاؤ بیٹے ۔ ماما کے ہاتھوں
کو بوسہ دیا اور تیزی سے کمرے سے نکل گیا ۔

اسپتال پہنچا تو ڈاکٹر نیاز صاحب کو بچانے کی
انتھک کوششوں میں لگے تھے ۔ ان کی سانس ڈوب
کر ابھر رہی تھی ۔ سب حیران و پریشان تھے ۔ انہیں
بلڈ کی ضرورت تھی ۔ شیوان نے اپنے اردگرد سے بے خبر
ہو کر اپنے ہاتھ ڈاکٹر کی جانب بڑھا دیئے ۔

" ڈاکٹر میرا گروپ دیکھیں اور جتنا بلڈ کی ضرورت
ہو آپ لے لیں ۔ بیٹے کا خون باپ کی رگوں میں پہنچا
تو ان کے چہرے پر زندگی کی حرارت رقص کرنے لگی ۔
آنکھیں کھلیں تو معجزہ دیکھا ۔ شیوان سر جھکائے
کمرے سے نکلنے لگا ۔

" شیوان بیٹے ! مجھے معا..... معاف کر دو ۔ آواز
ہونٹوں پر لرزنے لگی ۔ وہ سوچ رہے تھے ۔ آج میرا
بیٹا کتنا خوبصورت کتنا قدآور لگ رہا ہے ۔ ممی
نے آگے بڑھ کر اس کے بازوؤں کو تھام لیا ۔ میں تیرے
لئے سدا ترستی رہی چاند ۔ مجھے چھوڑ کر نہ جا ۔ ایک
لمحہ کو شیوان نے پلٹ کر دیکھا ۔ اس کی پتھرائی آنکھوں
میں اتنا درد تھا کہ ماں باپ کی آنکھیں جھک گئیں ۔
آپ نے مجھے جنم دیکر جو احسان کیا ہے میں اس کا قرض
چکا رہا ہوں ۔ لڑکھڑاتا ہوا بوجھل قدموں سے رات کی
تنہائیوں میں گم ہو گیا ۔

اشوک اور میرا اس کی راہ دیکھ رہے تھے ۔ شیوان
سر جھکائے اندر آیا تو بابا نے اسے تھام کر سینے سے لگا
لیا ۔ ماما نے بڑھ کر بلائیں لیں ۔

بیٹے دنیا کو تجھ میں کچھن دکھائی دیتا ہے مگر ساری
دنیا کی خوبصورتی مجھے تیرے چہرے پر نظر آتی ہے ۔ مجھے تجھ
پر فخر ہے میرے لعل ۔ شیوان بیٹے اس ماہ کی آخیر تک
تیرے بھائی بہن کی شادی ہے تو چلا جائے گا بیٹا ۔ ماما کا
غریب چہرہ ممتا کے نور سے چمک اٹھا ۔

ماما ، اپنے خوبصورت بھائی بہن کے قریب ہو نہ
تو نہیں لگوں گا ۔ وہ بڑی حسرت سے بولا ۔ لیکن اس کے اند
کی دنیا میں انتشار مچا ہوا تھا ۔ خون کا جذبہ غالب آگیا
شادی کے دن اس کے قدم خود بخود بنگلہ کی طرف بڑھنے
لگے ۔ خوشیاں اپنی بھرپور جولانیوں کے ساتھ پورے
بنگلہ پر محیط تھیں ۔ روشنیوں کے ہالے میں سجا مکان
خوبصورت لگ رہا تھا ۔ رنگ برنگے ڈریس پہنے بیرے
مہمانوں کو سرو کرنے میں لگے تھے ۔ سب کے چہرے سے
خوشیوں کے پیمانے چھلک رہے تھے ۔ شیوان الگ
سا ایک ستون کا سہارا لئے کھڑا تھا کہ اچانک بھگ
مچ گئی ۔ آگ آگ کے شور سے پوری فضا جھلس گئی ۔

(بقیہ صفحہ ۱۵۱ پر)

نئی کتابوں کا تعارف

تبصرہ کے لئے کتابوں کی دو جلدوں کا آنا لازمی

...اب :- ایک لمحہ ایک خواب
...ت :- سیفی سرونجی
... :- شعری مجموعہ
...ت :- ۹۶ ، قیمت :- ۲۵ روپے صرف
پتہ :- (۱) مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، دہلی، بمبئی، علی گڑھ
(۲) بھوپال بک ہاؤس
(۳) نسیم بک ڈپو، لکھنؤ
(۴) انتساب پبلی کیشنز، سیفی لائبریری، سرونج

مجھے ایسے لوگوں سے مل کر بے حد خوشی ہوتی ہے ...نے پاؤں کھول کر بغیر کسی کی انگلی پکڑے چلتے ...ر دوڑ لگاتے ہیں۔ ایسے ہی لوگ اپنے لئے نئی زمین کی تلاش کر لیتے ہیں۔

ان جواں ہمت لوگوں میں ایک نوجوان سیفی سرونجی ...ہیں نے سرونج کے ایک غریب کسان کے گھر میں آنکھ ...قدم قدم پر غربت سے دوچار ہوا۔ زندگی کو قریب ...ر دیکھا۔ ان نامساعد حالات میں بھی اردو میں ...ے کیا۔ اور اردو اخبارات و رسائل خرید کر پڑھنا ...نا تک پہنچا تا رہا۔ اور آج بھی اردو اور ادب ...کھنا اس کا محبوب مشغلہ ہے۔ یہ اس کی محنت ...ہی صلہ ہے کہ آج وہ بہ حیثیت اردو زبان کا مدرس سرکاری ملازم ہے۔ مسلسل جد و جہد پیہم کوشش اور زندگی کی راہوں میں آنے والے ہر طوفان سے ٹکراتے رہنا اس کا مقدر بن گیا ہے۔

سیفی کی زندگی کا ہو بہو عکس اس کی شاعری میں نمایاں ہے۔ یا یوں کہئے سیفی کی شاعری اس کی زندگی کا ترجمان ہے۔ پہلے مجموعہ کلام روشن الاؤ سے دوسرے مجموعہ کلام "ایک لمحہ ایک خواب تک" کہیں زندگی سے فرار دکھائی نہیں دیتا۔ ہاں اتنا ضرور ہے آپ بیتی کے ساتھ ساتھ جگ بیتی بھی شاعر کے مشاہدہ میں نظر آتی ہے۔ ظاہر ہے شاعر اپنے علاوہ اپنے اردگرد کی فضا اور ماحول سے کیونکر بچ سکتا ہے۔ سیفی کے یہاں بھی عصر حاضر کی تلخیاں محسوس ہوتی ہیں۔ جو اس کے سماجی شعور کی غماز ہیں۔ "روشن الاؤ" سے چند اشعار بلا کسی ترتیب کے یہاں ٹانک رہا ہوں

سیفی کا ساتھ دیں گے بھلا کس طرح لوگ
طوفان کا نام سن کے جو غمناک ہو گئے

محنت کسی کی رائیگاں جاتی نہیں کبھی
سیفی تمہارے سامنے زندہ مثال ہے

مجھ کو حیرت ہے کہ گھٹتا نہیں ہوتا تم کو
کس سے سیکھا ہے میاں تم نے تجارت کرنا

ہو گیا

سیفی ترے مکان کی دیوار دیکھ کر
سر پہ نہ آ پڑے کہیں، چلتے ہیں بچ کے لوگ

بدلے میں تو خلوص کے کوئی صلہ نہ مانگ
نیکی تو کر کے ڈال دے دریا میں نہ ڈال دے

تجھ کو اگر تلاش کسی دیوتا کی ہے
محلوں کے خواب چھوڑ دے کچے مکان دیکھ

بہت خراب ہے ماحول ان دنوں سیفی
جو گھر سے نکلو ہتھیلی پہ جان رکھ لینا

کوئی تو چہرہ شگفتہ ہمیں نظر آئے
اداس لوٹ کے ہم جب کبھی اپنے گھر جائیں

سیفی تجھے یہ شوق مشاعرے نہ اب کہیں
بیٹھا ہے کس لئے تو کتابیں چھپا کر

سیفی سرونجی کے یہاں نہ کوئی تحقیق اور نہ کوئی نئی تخلیق ہے۔ انہوں نے تو ایک بڑا سچ بولا ہے۔ زندگی کی حقیقتوں کو اپنے مخصوص انداز میں سپرد قلم کر دیا ہے۔ اور کر رہا ہے۔ اور یہ سچ ہی اس کا موضوع سخن ہے۔ اس کے یہاں ترسیل کا المیہ نہیں ہے۔ صاف ستھرے اشعار ہیں۔ اور زندگی کی سچی تصویر ہے۔

ؔ آکر مرے مکان کا نقشہ تو دیکھئے
یہ کرسیاں یہ میز شکستہ تو دیکھئے

کچھ تو ضرور بات تھی تیری گلی میں کل
پتھر لئے تھے سب، ترے سر پھرا تھا

کل چلے جائیں گے ہم دور کہیں بستی سے
ظلم اتنا نہ کرو دوستو بنجاروں پر

پہلے مجموعۂ کلام سے دوسرے مجموعۂ کلام "ایک لمحہ ایک خواب" تک طرزِ اظہار یکساں ہے۔ اور موضوع سخن بھی وہی ہے۔ ہاں اتنا ضرور ہوا ہے "روشن الاؤ" کی سی شدت نے نئے مجموعہ میں کم ہو گئی ہے۔ لیکن شعر کہنے کے تیور وہی ہیں۔

ؔ کون سمجھائے ذرا اس کے سوا کیا پائے گا
دل دکھا کر وہ ہمارا دیکھنا پچھتائے گا

مانا کہ امتحان میں ناکام ہو گئے
کل کی طرح سے پھر نئے سپنے سجائیں گے

کون کہتا ہے فرشتے نہیں اچھے لگتے
اپنے گھر میں کسے بچے نہیں اچھے لگتے

گوالیار کی کسی ادبی نشست میں جناب ندا فاضلی نے اپنی تقریر کے دوران ایک بات یہ کہی تھی۔
"ماں کے پیٹ سے قبر تک ایک راستہ ہے۔ ہر شخص اس راستے پر سفر کر رہا ہے۔ ہر مسافر پر منحصر ہے کہ وہ کس طرح یہ سفر طے کرے۔"
سیفی سرونجی نے اپنے سفر میں جس راستہ کا تعین اپنے لئے کیا ہے وہ ادب اور زبان کی خدمت ہے۔ جس کے لئے اس نے اپنے شب و روز وقف کر رکھے ہیں۔

ؔ مقصد ہے میرا چلنا چلوں گا تمام عمر
مانا کہ راستہ ہے نشیب و فراز کا

تازہ مجموعۂ کلام "ایک لمحہ ایک خواب" میں یہ ارتقائی

شہرِ خیال

"سہیل" کا تازہ شمارہ ملا۔ حسبِ معمول خوب ہے۔ آپ کو ابھی تخلیقات پابندی سے پیش کرنے کی سی پڑ گئی ہے۔ اور آپ نے ہماری عادت بھی خراب کر دی ہے بیٹھنے سے بقول رؤف خیر

اک یہی بات ترے پاس مجھے لاتی ہے
خوش مذاقی تری خوبی، مری کمزوری ہے

ڈاکٹر یعقوب یاور کا مضمون دراصل مرحوم محمد علی بالی کو خراجِ عقیدت ہے۔ لگتا ہے گلے باز عنوان مئے پارینہ رہا — لیکن کیا تاج جیسا پیارا شاعر مئے پارینہ ہو جائے گا — ہرگز نہیں — میرا دل انہیں۔ تاج کے شعر انہیں انشاء اللہ زندہ رکھیں گے۔

پچھلے حیدرآباد میں جو کل ہند قسم کا مشاعرہ ہوا کلکتہ کے ایک شاعر نے صفی اورنگ آبادی کی مشہور زمین میں کچھ شعر سنائے تھے۔ صفی کا مطلع تھا —

پروردگار — اتنی تو حسرت نکال دے
جو میرے دل میں ہے وہ تیرے دل میں ڈال دے

لے شاعر کے شعر ظاہر ہے اس بلند سطح کے نہ ہو سکے جب مائک سے ہٹا تو ثقلین حیدر نے اسی زمین میں بھوپالی کے اشعار سنا دیے

میں ہوں گدائے حسن مجھے یوں نہ ٹال دے
اک سکۂ نظر میرے کاسے میں ڈال دے
پیچھے بندھے ہیں ہاتھ مگر شرط ہے سفر
کس سے کہیں کہ پاؤں کے کانٹے نکال دے

تاج بھوپالی کو زندہ رکھنے کے لیے ان کے اشعار کافی ہیں جیسے

پھول کیا ہے شبنم کیا، شمع کیا ستارہ کیا
عکسِ حسن ہے تیرا اس میں استعارہ کیا

میں جس جگہ ہوں ساتھ مرے کائنات ہے
تیرے سوا کوئی بھی نہیں تو جہاں ہے آج

کتنے تاریک مراحل سے گزرنا ہوگا
صبح کو صبح سرِ راہ گزر ہونے تک
درد اس دور کا مقدر ہے لیکن اے دل
صرف اک معرکۂ محنت و زر ہونے تک

یہ مہر و ماہ تو اس انجمن کی زینت ہیں
ہم اپنے گھر کے لیے روشنی کہاں سے لائیں

سوچیں گے صبح دن یہ گزاریں گے کس طرح
فی الحال فکر ہے کہ کہاں رات کیجیے
جو بھی رستہ ہے تیرے گھر کا ہے وہ کس طرح تیری رہ گزر سے بچیں
اپنے بارے میں عمر کیا سوچیں
سوچنا ہے سبھی کے بارے میں

زمانے بھر کا غم اپنا لیا ہے
قیامت ہو گیا احساس ہونا

”وہ راتہ کس ادھ کا قسمت میں ہے شاید
آ ہے تجھے چھا کر ہی آنکھوں سے لگا لیں“
مرحوم آنسو آرہے ہیں اس لئے مزید کچھ نہیں لکھ سکتی۔ [illegible] مرحوم سے مجھے بڑی عقیدت تھی۔ وہ مجھے بھی بہت چاہتے تھے۔

● رؤف خیر (گولکنڈہ)

❀ قیصر عثمانی نمبر بے حد پسند آیا۔ ہر مضمون جاندار ہے اور قیصر صاحب کی شخصیت اور فن پر فنکارانہ مہارت سے احاطہ کیا گیا ہے۔ مبارکباد قبول فرمایئے
میں دو تین ہفتے کے بعد ہی اپنے سارے قرض اسی طرح ادا کر دوں گی کہ
”تا ہم کو شکایت کی بھی باقی نہ رہے جا“

● شگفتہ فرحت (بھوپال)

❀ برادرم۔ آداب و احترام
ماہنامہ سہیل پابندی سے مل رہا ہے۔ ہر شمارے کا ایک الگ معیار اور رنگ ہوتا ہے۔
سہیل کا تازہ شمارہ نمبر ۱۲ دستیاب ہوا۔ تمام تخلیقات معیاری ہیں۔ بخصوصی راز اعظمی صاحب کا مضمون ”جدید اردو طنز“ بہت معلوماتی ہے اور اعجاز طالب، اعجاز مانپوری، شفیع اللہ خاں راز، بہار الدین ریاض کی غزلیں قابل تعریف ہیں۔ آپ جس لگن کے ساتھ گیا کی خاموش فضا میں سہیل شائع کر رہے ہیں اس کے لئے میں آپ کو مبارکباد نہ دوں تو یہ بڑی زیادتی ہوگی۔ خلوص و آہنگ

● مدہوش بلگرامی
(ہردوئی)

❀ برادرم! سلام مسنون
آپ کا رسالہ برابر مل رہا ہے۔ قیصر عثمانی نمبر اچھا خاصا ہے۔ یہ بڑی اچھی بات ہے کہ وہ لوگ جو شہرت کی تمنا اور ستائش کے صلہ کی پرواہ کئے بغیر اپنے خون جگر سے ہمارے ادب کو مالا مال کر رہے ہیں ان پر آپ کی نگاہ انتخاب پڑتی ہے اور آپ ان پر مفید اور کارآمد معلومات مستقبل کے مورخ کے لئے فراہم کرتے ہیں۔ خدا آپ کو جزائے خیر دے۔

● ملک زادہ جاوید احمد (لکھنؤ)

❀ گذشتہ چند مہینوں سے آپ کا موقر جریدہ ”سہیل“ میرے مطالعہ میں ہے۔ اسے میں نے ہر اعتبار سے معیاری اور خوبصورت پایا۔ اس وقت شمارہ ۱۲ پیش نظر ہے جس میں ڈاکٹر یعقوب یاور اور راز اعظمی کے دونوں مقالے بے حد پسند آئے۔ غزلیں سبھی اچھی ہیں لیکن خاص طور سے علیم صبا نویدی کے یہ شعر دل کو چھو گئے۔

شاید کہیں سے بھیک ہی مل جائے نور کی
ہم جیسے کچھ فقیروں سے مل کر بھی دیکھنا
میں آئینہ ہوں ٹوٹ نہ پاؤں گا اے صبا
میرے بدن پہ مار کے پتھر کبھی دیکھنا

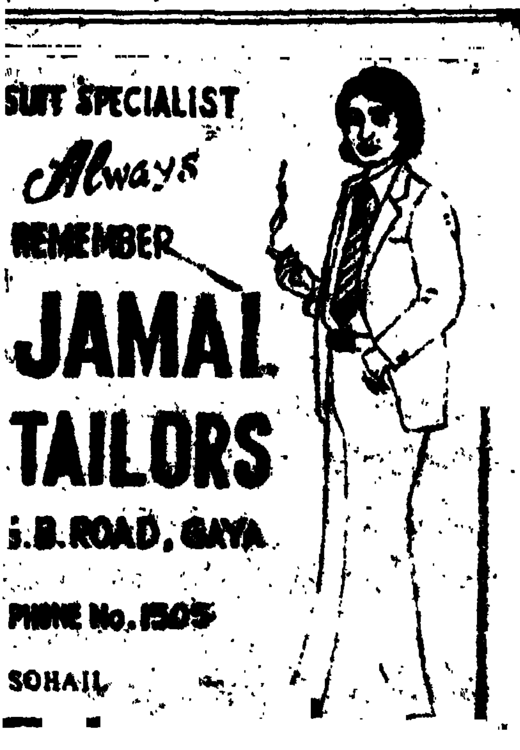
دوسری غزل میں البتہ کھنڈر کے ساتھ ظلمت کی اضافت کسی قدر گراں ثابت ہوئی۔ اگر موصوف زبان کی صحت کو فوقیت دیں تو بہتر ہوگا۔

● سعید رحمانی (کٹک)

❀ جمیل بھائی! سلام مسنون
سہیل کا تازہ شمارہ پڑھ چکا ہوں۔ جناب اصغر علی انجینیر کا تجزیہ حیات اللہ انصاری کا افسانہ ... بے حد پسند آیا۔

موصوف نے بہت ہی عمدہ اور اضافی تجزیہ کیا ہے۔
جدید اردو غزل بھی ایسی چیز ہے جو کم از کم میرے لئے فالکے کی چیز ہے۔ مشتاق احمد نوری کی شرد ھانجلی کے متعلق صرف اتنا کہوں گا کہ اسے پہلے بھی روزنامہ "سنگم" کے ادبی ایڈیشن میں ملاحظہ کر چکا ہوں۔ آپ کا کیا خیال ہے اس سلسلے میں؟ حیرت صاحب اندنوں سہیل میں پے در پے چھپ رہے ہیں۔ ویسے ان کی موجودہ غزل اچھی ہے۔ خدا سے دعا ہے کہ وہ اور بھی تیزی سے چھپیں۔
کہانیوں میں برت کی تاثیر گہرا اور دیرپا تاثر چھوڑتی ہے۔ اور یہی اثر انگیزی ایک کامیاب کہانی کی علامت اور دلیل ہے۔ ویسے ایوب جوہر کی کالی بلی بھی پسندیدہ کہانیوں میں شمار کی جا سکتی ہے۔ لیکن اس طرح کی عدد شماری آگے چل کر بھلا دی جاتی ہے یا پھر از خود فراموش ہو جاتی ہے۔
اس بار آپ کا "نمود" بھی اتنا اچھا لگا کہ مکرر پڑھا آئندہ ایسا لکھیں کہ تین بار پڑھ سکوں۔ آپ کے لکھنے کا انداز اچھوتا ہے۔ یا پھر آپ کی سوچ ——!
● محمد حامد (دربھنگہ)

❀ "عثمانی نمبر" کو ایک نشست میں پڑھ لیا۔
مبارکباد ہیں آپ اور آپ کا ادارہ جس نے عثمانی صاحب کی زندگی میں ان کو خراج عقیدت پیش کیا۔ عثمانی صاحب لائق مبارکباد ہیں کہ ان کو ان کی زندگی میں ان اپنی پہچان مل گئی۔ یہ تو خوش نصیبوں کو ہی ایسا الف ان کی زندگی میں ملتا ہے۔ بھائی یوسف ناظم کا انشائیہ بڑا رواں دواں ہی نہیں نہایت شگفتہ ہے۔ دیگر ان نے عثمانی صاحب کا خاکہ عمدگی سے پیش کیا۔ آپ نے تو کمال کر دکھایا کہ ایک ضخیم نمبر کی تیاری میں پوری طرح کامیاب ہیں۔ پتہ نہیں آپ نے کیا جادو کر دیا کہ اتنے سارے عمدہ مضامین مل گئے۔ ترتیب دیکر چھاپ دیا۔ اسے تو میں کہوں گا۔ غرض پھر ایکبار آپ کو "عثمانی نمبر" کی اشاعت پر دلی مبارکباد دیتا ہوں۔
● ادیب (بنگلور)





❀ برادرم دعائیں

آپ کا خط اور سہیل کے دو شمارے (۱ اور ۲) ملے۔ مگر قیصر عثمانی والا شمارہ آپ بھول گئے۔ ہو سکے تو ایک کاپی روانہ کیجئے

کتابت کے بارے میں ہمارا کہنا تو بے سود ہوگا۔ آپ خود ہی کوئی تدبیر نکالیئے۔

مسیحی مضمون "چپل" میں صفحہ ۱۹ پیراگراف ۲ میں اصطلاح کی جگہ اصطلاع غلط ہے۔ مغربی کے بجائے عربی اور صفحہ ۲۰ کالم ۱ سطر ۶ میں محل کے بجائے محل ہوگیا ہے۔

"چند یورپی خاندان ..... " میں "چند" خواہ مخواہ لکھ دیا ہے۔ صرف یورپی خاندان ...... ہی کافی تھا۔

زر سالانہ کی طرف سے آپ بے فکر رہیں۔ انگریزی تے میں سے "A-CHRIST" کی جگہ صرف CHRIST لکھوا دیجئے۔ A کاٹ دیجئے۔

● علی عباس ازل (بمبئی)

❀ مکرمی ایڈیٹر صاحب۔ آداب

آپ کے معروف رسالے سہیل کا "قیصر عثمانی نمبر" ملا۔

اس کڑے دور میں جب کہ اُردو کی جان پر بنی ہوئی ہے گیا جیسی دور افتادہ جگہ سے سہیل جیسے شاندار جریدے کو پہلے جیسی آب و تاب کے ساتھ زندہ رکھنا بڑے معرکے کا کام ہے جس کے لئے آپ اور آپ کا ادارہ دلی مبارکباد کا مستحق ہے!

قیصر عثمانی نمبر اپنی جگہ ایک منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ قیصر صاحب کی طویل نظم "پرچھائیوں کا دیس" جہاں فلمی دنیا کی مکمل منظر کشی کرتا ہے وہاں ان تلخ حقائق پر سے بھی پردہ ہٹاتی ہے۔ جن سے عام آدمی واقف نہیں۔ شمارے کے سبھی تخلیقات دلچسپ اور معنی خیز ہیں۔

دعاگو ہوں کہ سہیل بدستور اردو ادب کی خدمت کرتا رہے اور اسے لمبی عمر عطا ہو۔ آمین!

● تیج ناتھ زار (بمبئی)

❀ مکرمی سلام علیکم!

سہیل پابندی سے آرہا ہے۔ خدا کا شکر ہے چند ہی رسائل پابندی سے شائع ہو رہے ہیں ان میں "شاعر" بمبئی اور سہیل گیا کا نام سرفہرست ہے ورنہ اکادمیوں کے مجلے سرکاری رسالے سبھی دو شماروں کا ایک شمارہ چار ماہ بعد چھ ماہ بعد آتے ہیں۔ ماہانہ، سہ ماہی اور سہ ماہی سالانہ کے وقفہ سے شائع ہو رہے ہیں۔ سہیل کے لئے آپ لوگوں کی محنت لگن، خلوص میں سہیل کے قاری، ادیبوں اور شاعروں کو بھی جی جان سے ہاتھ بٹانا چاہئے۔ یہ اردو زبان و ادب کی ہی خدمت نہیں بلکہ ملک میں ایک اچھے سماج کی تشکیل کا ذریعہ ہے جو آنے والی نسلوں کو فیض عطا کرے گا۔

● منصور اعجاز

❀ جناب مسعود صاحب آداب

سہیل کا تازہ شمارہ ملا۔

جوگندر پال پر محمد صدیقی اور حمید سہروردی پر ابراہیم اختر کے مضامین پڑھے دونوں مضامین میں ایک کمی سی جو لگی وہ یہ کہ انہوں نے بجائے افسانے کے فن پر لکھنے

کے طرف افسانوں کا خلاصہ کر دیا ہے۔ ضرورت یہ تھا کہ وہ فنکار کے فن کو ابھارتے۔

حمید سہروردی پچھلے بیس سالوں سے برابر لکھ رہے ہیں اور جدید اردو افسانوں میں ایک معتبر نام ہے۔ انہوں نے ان بیس سالوں میں جس کردار کو جنم دیا ہے بات اس کردار پر ہونی چاہئے تھی۔

● شاہد عزیز، (اودے پور)

مکرمی مسعود منظر صاحب

قیصر عثمانی نمبر کے غائر مطالعہ کے بعد قیصر عثمانی کی زندگی کے چند نقوش میرے پردۂ ذہن پر کچھ اس طرح ابھرے کہ میں یہ چند سطریں لکھنے پر مجبور ہو گیا۔

"قیصر" روم کے بادشاہ کا لقب تھا اور عام قیس سے "قیصر" کا تصور بادشاہ ہی سے ہوتا ہے ن مجنوں کا نام تھا جو لیلیٰ کا عاشق تھا۔ تلفظ میں ر قیس میں بڑی یگانگت ہے۔ اور دوسرے لحاظ سے ر قیس میں بڑا امتزاج بھی ہے۔

"عثمانی" سے روحانیت کا تصور پیدا ہوتا ہے ، حضرت عثمان غنیؓ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ڑے ہی جلیل القدر صحابی اور تیسرے خلیفہ تھے۔ ، عثمان جنہوں نے عثمانیہ قائم کی، اترک تھے۔ ان لاد بھی عثمانی کہلاتی ہے۔ اور ہماری تاریخ اوائل کوں کا عزم و حوصلہ بتاتی ہے۔

گویا قیصر صاحب بادشاہ بھی ہیں اور مجنوں بھی ہر ترک بھی ہیں۔ جو بھی قیصر صاحب سے ملے گا وہ پہلی سمجھے گا کہ ان میں ایک مجنونیت سی ہے مگر گفتگو کرے گا تو وہ بہت پروقار نظر آئیں گے اور ٹھوس باتیں کریں گے اور اگر کچھ دیر تک گفتگو ہو رہی تو پھر روحانیت کا اثر بھی پائے گا۔

قیصر صاحب کسی ملک کے بادشاہ نہیں وہ تو د کے بادشاہ ہیں اور دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی چاہے وہ نثر ہو یا نظم دل کی بات ہر جگہ نظر آئے گی اور چونکہ دل کے بادشاہ ہیں تو فریفتہ بھی بہت جلد ہو ہیں۔ قیصر صاحب کو کسی خاص محمل کی قید نہیں جہا ان کی نظریں جم گئیں وہی مقام محمل ہے اور جیسا کہ خود عثمانی کے "سہیل نمبر" میں جمیل منظر صاحب اور جلا بازید پوری کے انٹرویو میں جلیل صاحب کے سوال پر کہ کو سب سے زیادہ کیا پسند ہے تو انہوں نے جواب د "عورت" یہ ان کے کھرے ہونے کا بین ثبوت ہے۔ گو ان کی شخصیت ایک کھلی کتاب ہے کہ جو چاہے اور جب چاہے اسے پڑھ لے اور اس لحاظ سے ان کی شخصیت منف ہے۔

اسی بنا پر ادارہ سہیل نے سہیل کا "قیصر عثمانی نمبر" نکالنے کا فیصلہ کیا جو اپنی جگہ بڑی اہمیت کا حامل ہے اس کے منظر عام پر آنے سے قیصر عثمانی کی شخصیت اور بھی ابھر کر سامنے آگئی ہے۔ مجھے یہ خاص نمبر بہت پسند آیا اس لئے کہ ان میں جن لوگوں کا قلمی تعاون حاصل ہو ہے وہ سب کے سب پائے کے ادیب اور شاعر ہیں اور بڑے ہی پروقار شخصیتیں ہیں۔ ہر مضمون اپنی جگہ ایک خاص اہمیت کا حامل ہے۔

میری قیصر صاحب سے پہلی ملاقات ۱۹۴۶ء میں گیا میں ہوئی تھی۔ میرے بھائی مفضل امام (شہید امام مرحوم) شیدا کیموروی کے نام سے جانے پہچانے جاتے ہیں میرے دوست زیادہ اور رشتہ دار کم تھے۔ دوست کا دوست

بھی درست ہوتا ہے کہ مصداق اسی وقت سے میری ان کی شناسائی ہوئی اور جیسے جیسے دن گذرتے گئے اور سال بیتتے گئے میری ان سے قربت زیادہ ہوتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ جب وہ گیا آتے تو پٹنہ ضرور آتے اور ہم سے ضرور ملتے۔ پھر بمبئی میں ہمارا ان کا ساتھ سنہ ۱۹۵۰ء سے ۱۹۵۸ء تک رہا پھر ۱۹۵۸ء تا ۱۹۶۵ء رہا۔ میں نے ان کو ہمیشہ ایک ہی جیسا پایا اور ان کے خلوص میں کبھی کوئی کمی نہیں پائی۔

اس کے بعد میں نے مستقل طور پر بمبئی سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور پٹنہ آگیا۔ میرے والد کا انتقال ہو چکا تھا اور میری جائداد کے انتظام و انصرام کے لئے میری موجودگی ضروری تھی۔

پھر جب قیصر صاحب سنہ ۱۹۶۹ء میں یعنی دس سال بعد گیا، اپنے آبائی وطن آئے تو پٹنہ بھی آئے اور مجھے اپنی کتاب تحفتنائیوں لکھتے ہوئے پیش کی "محبی یعقوب یونس صاحب کے لئے" بمبئی والے اور یاد کریں لیکن دس سال بعد بھی میں ان کو یاد رہا۔ یہ ان کے خلوص کا ایک ادنیٰ نمونہ ہے۔ ان کی کتاب "پرچھائیوں کا دیس" مجھے بہت پسند آئی اور ان کی نظم پر تو میں لوٹ لوٹ گیا۔ کیا حقیقت آمیز تصویر کھینچی ہے "فلمی دنیا" کی۔ مجھے یقین ہے کہ ایسی سچی تصویر کسی نے نہ کھینچی ہوگی۔ اور ایسا تازیانہ عبرت بھی کسی نے فلم والوں کو نہ مارا ہوگا۔ اور اس نظم پر تو میرے جذبات ایسے ابھرے کہ میں آبدیدہ ہو گیا۔ آپ بھی دل تھام کر سنئے شاعر کہتا ہے۔

مرغ و ماہی نہ جنہیں دخترِ انگور ملے
ہر گھڑی بادۂ محنت سے وہ مخمور رہے
لیکن قسمت کے جو ہیٹے ہیں وہ مزدور رہے
جن کے ہاتھوں سے ستاروں کو یہاں نور ملے
ان کے کاشانوں میں ہر وقت اندھیرا دیکھا
فلمی دنیا میں عجب میں نے تماشا دیکھا

یہ ان کے جذبات و احساسات و تخیل کا عروج ہے۔ ان کے فن کا کمال، ان کی شاعری کا کمال ہے۔ ان کے دل میں جو ایک ہلچل مچی تھی اس سے انہوں نے پوری فلمی دنیا میں ایک تہلکہ مچا دیا۔

پھر جب وہ ۲۱ سال بعد سنہ ۱۹۹۰ء میں پٹنہ آئے تو اپنی کتاب "حدیثِ دل" پیش کی تو یہ الفاظ لکھے "محبِ گرامی یعقوب یونس صاحب کی نذر، خلوص و محبت کے ساتھ"۔ اس کتاب کی ایک نظم کے چند شعر دیکھئے کتنا درد ہے، کتنی مایوسی اور یہاں بھی وہی تازیانہ عبرت ہے۔

یہ بغض کے بڑھتے ہوئے شعلے یہ اٹھتا ہوا نفرت کا د
دم گھٹنے لگا ہے اخوت کا اس ملک کا یارو خدا حاف
جھگڑا کہیں فرقہ پرستی کا تکرار کہیں حد بندی
عالم ہے بس اک وحشت کا اس ملک کا یارو خدا حاف
گاندھی کا خون ہوا پہلے، پھر نہرو کے ارمانوں
یہ دور ہے خونی سیاست کا اس ملک کا یارو خدا حاف

آخر میں ادارہ "سہیل" کو میں دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں جس نے "قیصر شمائل نمبر" کے ذریعہ قیصر صاحب کی ادبی خدمات کا اعتراف کر کے اپنا ایک اہم فریضہ ادا کر دیا ہے۔

● محمد یعقوب یونس (پٹنہ)

براہ کرم تخلیقات خوشخط اور صاف ارسال کریں
(ادارہ)

بانی :- حافظ محمد عبدالرحمن سہیل شیخ پوری ❀ بیادگار :- زین العابدین احمر و انوریس شیخ پوری

ماہنامہ سہیل گیا

مجلس مشاورت

ڈاکٹر تارا چرن رستوگی
ڈاکٹر بدر رئیس
اصغر علی انجینیر
قیصر عثمانی
شاہد احمد شعیب
ڈاکٹر محمد محسن
ڈاکٹر علیم اللہ حالی
سید احمد قادری

چیف ایڈیٹر :- مسعود منظر
ایڈیٹر :- جمیل منظر
معاونین :- شکیل احمد عباسی، عبدالقیوم ابدالی
• کتابت :- سید عبدالاحد گیاوی •

شمارہ ۵ جلد ۱۰

بدل اشتراک

• فی شمارہ .... ۳/۰ روپے
• زرِ سالانہ .... ۳۰/۰ روپے
• لائف ممبری .... ۵۰۱/۰ روپے

فہرست

نمود - ۵
متفرقات - رفیق جابر ۶
غزل ساجدہ زیدی ۶
ہم سفر... پہنچے - علیم اللہ حالی ۷
جاں نثار اختر - قیصر عثمانی ۱۰
ڈاکٹر کرامت... ایک ملاقات - اظہر نیر ۱۹
فردوس گیاوی۔ ایک نظم چند غزلیں ۲۳
کبھی ایسا بھی ہوتا ہے تو سوکھا - شاہد عزیز ۲۶
غزلیں :- منیر سیفی، نعمان شوق، ڈاکٹر حنیف ترین ۲۷
غزل :- ح۔ ف۔ کول ۲۸
دکھیاروں کی عید :- خورشید ہاشمی ۲۸
ایک کمیونسٹ کی موت ، مشرف عالم ذوقی ۲۹
بوجھ ، سید احمد قادری ۳۸

❀

• خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ •

ماہنامہ سہیل گیا
ریلوے سائیڈ روڈ، گیا - ۸۲۳۰۰۱

نومبر ۱۹۸۷

بہار سرکار

بہار فائر بریگیڈ سروس

مندرجہ ذیل ٹریفک کے مسائل پر آپ کے تعاون کی امید کرتے ہیں

(۱) فائر بریگیڈ کی گاڑیاں اطلاع ملتے ہی دو منٹ کے اندر نکلتی تو ضرور ہیں لیکن راستے کی بھیڑ کی وجہ سے جائے حادثہ پر اتنی جلد نہیں پہنچ پاتیں جتنی جلد چاہئے۔ ان کی گھنٹی اور سائرن کی آواز سننے پر آپ اپنی گاڑیوں کو کنارے کھڑی کریں

(۲) کبھی کبھی آپ انہیں اورٹیک بھی کرنا چاہتے ہیں۔ جس سے حادثہ ہوتا ہے۔ انہیں جائے حادثہ پر پہنچنے میں اور بھی دیر ہوتی ہے۔ مناسب ہے انہیں کبھی اورٹیک نہ کریں

(۳) پیدل چلنے والے بھی ان گھنٹی اور سائرن کی آواز سنتے ہی ایک کنارے کھڑے ہو جائیں۔ اس سے انہیں آگے بڑھنے میں سہولیت ہوگی۔ اور حادثہ کا امکان نہیں ہوگا۔

یہ آپ کی حفاظت کے لئے ڈیوٹی ہے۔ اور انہیں بھیڑ سے بچانے کا فرض صرف پولس پر ہی نہیں ہے، بلکہ آپ پر بھی ہے۔

جاری کردہ:- ستیہ گرو پرشاد
اسٹیٹ فائر بریگیڈ آفیسر، بہار، پٹنہ

P.R.NO 16 D(INF-14) 91-92

نمود

ارتقائی ادب کی پہچان

یہ بات بالکل صاف ہے کہ زندہ ادب کی پہچان تبدیلیوں سے ہوتی ہے۔ جس طرح زندگی غیر جامد، فعال، متحرک اور تغیر پذیر ہے اسی طرح ادب بھی تبدیلیوں سے زندہ رہتا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ دو ایک برسوں کی محدود معیار میں تبدیلیوں کا صحیح اندازہ نہ ہو سکے مگر ایک معتد بہ مدت کے بعد ان کا پتہ لگنا ضروری ہے۔ اسی لئے اس بات کی اہمیت ہے کہ ہر عہد کے ادبی ذخیروں کا مطالعہ کیا جائے اور اس طرح کیا جائے کہ عہد ماقبل کے ادبی ذخیروں سے موازنہ بھی ہو۔ صحیح اور سچی ترقی پسندی اسی میں ہے کہ ادب کو زندگی سے ہمکنار کرتے ہوئے زندگی کی سمت و رفتار کا انعکاس ادب میں بھی تلاش کیا جائے۔

اس لحاظ سے ماضی میں لکھی جانے والی ہر ادبی تحریر کی اہمیت مسلم ہے۔ کلاسکس کی بھی اہمیت اسی سے اجاگر ہوتی ہے اور نیا ادب بھی اسی طریقے سے پہچانا جاتا ہے۔ ادب کی صحیح قدر و قیمت عصروں کی مغائرت سے معلوم ہوتی ہے۔ قدیم ادبی سرمایوں کو نقش و نگار طاق نسیاں بنا کر ہم نیا ادب بھی پیدا کرنے سے قاصر ہیں۔ ایک دور کا دوسرے دور سے مقابلہ اور تصادم کاروان شعر و ادب کو آگے کی طرف لے جاتا ہے۔ اس طرح ہم ادب میں موضوعاتی اور اظہاری تکرار سے بھی بچ سکتے ہیں۔ لہذا ہمیں آج تھوڑی دیر کے لئے ٹھہر کر یہ دیکھنا چاہئے کہ کل کیا لکھا گیا تھا اور آج جو ہم لکھ رہے ہیں ... کا کہ مقابلہ کی ...

متفرقات

رفیق جابر

کہاں گیا مرے گیسو سنوارنے والا
وہ میرے لہجے میں مجھ کو نکھارنے والا

اداس اداس میں عارض مزاج برہم سے
یہ سن لیا ہے کہ پھولوں کی زندگی کم ہے

ہوئی ہے نت نئی ترکیب آزمانے کی
صدیں قفس سے ملا دیں میں آشیانے کی

عمر ساری کٹ گئی اک حسرتِ تعمیر میں
کاتبِ تقدیر نے کیا لکھ دیا تقدیر میں

ایک ہی شغل اختیار کیا
عمر بھر آدمی سے پیار کیا

مدتوں میں خبرِ یارِ جفا جو آئی
اپنی سانسوں سے کسی کی مجھے خوشبو آئی
اتنی بدمست و جنوں خیز خدا خیر کرے
اے نسیمِ سحر اس زلف کو کیا چھو آئی

گل فشانی ہو چکی اب اشک افشانی کریں
عاشقی اک آگ ہے اس آگ کو پانی کریں
زیرِ فرماں خود زمانے کی ہوا ہو جائے گی
آؤ ہم بلقیسِ دوراں پر سلیمانی کریں

جسم اور روح پہ چھائی ہوئی رعنائی تھی
چاندنی کل مرے آنگن میں اتر آئی تھی

غزل

پروفیسر ساجدہ زیدی

کشتِ ویراں کی طرح تشنہ رہی ذات مری
لوٹ آئی ترے در سے بھی مناجات مری

تو لہو بن کے رگوں میں مری دوڑا لیکن
تشنۂ دید رہی تجھ سے ملاقات مری

دل پہ کھلتے نہیں اسرار وجود اور عدم
یہی حیران نگاہی ہے مکافات مری

قافلے والے نہ سمجھے مری آواز ذرا
وحشتِ تنہائی میں نالندہ رہی ذات مری

خیمۂ خواب میں گونجی مرے دل کی آواز
راہِ عرفاں بنی ساعتِ سکرات مری

کون سمجھا مری بیدار نگاہی کی حدود
یوں تو ہر راہ میں تھی سرح حکایات مری

سازِ آہنگ کا اعجاز تھا ہر لفظ مرا
پھونک ڈالی خس و خاشاک نے سوغات مری

گرچہ آوارہ رہے مرے فسانے ہر سو
رازِ سربستہ زمانے میں رہی ذات مری

ہیں زمیں اور زماں دودِ چراغِ شبِ غم
مجھ کو لے آئی کہاں، گردشِ حالات مری

تند طوفاں بھی اُٹھے، بادِ مخالف بھی چلی
کس طرح جلتی رہی شمعِ خیالات مری

علیم اللہ حالی

ہم مسافر جہاں جہاں پہنچے

میرا دل اس بات کو قبول نہیں کرتا کہ پاکستان ایک الگ ملک ہے، مجھے اس کی خوشبو ہندوستان سے الگ محسوس نہیں ہوتی، وہی لوگ، وہی معاشرت، وہی ذہنیت، وہی فضا، سب کچھ تو وہی ہے اور تو اور معاشرے کے وہ سارے منفی رجحانات جو یہاں ہمارے ارد گرد پھیلے ہوئے ہیں وہاں بھی اسی طرح موجود ہیں۔ معمولی باتوں میں مدارج کا فرق ہے اور یہ فرق بھی ہندوستان پاکستان کی کرنسیوں کی باہمی قدر کے لحاظ سے گھٹتا بڑھتا رہتا ہے۔ دہشت گردی اور علیحدگی پسندی جو یہاں ہے سو وہاں ہے۔ رشوت اور عصبیت جو یہاں ہے سو وہاں ہے — بس فرق ہے تو اتنا کہ سیاست والوں نے اس برصغیر کے نقشے کو مصلحت کی قینچی سے تراش کر ایک چھوٹا سا حصہ الگ کر دیا ہے۔ اور اس کا نام پاکستان رکھ دیا ہے۔ کلچر، ثقافت، اور ماضی بعید کا پتہ لگاتے ہوئے ہم اور وہ دونوں ایک ہی منزل پر پہنچ جاتے ہیں۔ مجھے تو موہن جو داڑو، ہڑپا، نالندہ سب جگہ ایک ہی آثار ملتے ہیں۔ ہماری قدیم ترین ثقافت کے سارے نقوش ایک جیسے ہیں بلکہ ایک ہی ہیں۔ زمین کو ایک حد بندی کی لکیر سے بانٹ کر ہم الگ الگ مالک تو بنا سکتے ہیں مگر کلچر اور ثقافت کو تقسیم نہیں کر سکتے۔ اور میرے خیال میں ایک الگ ملک صرف جغرافیائی اور سیاسی حدود سے متشکل نہیں ہو سکتا۔ اب اپنی لاج رکھنے کے لئے جس طرح کچھ لوگ یہاں اپنے REMOTE میں جا کر ایک کلچر کی کھدائی میں مصروف ہیں اسی طرح وہاں بھی پاکستانی ثقافت کی بات اٹھتی ہے۔ یہ باتیں مجھے اوپر اوپر کی دکھائی دیتی ہیں۔ ہندوستان کی ثقافتی تاریخ کو کہاں سے شروع کیا جائے۔ یہ سوال بڑا اہم ہے، میں سمجھتا ہوں کہ اس کی تمہید اس سنہرے باب سے کرنی چاہیئے جہاں قوموں کے میل جول، صلح و آشتی صوفیانہ صلح کل اور معتقدات کے اختلاط سے ہندوستان میں ایک ملی جلی تہذیب کی نمو ہوتی ہے۔ تاریخ کی ترتیب ایک مقدس اور تعمیری مقصد کے تحت ہونی چاہیئے۔ ماضی بعید کے دھندلکوں میں لے جا کر آج کی مخلوط ثقافت کو مسمار کے عمل کو ایک سازش کہا جا سکتا ہے۔ اس سازش میں ہم دونوں برابر کے شریک ہیں — اور اس طرح اس حصے کو تہذیبی اور ثقافتی سطح پر کاٹنے کا عمل وہ لوگ

باکر مہیل گیا

ں کر رہے ہیں جو پاکستانی کلچر کی بات کرتے ہیں ۔ اور
لوگ بھی جو ہندوستان کی قدیم ترین ثقافت کو غیر
رادارانہ مذہبی رویئے سے جوڑنے کی کوشش کر رہے ہیں۔
ذہبی اور ثقافتی تہذیب کو مسخ کرنے کا کام دونوں
لبہ ہو رہا ہے ۔

لیکن جس طرح ہندوستان میں ایک طبقہ ہے جو ہم
ہنگی اور بھائی چارگی کی فضا بنائے رکھنے کی کوشش کر رہا
ہے اسی طرح پاکستان میں بھی ایک طاقت ہے جو اجتماعی ذہنیت
و پیچھے کی طرف لے جانے سے روکتی ہے ۔ میری مراد ادیبوں شاعروں
فن کاروں، قلمکاروں اور فنون لطیفہ کے میدان میں کام کرنے
والے ان لوگوں سے ہے جو اگرچہ تعداد کے اعتبار سے اقلیت
میں ہیں مگر اپنے فنون کی اثر پذیری کے لحاظ سے سب سے زیادہ
اہمیت کے حامل ہیں ۔ دانشوروں کا یہ طبقہ اگرچہ اہل سیاست
کی زد میں ہے اور یہاں وہاں ہر جگہ انہیں اپنے صحیح قد میں ابھرنے
کا موقع نہیں دیا جاتا ۔ مگر دانشوری وقتی اقتداری آویزش
سے بلند ہوتی ہے ۔ اور جب کبھی مختلف شعبہ ہائے زندگی
میں نمایاں کارنامے انجام دینے والوں کے قدروں کی پیمائش
ہوتی ہے تو یہ فنکار سب سے بلند و بالا نظر آتے ہیں ۔ اس
کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ سچا فنکار مذہب، سیاست، معاشرت
اور معشیت سے بلند ہو کر ایک ایسا نظام حیات ہمارے
سامنے پیش کرتا ہے جو انسان کو لطیف ترین جذبوں سے
ہمکنار کرتا ہے ۔ انسانی تہذیب کی انتہا یہی ہے کہ وہ
انسانی جذبات، ومحسوسات کا تحفظ کرے اور ایک ایسی
دنیا کی تعمیر کرے جو مصلحت، وقتی افادہ اور سیاسی
چالبازیوں سے نجات دلا سکے، جو انسانوں کو ان کے
باہمی اختلافات نظر و بصر کے باوجود ایک سمجھے ۔ اس لئے
انسانی معاشرہ کی نجات ان دانشوروں کے ذریعے

ہو سکتی ہے جو ملانے کا کام کرتے ہیں تقسیم کرنے
اور اسی لئے میں سمجھتا ہوں کہ افہام و تفہیم
خیرسگالی کی فضا بنانے میں شعراء و ادبا اور فنکا
ضرورت کسی بھی سطح پر نظر انداز نہیں کی جا سکتی ۔
اور پاکستان کے تعلقات کی خوشگواری کا انحصا
سیاسی مذاکرات، قائدین کی گفت وشنید، ق
اور تجویزوں سے زیادہ اس امر پر ہے کہ دونوں ملک
دانشوروں اور فنکاروں کو بار بار ملاقاتوں کے موا
جائیں ۔ ان کے آنے جانے کے لئے آسانیاں پیدا کی
انہیں تبادلۂ احساس وخیال کے لئے آزاد فضا دی جا
جب لہجہ لہجے سے ملتا ہے، فکر کا فکر سے اتصال ہو
زبان زبان سے ملتی ہے تو محبت کا رشتہ قائم ہو
ایسی بات نہیں ہے کہ ارباب اقتدار ایسی ملاقاتو
افادیت سے غافل ہیں لیکن عملاً یہ ہوتا ہے کہ سرکا
پر جن ادبا و شعرا کا تبادلہ ہوتا ہے وہ دانشوری ا
کی آزاد اور غیر منسلک فضا میں سانس لینے کی بجا
بندھے بندھائے نظریات سے وابستہ ہوتے ہیں ۔
اس طرح ان ملاقاتوں کا مقصد بھی یہ ہو کر رہ جا
ہم اپنی آئیڈیولوجیز کو خوبصورت انداز میں دوسر
تھوپنے کی کوشش کریں ۔ یہ لینے دینے سے زیاد
کا عمل ہے ۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جائے تو غل
کہ یہ بھی سیاسی اغراض کی تکمیل کا ایک وسیلہ
ہیں ۔ سیاست و اقتدار اور محدود جماعتی نظر
یہ LIAISON OFFICER قسم کے ادبا
یا تو ضیافت و تفریح میں الجھے رہتے ہیں یا پھر مبا
مناظروں کے ذریعہ اپنے رٹے رٹائے اسباق دہر
ہیں ۔ غلط فہمیوں میں گرفتار رہنے والے لوگ دلوں

کیوں کر سکتے ہیں۔

چنانچہ جب میں نے پاکستان کا قصد کیا تو طے کر لیا
تھا کہ مجھے حکومت سے کچھ لینا دینا نہیں ہے۔ نہ اس کے سامنے
اپنی بات کرنی ہے نہ اس کی بات سننی ہے۔ میں تو چھوٹے بڑے
اور امیر و غریب اہل قلم کے دلوں کی دھڑکنیں سننا چاہتا تھا۔
وہ کیا لکھ رہے ہیں۔ وہ کون سا اظہار بیان اپنائے ہیں۔
ان کے علائم میں ذات کے SUPPRESSIONS کا کتنا
حصہ ہے اور تخلیقیت کا کتنا، وہ جس معاشرہ میں رہ رہے
ہیں اس سے کس حد تک مطمئن ہیں، ان کے شعر و ادب میں کون
سا صوتی نظام ابھر رہا ہے۔ تبدیلیاں کس طرح وہاں نمودار
ہو رہی ہیں۔ وہ ہمیں کس طرح سمجھنا چاہتے ہیں، ان کے
تخلیقی کارناموں میں عظمت و جمال کے کیا کیا نقوش ہیں، ہم
انہیں کس حد تک چاہ سکتے ہیں۔ وہ ہمیں کتنی محبت دے سکتے
ہیں۔ ان سوالات کا جواب اسی طرح حاصل کیا جا سکتا
تھا کہ میں آزادانہ طور پر سفر کروں۔ نہ کسی رشتہ کا معتاج
ہوں نہ کسی مقررہ DELEGATION کا رکن رہوں۔
چنانچہ میں نے یہی کیا اور ویزا لے کر پرانی دلی اسٹیشن
پر تاری ایکسپریس کا ٹکٹ لینے کے لئے قطار میں کھڑا ہو گیا
مجھے یاد نہیں کہ میں نے ان سے ریزرویشن فارم بھرنے
کے لئے قلم مانگا یا انہوں نے مجھ سے۔ مگر ہم لوگوں میں جلد
ہی گفتگو کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ معلوم ہوا کل وہ بھی
میرے ساتھ کراچی جائیں گے۔ مجھے خوشی ہوئی کہ چلو
ایک اچھا ہم سفر مل گیا۔ اس وقت ہم دونوں جلدی میں تھے
بس اتنا معلوم ہو سکا کہ یہ صاحب تقسیم ہند سے پہلے
اتر پردیش کے باشندہ تھے۔ اب پاکستانی ہیں۔ سچے کامریڈ
ہیں۔ اشتراکیت کے انعام میں انہیں آٹھ نو برسوں تک
جیل میں رکھا گیا تھا۔ اپنی شباہت سے بھی وہ سادھو سنت

انڈین نظر آتے تھے۔ قوی الجثہ شخصیت، گہرا سانولا
رنگ، مضبوط اور توانا نقوش والے اس پاکستانی کمیونسٹ
سے مل کر مجھے خوشی بھی ہوئی اور تعجب بھی۔ میں نے ان سے
کہا کہ اگرچہ میں کبھی کمیونسٹ پارٹی کا ممبر نہیں رہا ہوں نہ
ممبر شپ کے حصول کی کوشش کی ہے۔ مگر عجیب اتفاق
ہے کہ شعور سنبھالنے سے آج تک کمیونسٹوں سے میری
خوب خوب بنی ہے۔ میں نے چند نام بتائے۔ ان میں سے
کچھ سے وہ معمولی طور پر واقف تھے۔ لیکن عجلت میں تھا پھر یہ
بھی طے تھا کہ کل وہ میرے ہم سفر رہیں گے اس لئے میں نے جیب
سے ایک کاغذ نکال کر ان کا نام لکھنا چاہا۔ انہوں نے
اعزاز نظیر بتایا۔ میں نے اعزاز لکھنے کے بعد تھوڑا توقف
کیا اور ان کی جسامت و ہیئت دیکھ کر پوچھا۔ خدانخواستہ
NAZEER ز سے تو نہیں ہے۔ وہ خوب ہنسے
اور جواب دیا نہیں ظ سے لکھئے۔ مگر مجھے لگتا ہے وہ
اعزاز نذیر ہی ہیں۔

دوسرے دن شام کو اسٹیشن پر ان سے پھر ملاقات
ہوئی۔ ان کا برتھ میرے مقابل تھا، خوب خوب باتیں ہوتی
رہیں۔ میں نے ان سے کہا کہ پاکستان جیسے مملکت خداداد اسلامیہ
میں اتنے مضبوط قسم کے اشتراکی کی کیا جگہ ہو سکتی ہے۔ راستے
بھر کمیونسٹ تحریک پر باتیں ہوتی رہیں۔ میں نے اس تحریک سے اپنی
جذباتی وابستگی کے باوجود اس کی نارسائیوں کا تذکرہ چھیڑ دیا
میں نے ان سے یہ بھی کہا کہ کم سے کم ہندوستان میں مجھے ایسا محسوس
ہوتا ہے کہ یہ تحریک اقتدار کی خرکت کی وجہ سے عوام سے دور ہو گئی
ہے۔ اعزاز نظیر نے مجھے جو وزیٹنگ کارڈ دیا وہ یوں تھا۔

C/O 683748 674186 AIZAZ NAZIR 371/8 Dastgir, F.B. Area KARACHI

(جاری)

قیصر عثمانی

جاں نثار اختر
یادوں کے آئینے میں

یہ اوائل ۱۹۵۰ء کی بات ہے۔ جب مہالکشمی ریلوے سٹیشن سے کچھ ہی دور ریس کورس کے سامنے فیمس سٹوڈیو بلڈنگ کو بنے ہوئے صرف سال دو سال کی مدت گذری تھی۔ بمبئی میں فلمی دنیا کی اس بھول بھلیاں جیسی عظیم الشان سہ منزلہ عمارت کا نظارہ آج بھی شیراز علی حکیم کے بلند عزائم کی یاد دلاتا ہے۔ اس جدید طرز کی خوبصورت عمارت میں اسٹوڈیو، لیبورٹری، ایڈیٹنگ رومز اور ریکارڈنگ تھیٹر کے علاوہ کئی سو دفاتر تھے جن میں ان دنوں راج کپور، رمیش سہگل، جگدیش سیٹھی، موہن سہگل، دیو آنند، گرو دت، بھگوان داس ورما، امیہ چکرورتی، شیخ مختار، ولی صاحب ایس۔ ایم۔ یوسف، ایس۔ یو۔ سنی، ایس۔ کے۔ اوجھا، آر چندرا، دیویندر گوئل، اور جدن بائی کے دفتروں میں بڑی چہل پہل رہا کرتی تھی۔ راج کپور کا آفس اپنی آرائش و زیبائش کے اعتبار سے خاص طور پر شہرت رکھتا تھا۔

اس بلڈنگ کی دوسری منزل پر فلم ساز و ہدایت کار ایس۔ ایم۔ نواب کے ذاتی فلمی ادارہ شاہین پکچرز کا دفتر بھی نیا نیا قائم ہوا تھا جس کے دروازے پر جلی حروف میں پینٹ کیا ہوا میرا نام کاریڈور میں ہر آنے جانے والے کو اپنی طرف متوجہ کیا کرتا تھا۔ پوری بلڈنگ میں یہ خصوصیت کسی اور دفتر کو حاصل ہوگی۔ میں ان دنوں شاہین کا کنٹرولر آف پروڈکشن تھا۔

ایک دن میں اپنے دفتر میں بیٹھا اس دسٹری بیوٹر کے نام ایک خط ڈکٹیٹ کرا رہا تھا کہ پائجامہ اور جیکٹ میں ملبوس لمبے لہراتے بالوں قد کے ایک دبلے پتلے سادہ رخ اجنبی نے پہلے سلام کیا پھر ایک رقعہ میرے ہاتھ میں تھما کر کہا۔

"مجھے جاں نثار اختر کہتے ہیں۔"

میں یہ نام سنتے ہی چونک پڑا۔ اس کے ساتھ ہی ان کی جوانی کے زمانہ کی مشہور نظم "گرلز کالج کی لاری" دماغ میں چکر کاٹنے لگی۔ میں نے یہ نظم کالج کے زمانے میں ساقی میں پڑھی تھی اور اس کی رومانی فضا بہت دنوں تک میرے دل و دماغ پر کیف و سرور کی بارش کرتی رہی تھی۔ اس وقت ایک بار پھر وہ نظم یاد آنے لگی تھی۔

فضاؤں میں ہے صبح کا رنگ طاری
گئی ہے ابھی گرلز کالج کی لاری

گئی ہے ابھی گو بجتی گنگناتی
زمانہ کی رفتار کا راگ گاتی
وہ سڑکوں پہ پھولوں کی دھاری سی کھنچتی
ادھر سے اُدھر سے حسینوں کو چنتی
فضاؤں میں ہے صبح کا رنگ طاری
گئی ہے ابھی گرلز کالج کی لاری

میں عہد گذشتہ کی اسی رنگین فضا میں کھویا ہوا تھا کہ اردو کے البیلے شاعر حضرت جاں نثار اختر نے مجھے یہ کہہ کر چونکایا۔ "معلوم ہوتا ہے آپ بہت زیادہ مصروف ہیں۔" "معاف کیجئے گا۔ میں بے اختیار آپ کی گرلز کالج کی لاری کے پیچھے پیچھے بھاگنے لگا تھا لیکن وہ تو بہت دور نکل گئی۔ میں نے ندامت بھرے لہجے میں کہا اور لفافہ چاک کرتے ہوئے انہیں دوسرے ملحقہ کمرے میں لے گیا۔ پھر آفس بوائے کو چائے کا آرڈر دے کر ہم دونوں صوفہ پر آرام سے بیٹھ گئے۔ نواب صاحب نے اپنے خط میں لکھا تھا۔

یہ ہیں جناب جاں نثار اختر۔ آپ ان کی نظم "میں بہت دور بہت دور چلا جاؤں گا" کے حقوق کے عوض انہیں پانچ سو روپے ادا کر دیجئے۔ نظم میرے پاس ہے۔ اسے "کھیل" میں فلماؤں گا۔

چنانچہ میں نے جلدی ہی ایک مختصر سے معاہدے پر [illegible] باضابطہ دستخط لینے کے بعد مذکورہ بالا رقم جاں نثار اختر صاحب کی خدمت میں پیش کر دی۔

یہ شاید فلمی دنیا کی پہلی رقم تھی جو انہیں شاہین پروڈکشنز کے دفتر سے ملی تھی۔ اس کے بعد ہم دونوں اس خالص کاروباری فضا سے دامن چھڑا کر شعر و سخن کی رنگین دنیا میں آ گئے۔ اس دوران میں چائے بھی آ گئی اور شعر و شاعری کا دور بھی شروع ہو گیا۔ جب یہ سلسلہ ختم ہوا تو میں نے اختر صاحب سے دریافت کیا۔ "آپ بمبئی آنے سے پہلے کہاں تھے اور کیا کرتے تھے؟"

"حمیدیہ کالج بھوپال میں اردو کا پروفیسر تھا اور اب بیوی بچوں کو چھوڑ کر بمبئی کی فلمی دنیا میں چلا آیا۔"

اس وقت مجھے اختر صاحب کے نرم نرم لہجے میں کسی سست رفتار ندی کی ہلکی ہلکی موجوں کی سی کیفیت محسوس ہو رہی تھی۔ وہ نیچی نگاہیں کئے گفتگو کر رہے تھے۔ "لیکن اس کٹھور دنیا کے تیور آپ برداشت کر سکیں گے؟" میں نے ان کی انتہائی شریف النفسی اور سادگی کو مدنظر رکھتے ہوئے سوال کیا۔

"دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ ویسے میں اپنے عزم میں ہمیشہ ثابت قدم رہنے کی کوشش کروں گا۔" اختر صاحب نے بڑے اعتماد کے ساتھ کہا۔

میری یہ فطرت ہے کہ میں اکثر پہلی ہی ملاقات میں لوگوں سے بے تکلف ہو جاتا ہوں۔ لیکن اس دن مجھے اختر صاحب کی غیر معمولی متانت اور کم سخنی کی وجہ سے بڑی گھٹن سی محسوس ہو رہی تھی۔ تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد مختصر گفتگو کے بعد اختر صاحب سلام و مصافحہ کر کے دفتر سے باہر چلے گئے اور میں سوچنے لگا کہ فلم کے جس بازار میں عام طور سے کھوٹے سکوں کے چلنے کا رواج ہو رہا ہے، کون فلم ساز ایسا ہوگا جو جاں نثار اختر جیسے سیدھے سادے اور سچے فنکار کو اپنے پاس پھٹکنے دے گا۔ جاگیردارانہ ماحول کے پروردہ اور اردو کے مستند اور کہنہ مشق حضرت مضطر خیرآبادی کے گھر کے چشم و چراغ کا بمبئی میں نہ جانے کیا حال ہو، یہ سوچ کر مجھے رحم سا آ رہا تھا۔

ضیا سرحدی کی لکھی ہوئی فلم "کھیل" کی شوٹنگ کے

ے مراحل سے گذر رہی تھی اور ایک دن نواب صاحب نے
ثار اختر صاحب کی مذکورہ بالا نظم بھی دلوا خرید
لی تھی۔ اس نظم کے چند مصرعے اب تک میرے ذہن
محفوظ ہیں۔

جب میرے اشک ترے ہار کے قابل ہی نہیں
جب مرا پیار ترے پیار کے قابل ہی نہیں
میں بہت دور بہت دور چلا جاؤں گا

س سے پہلے "کھیل" کی دوسری سیچوایشنز پر اپنے رنگ
منفرد موسیقار سجاد حسین کی ہدایت میں آرزو لکھنوی
ہزاد لکھنوی، ساغر نظامی اور شمس عظیم آبادی بھی کچھ گیت
پر کر چکے تھے۔ یہ دیکھ کر میرے اکثر دوست واحباب اور
شناسا یہی سمجھتے تھے کہ شاہین پکچرز سے ان سب حضرات
وابستگی میں میرے ادبی ذوق کو دخل تھا۔ لیکن یہ سچ
ہے۔ اس کا پورا کریڈٹ صرف اور صرف نواب صاحب
جاتا ہے جو نہ صرف گیا کے خاندانی نواب تھے بلکہ پٹنہ
یونیورسٹی سے ایم۔ اے ہونے کے علاوہ شعر و ادب کا بہت
صاف ستھرا مذاق رکھتے تھے۔ اور ادیبوں اور شاعروں
انہیں والہانہ محبت تھی۔ اگر نواب صاحب کی طبیعت
ہٹ دھرمی کا مادہ ضرورت سے زیادہ نہ ہوتا اور وہ
مت فلمی سے کام لیتے تو بہت ممکن تھا کہ ان کا ادارہ
بھی بمبئی کی فلمی دنیا میں ایک کامیاب ثابت ہوتا۔ لیکن
ایسا نہ ہو سکا۔ ان کی ہدایت کردہ فلم "کھیل" بدقسمتی سے
فلاپ ہو گئی۔ اس کے باوجود انہوں نے ہمت نہیں ہاری اور
جلد ہی اپنی دوسری فلم "ساز" کی تیاریاں شروع کر دیں۔ یہ
وہ زمانہ تھا جب نواب صاحب نے باقاعدہ جاں نثار اختر
صاحب کو نغمہ نگاری کے لئے چار سو روپے ماہانہ تنخواہ پر
اپنے اسٹاف کا ایک اہم جزو بنا لیا تھا۔ انہیں دنوں
اختر الایمان بھی اسی تنخواہ پر مکالمہ نگاری کے لئے شاہین
پکچرز سے مستقل طور پر وابستہ ہو گئے تھے۔ یہی وہ زمانہ
تھا جب ساحر لدھیانوی بھی بمبئی آ کر انتہائی جدوجہد
کی زندگی گذار رہے تھے۔ اگر جاں نثار اختر شاہین پکچرز
سے ماہانہ بیسس (MONTHLY BASIS) پر
وابستہ نہ ہوتے تو "ساز" کے لئے ایک دو گیت ساحر
صاحب کے بھی ضرور صدا بند ہو سکتے تھے۔ لیکن اصول
کیسے توڑا جا سکتا تھا؟

کچھ دن بعد "ساز" کے لئے اختر صاحب کا پہلا
گیت ریہرسل کی منزل سے گذر رہا تھا کہ میں نے موسیقار
سچن دیو برمن سے کہا۔

"برمن دا۔ اس گیت کے لئے لتا منگیشکر کی آواز
بہت ضروری ہے"۔ یہ سنتے ہی برمن دا کے چہرے پر کچھ
ایسے تاثرات نمودار ہوئے جیسے انہیں یہ مشورہ پسند نہ ہو اور میرا
یہ شبہ بالکل صحیح ثابت ہوا جب انہوں نے اپنے بنگالی
لہجے میں کہا۔

"قیصر صاحب لتا کا نخرہ ہم برداشت
نہیں کرے گا۔ ایک تو اس کا ڈیٹ نہیں
ملتا اور کبھی ملتا ہے تو بعد میں کینسل
ہو جاتا ہے۔ آپ فکر نہ کیجئے میرے
بلانے پر کلکتہ سے سندھیا مکرجی آ رہی
ہے بہت اچھا گاتی ہے۔ ہم اس سے
پلے بیک لے گا۔"

یہ سن کر میں مایوس ہو گیا۔ لیکن جب میں
نے اپنی ضد میں کوئی کمی نہیں کی اور یہ کہا کہ لانا میرا کام ہے
آپ کو کچھ نہیں کرنا ہوگا تو وہ بادل ناخواستہ راضی
ہو گئے۔ چنانچہ میں اس شام نانا چوک چلا گیا۔ جہاں

دلنوں لتا منگیشکر ایک منزر کے ملحقہ کمرے میں رہا
تھی۔ لتا سے جب میں نے اپنا مدعا بیان کیا تو وہ الجھن
میں پڑ گئی اور کچھ ہی لمحوں کے توقف کے بعد اس نے
معذوری کا اظہار کر دیا۔ لیکن میں یہ ٹھان کر گیا تھا
بھی ہو جائے لتا کو رضامند کر کے ہی اپنے گھر
س جاؤں گا۔ چنانچہ جب میں نے اسے ہر طرف سے گھیرنے
تار تیز کر دی تو وہ بالآخر یہ کہنے پر مجبور ہو گئی کہ
آپ کو ڈیٹ کے بارے میں دو دن کے بعد ہی بتا
ؤں گی۔ اس طرح کئی چکر کھلانے کے بعد آخر
نے میری بات رکھ ہی لی۔

اس دن میری خوشی کی انتہا نہ تھی جب میری
ب ترین گلوکارہ لتا منگیشکر فیمس سینے بلڈنگ
یکارڈنگ تھیٹر میں ساؤنڈ ریکارڈسٹ مکل بوس
نگرانی اردو کے رومانی شاعر حضرت جاں نثار اختر
فلمی گیت اپنی جادو بھری آواز میں مائک پر گا رہی
جب صدا بندی ختم ہو گئی اور نواب صاحب کے علاوہ
بائی، اختر حسین، انور حسین، ضیا سرحدی ،
لا یسان، امان اللہ اور دیگر حضرات اختر صاحب
مبارکباد دے رہے تھے تو مجھے یکایک خیال آیا کہ میں
اس کا معاوضہ دینا بھول گیا ہوں۔ میں اسے
میں دیوانہ وار ڈھونڈنے لگا۔ لیکن وہ کہیں
۔ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ لتا آخر
اوضے کے چھ سو روپے لئے بغیر کیسے چلی گئی۔ ف
ی میں ایسا کہاں ہوتا ہے؟ اور یہ صرف ایک بار
سری مرتبہ کے صدا بندی کے ختم ہوتے ہی وہ چپکے
گھر چلی گئی تھی۔ لتا کی یہ ادا میرے لئے ایک معمہ
تھی۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ اختر بھائی کے گیت میں

میں وہ کچھ اتنی کشش محسوس کرتی تھی کہ وہ ہر بار
اپنا معاوضہ لینا بھول جاتی تھی۔ یا یہ کہیں خود میری
شخصیت کی سحرکاری تو نہ تھی ـــ واللہ اعلم۔

"ساز" کے لئے اختر بھائی کے چار گیت بمبئی ٹاکیز
(ملاڈ) کے اسٹوڈیو میں ناصر خان اور نگار سلطانہ پر فلمائے
گئے تھے لیکن کچھ دن بعد جب فلم کی دس ریلیں تیار ہو گئیں
تو کمپنی کچھ ایسی مالی مشکلات میں گھری کہ بقیہ حصے کی شوٹنگ
نہ ہو سکی۔ اور "ساز" نامکمل رہ گئی۔ اگر یہ فلم بن کر ریلیز
ہو جاتی تو شاید جاں نثار اختر راتوں رات مشہور ہو جاتے۔
لیکن وہ اتنی اچھی قسمت لے کر نہیں آئے تھے۔ ان پر مصیبتوں
کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ اور انہیں نغمات کی دنیا میں نئے سرے سے
جد و جہد شروع کرنی پڑی۔ اس دوران ان کی شریک حیات
صفیہ علیل ہو گئیں۔ وہ بھوپال کے کسی کالج میں پروفیسر تھیں
اور حد درجہ پریشان۔ ادھر اختر بھائی بمبئی میں سخت حالات
سے گذر رہے تھے۔ عجیب دن تھے وہ۔ نہ ادھر چین تھا نہ ادھر

اس زمانے میں اختر بھائی اپنے ایک کرم فرما خلیل
بھائی کے ساتھ آرکیڈیا بلڈنگ باندرہ کے ایک کمرے میں
رہتے تھے۔ اور بمبئی کی زبان میں ان کی کھولی کا۔ یہ حال تھا
کہ کمرے کی دیوار پر صاحب خانہ خلیل بھائی سے لئے گئے قرض
کی فہرست روز بروز لمبی ہوتی جا رہی تھی۔ میں جب ان سے
پوچھتا کہ یہ دیوار آپ کی اس بڑھتی ہوئی فہرست کا بوجھ
کب تک برداشت کرتی رہے گی تو وہ ایک ہلکی سی مسکراہٹ
کے ساتھ جواب دیتے۔ "جب تک کوئی پروڈیوسر مجھ پر مہرباں
نہ ہو جائے۔"

انہیں دنوں کی بات ہے ایک دن میں ان کے کمرے
کی کھڑکی سے تاک جھانک کر رہا تھا کہ اختر بھائی نے کہا: قیصر
کل تو غضب ہی ہو گیا۔ کیا پھر کوئی ٹریجڈی؟ نادر شاہ ہو گیا؟

"رنگین نہیں سنگین کہو۔ بس یہ سمجھو میری جان نچ گئی": اختر بھائی نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ کہا۔

"کچھ واقعہ تو بتایئے۔ تجسس کیوں بڑھا رہے ہیں؟" میں نے کہا۔

"بات یہ ہے قیصر کل گو والیہ ٹینک کے پارک میں بیٹھا ایک نظم کے تخلیقی کرب میں مبتلا تھا کہ سامنے والی بنچ پر ایک نازک اندام حسینہ مجھے بڑی مستانہ اداؤں سے دیکھے جا رہی تھی": اختر بھائی نے کہا۔

"اور آپ؟" میں نے مسکراتے ہوئے دریافت کیا۔

"میں بھی اسے دیکھ رہا تھا": اختر بھائی نے شرما کر کہا۔

"مگر آپ نے تو اسے آدھا ہی دیکھا ہوگا؟" میں نے شرارتاً دریافت کیا۔

"وہ کیوں؟" اختر بھائی نے حیرت آمیز لہجے میں پوچھا۔

"آپ اپنی سوئی سوئی نیم وا آنکھوں سے پورا دیکھ بھی کیسے سکتے ہیں؟"

"بڑے شریر ہو۔" اختر بھائی نے معصومانہ لہجے میں کہا۔

"پھر کیا ہوا اختر بھائی؟" میں نے دریافت کیا۔

"وہ لڑکی جب مجھے دیکھتے دیکھتے مسکرا دی تو بے ساختہ میرے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ آگئی۔ اس کے بعد وہ لہراتی بل کھاتی میرے پہلو میں آکر بیٹھی میٹھی باتیں کرنے لگی۔ اس دوران جب میں اس کی کسی بات کا جواب دے رہا تھا کہ ایک بدمعاش لپکتا ہوا میرے سامنے آکر کھڑا ہو گیا اور لال پیلی آنکھیں کئے مجھ سے کہنے لگا۔

"تم کو ابھی میرے ساتھ پولیس اسٹیشن چلنا ہوگا۔ میری بیوی کو چھیڑنے کا وہاں مزہ آجائے گا۔ یقین مانو مجھے ایسا لگا جیسے زمین میں گڑا جا رہا ہوں۔ وہ تو خیریت ہوئی کہ گھڑی، قلم، انگوٹھی اور جتنے بھی روپے میری جیب میں تھے سب اس کے حوالے کر دیئے تو اس بدمعاش سے جان چھوٹی۔ یقین کرو اس دن سے میں نے کسی پارک میں بیٹھنا چھوڑ دیا ہے": اختر بھائی نے کہا اور وہ یکایک کسی خیال میں گم ہو گئے۔

ایک دن کا ذکر ہے۔ میں اسی آرکیڈیا بلڈنگ کے کمرے میں اختر بھائی کے پاس پلنگ پر بیٹھا تھا کہ انہوں نے بڑے مایوس لہجے میں کہا۔ "قیصر نینی تال سے صفیہ کا خط آیا ہے۔ لکھا ہے۔" موسم کی خوشگواری سے بچے خوش ہیں۔ ان کی مسرت کا خیال کروں تو آنا مشکل نظر آتا ہے۔ ورنہ میری نگاہیں تو ہر ذرہ میں تمہاری جو یا نظر آتی ہیں۔ دل میں جیسے ایک چور سا چھپا بیٹھا ہے کہ چٹکیاں لئے جاتا ہے۔ دو لوں راتیں تمہیں دیکھنے سے محروم ہوں، کہیں تم پریشان تو نہیں۔ اختر میں نے دو بار تمہیں خواب ہی میں دیکھا ہے۔

اختر بھائی ان دنوں بیمار تھے اور اس خیال نے کہ ان کی وفا کیش بیوی کی پریشانیاں اور بھی بڑھ جائیں گی وہ انہیں خط نہیں لکھ رہے تھے۔ لیکن اس بیمار زمانے میں بھی وہ صفیہ بھابی کے ان سارے خطوط کو ترتیب دینے پر مجبور رہتے تھے۔ جو "زیر لب" کے عنوان سے کتابی شکل میں جلد ہی منظر عام پر آنے والے تھے۔ اس سلسلے میں اختر بھائی نے اپنے کچھ ایسے دوست واحباب اور معتقدین کی ایک لمبی فہرست بھی تیار کی تھی جن سے فرداً فرداً وہ پانچ روپے وصول کرنے جا رہے تھے۔ کتاب کی پیشگی قیمت کے طور پر —

صفیہ بھابی بھوپال میں ہوں یا لکھنؤ میں۔ ہر روز اختر بھائی کو خط لکھتی جا رہی تھیں اور اپنے

میں اپنے شوہر اور محبوب کو تسلی دیا کرتی تھیں۔ حوصلہ بڑھایا کرتی تھیں۔ انہیں ہر وقت یہ خوف لگا رہتا تھا کہ کہیں ان کے اچھے اختر بیچارے اختر ناساعد حالات کا مقابلہ کرتے کرتے تھک نہ جائیں۔ انہیں اپنے دونوں بچوں جاوید (آج کے گراں ترین فلم رائٹر جاوید اختر) اور سلمان (جو امریکہ میں ڈاکٹر ہیں) کے مستقبل کی فکر بھی لگی رہتی تھی اور شاید اس فکر نے ان کی زندگی میں گھن لگانا شروع کر دیا تھا ان کی بیماری بڑھتی ہی جا رہی تھی۔

غالباً ۱۹۵۳ء میں جب اختر بھائی نے صفیہ بھابی کو علاج معالجہ کے لئے بمبئی بلا لیا تو ایک دن، مجھے ان سے نواب صاحب کے فلیٹ میں ملنے کا اتفاق ہوا تھا اور ان کی گرتی ہوئی صحت کو دیکھ کر مجھے بڑا دکھ ہوا تھا۔ زمانہ کے ہاتھوں ان کے رخساروں کے پھول بالکل کمھلا کر رہ گئے تھے پھر اس پہلی اور آخری ملاقات کے کچھ ہی دن بعد معلوم ہوا کہ اختر بھائی کے دکھ درد میں ہمیشہ ساتھ دینے والی صابر و شاکر بیوی چل بسی۔ اختر بھائی کا دل ٹوٹ کر رہ گیا اور انہوں نے ان کی موت پر ایک بڑی دردناک نظم کہہ ڈالی۔

"خاک دل":

لکھنؤ میرے وطن میرے چمن زار وطن
تیرے گہوارۂ آغوش میں اے جان بہار
اپنی دنیائے حسیں دفن کئے جاتا ہوں
تو نے جس دل کو دھڑکنے کی ادا بخشی تھی
آج وہ دل بھی یہیں دفن کئے جاتا ہوں
لکھنؤ میرے وطن میرے چمن زار وطن

کہتے ہیں وقت کا مرہم رفتہ رفتہ زندگی کے ہر زخم کو مندمل کر دیتا ہے۔ چنانچہ اختر بھائی کے ساتھ بھی ایسا ہوا۔ ایک دن میں آرکیڈیا بلڈنگ پہنچا تو وہ بڑے اچھے موڈ میں تھے۔ باتوں باتوں میں انہوں نے اپنے نئے عشق کی داستان چھیڑ دی۔ اس وقت مجھے ان کی ساری باتیں تو یاد نہیں لیکن اتنا ضرور یاد ہے کہ اختر بھائی کے اس نئے "رومانس" ایڈونچر میں ان کی محبوبہ دلشاد کی ایک چھوٹی بہن۔ بڑی خوبصورتی سے نامہ بر کا کردار ادا کیا تھا۔ غرض کہ یہ نیا عشق پروان چڑھتے چڑھتے ایک دن شادی میں تبدیل ہو گیا اور اس مرتبہ خدیجہ نام کی ایک دوسری حسین آگ ان کے گھر آنگن کو روشن کرنے لگی۔

زمانہ کروٹیں لیتا رہا اور وہ گیتوں کی دنیا میں جدوجہد کرتے ہی رہے۔ اسی طرح جب ۱۹۶۷ء کا سال آگیا تو ایک دن خلاف توقع گوئل سنے کارپوریشن کے دفتر میں آ پہنچے اور مجھے اپنے ساتھ کینٹین میں لے گئے جہاں چائے پیتے پیتے بولے۔

"قیصر میں ایک فلم بنانے کی کوشش میں ہوں اور چاہتا ہوں۔ میں آج اپنی وہ کہانی تمہیں سنانے آیا ہوں اور چاہتا ہوں کہ میرے اس پروجیکٹ میں تم میرا ساتھ دو لیکن جب گوئل صاحب (فلم ساز و ہدایت کار دیویندر گوئل) سے میری والہانہ وابستگی کے باعث انہوں نے میری طرف سے کوئی جوش و خروش نہیں دیکھا تو وہ مایوس ہو گئے اور پھر انہوں نے کسی دوسرے فلمی آدمی سے ناتا جوڑ لیا لیکن یہ سلسلہ جلد ہی ختم ہو گیا اور "بہو بیگم" (اشوک کمار، مینا کماری) انہوں نے ایم صادق کی ہدایت میں تنہا پروڈیوس کی جس میں انہیں فائدے کی بجائے نقصان ہوا۔ اور یہ ہونا ہی تھا۔ میں نے تو فلم سازی کے میدان میں شاید ہی کسی بڑے شاعر یا ادیب کو پھلتے پھولتے دیکھا ہو۔ بے چارہ شیلندر اسی میں مارا گیا

کیلنڈر کے اوراق بدل گئے اور ۱۹۷۴ء کا زمانہ آگیا تو ایک دن "ادبی سنگم" کے چوتھے سالانہ مشاعرے کے سلسلے میں شام کے وقت میں "ہریالیہ" جا پہنچا جہاں وہ اپنے ہم مشرب نوجوانوں کے ساتھ نہ جانے کب سے ناؤ نوش میں مبتلا تھے۔ اختر بھائی سے جب میں نے اپنے مشاعرے میں شرکت کی بات کی تو وہ بڑے خلوص اور پیار سے بولے: "تمہارا مشاعرہ ہے تو آنا ہی پڑے گا" اور میں خوش خوش وہاں سے چل دیا۔

مشاعرے کی تیاریاں زور و شور سے جاری تھیں کہ ایک دن کسی نے یہ خبر دی کہ اس تاریخ میں "سرسنگار سمسد" کا آل انڈیا مشاعرہ بھی ہو رہا ہے۔ میرے پاؤں تلے سے جیسے زمین سرک گئی۔ اب ہمارے مشاعرے کا کیا ہوگا؟ جاں نثار اختر صاحب کے علاوہ دوسرے مقامی شعراء بھی وہیں مدعو ہوں گے۔ اور وہ بھی با معاوضہ۔ میں فکر میں پڑ گیا۔ اور اس خبر کی تصدیق کے لئے پہلے تو اعجاز صدیقی مرحوم سے سرسنگار سمسد کے چیف برج نرائن جی کا ٹیلی فون نمبر لیا پھر اسی دن گھبراتے گھبراتے ان کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔ "ہلو ہلو جی میں برج نرائن جی سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"میں برج نرائن بول رہا ہوں۔ کہئے۔" دوسری طرف سے آواز آئی۔

"دیکھئے میرا نام قیصر عثمانی ہے۔ ہماری ایک چھوٹی سی انجمن ہے۔ ادبی سنگم۔ اس کا سالانہ مشاعرہ ۲۰ نومبر کو منعقد ہونے والا ہے۔"

"تو میں کیا کروں؟" برج نرائن نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"تو کیا آپ کا مشاعرہ بھی اس تاریخ میں ہو رہا ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

"آپ نے "سرسنگار سمسد" کا نام سنا ہے؟" میرے کانوں نے برج نارائن جی کا زہر میں بجھا ہوا یہ غیر متوقع فقرہ سنا تو میں نے جواب میں کہا: "آپ کی اس بات سے غرور کی بو آرہی ہے۔" اور میں نے غصے میں ریسیور زور سے پٹخ دیا۔

اس کے بعد مشاعرے کے دن شام کے تقریباً ۷ بجے تحسین سے حسن کمال نے مجھے فون پر اطلاع دی کہ عزیز قیسی اختر بھائی کے گھر میں دیر سے بیٹھے ہیں۔ وہ اپنے ساتھ انہیں "سرسنگار سمسد" کے مشاعرے کے لئے "رنگ بھون" لے جانا چاہتے ہیں۔ یہ سنتے ہی میرے دل کی رفتار تیز ہوگئی اور ایسا لگا جیسے ذہنی تناؤ کی وجہ سے مجھے بخار آنے والا ہے۔ میں نے پہلے تو اپنے فیملی ڈاکٹر سے کچھ دوائیں لیں پھر کھاروڈی کے علاقہ سے عزیز قیسی ہی کے تن و توش کے برابر کے ایک شاعر دوست مجاہد شولاپوری کو بلوایا اور انہیں یہ کہہ کر ٹیکسی میں روانہ کر دیا کہ کچھ بھی ہو جائے ہمارے مشاعرے میں جاں نثار اختر صاحب کو لانا ہی ہے۔ اس کے لئے کچھ بھی کرنا پڑے۔

بات دراصل یہ تھی کہ عزیز قیسی صاحب "ادبی سنگم" کے گذشتہ مشاعرے میں تشریف لائے تھے تو مشاعرے کے ختم ہونے کے بعد ملاڈ سے گورے گاؤں تک جانے کے لئے میں ان کے کنوینس (Conveyance) کا انتظام نہیں کر سکا تھا۔ ان کو اسی بات کا غصہ تھا۔ وہ مجھ سے بری طرح خفا ہوگئے تھے۔ انہوں نے شاید یہ قسم بھی کھائی تھی کہ اب وہ آئندہ ملاڈ کے مشاعرے میں کبھی شرکت نہیں کریں گے اور اب وہ اختر بھائی کو بھی ہمارے مشاعرے میں آنے سے روک رہے تھے۔ اس افسوسناک واقعہ کی جب یاد آتی ہے تو میں یہ سوچتا ہوں کہ اگر انسان باقاعدہ [illegible] کرنے کی

عادت ڈال لے تو زندگی میں بہت ساری غلط فہمیاں اور
تلخیاں کبھی پیدا نہ ہوں۔

جیسے جیسے گھڑی کی چھوٹی سوئی آگے بڑھ رہی
تھی میری حالت خراب ہوتی جا رہی تھی۔ میرا دل بیٹھا جا رہا
تھا۔ میرے فرستادے کو گئے ہوئے جب کافی دیر ہو گئی
اور مشاعرے کا وقت بالکل قریب آگیا تو میرا دل زور
زور سے دھڑکنے لگا۔ میں نے بیتابی کے عالم میں اختر بھائی
کا ٹیلی فون نمبر ڈائل کرنا شروع کر دیا۔ ادھر ٹیلی فون پر
خدیجہ بھابی تھیں جو میرے دریافت کرنے پر کہہ رہی تھیں۔

" وہ سب کے سب لڑتے جھگڑتے ابھی
ابھی سیڑھیوں سے اترے ہیں۔ اب
میں یہ نہیں کہہ سکتی کہ وہ آپ کے مشاعرے
میں پہنچیں گے یا رنگ بھون؟"

لیکن یہ اختر بھائی کی محبت، شرافت اور وضع داری
تھی کہ وہ میرے فرستادہ مجاہد سنڈولاپوری اور اپنے
سکریٹری صابر دت کے ساتھ ٹاؤن پہنچ گئے۔ ٹیکسی
پانی نگر گارڈن کے باہر کھڑی تھی۔ میں دوڑتا ہوا ان
کے پاس پہنچا تو ٹیکسی میں بیٹھے بیٹھے کہنے لگے۔

" قیصر بیٹے کا انتظام ہے یا نہیں؟
جب تک نہیں بتاؤ گے میں ٹیکسی
سے نہیں اتروں گا۔"

" اختر بھائی سب انتظام ہے"

سنتے ہی اختر بھائی کا چہرہ دمک اٹھا اور وہ جلدی
ٹیکسی کے باہر آ گئے۔

اسٹیج پر کرشن چندر، ظ۔ انصاری، نوشاد،
بلال آبادی، یوسف ناظم، قیصر الجعفری، اثر فیض
ی، حسن کمال دیگر شعرائے کرام پہلے سے جلوہ افروز
تھے اور مشاعرے کی کارروائی شروع ہو چکی تھی۔ تھوڑی دیر
بعد جب ناظم مشاعرہ حسن کمال نے اختر بھائی کا نام پکارا
تو وہ اپنے بکھرے بکھرے لمبے بالوں کو سنوارتے ہوئے
یا اور بگاڑتے ہوئے مائک تک آئے اور اپنا کلام اپنے
مخصوص رنگ میں سنانے لگے ۔۔ اختر بھائی جتنا اچھا
کہتے تھے اتنا ہی برا پڑھتے تھے۔ خوش گلوئی تو بہت
دور کی بات ہے۔ ان کے تحت میں پڑھنے کا وہ انداز بھی
نہیں تھا جو کیفی اعظمی، عزیز قیسی، کمار پاشی اور مظہر
امام کی شاعرانہ شخصیت کا طرۂ امتیاز ہے۔ بہر کیف اختر
بھائی کے پڑھنے میں کوئی حسن تھا یا نہیں ان کے کلام میں
وہ ضرور تھا جو ملک کے کونے کونے میں منعقد ہونے والے
مشاعروں کو اپنی طرف راغب کرتا تھا۔ مشاعرہ گیا
میں ہو یا لکھنؤ میں۔ حیدرآباد میں ہو یا دہلی میں۔ بھوپال
میں ہو یا سری نگر میں، وہ اپنی علالت اور کبرسنی کے باوجود
شرکت سے باز نہیں آتے تھے۔ زندگی کے آخری ایام
میں ان کی شاعری پر نکھار بھی خوب آ گیا تھا۔ لیکن یہ کتنا
بڑا المیہ ہے کہ "سلاسل"، "تار گریباں"، "نذر بتاں"
"جاوداں"، "پچھلے پہر" اور "گھر آنگن" کے محبوب شاعر
اور "یہ دل اور ان کی نگاہوں کے سائے" "آ جان وفا"
"جانے یہ کون میری روح کو چھو کر گذرا"، "آرزو کیا ہے
جستجو کیا ہے"، جیسے حسین گیتوں کے خالق حضرت
جاں نثار اختر آخری عمر تک فلمی دنیا میں کام کے لئے ترستے
رہے۔ مجروح اور ساحر کی طرح ان کی مانگ کبھی نہیں جبکہ
صرف بلانوشی بڑھتی گئی۔ نتیجہ ظاہر تھا۔ ان پہ کئی بار
دل کے دورے پڑے اور انہیں موت کی دستک سنائی
دینے لگی۔ چنانچہ انہیں پر نور لمحات میں "آخری لمحہ"
کے عنوان سے اختر بھائی نے اپنی بیٹی عنبرہ کے لئے ایسی

دردناک نظم کہیں جس کا تاثر مجھے یقین ہے کسی زمانے میں بھی کم نہیں ہو سکتا۔

تم مری زندگی میں آئی ہو
میرا اک پاؤں جب رکاب میں ہے
دل کی دھڑکن ہے ڈوبنے کے قریب
سانس ہر لحظہ پیچ و تاب میں ہے

اور بالآخر ۱۸ اگست ۱۹۷۶ء کو ایک ادبی جلسے میں یہ منحوس خبر سننے میں آہی گئی کہ جاں نثار اختر اس دنیا سے کوچ کر گئے۔

اختر بھائی کے انتقال کی خبر بمبئی کی ادبی دنیا میں آناً فاناً ہر طرف پھیل چکی تھی اور یکے بعد دیگرے "پریمالیہ" کے کمپاؤنڈ میں ان کے بے شمار چاہنے والے اپنا اپنا ماتمی چہرہ لئے ہوئے جمع ہو رہے تھے۔

جنازہ جب "پریمالیہ" کی دوسری منزل سے نیچے لایا گیا تو نہ جانے کتنی آنکھیں یک بارگی چھلک پڑی تھیں۔ اور پھر کچھ دیر بعد اختر بھائی کے جسد خاکی کو سانتا کروز کے قبرستان میں دفن کر کے لوگ واپس جانے لگے تو دل شکستہ ساحر لدھیانوی نے بھرائی ہوئی آواز میں مجھ سے چلتے چلتے کہا۔

"آج ہم لوگ اختر کو یہاں چھوڑ کر جا رہے ہیں
کل یہیں کچھ لوگ مجھے چھوڑنے آئیں گے۔"

اور بے ساختہ میری زبان پر یہ شعر آگیا

موت سے کس کو رستگاری ہے
آج اس کی کل اپنی باری ہے

جواب کے لئے ڈاک ٹکٹ ضرور ارسال کریئے

بقیہ :- بوجھ

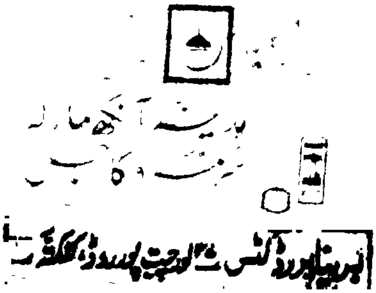
تمہارا اور صرف تمہارا
شمیم

خط تہہ کر کے میں نے اسے تکیہ کے نیچے رکھ دیا۔ اور خاموشی سے تپائی پر رکھے آج کے تازہ اخبار کو اٹھا لیا۔

ایک تصویر دیکھ کر میں چونک پڑا۔ تصویر کے نیچے لکھا تھا۔ یہ ایک پاگل انسان ہے جو پاگل خانہ سے فرار ہو گیا، جس کو بھی نظر پڑے وہ اطلاع کرے

غور سے دیکھنے پر یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ یہ تصویر اسی شمیم کی ہے جو مرتے مرتے ہم دونوں پر ایک عظیم احسان کر گیا ہے۔

میرا ذہن یہ قبول کرنے سے قاصر تھا کہ وہ مسیحا صفت انسان پاگل کیسے ہو سکتا ہے۔



اظہر نیر

ڈاکٹر کرامت علی کرامت سے ایک ملاقات

[ڈاکٹر کرامت علی کرامت اُردو کے ممتاز شاعر اور نقاد ہیں۔ صوبہ اڑیسہ کو پوری اُردو دنیا کے سے مربوط و منسلک کرنے کے سلسلے میں انھوں نے سب سے اہم رول ادا کیا ہے۔ انھوں نے اپنے تنقیدی مضامین کے ذریعہ اُردو میں صالح اور صحت مند جدیدیت کو فروغ دیا۔ موصوف شعری تنقید میں نظریہ اضافیات کے بانی ہیں۔ جو زمانے ادب کے لئے ایک نئی چیز ہے۔ "آزاد غزل" کے بانی مظہر امام نے انھیں آزاد غزل کا پہلا نظریہ ساز قرار دیا ہے۔ ابھی حال میں ان کی منتخب نظموں کا انگریزی ترجمہ THE STORY OF THE WAY AND OTHER POEMS کے نام سے شائع ہوا ہے۔ جسے بیرون ممالک میں بے حد پذیرائی نصیب ہو رہی ہے۔ خصوصاً تخلیقی سطح پر انھوں نے سائنسی اور شعری حیات کو بھی انداز سے یکجا کرنے کی کوشش کی ہے، اسے سب لوگوں نے ایک نیا تجربہ قرار دیا ہے۔ کرامت علی کرامت صاحب سے اظہر نیر نے جو انٹرویو لیا ہے اسے ذیل میں شائع کیا جا رہا ہے۔] (ادارہ)

اظہر نیر :- جناب کرامت علی کرامت صاحب آپ کو اردو ادب میں شاعر و نقاد کی حیثیت سے لوگ جانتے ہیں۔ پہلا سوال اس سلسلے میں کہ [illegible] ذرا بتائیے کہ اردو کی کس صنف نے آپ کو سب سے زیادہ متاثر کیا ہے نیز یہ کہ کیا اردو کی ایسی صنف ہے جسے آپ عالمی ادب کے عظیم کارناموں کی صنف میں جگہ دے سکیں گے؟

کرامت :- اردو کی ہر صنف میں کچھ نہ کچھ اچھی چیز مل جاتی ہے اس کے جمالیاتی پہلو [illegible] متاثر کرتی ہے۔ متاثر کرتی ہے اس میں کسی مخصوص صنف کی قید و بند نہیں۔ کبھی کبھی بہت معمولی [illegible] ادیبوں کے قلم سے بھی ایسی چیزیں [illegible] جاتی ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ کسی صنف کی کامیابی کا راز اس کو برتنے والے فنکار کی تخلیقی صلاحیت پر منحصر ہے۔ اس مخصوص صنف پر نہیں۔ آپ عالمی ادب کے عظیم کارناموں کے لئے کیا معیار مقرر کریں گے؟ عالمی ادب کا معیار ہر وقت [illegible] جاتا [illegible] ایسی [illegible] کیا آپ [illegible]

پانے والوں میں سے کتنوں کے نام مجھے یا آپ کو یاد ہیں ؟ میرے خیال میں پانچ یا چھ سے زیادہ نہیں۔ اگر اقبال کو نوبل پرائز نہیں ملا تو اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ وہ دوسرے نوبل پرائز پانے والوں سے کمتر درجے کے شاعر تھے۔ میری رائے یہ ہے کہ کسی مخصوص صنف کے بجائے ہمارے ادب کی ہر صنف میں کچھ نہ کچھ چیزیں مل جائیں گی۔ جنھیں ہم بین الاقوامی ادب کے سامنے فخر کے ساتھ پیش کر سکتے ہیں !!

ا۔ن ۔۔ آپ اردو غزل کے ایک معتبر استاد شاعر ہیں۔ صنفِ غزل کو اردو شاعری کی آبرو کہا گیا ہے ۔ اس کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے ؟ یہ بھی بتانے کی زحمت گوارا کریں کہ اردو کی جدید نسل کی غزل کس طرح اپنے پیش رو جدید شاعروں کی غزل سے مختلف ہے ؟

ک۔ح۔ک ۔۔ میں اپنے آپ کو اردو غزل کا استاد نہیں، اردو غزل کا ایک طالب علم سمجھتا ہوں۔ ہمیں اس امر پر غور کرنا ہے کہ ہم صرف صنفِ غزل کو اردو شاعری کی آبرو کہہ کر کہیں دوسری اصنافِ سخن کی توہین تو نہیں کر رہے ہیں ؟ ہمارے ادب میں مثنوی، قصیدہ، رباعی اور نظم کی روایت اس قدر مستحکم ہے کہ اسے کسی صورت نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ میری رائے میں ہر صنفِ سخن کی اپنی اہمیت ہوتی ہے۔ اور پھر غزل میں قافیہ پیمائی جس قدر سہل ہے معنی آفرینی اسی قدر مشکل۔ اس لئے تمام اصنافِ سخن سے اچھی تخلیقات کا انتخاب کر کے انہیں یکجا کر دیا جائے تو یہ انتخاب ہی ہماری شاعری کا آبرو کہلا سکتا ہے۔ جہاں تک آپ کے دوسرے سوال کا تعلق ہے ۔ میں سمجھتا ہوں کہ جدید تر شاعروں نے ابھی تک اپنے پیش رو کی بت شکنی نہیں کی ہے ۔ جہاں تک تکنک کا سوال ہے جدید تر شاعروں نے اپنے پیش رووں کی تکنک سے انحراف کرنے کے بجائے اس کی توسیع کی ہے ۔ البتہ موضوع کے اعتبار سے زندگی کے بعض مثبت پہلو بھی ابھر کر سامنے آئے جو ایک فال نیک ہے ۔ بعض جدید تر شاعروں میں تو بے پناہ تخلیقی صلاحیت موجود ہے لیکن ان کو ابھرنے کا موقع نہیں مل رہا ہے۔ اس کا واحد سبب یہ ہے کہ ان پر ابھی نقادوں کی نظرِ عنایت نہیں پڑی ہے اور ان پر بھرپور مضامین لکھے نہیں گئے ہیں ۔

ا۔ن ۔۔ وہ تنقید کون سی ہوگی جو جدید تر شاعری کے افہام و تفہیم میں معاون ثابت ہوگی ؟ یعنی نئی نسل کو کس قسم کی تنقید درکار ہے۔

ک۔ح۔ک ۔۔ ہر دور کی تجرباتی شاعری اپنے دور کے نقادوں کو بھی اپنے ساتھ لاتی ہے ہمارے دور کے نقادوں یعنی میرے ہم عصر نقادوں کے بعد جدید تر دور کا کوئی بھی نقاد پیدا نہیں ہوا ۔ کوئی نیا شاعر اپنا شعری مجموعہ چھپواتا ہے تو ہم لوگوں سے یا ہم سے سینئر نقادوں سے پیش لفظ لکھواتا ہے ۔ آخر ایسا کیوں ؟ اس شاعر کے معاصرین میں سے کوئی نقاد کیوں نہیں پیدا ہوتا جو اس شاعر کی شعری حیثیت کو منوائے ؟ ایسا جب تک نہ ہو سکے گا تب تک جدید نسل اپنی الگ ادبی شناخت بنا نہیں پائے گی ۔ فوری طور پر اس بات کی

ضرورت ہے کہ ان ناقہ ہائے بے زمام کو موڑے فنکار لاکر "نئے دستخط" (یا اس قسم کے کسی دوسرے نام سے) جدید تر شاعری کا ایک نمائندہ انتخاب شائع کیا جائے تاکہ اس کا صحیح خدوخال سامنے آسکے۔

ف۔ن :۔ کرامت صاحب! آپ مشورہ دیجئے کہ تنقید کے میدان میں قدم جمانے کے لئے نئے نقادوں کو کیا کرنا ہوگا؟

ک۔ع۔ک :۔ صحیح معنوں میں نقاد بننے کے لئے محض اردو، فارسی اور سنسکرت کے تنقیدی سرمائے کا مطالعہ کافی نہیں۔ انگریزی کی جدید تر تنقید کے پہلو بہ پہلو مختلف علوم جدیدہ پر بھی گہری نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔ گزشتہ چند سالوں میں مغربی تنقید میں بڑی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں لیکن ان نئے اصولوں کو اردو کی جدید تر شاعری پر ہو بہو منطبق کرنے سے کام نہیں چلے گا۔ بلکہ ہندوستانی مزاج کو مد نظر رکھتے ہوئے علوم جدیدہ کی روشنی میں [illegible] نکالنا ہوگا۔ اس کے لئے کافی مطالعہ، ذہانت اور [illegible] کی ضرورت ہے!!

ف۔ن :۔ [illegible] آپ کی کیا رائے ہے؟ آزاد غزل اگر اب تجربے کے مرحلے سے بہت آگے نکل گئی ہے تو پھر رسالوں میں بحثیں کیوں ہوتی رہتی ہیں؟

ک۔ع۔ک :۔ ظہیر صاحب۔ آپ ایک ایسے شخص سے آزاد غزل کے بارے میں رائے پوچھ رہے ہیں جو بقول مظہر امام "آزاد غزل کا پہلا نقش ساز" ہے میرا کہنا ہے کہ اگر آزاد غزل آپ کی تخلیق ذات سے میل کھاتی ہے۔ تو فطری تقاضے کے تحت اسے ضرور لکھئے۔ ورنہ بالکل لکھنے کی ضرورت نہیں۔ آزاد غزل کی بھی چند فنی پابندیاں ہوتی ہیں۔ لیکن آج کل کے نو مشق اور نو آموز شعراء آزاد غزل کے نام پر بحور و اوزان سے خارج چیزیں بھی لکھ دیتے ہیں۔ انھیں مدیر حضرات شائع کر دیتے ہیں۔ اس سے کم از کم مجھے بڑی ذہنی کوفت ہوتی ہے۔ کسی چیز کی مخالفت اس چیز کی مقبولیت کی ضامن ہوا کرتی ہے۔ رسالوں میں آزاد غزل سے متعلق مباحثوں کا جاری رہنا اس صنف کی مقبولیت کی دلیل ہے۔ "صنف غزل نیم وحشی صنف سخن ہے کہ نہیں؟" کیا اس مسئلے پر رسالوں میں بحث کا دروازہ بند ہو چکا ہے؟ اسی طرح آزاد غزل پر بھی بحث جاری رہے گی۔

ف۔ن :۔ کرامت صاحب! ابھی حال میں آپ کی منتخب نظموں کا جو انگریزی ترجمہ THE STORY OF THE WAY AND OTHER POEMS کے نام سے شائع ہوا ہے اس کی مقبولیت کے بارے میں کچھ بتائیے؟

ک۔ع۔ک :۔ یہ کتاب صرف دو مہینے پہلے شائع ہوئی ہے لیکن اس کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ اس کی ایک نظم Quatrains [illegible] یونیورسٹی امریکہ کی جانب سے INTERNATIONAL POETRY YEAR BOOK 1990 میں شامل ہو [illegible] ANTHOLOGY OF INTERNATIONAL POETRY 1991 [illegible] ہو چکی ہیں۔ ہندوستان میں [illegible] نریندر پال سنگھ [illegible] (By [illegible]) [illegible]

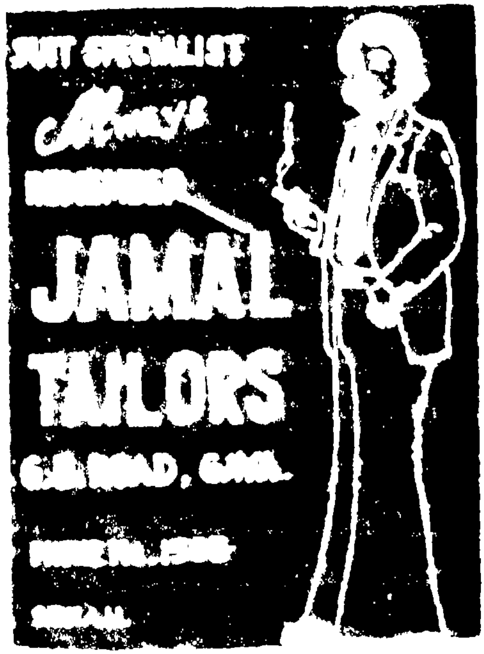
(مدیر ([illegible]) کملیش نراین مہاپاترا (مدیر POETRY [illegible]) نرنجن مہانتا (مدیر POETRY) شیلیندر نارائن ترپاٹھی (مدیر POESIE) وغیرہ نے بھی اس مجموعے کو بے حد پسند کیا ہے۔ INDIAN EXPRESS میں منشا راکھور نے اس پر بہت اچھا تبصرہ کیا ہے۔ بیرونی ممالک کے وسائل میں بھی اس پر رفتہ رفتہ تبصرے آ رہے ہیں۔ اس مجموعے نے ڈاکٹر وزیر آغا کو اس قدر متاثر کیا ہے کہ انہوں نے میری انگریزی نظم THE STORY OF THE [illegible] ۔ "اوراق لاہور" میں شائع کرنا چاہتے ہیں۔ اسے رسل نے جو اس کتاب کا پیش لفظ لکھا ہے وہ بھی وزیر آغا صاحب کو اس قدر پسند آیا کہ اس کا اردو ترجمہ "اوراق" میں شائع کرنا چاہتے ہیں۔ بہرکیف اس سلسلے میں جو کچھ بھی ہوا ہے یا ہو رہا ہے وہ "بزور بازو نیست" !!

(الف) :- جناب کرامت صاحب! اب آپ سے ایک آخری سوال ہے۔ بتلائیے ان دنوں آپ کیا کچھ لکھ رہے ہیں؟

کرامت :- اس وقت "ریاضیاتی لسانیات" MATHEMATICAL LINGUISTICS - پر کام کر رہا ہوں۔ ایک مدت سے صرف غزل کہتا رہا تھا۔ نظموں کی طرف توجہ نہیں دی تھی۔ اب غزل کے پہلو بہ پہلو نظم گوئی کی طرف بھی توجہ دے رہا ہوں۔ کیونکہ نظموں کے انگریزی ترجموں کی مقبولیت نے میرا کافی حوصلہ بڑھایا ہے۔ میں اپنی تازہ نظموں کے انگریزی ترجمے بیرونی ممالک کے رسائل کو بھی اشاعت کے لئے بھیجنا چاہتا ہوں تاکہ میری آواز دور دور تک پہنچے۔ ایک طویل عرصے سے میرا کوئی شعری یا نثری مجموعہ شائع نہیں ہوا۔ ایک شعری مجموعہ اور ایک تنقیدی مضامین کا مجموعہ مرتب کر رہا ہوں۔ دیکھئے یہ کتاب کب تک چھپتی ہیں۔ چند دوست و احباب کی کتابوں پر پیش لفظ لکھ رہا ہوں یا کتابیں چھپنے پر کسی رسالے میں تبصرے کر دیتا ہوں !!

(الف) :- جناب! میں نے آپ کا کافی وقت لیا۔ معذرت خواہ ہوں۔ اب آپ اجازت دیجئے۔ خدا حافظ

کرامت :- آپ کا شکریہ، خدا حافظ !!



ایک نظم زیبا کے نام

فردوس گیاوی

اس شمارہ میں فردوس گیاوی کی کئی تخلیقات محض اس وجہ سے پیش کی جارہی ہیں کہ سہیل کے قارئین اس فنکار کی صحیح تخلیقی شخصیت سے واقف ہوسکیں۔ لگا ہے گا ہے ایک آدھ تخلیقات سے لبا اوقات فنکار کے خوب وزشت کا اندازہ نہیں ہوسکتا ـ اس طرح تو محض اسی تخلیق کی کامیابی یا ناکامی کا اندزہ لگایا جاسکتا ہے ـــــ اور ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ کسی ایک ناکام یا کامیاب تخلیق پر فنکار کے بُرے یا اچھے ہونے کا اطلاق نہیں کیا جاسکتا۔

گویا بہ یک وقت کئی تخلیقات پیش کر کے سہیل ایک فنکار کی صحیح شخصیت کے مطالعہ کی دعوت دے رہا ہے ـــ ہم فردوس گیاوی کے خوب وزشت کا ذکر کر کے اپنی رائے لادنا بھی نہیں چاہتے، اچھا ہے کہ ہماری رائے کے بغیر آپ اپنا تاثر قائم کریں ـــ ہم صرف اتنا کہہ کر بس کرتے ہیں کہ فردوس گیاوی الفاظ کے استعمال میں جری اور بے باک ہیں، ادھر اُدھر بکھرے ہوئے اکثیل الفاظ کو جوڑ کر تخلیق کا گھروندا بھی بنایا جاسکتا ہے اور تاج محل بھی۔ فردوس گیاوی کیا کر پائے ہیں اس کا فیصلہ آپ کریں مگر خیال یا احساس کو چاہے وہ کسی درجہ کا بلند یا شدید ہو ایک پیکر میں ڈھالنا بھی ایک آرٹ ہے۔ فردوس گیاوی کو اسی روشنی میں سمجھنا چاہئے۔ (ادارہ)

تجھ کو چاہا ہی نہیں تیری عبادت کی ہے
کس عقیدت سے صنم میں نے محبت کی ہے

کچھ بھی منظور نہیں اب تیری چاہت کے سوا
(۱) کوئی مقصد ہی نہیں تیری محبت کے سوا
دولت دیں ہے تو دولت ایماں تو ہے
کوئی صورت نہیں اچھی تیری صورت کے سوا

تیری زلفوں میں ہے پوشیدہ گھٹا ساون کی
(۲) تیری سانسوں سے نکلتی ہے مہک چندن کی
بجلیاں ہیں تیرے نازک سے بدن میں جاناں
ہر ادا سے تیری، رونق ہے میرے گلشن کی

کوئی پوچھے تو بتاؤں کہ ہے کیسی زیبا
(۳) رنگ پھولوں کا لئے پھرتی ہے پیاری زیبا
تیرا چہرہ ہے مقدس سا صحیفہ کوئی
بندگی بعد خدا کرتا ہوں تیری زیبا

جان دل، جان جگر جان تمنا زیبا
(۴) میری رگ رگ میں ہے تیرا ہی سراپا زیبا
یوں نہ مغموم رہا کرا ے میری جان غزل
دل میں طوفان سا ہو جاتا ہے برپا زیبا

(۵) کس طرح بھولوں تجھے مجھ کو بتا اے زیبا
دور رہ کر نہ اس درجہ ستا اے زیبا
ابھی جا توڑ کے بے ہودہ سماجوں کی فصیلیں
اس طرح بیٹھ کے آنسو نہ بہا اے زیبا

اک نہ اک روز یہ حالات بدل جائیں گے
(۶) جو مصائب ہیں اکھا سر پہ وہ ٹل جائیں گے
پیار کی جیت تو ہو کر ہی رہیگی فردوس
دل کے ارمان بھی اک روز نکل جائیں گے

غزلیں

یہ سچ نہیں! کہ تمازت سے ڈر گئی ہے ندی
سکون دل کے لئے اپنے گھر گئی ہے ندی
ابھی تو پہنے ہوئی تھی لباس خاموشی
یہ کیا ہوا کہ اچانک بپھر گئی ہے ندی
ہمیں یہ ڈر ہے کہ پھر سے بپھر نہ جائے کہیں
قدم بڑھاؤ کہ اس وقت اتر گئی ہے ندی
وہ شخص تڑپا نہ چلّایا اور مر بھی گیا
پتا چلا نہیں کب وار کر گئی ہے ندی؟
نہیں ملی جو رفاقت کسی سمندر کی
تو ریزہ ریزہ سی ہو کر بکھر گئی ہے ندی
نہ جانے آج تو اتنی ملول سی کیوں ہے
یہ کیا ہوا کہ تری آنکھ بھر گئی ہے ندی
سنا سنا کے غموں کی کہانیاں فردوس
مجھے تو اور بھی غمگین کر گئی ہے ندی

اب کیا بتاؤں شہر یہ کیسا لگا مجھے
ہر شخص اپنے خون کا پیاسا لگا مجھے
خفگی ہو یا جفائیں ہوں یا مہربانیاں
ہر رنگ چشم ناز کا اچھا لگا مجھے
دیکھا جو غور سے تو وہ جھونکا ہوا کا تھا
تم خود ہی چھو کے آئی ہو ایسا لگا مجھے
وہ شخص جس سے پہلے کبھی آشنا نہ تھا
نزدیک سے جو دیکھا تو اپنا لگا مجھے
یوں بھی ملے گی منزل جاناں یقیں نہ تھا
وہ سامنے کھڑے ہیں بھی اک سپنا لگا مجھے

کوئی سایہ یہاں نہیں ملتا
دھوپ میں سائباں نہیں ملتا
کھینچ دی جب لکیر دوری کی
فرش سے آسماں نہیں ملتا
ہم کہیں کس سے اپنے دل کی بات
کوئی بھی ہم زباں نہیں ملتا
ہر طرف دشمنوں کے ڈیرے ہیں
اب کوئی مہرباں نہیں ملتا
شہر جلسا تو شور ہے ہر سو
دل جلا تو دھواں نہیں ملتا
ایسی کشتی کا بس خدا حافظ
جس کو اک بادباں نہیں ملتا
کس طرف جائیں ہم کہاں ڈھونڈیں
کہیں تیرا نشاں نہیں ملتا
چلو فردوس اس جگہ سے چلو
کچھ سکون اب یہاں نہیں ملتا

فردوس گیاوی

پھر کبھی یہ خطا نہیں کرنا
سب سے ہنسی کرلا نہیں کرنا
بھیس بدلے درندے پھرتے ہیں
راہ تنہا چلا نہیں کرنا
وگ تیری ہنسی اڑائیں گے
ل کی باتیں کہا نہیں کرنا
بدلتا ہے رنگ موسم سا
بھی اُسے وفا نہیں کرنا
مرے واسطے کبھی اے دوست
ندگی کی دعا نہیں کرنا
اس لب پہ لئے گذر جانا
شنگی کا گلہ نہیں کرنا
رو دلوار کبھی رلاتے ہیں
میں تنہا رہا نہیں کرنا
ندگی ملتی ہے فقط اک بار
ندگی کو خفا نہیں کرنا
تقدیر خود بناتا ہوں
کو آتا نہیں ہے کیا کرنا
کی تصویر خط میں رکھ دینا
ت دل کی لکھا نہیں کرنا
ہوں انساں بھٹک بھی سکتوں
سے تنہا ملا نہیں کرنا
حد میں رہا کرو فردوس
سے آگے بڑھا نہیں کرنا

فردوس گیاوی

دن ڈھلے تک رہے ہم لوگ کہاں مت کہنا
اور جو بات ہوئی ہم میں عیاں مت کہنا
فیصلہ کوئی بھی تم سوچ سمجھ کر کرنا
جلد بازی میں کسی بات پہ ہاں مت کہنا
حد سے کر جائے تجاوز نہ کہیں اس کا غرور
اپنے محبوب کو تم جان جہاں مت کہنا
وہ تو پہلے سے ہی افسانہ کا جادوگر ہے
بھول کر بھی اسے گونگے کی زباں مت کہنا
آگ کو آگ دھواں کو بھی دھواں کہہ دینا
بات کوئی بھی ہو بے نام و نشاں مت کہنا
بات سے بات جو نکلی ہے تو اک بات سنو
بات جو دل کی نہ سمجھے اسے جاں مت کہنا
اس سے نقصان کا امکان بہت ہے فردوس
سب کے آگے کبھی روداد فغاں مت کہنا

قصور اس کا ہے خود کو مگر سزا دوں گا
یہ حوصلہ بھی زمانے کو بھی دکھا دوں گا
ابھی نہ چھیڑ خدارا خموش رہنے دے
پڑا جو وقت تو اسے زندگی سزا دوں گا
کمر نہ دوں گا تجھے اس کا ہے ملال مجھے
میں با تجھ کو سہی پھر بھی اسے دوں گا
ابھی شکستہ کھلونے سے دل کو بہلا لے
بڑا ہوا تو کھلونا تجھے نیا دوں گا
خدا کے واسطے مجھ سے نہ رکھ خوشی کی امید
بس ایک غم ہے بجز اس کے اور کیا دوں گا
اب آرزو نہیں فردوس زندہ رہنے کی
جو زہر دے گا مجھ میں اسے دعا دوں گا

غزلیں

شاہدہ عزیز

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے

کبھی تنہائیوں کے سرد جنگل میں
ہوائیں تیز چلتی ہیں
کوئی بھولا ہوا لمحہ
کوئی بچھڑی ہوئی ساعت
کوئی پرچھائیں .....
میرے پاس سے ہو کر
گزرتی ہے ....
کبھی ایسا بھی ہوتا ہے
کہ برسوں تک
کوئی موسم نہیں آتا
وہی اک سوکھا دریا
جسم کے اندر اترتا ہے

سوکھا

بستیاں اپنے سر پہ
اٹھائے ہوئے لوگ جانے لگے
کھیتوں نے حسرت سے دیکھا انہیں
منڈیروں کی آنکھوں میں
کانٹے اُگے ....
راستے ان کے پیروں سے
لپٹنے لگے۔
سورجوں کی برستی ہوئی آگ میں
ننھی منی صدائیں جھلسنے لگیں
بستیاں اپنے سر پہ اٹھائے ہوئے
لوگ بھاگے مگر .....
نہ جانے کہاں پانیوں کا شہر ؟
نہ جانے کہاں پانیوں کا شہر ؟

غزلیں

منیر سیفی

وہ آسمانوں میں سورج لپیٹ دیگا پھر
بکھیر دیگا ستارے شمار کرتا ہوا

بس ایک پھونک میں سب جی اٹھیں گے جیسے کہ
سفر میں گھر کا کوئی انتظار کرتا ہوا

اسے اٹھا کے گلے سے لگا لیا میں نے
گرا جو سامنے پیچھے سے وار کرتا ہوا

محاذ جنگ پہ جانے سے قبل اک فوجی
پھپھک کے رو پڑا بچوں کو پیار کرتا ہوا

کہ سرحدوں پہ بھی ہوتا ہے میرا استحصال
وہ سوئے چین سے میں جاں نثار کرتا ہوا

نعمان شوق

سچائی کی بستی سے یا خواب نگر سے آئے گا
مجھ کو بھی معلوم ہے پہلا میر کدھر سے آئے گا

کیسے کیسے دریا دیکھ رہے ہیں ان ہونٹوں کا خواب
اس کی پیاس کا رشتہ کب معمولی گھر سے آئے گا

سب کے سب یہ سوچ کے خوش ہیں پھل کی آس لونڈی گی
بچے کب یہ جان رہے ہیں سنگ شجر سے آئے گا

سب منظر سے خائف ہوں گے لیکن دیکھ رہے ہوں گے
لطف تو یہ ہے ان کو مزہ بھی اس منظر سے آئے گا

پیکر کے ہر رنگ کو آنکھوں میں بھر لے جائیں گے لوگ
ایسا بھی شہکار کسی دن دست ہنر سے آئے گا

ماضی چاہے جو بھی رہا ہو حال تو سب کے سامنے ہے
اجڑے گھر کا رشتہ بھی ویران کھنڈر سے آئے گا

ڈاکٹر حنیف ترین

نشہ کرنے کا بہانہ ہو گیا
جب ذرا موسم سہانا ہو گیا

تجھ سے ملتا تو کہاں اے جانِ جاں
تجھ کو دیکھے اب زمانہ ہو گیا

مڑ کے دیکھا جب بھی پیچھے کی طرف
"آج" "دھندلا" "کل" فسانہ ہو گیا

گلستاں زادے بہت ہی شاد ہیں
جب سے زنداں میں ٹھکانہ ہو گیا

بیعت حق کی غلاموں کے واسطے
خوں بہانے کا بہانہ ہو گیا

سچ لکھوں گا چاہے مٹ جاؤں حنیف
جھوٹ اب میرا نشانہ ہو گیا

ج.ف.کول

دل پژمردہ سے گھبرائیں کیوں ہم؟
جو گھبرائیں تو پھر اترائیں کیوں ہم؟
نقدر موتی تو سونا حال دل ہے
چلیں گے جام حرم کترائیں کیوں ہم؟
نہیں ہو کوئی اپنا اس جہاں میں
محبت یار میں چلائیں کیوں ہم؟
مرے سینے پہ تیرے تیر برسیں
جلال عشق سے تھرائیں کیوں ہم؟
مجھے تو حادثوں نے زیست بخشی
مٹے کب زندگانی تھکائیں کیوں ہم؟
میں تنہا کے لبستہ نہیں اے دوست
جگر ہے جام جم چھلکائیں کیوں ہم؟
مجھے ہو کیوں شکایت قسمتوں کی؟
عقابی بال و پر کٹوائیں کیوں ہم
حبیب شاعر نہیں، اے محرم جاں فرید
ہیں شہید ازل پھر مسکائیں کیوں ہم؟

خورشید ہاشمی

دکھیاروں کی عید

مہنگائی میں عید ہے آئی کیسے مناؤں عید سکھی
چینی مہنگی، دودھ ہے مہنگا کیسے مناؤں عید سکھی
بندیا مہنگی چوڑی مہنگی، ساری ہے ملیوان سکھی
بھاؤ چلا آکاش کو چھونے کیسے مناؤں عید سکھی
ساجن تھے پردیس گئے پر اب تک لوٹ نہ پائے ہیں
عرصہ گذرا خبر نہ آئی کیسے مناؤں عید سکھی
اب کے بگیا میں ہریالی پہلی جیسی آ نہ سکی
آج تلک کوئل نہ کوکی کیسے مناؤں عید سکھی
دل ہے سونا آنگن سونا، گھر باہر سنسان سکھی
قدم قدم پر دہشت برسے کیسے مناؤں عید سکھی
گھر گھر میں انجانی نفرت، خوف بہت ہی جاگا ہے
آئے دن تو گھر جلتے ہیں کیسے مناؤں عید سکھی
کون محافظ، کون مسیحا، کس سے ہے فریاد سکھی
اپنے تو سب آس ہی لوٹے، کیسے مناؤں عید سکھی

ہر گھر میں خورشید ہے روشن گھپ اپنا گھر سارا ہے
اب بجلی بھی کم ترسیلے ہے، کیسے مناؤں عید سکھی

مشرف عالم ذوقی

ایک کمیونسٹ کی موت

جس وقت کامریڈ نور محمد اسپتال لایا گیا اس کی لگ بھگ آدھی سانس اکھڑ چکی تھی۔ جسم کا کوئی بھی حصہ ثابت نہیں بچا تھا۔ دماغ کا آدھا گوشت تک باہر آگیا تھا۔ اس کے بچنے کی گنجائش بہت کم رہ گئی تھی۔ اور جس وقت کامریڈ نور محمد کو اسٹریچر پر لٹا کر ایمرجنسی وارڈ میں داخل کیا گیا ـــ وارڈ سے باہر آسمان کو گھورتی ہوئی دو آنکھیں تھیں، دو عجیب سی آنکھیں ـــ نہ یہ آنکھیں سہمی تھیں۔ نہ ان میں خوف و ہراس تھا بلکہ ان آنکھوں پر آسانی سے کسی کو بھی پاگل ہونے کا شبہ ہو سکتا تھا۔

یہ سالک رام تھا ـــ درمیانہ قد۔ دبلا پتلا جسم۔ زرد رنگ دھنسے ہوئے گال، سانولا چہرہ۔ چھوٹی چھوٹی آنکھیں ایک میلا کرتا پائجامہ اور آدھی گھسی ہوئی ہوائی چپل پیروں میں ڈالے ـ سر کے بال ابھرے ہوئے۔ داڑھی بے ترتیبی سے بڑھی ہوئی۔ پھر یوں ہوا کہ اس کے بدن میں تیزی سے حرکت ہوئی۔ دونوں ہاتھ آپس میں التجا کرنے کے انداز میں اٹھ گئے۔ گلے سے عجیب عجیب رونے کی آواز نکلی اور وہ آس پاس کھڑے لوگوں کے سامنے جا جا کر ہاتھ جوڑ کر کہنے لگا ـ ـ ـ

" تم لوگوں نے نور محمد کو کیوں مارا بھائی۔ میں سچ کہتا ہوں وہ مسلمان نہیں تھا۔ میری بات کا یقین کرو لوگو ـ ـ ـ وہ مسلمان نہیں تھا ـــ وہ مسلمان نہیں تھا ـــــ

" چلو چلو ـ ـ ـ کسی نے جملہ کسا ـ ـ ـ کوئی پاگل ہے "

سالک رام نے گھور کر دیکھا ـ ـ ـ اندر سے نفرت کی ایک تیز لہر اٹھی ـ ـ اس نے کچھ بولنے کی کوشش کی تو اسے لگا، اس کے منہ سے کتے جیسی بھنبھناہٹ جیسی نکل رہی ہوں۔ دانت نوکیلے اور سخت ہوگئے ہوں۔ وہ کسی کی طرف بھی لپک سکتا ہے۔ کسی کو بھی کاٹ سکتا ہے ـ ـ ـ اچانک اس کے گلے سے ایک گھڑگھڑاتی ہوئی چیخ نکلی۔ اس کے پہلے کہ دوسرے لوگ متوجہ ہوں، وہ تیزی سے بھاگتا ہوا گیٹ کھول کر باہر نکل گیا۔

سالک رام جس وقت باہر آیا تیز تیز آندھیاں اٹھ رہی تھیں۔ وہ سب کچھ دیکھ رہا تھا

سارے منظر صاف صاف تھے .... ایک چھوٹا سا گھر، چارپائی بھی ہے۔ کھاٹ پر ننگے بدن اس کا باپ بیٹھا ہے سر منڈا ہوا ہے۔ پیچھے بالوں کی ایک چھوٹی سی چٹیا لٹک رہی ہے۔

سالگ رام ـــ برف جیسے سرد الفاظ اس کے کانوں میں اترے .... اشنان کر لیا، سالگ رام ... سندر ہو گئے .... پھر شلوکوں کا جاپ شروع ہوتا۔ بیچ بیچ میں، رسوئی میں کھانا پکاتی اماں کی [illegible] تھال پروسا جاتا۔ کیوں رے .... ابھی تک کھانا نہیں بنا ... کبھی کبھی شک لگتا ہے کہ تیری برہمن کی جات بھی ہے کہ نہیں۔

اندر ہی اندر سلگ اٹھتا سالگ رام ... کچی مٹی کی دھلائی سے، زمین کی سوندھی سوندھی خوشبو اٹھ رہی ہوتی اٹھ کر وہ اماں کے پاس رسوئی میں آ جاتا۔ اماں کی روتی آنکھوں کو دیکھ کر سوچتا، بھگوان کی پوجا ارچنا تو سب بیکار ہے، جب من ہی صاف نہ ہو۔ اور سارے میں تلک پانڈے زور زور سے شلوکوں کے پاٹھ میں معروف ہوتے۔

کہاں تلک پانڈے اور کہاں سالگ رام۔ یہ نام کا چکر بھی عجیب ہے، کسی بھی بات میں سمجھوتہ نہ کرنے والے بابو نے دھرم کی راہ میں اس کے اس برہمن نام سے سمجھوتہ کر لیا تھا۔ ہوا یوں کہ تلک پانڈے کو جب بہت دنوں تک کوئی اولاد نہیں ہوئی تو کہتے ہیں ایک پہونچا ہوا سادھو ان کے دروازے آیا تھا ـــ الکھ نرنجن .... سو بھکشا مانگی اور تلک پانڈے کی فریاد سن کر بولا ـــ گھبرا مت برہمن پتر ـــ بچہ ہو جائے گا۔ لیکن اس کا نام برہمن کے نام پر رکھنا ـــ سمجھ گیا نا بچہ ـــ

نام میں کیا رکھا ہے ـــ یوں سالگ رام نے اس ماحول میں آنکھیں کھولیں جب گھر کی ایک ایک شے میں دھرم سانپ کی طرح کنڈلی مارے بیٹھا تھا۔ بابوجی صبح ہی صبح بھکشا مانگنے نکل جاتے پھر دوپہر ڈھلے یا پھر شام ڈھلے واپس آتے۔ جب سالگ رام تھوڑا بڑا ہوا تو وہ بھی شامل جانے لگا۔

تلک پانڈے کے گھر سے چند فرلانگ کی دوری پر ایک مسلمان کا گھر ہے۔ وہاں سے گزرتے ہوئے ایک بار سالگ رام کو دیکھ کر اس کا ہم عمر ایک لڑکا زور سے ٹھٹھا مار کر ہنس دیا تھا .... لڑکے نے سالگ رام کے ننگے سر اور پیچھے لٹکتی چٹیا کو دیکھ کر کہا۔

" تیرے سر پر لونچھ۔"

سالگ رام غصے میں بولا " ملیچھ کہیں کا "

لڑکے کی ہنسی اچانک غائب ہو گئی۔ اس نے سالگ رام کو بڑے غور سے دیکھا۔ غصے میں بھرا ہوا سالگ رام دندناتا ہوا گھر پہنچ گیا۔ گھر پہنچ کر چھوٹے سے آئینے میں اس نے اپنی شکل دیکھی۔ اور اس کے سامنے اس کی عمر کے وہ سارے لڑکے گھوم گئے جو چہرے مہرے اور پہناوے سے کیسے سندر دکھتے تھے .... اور ایک وہ ہے ـــ پیروں میں کھڑاؤں کی کھٹ کھٹ ـــ بار بار کھل جانے والی دھوتی ـــ جھولتا ہوا کرتا ـــ منڈا سر، باہر نکلی ہوئی چٹیا۔ اسے گھن آ رہی تھی خود سے، نفرت محسوس ہو رہی تھی .... یہ سب ـــ جیسے اسے ایک اچھی بھلی دنیا سے کاٹ کر کسی قید خانے میں قید کر دیا گیا ہو ـــ مگر کسی بھی طرح کی بغاوت کے لیے لفظ کہاں تھے، اس کے پاس۔ لفظوں کے گھنگرو تو تلک پانڈے نے پیدا ہوتے ہی اس کے ننھے منے پاؤں میں کھینچ کر توڑ دیئے تھے۔

سالگ رام جیسے آگ کی گرم گرم بھٹی میں تپ رہا تھا .... اس رات، کافی دیر تک اسے نیند نہیں آئی

اور سہیل گیا
ہونے تک وہ اپنا سوچ پرکھ سکے کے فیصلہ کی مہر
چکا تھا۔ تلک پانڈے ہمیشہ کی طرح سویرے
گئے۔ نہا دھو کر پوجا ارچنا سے فارغ ہو کر آواز
دی۔

سالگ رام!
سالگ رام جیسے اس آواز کے انتظار میں تھا۔
بڑھا اور اپنا فیصلہ سنا دیا۔
آج سے میں آپ کے ساتھ نہیں جاؤں گا۔
کیا ــــــ تلک پانڈے کی آنکھوں میں حیرت
وہ اسے غور سے دیکھ رہے تھے۔ جس معصوم کی
نا نہیں جانا تھا آج انکار کا لفظ کیسے سیکھ لیا
اور سالگ رام نے اٹک اٹک کر اپنی بات ایکدم
منے رکھ دی۔

میں پڑھنا چاہتا ہوں ــ میں پڑھوں گا ــ میں یہ
میں کروں گا...... مجھے یہ سب اچھا نہیں لگتا۔
تلک پانڈے کے دماغ میں جیسے ایک ساتھ ہزاروں
چھوٹ گئیں ــ وہ اٹھے۔ آگے بڑھے اور سالگ
بدن پر تڑا تڑ چپلوں کی بارش کر دی...
سالگ رام اب بھی روتے ہوئے چلا رہا تھا......
اچھا نہیں لگتا۔ میں یہ سب نہیں کروں گا نہیں
...... مجھے یہ چپلی بھی اچھی نہیں لگتی۔ میں بال بڑھاؤ

پھر ایک لمبا عرصہ گذر گیا ــ تلک پانڈے نے
تی لی سے بھاگتے ہوئے گئے۔ انقلاب کے اس
آگے جھک گئے۔ جو شکل سے سالگ رام
نکلا۔ اس کی وہ جھیرے دھیرے دھرم
کا چیزوں سے کٹتا جا رہا تھا۔ ادھر ملک نے

نے دنیا کو خیرباد کیا۔ ادھر سالگ رام زمانے کی ضرورتوں
کو پورا کرنے کرنے لگ گیا۔ وقت بدل رہا تھا۔ زمین، پانی،
فضا، ہوا، سب میں نفرت کے جراثیم گھس گئے تھے۔ اس نے
بدلے بدلے بھارت کا کچھ 'انش' تو بالوجی میں تلاش کیا
تھا اور کچھ وقت کے تھپیڑوں میں دیکھا۔ یہاں تو نفرت کے
اندھیرے تھے، جلوہ دار لفظ تھے اور مسجد مندر کے ہنگامے
تھے جیسے یہ فرق کی ریکھائیں تھیں اور بدلی بدلی سی آنکھیں
تھیں۔

سالگ رام ــ شانتی کا دیا ــ مندر چھوڑ آئے... وہ
برسوں پیچھے چھوٹی آواز کے زد میں ہوتا... اور سالگ رام
یہ بھی دیکھ رہا تھا۔ محبت، میل ملاپ کی کہانیاں تاریخ کے
پنوں میں کھوتی جا رہی ہیں۔
ملک کے حاشئے پر جب سرخ سرخ خون بہیں جاتا
تو سالگ رام اپنے اندر چھپے اس چپلی والے سالگ رام کا
جائزہ ضرور لیتا جو نفرت کے اس اندھیرے بڑی مشکل
سے باہر نکل سکا تھا۔ اب سالگ رام کی پارچون کی ایک چھوٹی
سی دکان تھی لیکن شہر کے کلچرل سرگرمیوں میں بھی اس کی
دلچسپی تھی۔

اس دن ایک مسلمان لڑکا اس کی دکان پر بیٹھا ہنستا
رہا تھا: اسے یاد آ رہا ہے جانتے ہیں آپ ــ نور محمد ــــ سالا
اپنے مذہب سے پھر گیا ہے۔ مذہب وذہب کو نہیں مانتا ــ عید
بقر عید جمعہ کی نماز بھی نہیں پڑھتا ہے۔"
"ایسا ــ"
سالگ رام کو تعجب ہوا۔
مسلمان لڑکے نے دھیمی سرگوشیوں میں بتایا ــ
"کسی سے کہنا مت ــ سالا کمیونسٹ ہو گیا ہے۔ پکا کمیونسٹ
کمیونسٹ ــ

ایک پل کے لئے سالگ رام کو لگا، جیسے اس نے کسی بھیانک حادثے کی کوئی خبر سُن لی ہو۔ مسلمان ہے لیکن نماز نہیں پڑھتا۔ مسجد نہیں جاتا۔ کمیونسٹ ہو گیا ہے۔ بچپن کی ایک آدھ میلی تصویر نگاہوں میں جھلملا اٹھی ——— تیرے سر پر چوٹی ——— اور اس چوٹی والے سالگ رام نے غصے میں چڑھایا تھا.... ملیچھ کہیں کا ——— مسلمان لونڈے کے چلے جانے کے بعد سالگ رام کو اچانک جانے کیوں نور محمد سے ملنے کی خواہش ہوئی۔ نور محمد کا نام کسی نہ کسی بہانے وہ برابر سنتا رہا تھا مگر اس سے ملے ایک مدت ہو گئی تھی۔

اس دن وہ اپنے ایک دوست کے ہمراہ کمیونسٹ پارٹی کے دفتر گیا تھا۔ دفتر میں تھوڑی سی بھیڑ بھاڑ تھی۔ اور اس بھیڑ میں رواں دواں بولتا ہوا اسے ایک شخص نظر آیا جس کے ہاتھ پر بینڈیج بندھا تھا۔ اور جو ایک چھوٹی سی بچی کا ہاتھ تھامے تھا۔ بچی کسی انجانے خوف سے سہمی ہوئی تھی۔

سالگ رام نے بینڈیج والے نوجوان کو غور سے دیکھا اور وہ آدھ میلی سی تصویر اس کی نگاہوں میں ناچ اٹھی۔

... نور محمد ——— !

ہیلو کامریڈ ——— ایک نوجوان نے نور محمد سے ہاتھ ملایا۔ نور محمد نے بھی اپنا بینڈیج والا ہاتھ آگے کر دیا ———

یہ سب کیسے ہوا؟

نور محمد کھلکھلا کر ہنس دیا ——— بہت ہی سادی ہنسی تھی اس کی۔

اس کے دوست نے بتایا ——— اپنا کامریڈ بھی عجیب انسان ہے۔ دنیا میں جو کہیں مرتا ہو، کسی کا بھی گھر جلتا ہو۔ کامریڈ کی آنکھوں میں آنسو دیکھ لو۔ آج تحریک سے وابستگی تو ایک بے معنی سی شئے ہو گئی ہے دوست ———

لغت بازی کی فضا میں سانس لینے والے بھلا زندگی کی گہرائی میں کیا اتر سکیں گے۔ کمٹمنٹ کیا ہوتا ہے، دیکھنا ہے تو نور محمد کو دیکھو ——— اپنے کامریڈ کو ———

سالگ رام ایک بار پھر عجیب نظروں سے نور محمد کے ہنستے ہوئے چہرے کا جائزہ لیا ——— اور ایکدم سے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا۔

سلام کامریڈ ——— دعا کرتا ہوں تمہاری صحت کے لئے۔

نور محمد کھلکھلایا ——— کیوں ——— میری صحت کو کیا ہوا۔ اچھا بھلا ہوں ———

سالگ رام کو کمیونسٹ پارٹی سے کوئی لگاؤ تو نہ تھا مگر نور محمد کی وجہ سے پارٹی دفتر کے چکر شروع ہو گئے تھے۔ اسے یہ آدمی اچھا لگا تھا ——— مکر و فریب اور بناوٹ کی دنیا سے دور ——— پھر نور محمد کی زندگی کی کتنی ہی حقیقتیں اس کے سامنے روشن ہوتی چلی گئیں۔ نور محمد کا بڑا بھائی ڈاکٹر تھا۔ ایک بہن پروفیسر ہے۔ باپ ایجوکیشن کے محکمہ میں ڈپٹی ڈائریکٹر تھے۔ مگر خود نور محمد نے کسی کی بھی نوکری قبول نہیں کی۔ وہ چاہتا تو بہت کچھ کر سکتا تھا۔ مگر اس نے پورے طور پر خود کو پارٹی کے نام پر وقف کر دیا۔ اب وہ ہے اور اس کی پارٹی ہے۔ سورس آف انکم بالکل ہی نہیں اور وہ بچی، وہ چھوٹی سی بچی فسادی کی دین ہے۔ یہاں سے کچھ کیلومیٹر دور گاؤں میں فرقہ وارانہ دنگے میں لڑکی کے گھر والے شہید ہو گئے۔ ریلیف کے کام کے لئے نور محمد بھی وہاں کا دورہ کرنے گیا تھا۔ اور واپسی میں وہ اس لڑکی کا سرپرست بن کر لوٹا تھا۔ لڑکی ہندو تھی، جب کوئی اسے رکھنے کو تیار نہیں ہوا تو اسے نور محمد نے اپنے پاس رکھ لیا۔ نور محمد نے شادی نہیں کی تھی۔ اس کی وجہ جبکہ وہ یہ بتاتا تھا کہ شادی کے بعد وہ پارٹی کو اپنا وقت

بنے کے قابل نہیں رہے گا۔

پارٹی دفتر کے اسٹور روم کو اس نے ایک چھوٹے سے اف ستھرے کمرے کی شکل دیدی تھی۔ سالگ رام اس دن چانک وہاں پہنچ گیا تو کیا دیکھتا ہے .... دروازہ کھلا ہے

" پڑھو — مسجد مندر دنگے کرواتے ہیں۔ خدا ایک ان یبی طاقت کا نام ہے۔ اور جو چیز دیکھی نہیں گئی اس کا کیا ننا — "

پتہ نہیں۔ وہ کتنی دیر سے اور کیا کیا تعلیم دے رہا سالگ رام اتنا ہی سُن سکا — وہ سُن سے تھا۔ ں کی آواز سُن کر کامریڈ نور محمد چونکا۔ چہرے پر مسکراہٹ ۔

" ارے سالگ رام — آجاؤ — "

یکتا نے نمستے کی —

سالگ رام نے شک کی نگاہوں سے نور محمد کو دیکھا " یہ کیا پڑھا رہے تھے — اس کے لہجے میں ناراضگی — کیا میں یہ سمجھوں کہ تم اس بچی کے ذہن میں کچھ نامعلو ہر بھر رہے ہو۔

نور محمد نے ٹھنڈی سانس لی — نہیں، زہر کا ہر نکال لیا۔

سالگ رام نے دیکھا — نور محمد کا چہرہ اچانک بدلا نکھوں سے چنگاریاں نکلیں۔

" اسے سچ بتا رہا ہوں۔ سچ سالگ رام۔ اس یار جیسا کہ تم کہہ رہے ہو۔ ایک لاوارث بچی مل اور میں جس ██ ندی میں جا رہا ہوں اُسے سکتا ہوں۔ دنگوں نے اس کے ماں باپ چھین لئے — ما یہ اس کا مشغلہ نہیں ہے۔ یہ معمولی سا سوال ہے کہ قصور کیا تھا۔ یا اس کے ماں باپ نے کیا گناہ

کئے تھے۔ موقع پرستوں نے موقع پایا گھر لوٹا۔ گھر جلایا اور ایک بچی کو لاوارث بنا دیا — یہ سب تمہارا مذہب کرا رہا ہے سالگ رام — تمہارا مذہب — تم جس کے ڈھول پیٹتے رہتے ہو — مسجدوں کو آباد کرتے ہو — مندروں میں شنکھ بجواتے ہو۔ وہی تمہارا مذہب، جسے ان سیاسی بھیڑیوں نے مہرہ بنا رکھا ہے۔

نور محمد کے چہرے پر آکروش تھا — برسوں کی تہذیب، تمدن، سب کو تمہارے ان مذہبی جھگڑوں نے ختم کر دیا — مثالی ملاپ و محبت، اب تو بس ایک کھوکھلا ڈھانچہ بچ گیا ہے سالگ رام — جس میں مندر اور مسجد قید ہے۔ ہم تم کہاں باقی ہیں۔ یہ بچی، بچی ہے، اس سے پوچھو تو مذہب کے نام پر اس کا چہرہ بدل جاتا ہے۔ کل کو یہی حال رہا نا۔ تو نئی تہذیب کے بچے تمہارے مذہب سے نفرت کریں گے سالگ رام — اور تم بس ترشول بھانجتے رہنا اور مسجدوں میں سر دیئے رہنا۔

ہنس مکھ چہرے والے نور محمد کا پہلی بار اتنا خوفناک چہرہ دیکھا تھا سالگ رام نے۔ اس بیچ صرف اتنا ہوا کہ یکتا اٹھی ... پاس والے اسٹول پر رکھے گھڑے سے گلاس میں پانی ڈھالا۔ پانی لا کر اس کے سامنے پیش کیا اور ایک طرف سمٹ کر چپ چاپ بیٹھ گئی۔

سالگ رام نے سر اٹھایا۔ دھیرے سے کہنا چاہا۔ " کامریڈ نور محمد — سڑکوں پر اگر خون بہتا ہے تو اس میں مذہب کا کیا قصور — سیاسی بھیڑیئے اگر مذہب کو اپنا مہرہ بناتے ہیں تو دھرم کا کیا دوش — تم اس بچی کے اندر زہر بھر رہے ہو؟ " نہیں — اس عمر کے تمام بچے بچیاں کیا اسی نتیجے پر پہنچیں گے۔ میں صرف اس سوچ کو کرید رہا ہوں پارٹی دفتر میں لوگوں کے آنے کا وقت ہو گیا تھا۔

اس لئے سالگ رام وہاں زیادہ دیر تک نہیں بیٹھا۔
لیکن نور محمد کی آواز بار بار اس کے ذہن پر شب خون مار
رہی تھی۔ کل اس عمر کے تمام بچے، بچیاں . . . . .

سالگ رام کی کنپٹی گرم ہو گئی۔

سالگ رام اس دن اپنی دکان میں گاہکوں کو سودا
دے رہا تھا کہ وہی مسلمان لونڈا اختر فوا آدھمکا۔

نئی خبر سنتے ہو۔

مہاودہ کے پڑے کو غور سے دیکھتے ہوئے سالگ رام نے
تھوڑی سی گردن اٹھائی۔ کوئی نئی خبر ہے کیا؟

بالکل تازی — اختر فوا نے دھماکا کیا۔ جانتے ہو
نور محمد نے جس بچی کو اپنے یہاں رکھا ہے۔ اسے لینے اس کا چچا
آیا تھا۔

پھر؟

بچی نے جانے سے صاف انکار کر دیا۔ بات کافی
بڑھ گئی۔ ہنگامے بھی ہوئے۔ پارٹی دفتر کا معاملہ تھا سارے
لوگ نور محمد کے ہی ساتھ تھے۔ چچا بکتا جھکتا لوٹ گیا۔
لیکن دھمکیاں دیتا ہوا گیا ہے۔ کہہ رہا تھا۔ وہ سب کو
دیکھ لے گا۔ سالے ادھری . . . ناستک — کمیونسٹ بنتے ہیں
سالے . . . اپنا دھرم تو بھرشٹ ہے ہی . . . بچی کا دھرم بھی
بھرشٹ کراتے ہیں۔

اشرف بہت زور سے ہنس رہا تھا۔ تم دیکھ لینا — یہ
سالا نور محمد اپنی کرنی سے مارا جائے گا۔ سالا مسلمان کے
گھر پیدا ہو کر کمیونسٹ بنتا ہے۔ اماں کہتی ہیں کمیونسٹ
کا جنازہ کیڑے پڑتے ہیں۔ مرتے وقت مٹی بھی نصیب نہیں ہوتی

سالگ رام کسی اور ہی سوچ میں ڈوبا تھا۔ دکان پر
چھوٹے سے ایک بچے کو بٹھا کر وہ پارٹی دفتر نکل گیا۔ دفتر میں
آج یکتا والا معاملہ ہی زیر بحث تھا۔ نور محمد نے یکتا کو پاس
ہی بٹھا رکھا تھا۔

ایک بزرگ نے سمجھایا — بات بڑھانے سے فائدہ
کیا ہے نور محمد — یکتا کو چچا کے حوالے کر دو۔

"میں چاچا کے پاس نہیں جاؤں گی۔" یکتا کی آنکھیں
سرخ ہو رہی تھیں۔

بزرگ نے بچی کی بات کو کاٹتے ہوئے کہا "بچی کی پرورش
ایک مشکل کام ہے کامریڈ۔ اور تمہیں کوئی تجربہ بھی نہیں۔
دوسری دشواریاں بھی آسکتی ہیں"

"میں نہیں جاؤں گی" یکتا نے پھر چیخ کر کہا

نور محمد ایک جھٹکے سے اٹھا۔ اس کے چہرے پر ہلکی
شکن تھی: "بچی کی پرورش پارٹی کی دیکھ ریکھ سے زیادہ
مشکل کام تو نہیں — یہ تجربہ ہی سہی — جب یکتا کہتی
ہے کہ وہ نہیں جائے گی تو وہ میرے ساتھ ہی رہے گی"

سالگ رام نے دیکھا، نور محمد کی اس بات پر
تھوڑے کئی کامریڈوں کے چہرے بن گئے تھے۔ اس نے دل
سے سوچا — کیا اس لئے؟ کہ وہ لڑکی ہندو ہے اور
چاچا کے پاس بھیجنے کا مشورہ دینے والے بھی۔ اس نے
دیکھا — اور دیکھتا رہا — کہا کچھ بھی نہیں۔ یکتا چاچا کے
ساتھ کیوں نہیں گئی۔ کچھ ہی دیر بعد اس کا جواب
کی وہی پرانی مسکراہٹ دے رہی تھی۔

سیدھی سی بات ہے سالگ رام۔ دنگے مسجد
کرواتے ہیں۔ لڑکی کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی ہے۔
پاس خود کو زیادہ محفوظ سمجھتی ہے۔

لیکن دراصل معاملہ تو اب اٹھ رہا تھا۔ جا
دھیرے دھیرے یہ بات پارٹی دفتر سے نکل کر چھپا
کا لباس پہننے لگی تھی۔ دھیرے دھیرے یہ بات پھیلی
ایک مسلمان شخص فساد میں مارے گئے ایک ہندو شخص

کی لاوارث بچی کی پرورش کر رہا ہے۔ بات آگے بڑھی تو پارٹی دفتر میں دھمکیاں پہنچنے لگیں۔ نور محمد اپنی بات پر اڑا رہا تھا۔ یکتا اپنی مرضی سے جانا چاہے تو اسے کوئی انکار نہیں۔

اور یکتا کا جواب تھا۔ اس کا چاچا ہندو تھا۔ مندر مسجد دنگے کرواتے ہیں۔ وہ یہیں نور محمد کے پاس رہے گی۔

لیکن نور محمد تو مسلمان ہے۔

نہیں۔ یکتا بس اتنا ہی جواب دیتی اور وہی پراسرار قسم کی چپی اوڑھ لیتی۔ نہ منہ پر ہنسی۔ نہ چہرے پر ذرا بھی مسکراہٹ

پارٹی دفتر میں اس دھمکی کا اثر پڑا تھا۔

اگر دفتر غصے میں آکر جلا دیا گیا تو پارٹی کا بہت نقصان ہو جائے گا۔ قیمتی کاغذات تک برباد ہو جائینگے۔

کسی نے سمجھایا۔ نور محمد تمہارا یہاں رہنا خطرے سے خالی نہیں۔ اگر بچی کو اپنے پاس رکھنے کی ضد ہے تو پھر یہ جگہ خالی کر دو۔

نور محمد اچانک چونک اٹھا۔ غور سے اس بوڑھے پارٹی ورکر کا چہرہ دیکھا۔ اتنے غور سے کہ بوڑھا کامریڈ ایکدم سے گھبرا گیا۔

نور محمد کے اندر جیسے کسی نے زبردست سناٹا بو دیا تھا۔ اس نے ایک پوری زندگی پارٹی کے نام وقف کر دی تھی۔ اسی لئے اس نے کہیں سروس نہیں کی۔ شادی نہیں کی۔ ڈاکٹر بھائی اور ایڈوکیٹ بہن اس کا خرچ پورا کرتے رہا۔ یہ محتاجی تو اس نے صرف اور صرف پارٹی کے لئے قبول کی تھی۔ لیکن وہ یہ کیا سن رہا ہے۔

تن۔۔۔۔ تن۔۔۔۔

ذہن پر جیسے کوئی لگاتار ہتھوڑا مار رہا تھا۔ تم یہ جگہ خالی کر دو نور محمد۔ تم یہ جگہ چھوڑ دو۔۔۔ آؤ یکتا۔

نور محمد نے یکتا کا ہاتھ تھام لیا۔ بوڑھے پارٹی ورکر نے چونک کر نور محمد کی طرف دیکھا۔

"تم میری بات کا برا تو نہیں مان گئے کامریڈ؟"

"نہیں تو۔ نور محمد مسکرایا۔ بالکل نہیں۔ یوں بھی کرایہ لگا کر اس کمرے کے دو سو روپے آسانی سے مل سکتے ہیں۔ کیوں کامریڈ۔؟"

پھر وہ رکا نہیں۔ یکتا کا ہاتھ تھام کر تیزی سے باہر نکل گیا۔

سالگ رام ایک بار پھر سن سے تھا۔ دکانداری میں دل نہیں لگ رہا تھا۔ کان بج رہے تھے۔ ذہن میں آندھیاں چل رہی تھیں۔۔۔ لیکن۔۔۔ نور محمد بھی تو مسلمان تھے۔۔۔ نہیں۔۔۔۔ اگر انسان کہوں تو۔۔۔۔ جسے آج کے دور میں ایک سطحی، بے حقیقت سا لفظ بنا دیا گیا ہے۔۔۔۔ انسان: کیسے ہوتے ہیں؟ جیسے ہزاروں گھوڑے اس کی فکر کے میدان کو روندتے ہوئے بڑھ رہے تھے۔ ٹاپ۔۔ ٹاپ

اس نے دیکھا۔ ایک کمرے کا ایک چھوٹا سا گھر ہے۔ دو بچے بیٹھے ہوئے ہیں اور نور محمد ٹیوشن پڑھا رہا ہے۔ ٹیوشن پڑھاتے پڑھاتے اچانک اس نے نظر اٹھائی ہے۔ چونک گیا ہے۔

سالگ رام۔ کب آئے۔ بیٹھو۔ جاؤ لڑکو۔ بعد میں آجانا۔

لڑکوں کے جانے کے بعد نور محمد نے مسکراتے ہوئے یکتا کی طرف دیکھا۔ پھر وہی پرانی مسکراہٹ چہرے پر سجا کر بولا۔

پارٹی کے علاوہ بھی میری ایک ذمہ داری بڑھ گئی ہے

یہ ہے اس نے یکتا کی طرف اشارہ — ٹیوشن پڑھا رہا ہوں آج کل — کچھ آمدنی ہو جاتی ہے۔

لفظوں میں درد سمٹ آیا تھا۔ لیکن اس درد کا اظہار نہیں کرنا چاہتا تھا — ہم نام دے کر رشتوں کو بانٹ بیٹھے ہیں سالگ رام ..... آخر میں یکتا کی پرورش کیوں نہیں کر سکتا۔ کیا صرف اس لئے کہ میرا نام مسلمان کا ہے۔ ..... زندگی کے مفہوم کو ہم اب بھی غلط راستوں میں تلاش کر رہے ہیں... سالگ رام۔ ہماری غلطی یہی ہے کہ ہم ناموں میں مذہب تلاش کرتے ہیں اور پہچان ڈھونڈتے رہتے ہیں۔

اس کے چہرے پہ کب ہی کرب تھا —— یکتا کا مطلب کیا الگ رنگ اختیار کر گیا ہے۔

سمجھ گیا ؟

نور محمد نے ایک بوجھل سا سانس لیا — مندر مسجد جیسے کی طرح اس میں بھی مذہب کا رنگ ہے... ظاہر ہے تمہارا مذہب جیت جائے گا۔ میں ہار جاؤں گا۔

اس کے چہرے پر ایک زہریلی مسکراہٹ طلوع ہوئی تھی —— تم لوگ یاترائیں نکالتے ہو..... پد یاترائیں نکالتے ہو — اور تمہارے رہنما نفرت کی روٹیاں تقسیم کرتے کرتے دلوں کی تقسیم کرتے جاتے ہیں۔ مجھے آنے والے وقت اور کل کے ہندوستان سے ڈر لگتا ہے۔ خیر چھوڑو۔ چائے پیو گے۔ پاس ہی ہوٹل ہے..... میں چائے کا آرڈر دے کر آتا ہوں۔

نور محمد نے چپل پہنی اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

سالگ رام کے پاس اتنا موقع کافی تھا کہ تجسس کے پھندے کو آزاد کرکے وہ یکتا سے تھوڑی سی بات چیت کر سکے۔

یکتا — اسے اپنی آواز بہت کمزور سی لگی۔

یکتا نے نظر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

یکتا — تم سچ مچ چاچا کے پاس نہیں جانا چاہتی؟

"نہیں —— وہاں سب دھرم کو ماننے والے لوگ ہیں —— وہ کسی بزرگ کی طرح گویا تھی — اور افیم ہے۔ دھرم دنگے کرواتا ہے — خدا ایک ان سچائی ہے۔ اور جو چیز دیکھی بھی نہیں گئی، اس کا کیا ملک میں آج جو کچھ ہو رہا ہے۔ وہ سب دھرم کی دین۔

سالگ رام کو اس کی آنکھوں میں بڑھاپا اتر لگا — اسے لگا، جیسے یکتا نے اپنا سبق کچھ اس طرح کر لیا ہو کہ اب کبھی نہیں بھولے گی... سالگ رام کے میں اتھل پتھل سی مچ گئی۔ اس کے لفظ گونگے تھے۔ غور سے اس چھوٹی سی بچی کا چہرہ پڑھ رہا تھا جو ا لہان بھارت میں — وقت کے تھپیڑوں میں کھو کر —— بہت زیادہ جوان اور تجربہ کار ہو گئی تھی۔

تبھی نور محمد دو چائے کا گلاس لے کر آ گیا۔ ا لہجہ خوفزدہ تھا "چائے پی کر یہاں سے سیدھے گھر سالگ رام۔ بازار میں ٹینشن ہے۔"

یکتا نے خوفزدہ نگاہوں سے نور محمد کی طرف اور نور محمد چائے کا گلاس کانپتے ہاتھوں میں اٹھا میں ٹہلنے لگا۔

یہ کیسا ملک ہے... یہ اس ملک میں کیا ہے — کامریڈ نور محمد نہیں رہا —— وہ سہما رہا ہے... پاگلوں کی طرح..... وہ جیسے اس موڈ کچھ بھی سوچنا نہیں چاہتا —— ذہن کی نسیں جیسے ہی کھنچ جائیں گی۔ پھر ٹوٹ جائیں گی — لیکن کامریڈ کا وہ زرد زرد سا چہرہ سالگ رام کی نگاہوں سے نہیں ہوتا... ہر بار جیسے مسکراتا ہوا وہ شخص سا

کی طرح کنڈلی مار کر سامنے ہی بیٹھ جاتا ہے... مجھے دلوں کی تقسیم سے ڈر لگتا ہے سالگ رام... آنے والے وقت اور کل کے ہندوستان کے تصور سے......

دور تک خون کے چھینٹے ہی چھینٹے ہیں۔ اور ان میں ایک لہولہان تصویر بچی ہے کامریڈ نور محمد کی...

سالگ رام.... ذہن کے دروازے کو سرکش گھوڑے اب تک روند رہے ہیں... سالگ رام.... تم ایک بے مروت ملک کی پیداوار ہو سالگ رام۔

اور سالگ رام کو لگتا ہے... اگر اس کے بس میں ہوتا تو وہ اس ملک سے نفرت کرتا.... ہاں اس ملک سے... زوردار نفرت... ہاں اس ملک سے جہاں وہ جیتا ہے۔ ایک چھوٹا سا بچہ جب کسی بات پر ناراض ہوتا ہے تو وہ اپنا سارا غصہ اپنی ماں پر نکالتا ہے ــ اسے بھی ملک پر غصہ کرنے کا حق ہے..

اس کے وجود پر جیسے برف کی موٹی موٹی سل رکھ دی گئی تھی۔ شہر جب لہو کی سرخیاں لکھ رہا تھا ــ یہی نور محمد تھا جو اپنی جان کی پرواہ نہ کرتے ہوئے لوگوں کو بچانے میں مصروف تھا۔ قدم تھے کہ تھکتے نہیں تھے۔ کس کس کی جان نہیں بچائی اس شخص نے ــ مگر اسے کیا ملا ــ سوائے ایک مسلمان سمجھے جانے کا ــ اور کیا ملا اُسے ــ اور یکتا ــ یکتا کو تو وہ اسی روز پارٹی دفتر چھوڑ آیا تھا۔ شاید اس نے کسی انجانے خطرے کی بو سونگھ لی تھی۔

سالگ رام... سالگ رام ایک بار پھر بھیانک سناٹے میں ہے۔ اس کے گلے سے گھرگھرانے جیسی آواز نکلتی ہے ــ ٹھیک ویسی جیسے کتے پتھر مارنے پر نکالتے ہیں۔

سالگ رام سرپٹ بھاگ رہا تھا۔ اور بھاگتے ہوئے وہ صرف ایک ہی سوال کی زد میں تھا۔

آخر دنگائیوں نے نور محمد کو کیا سمجھ کر مارا ہے؟ نور محمد تو مسلمان نہیں تھا ــ نور محمد تو کمیونسٹ تھا ــ پھر اسے مارنے والوں نے ـــــ

وہ سرپٹ بھاگ رہا ہے

اور اب وہ پارٹی دفتر میں تھا۔ پارٹی دفتر میں ایک گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا ـــ بیچ میں دھیرے دھیرے سسکیاں بھرتی یکتا کھڑی تھی۔ قانونی پیچیدگیوں میں الجھی یکتا ــ بہت ساری آنکھیں سوالیہ نگاہوں سے یکتا کو گھور رہی تھیں۔

اس کا کیا ہوگا ــ؟ کہاں جائے گی یہ؟ کیا چاچا کے پاس؟

اچانک سالگ رام کے بدن میں حرکت ہوئی۔ اس نے غور سے یکتا کو دیکھا۔ پھر دھیرے دھیرے اس کی طرف بڑھنے لگا۔ اور آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔

یکتا ــ تم میرے ساتھ چلوگی!

یکتا کی سسکیاں اچانک رک گئیں۔ اس نے سالگ رام کی طرف عجیب نظروں سے دیکھا۔

سالگ رام ــ میں تمہارے ساتھ چل سکتی ہوں.... اگر تم.... دھرم کو نہیں مانتے ہو ــ

اور بہت سارے لوگوں کی طرح سالگ رام نے بھی دیکھا، یکتا کسی ٹیپ کی طرح شروع ہو چکی تھی۔

دھرم افیم ہے ــ دھرم دنگے کرواتا ہے ــ خدا ایک ان دیکھی ہے.... اور جو چیز دیکھی نہیں گئی، اس کا کیا ماننا.... ملک میں آج جو کچھ بھی ہو رہا ہے......

سید احمد قادری
مدیر ادبی نقوش، حاکم گنج، گیا

بوجھ

اسٹیشن پر کچھ معمول سے زیادہ ہی بھیڑ نظر آ رہی تھی حالانکہ یہ اسٹیشن کسی خاص اہمیت کا حامل نہیں ہے۔ ویسے ایکسپریس اور میل وغیرہ رکتی ہیں۔ صرف ٹنک ٹیڑھی بھیڑ نظر آ رہی تھی۔ شاید کسی اسٹوڈنٹ پارٹی کا ٹور تھا کیونکہ زیادہ تر طلبا و طالبات ہی نظر آ رہے تھے۔ سبھی کو ٹرین کا انتظار تھا۔ ٹرین کے آنے میں کوئی آدھا گھنٹہ باقی تھا۔ میں اپنی بیوی نجمہ اور بیٹا پپو کو لے کر ویٹنگ روم میں آ گیا۔ فرسٹ کلاس ویٹنگ روم میں ویٹر گرد آلود میز، کرسیاں اور آئینے کی سطح کو صاف کر رہا تھا۔

میرے بعد فرسٹ کلاس ویٹنگ روم میں تیزی سے داخل ہونے والے مسافروں میں کشمیری کوٹ میں ملبوس ایک کم سن پنجابی عورت تھی۔ اس کے کانوں میں آویزاں زمرد کے آویزے اور اس کے ہاتھوں کی سجاوٹ کا انداز اس عورت کے حسن ذوق کے مظہر تھے۔ ایک قلی کے سر پر سامان اٹھائے وہ عورت داخل ہوئی۔

دوسرا مسافر جو اس کے بعد اس ویٹنگ روم میں آیا وہ ایک مرد تھا اس کے ساتھ بھی پورٹر کے سر پر رکھا ہوا سوٹ کیس اور بستر تھا۔ اس کی آنکھوں پر چشمہ چڑھا ہوا تھا۔ میں کرسی پہ بیٹھ کر السٹریٹڈ ویکلی دیکھ رہا تھا۔

پپو چلاتا ہوا آیا۔

"ابو ٹرین آ گئی"۔

میں نے سامانوں کو یکجا کیا اور قلی کے سر پر رکھ کر پلیٹ فارم پر آ گیا۔ شملہ کے لیے میرا ریزرویشن ہو چکا تھا۔ اس لیے جگہ ملنے میں پریشانی نہیں ہوئی۔ سامان کو رکھوا کر اطمینان سے نجمہ اور پپو کے ساتھ بیٹھ گیا۔

ٹرین اپنی منزل کی جانب تیزی سے گامزن تھی۔ پلیٹ فارم، بلند و بالا عمارتیں، درخت، بجلیوں کے کھمبے تیزی سے پیچھے کی طرف چھوٹ رہے تھے۔ ٹھیک اسی طرح میرا ذہن اپنے ماضی کی طرف خود ہی بھاگتا چلا گیا۔

میں ایم ایس سی کا آخری سال پورا کر رہا تھا تو کریم صاحب جو نجمہ کے والد تھے، کے پاس ٹیوشن حاصل کرنے گیا تھا۔ وہ بہت ہی اخلاق سے ملتے تھے اور اپنے لڑکے سلیم کی پڑھائی میرے سپرد کر دی تھی۔

میں نے سلیم کو ٹیوشن پڑھانا شروع کر دیا۔ قدرتاً روزانہ ہی نجمہ سے ملاقات ہوتی لیکن اس ملاقات میں سوائے آداب و سلام کے علاوہ اور کوئی بات نہ ہوتی۔ نجمہ بھی اس سال بی۔ اے۔ آنرس کی تیاری کر رہی تھی۔ نجمہ کو دیکھنے کے بعد بے اختیار اس سے باتیں کرنے کی خواہش ہوتی۔

لیکن اس نے کبھی اس کا موقع ہی نہیں دیا۔ نہ معلوم وہ کن خیالات میں کھوئی رہتی۔

اسی درمیان میرا امتحان ختم ہو گیا اور میں اپنے گاؤں چلا گیا۔ کچھ ہی دنوں بعد میرا رزلٹ نکلا اور میں فرسٹ کلاس فرسٹ تھا۔ رزلٹ کے بعد نوکری کی جستجو ہوئی، کئی جگہ اپلائی کیا، لیکن ہر جگہ پیروی یا روپیہ کو اہمیت دی جاتی۔ اچانک ایک دن کریم صاحب کا خط ملا۔ انہوں نے مجھے فوراً بلایا تھا۔ چنانچہ جب میں وہاں پہنچا تو میری تقرری ایک کالج میں ہو گئی۔ کریم صاحب کی کوششوں سے۔ میں کریم صاحب کے احسانوں تلے بالکل دب چکا تھا۔

نوکری ملنے کے بعد اطمینان و سکون نے سنہرے خواب دکھانے شروع کر دیے ——— میرا ایک چھوٹا سا گھر ہوگا جس میں میں، میری ماں، ایک بیوی اور چند بچے آنگن میں کھیلتے ہوئے ———

ایک دن ماں نے مجھے آواز دی، میں ان کے قریب گیا، انہوں نے مجھے اپنے قریب بٹھایا اور مسکراتے ہوئے کہنے لگیں ———

"بیٹا، آج تمہارے کریم صاحب آئے تھے۔"

"اچھا ——— مجھے معلوم نہیں۔"

"ہاں وہ دراصل مجھ سے ملنے آئے تھے، ان کی خواہش ہے کہ نجمہ ان کی بیٹی، میرے گھر کی بہو بن جائے۔ اس بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟ تم نے تو نجمہ کو دیکھا ہی ہوگا۔"

"ہاں ماں! دیکھا تو ہے۔ اچھی، خوبصورت ہے، پڑھی لکھی ہے، ایسی لڑکی سے شادی کے بعد یقیناً میں خود کو خوش نصیب سمجھوں گا۔"

اس کے بعد میری شادی نجمہ کے ساتھ انجام پا گئی۔

ایک سال بعد ہم دونوں کی محبت کی نشانی پپو کی شکل میں سامنے آیا۔

نجمہ لیکن اب بھی ویسے ہی پہلے کی طرح گم صم رہا کرتی۔ میں نے کئی بار اس کا سبب پوچھا، مگر اس نے ہمیشہ ہنس کر ٹال دیا۔ ہم لوگوں کی ازدواجی زندگی پرسکون طور پر گذر رہی تھی۔ ایک ساتھ رہتے ہوئے قریب پانچ سال گذر گئے اور ہم دونوں اتنے قریب ہو گئے تھے، دنیا کی کوئی طاقت ہم دونوں کو جدا نہیں کر سکتی تھی۔ لیکن مجھے برابر یہ محسوس ہوتا کہ اب تک ہم الگ ہی الگ رہے ہیں۔ فاصلے جو تھے ہم سب کے منزل اتنی ہی دور ہو گئی ہے۔ بات یہ نہ تھی کہ جذبات یکسر مفقود ہوں یا کوئی اختلاف ہو۔ ہم دونوں شروع ہی سے بالکل ہم آہنگ اور ہم نوا رہے تھے۔ پسندیدگی کا جذبہ کم نہیں ہوا تھا بلکہ بڑھتا ہی گیا تھا۔ مجھے اچھی ملازمت مل گئی تھی۔ ایک چھوٹا سا بنگلہ بھی حاصل کر لیا تھا۔ جو بے حد پر فضا جگہ پر واقع تھا۔ مگر نجمہ کی پراسرار خاموشی ہر وقت دل پر کھٹکتی رہتی۔ حالانکہ نجمہ نے کبھی کوئی شکایت کا موقع نہیں دیا۔ ہم دونوں کی [illegible] زندگی بے مزہ [illegible] مجھے ہمیشہ اپنے درمیان کوئی تیسرا سایہ [illegible]

ذہن کے پردے پر تصویریں ابھر ابھر کر ڈوبتی [illegible] ریل کی ایک تیز سیٹی نے میرے خیالات کے [illegible] کو توڑ [illegible] گاڑی ایک بڑے اسٹیشن پر پہنچ چکی تھی۔ میں سوچنے لگا زندگی بھی تو ایک گاڑی ہی کی مانند ہے جو [illegible] رکتی ہے اور پھر آگے کی طرف رواں دواں ہو جاتی ہے۔ اور یہ مسافر ان یادوں کی طرح ہیں جو انسان کے ذہن میں آتے جاتے رہتے ہیں۔

گاڑی نے وسل دی اور پھر آگے بڑھنے لگی ———

...ساتھ جیسے ٹرین اپنی منزل شملہ پہنچ گئی۔ میں نے سامان اٹھایا، اور سامان قلی کے ذریعہ ایک ٹیکسی پر رکھوایا اور ہم ہوٹل پہنچ گئے۔ ایک کمرہ بک کرانے کے بعد ہم لوگ فریش ہوئے اور ناشتہ کیا۔ [illegible] آرام کرنے کے بعد صبح میں ہماری طبیعت بالکل ہشاش بشاش تھی۔

چونکہ شملہ کی سب سے شام مشہور ہے اسی وجہ سے ہم لوگوں نے شام کو گھومنے کا پروگرام بنایا۔

شام کے وقت جب ہم لوگ شملہ کے ایک مشہور مال روڈ پر پہنچے، جو کہ بہت [illegible] اور خوب صورتی کے لئے مشہور ہے تو وہاں کا نظارہ بہت دلکش تھا۔ خوشی کے نغمے ہر طرف بکھر رہے تھے مسکراہٹوں کی قوس وقزح ہر سمت پھیلی ہوئی تھی۔ جھیل کے کنارے کا ماحول بہت ہی رنگین اور حسن سے معمور تھا۔ سورج اب پچھم کی جانب ڈوبنے جا رہا تھا جس کی وجہ سے پورا آسمان پر لالی چھائی ہوئی تھی اور ایسا لگ رہا تھا جیسے پیالے میں شراب انڈیل دی گئی ہو۔ جھیل کا ماحول خوابناک ہوتا جا رہا تھا۔ ڈوبتے ہوئے سورج کی کرنیں جھیل کی لہروں پہ بے تحاشہ مچل رہی تھیں۔ پانی کی سطح پر خوب صورت کشتیاں نہایت سبک رفتاری سے تیر رہی تھیں اور خاموش پانی میں اضطراب کی لہریں پیدا ہو رہی تھیں۔

پپو اور نجمہ ایک طرف کو نکل گئے تھے [illegible] گھوم رہا تھا اور ان قدرتی مناظر سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ کہ اچانک - بچاؤ، بچاؤ کی چیخ سن کر [illegible] کی سمت [illegible] دیکھا تو نجمہ اپنی پوری طاقت سے پکار رہی ہے ——
پپو جھیل میں گر گیا۔ اسے بچاؤ ...... [illegible] میں [illegible] ہو گیا۔ اور ایک اضطرابی کیفیت [illegible] ہو گیا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں، کیا نہ کروں ——

اتنے میں ایک آدمی جو شکل سے ملاح معلوم ہو رہا تھا کئی ڈبکیاں لینے کے بعد پپو کے پاس پہنچ گیا اور اسے اٹھا کر کنارے لے گیا۔ نجمہ نے پپو کو فوراً اپنی گود میں لے لیا میں اپنے انجان محسن کو تشکرانہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی حالت بالکل غیر ہو رہی تھی۔ اس نے اپنی جان کی پرواہ کئے بغیر پپو کو بچا لیا تھا۔ مگر خود کافی پانی پی گیا تھا۔ میں نے فوراً ایک ٹیکسی لی اور اسے اسپتال لے گیا لیکن اس وقت تک اس کی حالت بہت زیادہ تشویشناک ہو گئی تھی۔

اسٹریچر پر پڑا وہ آخری سانسیں لے رہا تھا۔ مگر اس کی آنکھیں نجمہ پر مرکوز تھیں۔ اور نجمہ بھی جیسے اسے پہچاننے کی کوشش کر رہی تھی۔

ڈاکٹروں نے اسے بچانے کی ہر ممکن کوشش کی۔ مگر وہ آخری گھڑیاں گن رہا تھا۔ اور مسلسل اس کی نظریں نجمہ پر ٹکی ہوئی تھیں۔ اور اس کے چہرے پہ ایک پراسرار مسکراہٹ کھیل رہی تھی جسے میں محسوس کئے بغیر نہ رہ سکا۔ کچھ ہی دیر میں اس کی روح پرواز کر گئی۔

میری سمجھ میں نہ آ سکا کہ اتنی جلدی یہ کیا ہو گیا ——
قدرت کے اس انوکھے کھیل پر میں حیران رہ گیا۔ اور ہم اس عظیم انسان کی موت پہ آنسو بہائے بغیر نہ رہ سکے۔

تین چار دنوں بعد طبیعت سنبھلی [illegible] ان پراسرار آنکھوں کا راز جو ایک ٹک نجمہ کو گھور رہی تھیں، میری سمجھ میں نہ آ سکا۔ دوسرے دن میں نے نجمہ سے پوچھا۔
نجمہ! وہ [illegible] کون تھا جو ایسی حیرت بھری نظروں سے تمہیں دیکھ رہا تھا۔ اس کی نظروں کا مفہوم سمجھنے سے [illegible] قاصر ہوں۔ اب تم ہی بتاؤ [illegible] کون سا راز پنہاں ہے؟

نجمہ گم سم سر جھکائے بیٹھی رہی۔ اس کے چہرے پہ ایک رنگ آتا اور ایک رنگ جاتا نظر آنے لگا۔ دیکھنے سے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ کشمکش کا شکار ہے۔ اس کے لب کپکپائے تھے اور وہ بمشکل اپنے آنسوؤں کو روک سکی۔ میں نے اسے تسلی دی اور سینے سے لگا لیا۔ وہ کچھ دیر تک سسکیاں لیتی رہی۔ اور پھر چند لمحوں بعد کہنے لگی۔

آپ مجھے معاف کر دیں۔ میں نے ہمیشہ آپ کو دھوکا دیا ہے۔ میں برابر چاہتی رہی کہ آپ کو اس بات کا احساس نہ دلاؤں، مگر میں مجبور تھی۔ اس کی یاد دل سے جتنا بھلانا چاہتی وہ اتنا ہی یاد آتا۔ شمیم ایک مجبور اور ستم رسیدہ انسان تھا۔ اس کے گلے میں سحر اور اس کے گانوں میں جادو تھا۔ کھدر کا معمولی سا لباس زیب تن کئے رہتا۔ اس کے گانا سنتے ہی ایسا لگتا جیسے کسی نے دل کے تار جھنجھوڑ دیئے ہوں۔ جسم خالی خالی سا لگنے لگتا تھا۔ روح آواز اور ساز کے تال سے بندھی ہوئی معلوم ہونے لگتی تھی۔ وہ مزاج کا بہت نیک اور شریف انسان تھا۔ میں پہلی بار اس سے متاثر ہوئی۔ اور ہم دونوں کی محبت پروان چڑھتی رہی۔ ہم نے فیصلہ کر لیا تھا کہ میں شادی کروں گی تو شمیم سے ہی۔ ایک بار میں نے شمیم سے کہا تھا کہ ——— شمیم! میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ دن رات تم میرے دل اور آنکھوں میں بسے رہتے ہو۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ میں تمہارے ساتھ زندگی گزاروں گی۔ تمہارے یہ مدھر گیت مجھے ابدی سکون بخش دیں گے۔

مگر شمیم نے [illegible] الفاظ میں کہا تھا۔ نجمہ تم ایک میرا [illegible] قدرت نے گلے کے سوز اور ساز کے سوا کچھ نہیں دیا ہے۔ تم میرے ساتھ زندگی کی خوشیاں نہیں حاصل کر سکو گی شاید ——— میں نے شمیم کو بہت سمجھایا اور کہا کہ تم میرے ڈیڈی کے پاس شادی کا پیغام لے کر جاؤ۔ وہ تمہاری بات نہیں ٹھکرائیں گے۔ اس لئے کہ وہ ایک پڑھے لکھے اور روشن خیال انسان ہیں۔

چنانچہ شمیم میری ضد پر بڑی مشکل سے تیار ہوا۔ اور ڈیڈی سے ملنے گیا لیکن ——— انہوں نے بڑی بے رخی سے اس کی بات کو ٹھکرا دی اور اسے اس کی اوقات بھی بتا دی۔

اس کے بعد مجھ پر بہت ساری پابندیاں عائد کر دی گئیں میرا گھر سے نکلنا بند کر دیا گیا۔

ایک رات شمیم چپکے سے میرے گھر گیا۔ اور میرے کمرے میں ایک خط چھوڑ کر جانے لگا کہ اچانک ڈیڈی کی نیند ٹوٹ گئی۔ اور چور چور کی صدا لگانے لگے۔ میرے ملازمین نے شمیم کو پکڑ لیا اور اسے بے حد جسمانی اذیت دے کر پولیس کے حوالے کر دیا۔ جسے میں آج بھی اپنے پاس محفوظ رکھے ہوئی ہوں کہ یہی اس کی آخری نشانی ہے۔

یہ کہہ کر اس نے اپنا سوٹ کیس کھولا۔ اور ایک خط نکال کر میری طرف بڑھایا۔ خط ہاتھ میں لے کر میں اسے پڑھنے لگا۔ لکھا تھا۔

نجمہ!

میں تمہارے ڈیڈی سے، تمہارے کہنے کے مطابق ملنے گیا، لیکن انہوں نے انکار کر دیا۔ میں نے ان کے فیصلے پر اپنا سر خم کر دیا۔ اور کل میں یہ شہر چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ خدا تمہیں ہمیشہ خوش رکھے۔ ہو سکے تو میری یاد دل سے فراموش نہ کر دینا ——— اللہ سے بس ایک ہی تمنا ہے کہ تب تک تمہارا ہی نام میری زبان پہ رہے

سہیل کے متعلق اپنی رائے سے نواز ئیے

بانی : حافظ محمد عبدالرحمن سہیل سنہساروی

ماہنامہ سہیل گیا

مجلس مشاورت

- ڈاکٹر تارا چرن رستوگی
- ڈاکٹر قمر رئیس
- اصغر علی انجینیر
- قیصر عثمانی
- شاہد احمد شعیب
- ڈاکٹر محمد مثنی
- ڈاکٹر علیم اللہ حالی
- سید احمد قادری

چیف ایڈیٹر : — مسعود منظر
ایڈیٹر : — جمیل منظر

— : معاونین : —
شکیل احمد جمالی، عبدالقیوم ابدالی، فیضان عزیزی

شمارہ ۶-۷ جلد ۱۵

— : بدل اشتراک : —

- اس شمارے کی قیمت ۱۰ روپے
- زر سالانہ — ۴۰ روپے
- لائف ممبری — ۱۵۵۱ روپے

بیاد گار : زین العابدین احمد و ادریس سنہسروی

فہرست

نمود ———— ۵
پروفیسر ساجدہ زیدی۔ تعارف ۔ ڈاکٹر تارا چرن رستوگی ۔ ۱۰
آتش سیال ایک جائزہ ۔ مسعود سبزواری ۱۳
آتش تحرک کی شاعرہ ۔
ساجدہ زیدی ۔ پروفیسر علیم اللہ حالی ۱۹
سرحد کوئی نہیں کی تخلیقی جہات ۔ مرزا سعید الظفر چغتائی ۔ ۲۵
ساجدہ زیدی کی نظم نگاری ۔ سید احمد قادری ۳۳
ساجدہ زیدی سے ایک ملاقات ۔ فیاض حالی ۳۹
کاغذی ہے پیرہن ساجدہ زیدی ۴۳
پھر کوئی طوفان بلا میرے لئے " ۴۵
زاد سفر کیا ہوا " ۴۷
غزلیں " ۵۰
تخلیقی شعر کی نفسیاتی تعبیر ۔ پروفیسر ساجدہ زیدی ۵۱
مسعود سبزواری کی
شعری جہات پروفیسر ساجدہ زیدی ۵۹

خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ

ماہنامہ سہیل
ریلوے سائڈ روڈ، گیا ۸۲۳۰۰۱

فون نمبر ۲۱۵۷۳

یہ خصوصی شمارہ

ماہنامہ سہیل کا یہ عام شمارہ ہم نے ساجدہ زیدی کے لئے مخصوص کر دیا ہے۔ کسی اہم فنکار کا قرض ہرگز اس طرح ادا نہیں کیا جا سکتا کہ اس کے فکر و فن کو چند صفحات کے رسالے میں پیش کیا جائے۔ ہم اسے اصل کی ادائیگی نہیں بلکہ سود بھرنا کہتے ہیں۔ اصل تو ابھی باقی ہے ممکن ہے ماہنامہ سہیل اپنی بے بضاعتی کی وجہ سے یہ قرض ادا نہ کر سکے لیکن اگر کوئی محفی آئندہ ایسا کرے تو ہم یہ سمجھیں گے کہ اس نے ہمارا بوجھ ہلکا کیا ہے۔

ہندوستان کے شعری منظر نامہ پر ابھرنے والی خواتین شعراء میں شفیق فاطمہ شعریٰ، ساجدہ زیدی اور زاہدہ زیدی نے ایک نئی فضا کی تعمیر میں نمایاں کام کیا ہے۔ بلاشبہ شفیق فاطمہ شعریٰ کے طویل فنی سفر کے مقابلے میں ان کا مختصر شعری مجموعہ 'گلہ مغفورہ' اس امر کی پہچان ہے کہ شفیق فاطمہ شعریٰ کی بہت سی تخلیقات ابھی آنا باقی ہیں۔ ان کے لہجہ کی غیر مجیت کے مقابلے میں ساجدہ زیدی کے فن سے ابھرنے والی خالص ہندوستانی عورت اس تصویر کو مکمل کرتی ہے۔ شاعری میں جانا پہچانا ماحول، تنہائی کی وہ سوچیں جن میں ذات سے گزر کر پوری دنیا کے مسائل سامنے آجائیں۔ جذبے کا رکاؤ، ٹھہراؤ اور تخلیقی شخصیت پر مکمل اعتماد نے ساجدہ زیدی کے جو تین شعری مجموعے ہمیں دیئے ہیں وہ ہمیں ان کے بارے میں، ہم عصر شعری میلانات اور اردو شاعری کے مستقبل کے بارے میں بہت کچھ کہنے کی دعوت دیتے ہیں۔

ہم نے یہ خاص شمارہ نکال کر اس دعوت کو عام کیا ہے۔ ہمیں ان ارباب ذوق کا انتظار رہے گا جو اس چھوٹی سی لکیر کو شاہراہ بنا دیں گے۔

مسعود منظر

ڈاکٹر تارا چرن رستوگی

پروفیسر ساجدہ زیدی، تعارف

اگر اردو تنقید پر معتقدات ذہنی و قلبی کا کاروبارانہ قبضہ نہ ہوتا تو پروفیسر ساجدہ زیدی کو اکتسابی و وجدانی صلاحیتوں کے اعتبار سے اردو شعر و ادب میں ممتاز مقام و مرتبہ حاصل ہو گیا ہوتا۔ موصوفہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں شعبۂ انگریزی تعلیم سے وابستہ رہی ہیں۔ انہوں نے لندن یونیورسٹی سے تعلیمی نفسیات پر مقالہ لکھ کر ایم فل کی ڈگری حاصل کی۔ انگریزی میں جو کتابوں کے مسودات یوں ہی پڑے ہوئے تھے۔ جو اب میرے اصرار پر طباعت کے لئے تیار کئے جا رہے ہیں۔ اور ایک کتاب، ضخیم کتاب جو طباعت کے منزلوں سے گذر رہی ہے۔ تعلیمی نفسیات ہی سے متعلق ہے اور جس کو دہلی کے مشہور ناشر O M SONS PUBLICATION شائع کر رہے ہیں۔ بالاتفاق کتاب ہذا کا مسودہ دیکھنے کا اتفاق ہوا جس کی ورق گردانی کرتے ہوئے انگریزی میں ایک نظم ملی۔ اگر زیدی صاحبہ اس نظم کو JOURNAL OF ENGLISH WRITING IN INDIA کو بھیج دیں تو بحیثیت INDO_ANGLIAN POET بھی شہرت مل سکتی ہے۔ بالعموم اردو والے معیاری انگریزی لکھنے سے قاصر رہتے ہیں۔ کیونکہ ان کے یہاں اگر مگر حالانکہ اور لیکن وغیرہ الفاظ کی بھرمار رہتی ہے۔ اور جب ان کو بآسانی حذف کیا جا سکتا ہے، بات کہنے میں آ ہی جاتی ہے کے مصداق دیکھئے اقبال تین سال کے قریب کیمبرج میں رہے مگر صحیح انگریزی لکھنا نہ سیکھ سکے وہ ON BEHALF اور IN BEHALF کے مابین فرق کو نہیں سمجھ پائے اور اسی طرح کے اور اسقام کی ان کے یہاں بھرمار ہے جن کی نشاندہی میں نے اپنی حالیہ تصنیف IQBAL IN FINAL COUNTDOWN میں کی ہے۔ زیدی صاحبہ خوش صاف و شستہ لکھتی ہیں۔ بہ حیثیت شاعرہ ان کا مقام و مرتبہ خاصا رفیع ہے۔ ساجدہ زیدی کی شاعری پر میرا مبسوط مضمون روح ادب کلکتہ (جنوری مارچ ۱۹۹۱ء) میں شائع ہوا تھا۔ شعر ساجدہ کا کلیدی عنصر درد و سوز مندی ہے۔ جو انفرادی بھی ہے اور ساجیاتی بھی۔ فی الواقع شاعری کا مصدر درد و سوز ہی ہے۔ رشی والمیکی نے فقط ماتمی کے شور ماتم ہی کا ہم سوزی کو شعر انگیز اور شعر آفریں بتایا ہے۔ بدھ دھرم (بدھ دھرم کہنا غلط ہے جو اردو میں عام ہے) میں "غم" کو

کلیدی حقیقت بتایا ہے۔ پیدائش، زندگانی، مرگ تینوں غم ہی کے سلسلے ہیں۔ اور اس غم سے نجات حاصل کرنے کے لئے نروان حاصل کرنے کا لائحۂ عمل پیش کیا۔ سنگھ (جماعت خدمت کاران) سے وابستہ ہو کر بدھی [illegible] یعنی علم و عرفان) کا حاصل کرنا اور اس طرح نروان (حصول لاتعلقات در تعلقات) حاصل کرنا ہی مولانا روم کہتے ہیں ۔۔ پیشوا کن عقل صبر اندیش را (مثنوی دفتر ششم) مہاشونیہ (خلائے عظیم و بسیط) سمادھی (توازن دل و دماغ) فنا فی اللہ و بقا باللہ وغیرہ اصطلاحات ایک مفہوم کی حامل ہیں۔ مگر رہبانیت کے حلقے میں پھنس کر اقبال نہ جانے کیا کیا کہنے لگے مگر اپنے بڑے بھائی عطا محمد کے معطل ہو جانے پر درگاہ نظام الدین کے دربار میں نیازمندانہ اشعار پیش کرنے لگے۔ حضرت نظام الدین اولیا راہب تھے اور ہر راہب کی طرح خدمت خلق کو عین عبادت سمجھتے تھے۔ ساجدہ زیدی کے کلام میں صوفیانہ سوز مندی موجود ہے۔ اور ایسی سوز مندی جو انفرادی اور سماجی ہوتے ہوئے بھی اپنا وجود قائم رکھتی ہے۔

ساجدہ صرف ایک شاعرہ ہی نہیں ہیں وہ شاعری سے متعلق واضح خیال بھی رکھتی ہیں ملکہ "تخلیق شعر کے باب میں" کے تحت لکھتی ہیں:

> "شاعری ـــــ اگر ایک طرف، اپنی ذات کی تاریک تنہائیوں میں ڈوب کر اپنی ہی سمت ایک ایسے سفر کا نام ہے جس کا ہر قدم کیف آگیں بھی ہے اور لرزہ خیز بھی، روح پرور بھی ہے اور درد انگیز بھی، دزدیدہ بھی ہے اور بے باک بھی ہے۔
> انسانی زندگی..... دکھ، سکھ، رنج و راحت، حسرتوں، آرزوؤں، تلخیوں ناکامیوں، خواہشوں، محرومیوں، خباثتوں اور کثافتوں کو اپنے خون کی گردش میں تحلیل ہوتا محسوس کرنے کا بے پناہ درد ہے .... تخلیقی عمل کا سفر بڑی حد تک بعید از فہم اور پراسرار عمل ہے ... شعور و لاشعور کا پراسرار طور پر باہم دگر ہو کر ایک ہی سمت میں بہاؤ، تجزیے سے ماورا حقیقت ہے .... تخلیق شعر کے نتیجے میں کائنات کے جملہ مظاہر و حقائق میں یکی محسوس ہوتی ہے ...... تخلیق شعر کے وقت اس قوت سے ہم کلام ہوتی ہوں جو میرے وجود کے پنہاں خانے میں پنہاں بھی ہے اور کائنات میں جاری و ساری بھی ......"
> (سیل وجود)

"تخلیق شعر کے باب میں" کو بطور مضمون پیش کیا جانا چاہئے۔ رموز و غوامض شعری کے فلسفہ کو اردو شعرا باستثنائے فراق گورکھپوری درخور توجہ نہیں سمجھا ہے۔ انگریزی میں اس موضوع پر بے شمار ماخذ دستیاب ہیں۔ کولرج، کیٹس کے خطوط، شیلے کے خطوط، پریسکاٹ، رگنساتین کوئیشلر کی کتابیں اس موضوع پر روشنی ڈالتی ہیں۔ تمام تر ماخذ سے استفادہ کرتے ہوئے اپنے شعری وجدان کو پیش نظر رکھتے ہوئے ساجدہ نے اس موضوع پر قلم اٹھایا ہوگا۔ [illegible] فراہم کیا (اردو کے ناقدوں میں) افسوس کا مقام ہے، ایک ایسا بھی ناقد (؟)

ہے میں نے کوشش کی نا بالغ ذہنیت بتلا سبب کہ وہ خود انگریزی کا پہنچ ہے مگر میں انگریزی نہیں لکھ سکتا) ساجدہ کی ذہنیت متعدد عالم کے گہرے مطالعہ پر استوار ہوئی اور ان کے تجربات و مشاہدات مشرق و مغرب پر محیط ہیں ۔ سیاسی بصیرت بھی معمولی نہیں ہے ۔ در خور صد اعتنا ہے ۔ روس، پاکستان کے حالیہ واقعات کے بارے میں ساجدہ زیدی کی رائے صائب بھی ہے اور صحیح بھی ہے ۔ اس پہلو پر بھی مضمون لکھا جا سکتا ہے ۔ پارلیمان میں ایسے لوگوں کی کثرت ہے جو زر و زور کے ذرائع سے ایوان تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے ہیں ساجدہ زیدی جیسے صفات والوں کا ایوان تک پہونچنے دیا جائے ۔ یہ قومی ضرورت ہے ۔ " آتش سیال " میں موصوفہ نے اپنا تعارف شامل کیا ہے جو درج ذیل سوالات سے شروع ہوتا ہے ۔

میں کیا ہوں ؟

کون ہوں ؟

کہاں سے آئی ہوں، کس سمت جاؤں گی ؟

میری ہستی میں، میری نیستی میں فرق ہی کیا ہے ؟

بالفاظ دیگر خود احتسابی اور اس تعلق سے گرد و پیش پر گہری نظر ڈالنا وغیرہ متوجہات ان کے سامنے رہے ہیں ۔ یہ رویّہ معمولی نہیں ہے، فلسفیانہ ہے، خالص فلسفیانہ ہے افلاطون نے کہا ہے AN UNEXAAMINED LIFE IS NOT WORTH LIVING (وہ زندگی جس کا انتقادیاتی جائزہ نہ لیا جائے بیکار محض ہے)

اسی مجموعے میں شامل نظم " وجدان " میں کہتی ہیں :

" ....
کبھی لگتا ہے
میرے جانب بے کراں گہرا اندھیرا ہے
یہ سارے فلسفے و آگہی اور فکر کے رشتے
یہ تہذیب و تمدن کے بلند آہنگ ہنگامے
مذاہب اور سیاست کی فسوں کاری
یہ سب مجذوب کی بڑ ہیں
یہ ساری کائنات اک وہم ہے
اک نامکمل نقش ہے
تخلیق بے مقصد ہے، بے معنی "

یہ سب خالص فلسفیانہ خیالات ہیں، محض متصورات ہیں ۔ وہ ذاتی متخیلات ہیں اور وجودیاتی محسوسات بھی ۔

قبال کے یہاں بھی ایسے خیالات تھے۔ مگر وہ ان کو الہیات میں کھینچ کر لے گئے اور تجربات کو الہامات میں تبدیل کر بیٹھے۔

"آتش سیال" میں "تو شب آفریدی"..... بھی بے پناہ ایمائیت سے بھرپور نظم ہے کیوں کہ قارئین کو اس کے پس منظر کا خود ہی پتہ مل جاتا ہے۔ لہٰذا اس نظم میں اقبال کی نظم "تو شب آفریدی چراغ آفریدم" ا معنویت یا لامعنویت از خود شامل ہو جاتی ہے۔

بہت دور ـــــ حد نظر تک
اندھیروں کا جنگل
سرحد ہمت و امکاں تک
یہی بے کراں، بے اماں سلسلہ ہے

سی معنویت سے بھرپور نظم "وقت اور انجام" کا ایک حصہ ملاحظہ فرمائیں:

زندگی ۔ وقت کے ہاتھوں میں پگھلتا ہوا جام
زندگی ۔ اپنی تلاش آپ ہی اپنا انجام
زندگی ۔ بہکے ہوئے نطق سے بکھرے ہوئے لفظ
زندگی ۔ شعلہ بہ لب، حشر بکف، سوز انجام
زندگی ۔ شوق کی راہوں میں حقیقت طلبی
ہمت کے سینے پہ امکان کی یلغار کا نام

ریہ قطعے :

ایک شرارے سے ہوا عالم امکاں روشن ایک شعلے سے جلا گھر، یہ تماشا دیکھا
حد امکان طرب، شدت درد ہستی مختصر زندگی عشق میں کیا کیا دیکھا

دامن شب میں کہیں رنگ سحر ہے کہ نہیں کیا افق تک بھی کوئی راہگزر ہے کہ نہیں
ایک شام اور کٹی، ایک سحر اور ہوئی دل ویراں تجھے اتنی بھی خبر ہے کہ نہیں

طبوعہ غزلیات سے چند اشعار:

خیمۂ خواب میں گونجی مرے دل کی آواز ٭ راہ عرفاں میں بنی ساعت سکرات مری

[illegible] کوئی ہماری [illegible] نہ سمجھا ٭ [illegible]

وہ تنہا میں ملتے تھے ہم مگر یہ سنبھالیا ہے دل کو ٭ نگاہ و دل ہی کہاں ملتے تھے نگاہ و دل کے عذر سے پہلے

مقام دار و رسن تک تو آگئے تھے قدم ٭ وہی تھی منزل آخر نظر جہاں پہنچ گئی

یہ کس کافر نظر نے بھر دیا سنگیت رگ رگ میں ٭ کہ حرف درد و حرماں بھی ترنم ریز ہے ساقی

کون تھے کیا تھے، کہاں تھے ہمیں کس کی تھی طلب ٭ خود ہمیں اپنی ہی ہستی کا پتہ یاد نہیں

ساجدہ نے منظوم ڈرامے بھی لکھے ہیں۔ حالیہ ڈرامہ کا عنوان ہے "........ کی سرحد کوئی نہیں"، اس میں صرف کردار ہیں، گوتم اور زہرہ۔ جن کے جذبات کے منازل کو بہ حسن و خوبی پیش کیا گیا ہے۔ گوتم اور زہرہ قریب در قریب آتے ہیں۔ مگر ان کے جذبات کے ارتعاشات ڈرامے کے اختتام پر بھی انجام آشنا نہیں ہوتے۔ ودا تحمائیکہ مصنفہ حرف آغاز کے تحت لکھتی ہیں کہ ڈرامہ کے کردار کسی منفرد خیال کی علامت نہیں ہیں۔ مگر پیش کردہ تصورات و واقعات زندگی کی گہرائیوں تک پہونچاتے نظر آتے ہیں۔ سوز مندی راہ و جادہ بھی ہے اور منزل مقصود بھی۔

ساجدہ زیدی شاعری میں گو ہر شہوار ہی نہیں بہت بڑی شخصیت ہیں ؎

میری ہوس کو عیش دو عالم بھی تھا قبول
تیرا کرم کہ تو نے دیا دل دکھا ہوا ، (فانی بدایونی)

ساجدہ حقیقتہً دل دکھی نہیں ہیں، شمع روشن ہیں۔

مصور سبزواری

آتش سیال ۔ ایک جائزہ

چاند اپنے داغوں کو جلا نہیں دے سکتا۔ شراب اپنے آپ کو نہیں پی سکتی۔ آئینہ اپنا عکس دیکھے تو نابینا ہو جائے۔ انہیں سے ملتے جلتے فرمودات کاغذی پیرہنوں پہ لکھے ہوئے مذہبی احکامات کا روپ دھارتے ہوئے اپنی تمام تر بہیمانہ قوتوں کے ساتھ دندناتے ہوئے عورت کے سامنے اسی وقت سے کھڑے ہوئے ہیں جب سے اس نے ساتویں پسلی کی گرفت سے اپنے آپ کو رہا کیا تھا۔ بیکراں صدیوں سے بیکراں صدیوں تک بہیمانہ طلسم کے کالے بھجنگ ہیولے، فتح گرداں جنسی فتوحات کے وصول بیٹتے ہوئے خون آلود گنہگار چہروں کی آب پر عورت کی محبت اور ______ عفت کا امتحان لیتے رہے اور وہ گناہ شوق کے نام پہ کفارہ پہ کفارہ ادا کرتی رہی۔ اس کو اپنی محبت کا سب سے پہلا کفارہ اس وقت ادا کرنا پڑا جب حوا کے روپ میں اس کے بیٹے ہابیل کی لاش اسے دکھا کر اس کے قدموں میں جنت بچھا دی گئی۔ دوسرا کفارہ مریم کی شکل میں اس نے اس وقت ادا کیا جب یسوع مسیح کو اس کی آنکھوں کے سامنے صلیب پر چڑھایا جا رہا تھا اور تیسرے المناک کفارہ کی ادائیگی فاطمہ کے پیکر میں اس دن ہوئی جب بے آب و گیاہ جلتی ریت میں حسین کے خشک گلے پہ کند چھری پھیری جا رہی تھی اور فاطمہ کی روح برہنہ پا بال بکھرائے مامتا کے مقتل میں فریاد کر رہی تھی۔

عورت جو کہ تخلیق اور وجود کا سرچشمہ رہی۔ اس کی ہر محبوب تخلیق کا قتل ازل سے اسی طرح ہوتا رہا اور وہ ہر قتل کے لئے اپنے آپ کو تیار کرتی رہی۔ اس کے کفارہ کی تکمیل میں تو کسی کو شبہ نہ رہا مگر اس کی ذات کو نامکمل اور بے حیثیت تسلیم کرنے اور کرانے میں ساری کائنات فہم سخن تک پیش پیش رہا۔

زیر نظر مجموعہ آتش سیال کی نظموں میں عورت (مشرقی عورت) نے شاید پہلی بار اس المناک بے حقیقت حیثیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنے منصب دیرینہ کو ادا کرنے سے انکار کر دیا ہے۔

فلسفہ شعر

تمنا کا طلسم
درد ہستی کی چبھن
آبلہ پائی کا احساس
تلخ کامی کی شناس
لگ رہے کہ مری ذات کا حصہ ہی نہیں ۔
مجھ کو ہنگامۂ عالم سے سروکار ہی کیا ۔
میں یوں ہی گھٹتی سسکتی رہی لمحہ لمحہ
اور لوگوں کی انا بڑھتی رہی
پھولتی پھلتی رہی
ذہن کو تھپکیاں دے دے کے سلایا
کہ نہ جاگے نہ کرے شور و بکا
مجھ کو گمنامی کے غاروں میں ڈھکیلا
مجھے محصور کیا سہرا انہیں دیواروں کے پیچھے
کہ جہاں
میری دلکش تصویر
کہ جو ان صدیوں نے سجا رکھی تھی
میں وہ تصویر نہیں ....
نقش بر دیوار نہیں .....

(میں وہ تصویر نہیں)

اس نظم میں جو کردار ابھرتا ہے وہ صبر و قناعت کی حیثیت خوردہ لیس ماندہ، پردہ نشیں مظلوم عورت کا نہیں بلکہ یہ تو ایک ایسا سراپا ہے جو عورت کو ایک اٹوٹ اکائی کے روپ میں اس کے مکمل وجود کو منوانے پر مصر ہے ۔ یہ [illegible] سطح پر نہیں ہوا ہے بلکہ اس کی سطح پر کائنات کے اسرار و رموز سیاسی و اقتصادی، ادبی و ثقافتی احوال [illegible] کی صورت میں [illegible] ظلم و تشدد، خود غرضی اور بے انصافی کا جو پاشیدہ [illegible] بہتر طریقے سے نمایاں کر رہی ہے ۔ بیانیہ انداز میں یہ آواز کسی مرد کی نہیں عورت کی، یہ [illegible] آواز ہے جس کی گونج کے ارتباط ابد سے ازل تک پھیلے ہوئے ہیں وقت کے شب کی ابتدا سے لے کر [illegible] آوازوں کی صورت ایک لازوال شعلہ بار تیغ بن کر ابھرا ہے ۔

مخ بستہ فضائیں سانسیں لیتی ہیں
مرے سینے وہ آتش فروزاں ہے
جو ہر زندہ حقیقت کا مقدر ہے
یہ آتش میری خالق ہے
کہ اس نے مرگ و ہستی
غیر خود اور خود کی
ریتیلی دیواروں کو گرا کر
ایک خلائے بیکراں کا منظر حیرت دکھایا ہے
مجھے ہستی میں رہ کر
نیستی کا بار اٹھانے کا
فن مطلق سکھایا ہے
(آتش سیال)

لیکن اس آتش سیال کی نشو و نما میں خود ساجدہ زیدی کو بارہا تن تنہا آگ اور خون کے دریا سے گذرنا پڑا ہوگا۔ اس لئے نہی عن المنکر اور امر بالمعروف کی بوسیدہ صداقتوں پر قائم عصری عرفان کے بجائے اس مجموعہ کی پوری شاعری میں شخصی تلاش کا فن ردّ و قبول کے عالمانہ استدلال کے ساتھ رونما ہوا ہے۔ ساجدہ زیدی کو مشرق کے بے مغز ذہن اور مغرب کے بے روح جسم سے شکوہ نہیں۔ وہ مشرق و مغرب کے متضاد اتصال سے ایک سرتاپا متحرک با شعور انسانی وجود کی تشکیل کی خواہش مند ہیں۔

رات کٹ جائے گی یوں ہی باتوں میں
اور جب لمحوں کی زنجیر کٹے
تم اسی روح کے سناٹوں میں کھو جاؤ پھر
میں اسی ریت کے صحرا میں بکھر جاؤں پھر
لمحہ لمحہ یوں ہی گذریں یہ عدم کی راہیں
گا ہے گا ہے اسی یک رنگئی ماحول کی ویرانی میں
میں بھی زخموں کے تعلق سے تمہیں یاد کروں
تم بھی بکھرے ہوئے فقرات میں ڈھونڈو مری ہستی کے نشاں
(مشرق و مغرب کا نقطۂ اتصال)

ان کے یہاں ماضی کے شعور نے اپنے سارے زرد پتے ہی نہیں گرائے ہیں کہ اس پت جھڑ میں نئے شگوفے بھی کھلتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

رگوں میں زہر کو دوڑا دیا لہو کی طرح
مژہ پہ قطرۂ شبنم میں آگ دہکائی
ہر ایک لمحے کو ایک عمر کا خراج دیا،
ہر ایک خار کو سو آبلوں کی رعنائی
مہیب بھی نہیں کچھ ایسا دشت تنہائی (ایک نظم)

اساطیری حقائق سے گریز کرتے ہوئے ساجدہ زیدی کے یہاں لہجے کا باوقار حسن جس سنجیدگی سے انگیز ہے وہ جدید ذہن کے مسخ شدہ فرار سے بالکل الگ شئے ہے۔ انسانی رشتوں کے ربط اور انقطاع کا تجزیہ جا بہ جا ان کے یہاں بڑے موثر احساس کے ساتھ ہوا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ روح کی جسمانیت اور جسم کی روحانیت کے گہرے پاکیزہ جائزے ان کی شاعری میں بلند پایہ اور بڑی شاعری کے تمام محرکات اور امکانات واضح طور پر مہیا کر دیئے ہیں۔

ان نظموں کے پس منظر میں وہ جدید میکانکی معاشرہ بھی ہے جو ساری فکری اور روحانی اساس کو گنوا کر ہیئتی یا بے سمتی کا شکار ہو گیا ہے۔ بحرالکاہل میں بے بادباں کشتیاں، اس قبیل کی ایک کلیدی نظم ہے ان نظموں کے تناظر میں سماجی عصبیت کا پروردہ وہ ناقد ذہن بھی ہے جو مکمل طور پر بالغ نہیں، چھوٹے چھوٹے فریبوں پر مشتمل مسرتوں کے مسلسل پرورش نے آج کے انسان کو بھی بڑی حد تک طفلانہ اشیا اور خوب صورت خوابوں سے دست بردار نہیں ہونے دیا وہ آج بھی اپنے جذبوں کو کھلونوں کی دکان میں سجا ہوا دیکھنا چاہتا ہے اور صرف ظاہری سطح پر انہیں قبول کرنے کو تیار ہے باطنی حظ اٹھانے کے لئے نہ اس کے پاس فرصت احساس نہ محدود انسانی بصیرت سے نکلنے کا جواز...... اقدار حیات کی شکست و ریخت کا مرثیہ "آتش سیال" کی شاعری کا مقدر نہیں ہے۔ انسانی دوا کے ساتھ ساتھ ہی کائنات کی بھی ساری طنابیں اکھڑ گئی ہیں۔ اپنی تخلیق کے ساتھ خود خالق بھی شکست کے صدمے سے دوچار ہوا ہے۔

اے خدا
تو فلک پر نہیں
ہم زمیں پر نہیں
عدم اور ابد کے تضادات میں
تو بھی بکھرا ہوا
ہم بھی ٹوٹے ہوئے (ایک نظم)

آتش سیال کی شاعری کے شدید تر احساسات ان نظموں میں شدید ترین ہو گئے ہیں جو صابرہ زیدی کی موت پر لکھی گئی ہیں۔ سب سے اہم بات یہ کہ یہ نظمیں نہ صرف ساجدہ زیدی نے اپنی بڑی بہن کے سوگ میں کہی ہیں بلکہ ان

الم انگیز موضوعاتی رشتے سیلانِ ادب ..... موت سے لے کر ہر ایک انسانی زیاں سے جاملتے ہیں۔ ان نظموں کی اہمیت بیانیہ مرثیت میں نہیں بلکہ ان لامتناہی گم شدہ روشنیوں کے ماتم میں ہے جو ذہن کے سیہ خانے میں ایک بار سپرد ہو کر مصلوب ہو گئیں ان نظموں کا منضبط ٹھہراؤ مستعمرانہ طرز کی باوقار مرثیت کی یاد دلاتا ہے۔

یہی احساس دردانگیز
زہر زندگی بن کر جو رگ رگ میں تڑپتا ہے
مجھے شاید سہارا دے
کہ میرے اور تمہارے درمیاں
بس اک یہی رشتہ تو باقی ہے (ہستی کا المیہ)

وہ ایک طائر تھی
جس کی آزادیاں شاخ پر بسیرا کرنے سے ختم نہیں ہوئیں
اور وہ آزاد ہو گئی۔
جسم وجاں کی قید سے آزاد
وقت ومکاں کی قید سے آزاد
مگر اس شاخ سے رہ رہ کر خون کیوں ٹپک رہا ہے؟ (وہ کون تھی؟)

آتشِ سیال میں گوناگوں فکری انکشافات، انگشت پیچ در پیچ ذہنی الجھنیں اور رونما ہونے والے کرب آمیز اور ہولناک واقعات کے زندہ Images دیکھ کر جدید نظم کے امکانات ومراتب کی توسیع ہوتی نظر آتی ہے۔ جدید دور کا حیراں کن زاویۂ نظر کو سمجھنے اور سمجھانے میں نہ صرف افکار کو بدلتے ہوئے میلانات سے آشنا کرایا ہے۔ بلکہ ذاتی کرب کے تقابل میں بکھرے ہوئے عصری اور آفاقی کرب کی وسعتوں میں بھی اپنے پڑھنے والوں کو شامل کر لیا ہے۔ ان کی شاعری نہ سامری کا فن ہے نہ موسیٰ کا یدِ بیضا۔ نہ نیلے پانیوں پر لکھی ہوئی داستان ہے نہ پتھروں پر کھدے ہوئے اقوالِ زریں۔ بلکہ سات سمندروں کے ہفت خواں سے گذرتے ہوئے شعلوں کی وہ کہانی ہے جسے ساجدہ زیدی سے پہلے کسی نے نہیں کہا ہے اور اگر کہا بھی ہے تو اس سلیقے اور اہتمام سے نہیں۔

مجموعی طور پر ساجدہ زیدی کے یہاں نظم کی اداراکی کیفیت سے ایک طلسماتی روشنی افق در افق پھیلتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ پیچیدہ تاثرات، نازک محسوسات اور عمیق ترین جذبات کا اظہار کرتے وقت شکستہ کائنات کو مرتب کرنے کے بجائے وہ موجودہ انسان کی کھوئی شخصیت کو ایک بامعنی اور مثبت انداز میں مرتب کرنا چاہتی ہیں۔ وہ جدید علوم کی مدد سے کائنات کے نئے آفاق اور ذہن کے نئے ذرائع دریافت کرنے میں مصروف ہیں۔ جس سے ان کی شاعری کی کشش انجانی حدود تک پھیلتی چلی گئی ہیں۔ آتشِ سیال نہ ابلاغ کی ترسیل کا [illegible]

پروفیسر علیم اللہ حالی

آتشیں تحرک کی شاعرہ ساجدہ زیدی

سب سے پہلی بات جو مجھے ساجدہ زیدی کی شاعری کی طرف متوجہ کرتی ہے وہ یہ ہے کہ اس میں مجھے ایک آتشیں تحرک کا احساس ہوتا ہے۔ ایک ایسا منظر سامنے آجاتا ہے جہاں کوئی آتش کدہ بیکراں اضطراب و التہاب کے عالم میں مچلتا پھرتا ہو۔ بے کلی، بے چینی، تلاش پناہ اور کوشش سکون کی تمام کیفیتیں مل جل کر ساجدہ زیدی کی شاعری میں ایک خاص فضا تیار کر دیتی ہیں۔ وہ آگ جو بے چینی اور انتشار کی خارجی تصویر ہمارے سامنے پیش کرتی ہے وہ شاعرہ کی داخلی شخصیت میں ایک مستقل لاوہ سلگ رہی ہے۔ اندرون کا یہ کرب اس کی شخصیت کو متعدد سمتوں میں لے جاتا ہے۔ کبھی الٰہیات کی طرف کبھی بھولے بسرے رشتوں کی طرف۔ کبھی سماجی مسائل کی طرف، کبھی ماضی میں، کبھی حال میں، کبھی فکر و فلسفہ کی سمت۔ یہ سارے ان کی فنکارانہ شخصیت کے نہاں خانے سے پھوٹتے ہیں۔ جہاں ایک شعلہ جوالا رقص کناں ہے۔ ساجدہ زیدی کے یہاں کے فکر و نظر کی رنگ کاری اور موضوعات و احساسات کا تنوع اسی التہابی تحرک کا جذبۂ بے اختیار شوق ہے۔ چنانچہ ساجدہ کے یہاں کوئی موضوع اوپر سے لادا ہوا ہی نہیں ہے۔ خارجی موضوعات اور سماجی مسائل بھی ان کے نہاں خانۂ احساس میں تپ تپا کر نئی صورتوں میں جلوہ گر ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی تو ان صورتوں سے اصل کا پتہ لگانا بھی دشوار ہو جاتا ہے۔ یوں ایک طرح سے ابہام ہو سکتا ہے لیکن جب انہیں شاعرہ کی شخصیت کے ساتھ ساتھ سمجھا جائے تو پھر سب کچھ صاف ہو جاتا ہے۔

میں نے ساجدہ زیدی کی شاعری کے واسطے سے آتشیں تحرک کی بات کی ہے۔ یہ بات [illegible] ہوتی ہے کہ انہوں نے اپنے متعدد مجموعوں کے جو نام رکھے ہیں اور ان کی جو TITLE POEMS ہیں [illegible] وہی کیفیت پائی جاتی ہے۔ ان کا پہلا مجموعہ "جوئے نغمہ" کے نام سے شائع ہوا تھا۔ تحرک [illegible] بھی پیدا ہوتا ہے۔ "آتش نفس" کا لفظ ظاہر ہے آتشیں کیفیت [illegible] نہیں بھولنا چاہئے کہ اول تو شاعرہ [illegible] ممکن ہے کہ ان کی فنکارانہ شخصیت کے [illegible]

خدوخال واضح نہیں ہو سکے ہوں۔ شخصیت کی تکمیل گردش ماہ و سال اور تجربات ماضی و حال سے ہوتی ہے۔ دوسری بات یہ بھی ہے کہ فنکار صرف گرمی نشاط و تصور سے نغمہ سنج نہیں ہوتا۔ یا دوسرے لفظوں میں یہ کہہ لیجئے کہ نغمہ محض انبساط کا نتیجہ نہیں ہوتا۔ یہ ایک اور چیز بھی ہوتی ہے جسے غالب نے نغمہ ہائے غم کہا ہے۔ ممکن ہے ساجدہ زیدی کا مجموعہ "جوئے نغمہ" وہی لوح حیات ہو جس کی مکمل تصویریں بعد کے مجموعہ ہائے کلام میں ملتی ہیں۔ میرے پیش نظر ان کا پہلا مجموعہ نہیں ہے۔ مگر اس سے کوئی خاص فرق بھی نہیں پڑتا۔ دوسرا مجموعہ "آتش سیال" اور تیسرا "سیل وجود" ہے۔ سیال اور سیل کے الفاظ خواہ شعوری طور پر لائے گئے ہوں یا لاشعوری طور پر آ گئے ہوں مگر یہ بات تو بہرحال ثابت ہوتی ہے کہ فنکار کے یہاں کوئی شئے ضرور ہے جو ثابت نہیں بلکہ سیار ہے۔ حرکت و روانی، تحرک و تفاعل کی معنویت بھی الگ الگ موقعوں پر الگ الگ ہوتی ہے۔ جب یہ رقص ہو جائے تو انشراح و انبساط کی علامت ہے جب طواف ہو جائے تو ابدیت کا اشاریہ ہے۔ بسمل ہو تو تڑپ بن جائے، محویت ہو تو حال ہو۔ شعلگی ہو تو اضطراب ہو تحرک ہر حال میں متحرک ہوتا ہے۔ ساجدہ زیدی کے یہاں اس کے متعدد SHADES نظر آتے ہیں۔ ان کے دوسرے مجموعے آتش سیال میں یہ صورت حال ہے:

میرے سینے میں وہ آتش فروزاں ہے
جو ہر زندہ حقیقت کا مقدر ہے
یہ وہ سیال آتش ہے
کہ جس کے بجرے ساحل ہیں
صدیاں ڈوب جاتی ہیں
زمانے جذب ہو جاتے ہیں
اور لمحوں کی زنجیر مسلسل ٹوٹ جاتی ہے (نظم آتش سیال)

اندرون ذات جذبوں کی تپش فنکار کو فکر و احساس ایک ناپید کنار وسعت سے آشنا کرتی ہے۔ یہاں غم ذات اور غم کائنات کا امتیاز باقی نہیں رہتا، یہاں ماضی، حال اور مستقبل سب کے سب ایک فکری نظام پیدا کرتے ہیں۔ وقت خانوں میں بٹ کر نہیں رہتے داخل کی اس دنیا میں ایک TRANSPARANT فضا بن جاتی ہے۔ جو ذات اور کائنات کے بعد کو ختم کر دیتی ہے۔ اور سب کچھ اپنے آپ سے قریب دکھائی دینے لگتا ہے۔ ساجدہ زیدی کے فکری نظام میں احساسات کا لمس شامل ہے اس لئے ہر خارجی موضوع ان کا اپنا موضوع دکھائی دیتا ہے وہ ذات سے باہر کچھ بھی نہیں دیکھتیں۔ اس لئے کہ ان کی ذات میں سب کچھ سمٹ آیا ہے فنکارانہ شخصیت کی یہ شیرازہ بندی ایک بھرپور مکمل اور زرخیز جہان شعر پیدا کرتی ہے۔

تیسرے مجموعہ کلام کی تمثیلی نظم کا مندرجہ ذیل حصہ بھی ہمارے لئے اہمیت رکھتا ہے کہ اس کے ذریعہ ہم ساجدہ زیدی اور ان کے کلام کو تمام DIMENTIONS میں سمجھ سکتے ہیں

وہ منظر ہر گھڑی پر موجود ہے
وہ لمحہ
ہر ایک لمحے کے دل میں شامل کیا ہے
کہ

بیکراں فاصلے
زمین و زماں کے دائرے
کہ ایک سیل حرکت میں بہہ رہے ہیں
رواں ہے ——— رفتار کا سفینہ
ہمارا سفینہ
کہ بہاؤ کی حرکت کا ہے دفینہ
کہ

ہم بھی
تم بھی ——— تو
لرزاں بار زماں ہیں
رفتار بے اماں ہیں

(نظم: سیل وجود)

ساجدہ زیدی کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ انہوں نے بہت سے بے نام جذبوں اور مبہم کیفیتوں کو فکری سطح پر لے جا کر انہیں معنویت دینے کی کوشش کی ہے۔ ان کی شاعری کا یہ PHILOSOPHICAL BENT ان کے ذاتی تجربات کو ہمہ گیر بنا دیتا ہے۔ تصورات اور کیفیات کی ماورائی فضا بسا اوقات ایک خارجی اور ٹھوس حقیقت کی طرح سامنے آ جاتی ہے کہ ان کا توانا اور طباع ذہن احساس کے دھندلکوں میں وضاحت تلاش کر لیتا ہے۔ نفی سے اثبات کی طراوت پیدا کرتا ہے گمان کو یقین کی منزل پر لے آتا ہے ——— اور یوں قاری کو ایک لسانیاتی عرفان بخشتا ہے۔ مجموعہ سیل وجود میں ایک خوبصورت اور مختصر نظم میں زمانی خلا کی ایک تصویر بنتی ہے NOTHINGNESS کا احساس دل کی دھڑکن کو بھی بے معنی بتانے لگتا ہے زندگی اور گردش کی اس STILL کیفیت میں جہاں ہر طرح کا امکان خیال جمتا سا محسوس ہوتا ہو اگر کسی وجود کا احساس نہ ہو تو آدمی کا دم ہی نکل جائے۔ ساجدہ زیدی کے نزدیک ڈوبتے ہوئے کو معنویت کا احساس ہی کتنا لطیف حسین سہارا ہے۔

لیکن کوئی تازیانہ سی قوت ہے
جو ——— متحرک ہے۔

مطلق ہے
محرک ہے
بلند ہے
بے کیفی ماحول میں
سپہر خانۂ دل ڈھونڈ رہی ہے۔ (نظم آخری شب)

ساجدہ زیدی کی شاعری تیقن آمیز فکر، استعجاب، استفہام اور تشکیک کے عناصر سے مرکب ہے اور کبھی کبھی ترکیب کا عمل اس قدر پیچیدہ ہو گیا ہے کہ ان میں سے کسی ایک کی شناخت بھی مشکل ہے ان کے سوالیہ نشان کا مقصد کچھ جواب نہیں بلکہ قاری کو بہت کچھ سمجھانا ہے، ان میں مسائل کا حل اور ان کی ہتھی دستی کی بجائے فکر و نظر کی ترسیل ہے۔ یہ ان کے لئے یہ وضاحت کی ایک وضعیت ہے اور عام قاری کے لئے استعجاب۔ یہ بھی ہے کہ ایسی شاعری عام قارئین کے لئے نہیں ہوتی اس لئے ساجدہ زیدی کے مخاطب بھی مخصوص ہیں۔ "آتش سیال" میں ایک نظم یوں شروع ہوتی ہے۔

سپید کیوں رات کا دل ہے ؟
خموشی کی زبان کیا ہے ؟
ہوا کا رنگ کیسا ہے ؟
فضا کے راگ کیا ہیں ؟
آسماں کے سرمئی چہرے پہ یہ کن جذبوں کا پرتو ہے۔
------------ الخ (نظم: نئے زاویئے)

انہیں صرف سوالنامہ نہیں کہا جا سکتا۔ اس لئے کہ ان میں سے ہر سوال اور خاص طور پر خاتمۂ نظم قاری کو بصیرت کی ایک دنیائے بیکراں میں پہونچا دیتا ہے۔ ساجدہ زیدی کا یہ رویہ قاری کے ذہن و دل میں تشکیک و تاب تخلیق پیدا کرتا ہے۔ سوالات کا یہ میڈیم (MEDIUM) ساجدہ زیدی کے ذہن کے INTROVERSION کی بہچان ہے۔ شاعری ان کے لئے اتنی ہی ذاتی اور نجی ہے جتنا خود ان کا اپنا وجود۔

ساجدہ زیدی نے اپنی متعدد نظمیں دوسروں کو تحفے یا نذرانے میں بھی عطا کی ہیں۔ کوئی نظم علی کے نام، کوئی سلمان کے نام، کوئی صفیہ، الطاف حسین حالی اور آپا کے نام۔ اس میں نہ قاری کو کچھ سوچنا چاہئے نہ ان لوگوں کو خوش ہونا چاہئے جن کے نام یہ نظمیں منسوب ہیں۔ سچ یہ ہے کہ ان جیسے کوئی نظم نگار کی شخصیت سے الگ نہیں عام طور پر ایسی منسوب شدہ نظموں پر موضوع کی جامدیت اور بیان خارجیت کا شائبہ ہوتا ہے مگر ساجدہ زیدی کی یہ نظمیں ان کی اپنی ذات سے اتنی قریب ہیں جتنی دوسری نظمیں بلکہ ان میں سے بعض تو اپنائیت سے شرابور ہیں۔ شاعری پرسنل ہو کر بھی اتنی جام جہاں نما ہو سکتی ہے اس کی مثال خال خال ملتی ہے۔

ساجدہ زیدی کی شاعری میں ان کی شخصیت سے مکمل INVOLVEMENT نے اسلوب کی بحث کو بے معنی بنا دیا ہے۔ ان کو ہیئت سے بہت الجھن ہوتی ہے،

"ہیئت کا کوئی تجربہ نہیں ہوتا، ان تجربے کی ہیئت ہوتی ہے۔ تجربہ جتنا انوکھا، جدید اور پیچیدہ، گہرا، شدید اور بامعنی ہوگا اور احساس و خیال جتنا الجھا ہوا ہوگا اسی مناسبت سے اس کی ہیئت کے یہ عناصر شامل ہوں گے۔ جب تخلیق کا سیل رواں ہوتا ہے یعنی وجدان اور جمالیاتی احساس ایک دھارے کی شکل میں بہہ نکلتے ہیں تو ہر خیال اپنی ہیئت اپنے ساتھ لے کر پیدا ہوتا ہے۔"

(کچھ تخلیق شعر کے باب میں، مشمولہ سیل وجود)

ساجدہ زیدی کی شاعری ان کے دل کی آواز بھی ہے اور عصر حاضر کا رزمیہ بھی۔ ان کے علاوہ یہاں کچھ ایسے عناصر بھی ہیں جو نفوذ لطیف میں رنگ و دم پیدا کرتے ہیں۔ کچھ لازوال فکری مسلمات ناقابل تغیر انسانی فکر کی کاوش، زمان و مکان کی گردشوں سے ماورا، انسانی معاشرہ کی کچھ سچائیاں اور ایک نامعلوم تسخیر لیکن [illegible] سا جہاں آباد دیا۔ —— یہ اور ایسی کئی خصوصیات ساجدہ زیدی کی شاعری کو عام معیار سے ممتاز کرتی ہے۔ وقت کی ٹوٹتی ہوئی اقدار کے حوالے سے فرد کی داخلی شکست و ریخت کا شعری منظر نامہ تیار کرنا ساجدہ زیدی کا کارنامہ ہے —— اور یہ ایک بڑا کارنامہ ہے۔

مرزا سعید الظفر چغتائی

"حد کوئی نہیں" کی تخلیقی جہات

ادبیات عالم کا آغاز قابل لحاظ طور پر نظم سے ہوا مشرق میں بھی اور مغرب میں بھی۔ قدیم ادبیات میں منظوم ڈرامے بکثرت سے لکھے گئے۔ اتنے گراں مایہ کہ ان کا نام آج ہزاروں سال بعد تک زندہ ہے۔ اور اتنے مختلف موضوعات منظوم ہونے والوں کے شائقین ان سے لطف اٹھاتے رہے۔ اور سوچنے کی خوگر انہیں پڑھ کر گہری سوچ میں ڈوب جاتے رہے۔ لیجنڈ شاعر اور مشہور عالم شیکسپیر کے علاوہ قدیم یونان کے ہومر اور بعد میں ہندوستان سے کالی داس نام لینے کافی ہیں۔

جوں جوں زمانہ گذرتا گیا۔ انسان کو ذہنی عافیت کے وہ لمحات کم سے کم ملنے لگے جو شعر میں شیرینی اور فکر کی نازک باریکیاں پیدا کرنے کے لئے درکار ہوتے ہیں۔ لہٰذا ملکۂ شعری گھٹتا گیا۔ دوسری طرف نثر کا وسیع میدان سامنے آتا گیا اور اہل قلم یہ محسوس کرتے رہے کہ تجربات زندگی کی باریکیاں اتنی وضاحت اور حقیقت پسندی سے شعر میں نہیں کہی جا سکتیں جتنی کہ نثر میں بیان کی جا سکتی ہیں۔ اس لئے افسانوی ادب تو تمام تر نثر میں آ ہی گیا ہے کہ بعض لوگوں نے نثر میں نظمیں تک لکھنے کا ادعا کر ڈالا۔

ساجدہ زیدی ہم عصر اردو کی وہ منفرد اور معروف شاعرہ ہیں جنہوں نے نثر زدہ عہد میں منظوم ڈرامے دار گنداوں میں پیش قدمی کرنے کی جرأت کی ہے۔ ان کی نظموں کے تین مجموعے۔ جوئے نغمہ۔ آتش سیال۔ سیل وجود۔ منظر عام پر آ چکے ہیں۔ انہیں کتابوں سے کہیں زیادہ کتاب زندگی کے مطالعے نے وجودی بنا دیا ہے اور حد تک ماورائی بھی۔ گو کہ ان کے قدم آب و گل کی زمین پر ہمیشہ مضبوطی سے قائم رہے۔ ویسے یہ بات بھی قابل ہے کہ ماورائیت سے مس ہی نہ ہو تو خلوت کدۂ شعر میں کسی کو بار مل ہی نہیں سکتا۔ ساجدہ زیدی غزلیں بھی کہہ لیتی ہیں نظمیں بھی لیکن نظم ان کا خاص میدان ہے اور ان کا ایک ڈرامہ ... ہے کہ حد کوئی

سیدھی ملتا ہے۔ اسی فضا، اسی مزاج اور انھیں تاثرات کے ساتھ انہوں نے منظوم ڈرامہ تخلیق کیا ہے جو چار ایکٹ کی مسلسل ہم کلامی۔ (صرف دو افراد کی ہم کلامی) ہے۔ موضوع ہے عشق تمنا۔ جسے اس طرح کہا گیا ہے اور اس کے عواقب زندگی کی ان الجھنوں اور کیفیات میں جن کے تانے بانے سے وجودیت کا فلسفہ جنم لیتا ہے۔

ڈرامہ ایک بلیغ نثری حرف آغاز سے شروع ہوتا ہے۔ ڈرامے کا خلاصہ یہ ہے کہ (پہلے ایکٹ میں) مرد اور عورت ایک دوسرے سے قریب آتے اور قرب و شباب سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ (دوسرے ایکٹ میں) الگ الگ تنہائی میں ایک دوسرے کے تصور اور آتش فراق کی کیفیت ہے۔ سال ہا سال بعد (تیسرے ایکٹ میں) وہ پھر ملتے اور اب عورت ہمہ تن آرزو ہے۔ مگر مرد اندیشہ ہائے دور دراز میں گھرا ہوا ہے۔ وہ دامن چھڑا کے اسے تشنہ کام چھوڑ جاتا ہے۔ ڈھائی برس اور گذر جاتے ہیں (اور چوتھے ایکٹ میں) دونوں پھر ملتے ہیں۔ اب عورت کے جذبات میں پختگی گہرائی ہے مگر ٹھہراؤ آچکا ہے۔ وہ اپنی زندگی سے کسی غیر معمولی تلخی کے بغیر تخلیقی سطح پر صلح کر چکی ہے اور گوتم سے کہہ دیتی ہے کہ وہ وقت گذر چکا ہے جب وہ تمنائے وصل سے سرشار تھی اور ہمہ تن آرزو تھی۔

برو ایں دام بر مرغ دگر نہ کہ عنقارا بلند است آشیانہ

ہندوستان کے تاریخی اور ثقافتی پس منظر میں ساجدہ نے مرد کا نہایت معنی خیز نام گوتم رکھا ہے۔ جو اسرار حیات سمجھنے کی دھن میں اپنی محبوبہ "زہرا" کو چھوڑ جاتا ہے اور باغ ہستی میں کھلنے والی یہ نو شگفتہ کلی صبح اولیں کے بعد دوسرے قطرۂ شبنم کے فیض سے محروم رہ جاتی ہے۔ گوتم کو جب عرفان ہوتا ہے کہ:

"کسے نکشود و نکشاید زحکمت ایں معمہ را"

تو زہرا طے کر چکی ہوتی ہے کہ "جریدہ رو کہ گذرگاہ عافیت تنگ است"۔ اب اس کے ہاتھ میں فن کا سہارا ہے اس حقیقت پسندانہ احساس کے ساتھ کہ اس سے نہ تشنگی رفع ہوگی اور نہ رائیگاں عمر عزیز کی تلافی ہی ہو سکے گی۔ لیکن آرزوئے حیات کی جولان گاہ یہی اور صرف یہی ہے:۔

"زہرا: میں دنیائے دیرینہ اضطراب آج
حرف و رنگ و بیاں کے سانچے میں ڈھال کر جی رہی ہوں
پھر بھی یہ جانتی ہوں
کہ یہ بھی تشنہ وسائل زندگی ہیں
شاید یہ تلاش کا راستہ ہیں ......
لیکن ......
یہ منزل آخری نہیں ہے"

اس مقام پر پہنچ کر "آگ کا دریا" میں قرۃ العین کا جملہ یاد آ جاتا ہے کہ "دنیا میں ... [illegible]"

ہیں۔ اس کے علاوہ محمد حسن کے ڈرامے "کہا ہوا [illegible]" کا سیرونین ناہید کا بھی خیال آتا ہے جو فن کا چراغ جلانے کے لئے ایسی راہ پہ جا پہنچتی ہے جہاں خود زندگی کی شمع ایک جھونکے میں بجھ جاتی ہے۔ زہرا اور ناہید میں فن سے لگاؤ مشترک ہے۔ مگر ناہید فن کے لئے زندگی کا اپنا ڈھنگ اختیار کرتی ہے اور زہرا کو (بظاہر) زندگی کی آرزو مندی فن کی سمت لے جاتی ہے۔ لیکن بین السطور میں یہ اشارے موجود ہیں کہ زہرا کی بنیادی طور پر ایک فنکار کی حسیت اور تمنائے حیات رکھتی ہے۔ زہرا ایک راہ تک پہونچ جاتی ہے اور ناہید راستہ تلاش کرتے کرتے کھو جاتی ہے۔ ایک کا المیہ سلگتی آگ ہے، دوسری کا دہکتا ہوا انگارہ۔

گوتم اور زہرا کے مسئلے کا تخاطب ان کے کرداروں میں ایسے کی آمیزش ہے ساتھ ہی ہندوستان کا ثقافتی اور معاشرتی مسئلہ بھی سامنے لاکھڑا کر دیا ہے۔ جس میں محبت اور انسانیت کی کشش تو ہے مگر زندگی کے گوناگوں عملی مسائل کے روح فرسا الجھن اکثر واردات دل پر غالب آجاتی ہے۔ یہ کم و بیش وہی الجھن ہے جسے وجودی ادب میں دہشت یا بعض حالات میں قنوط کہا جاتا ہے۔ جو تیسرے ایکٹ میں پوری طرح ابھر کر محسوس ہوتی ہے۔ حالانکہ بڑی چابکدستی سے ان جزوی باتوں سے دامن بچایا گیا ہے۔ جیسے یہ الجھن، یہ دہشت کسی خاص طبقے، افراد یا حالات تک مخصوص ہو جاتی ہے۔ ساجدہ زیدی کے ڈرامے میں زندگی کا یہ ڈائیلما جو دہشت خیز ہے انسان کا ذہنی مسئلہ بن کر آفاقیت کی سرحدوں تک پہونچ جاتا ہے۔ اس پیچیدہ کیفیت کی عکاسی میں شعریت کا دامن ہاتھ سے چھوٹنا کیا معنی، لے اور تیز ہو جاتی ہے۔ نغمہ و نالہ ایک ہو جاتے ہیں۔ یہاں ہر قاری اپنے خیالی [illegible] کر سکتا ہے اور [illegible]

دوسرا ایکٹ پڑھتے وقت میگھ دوت یاد آتا ہے۔ تیسرے ایکٹ کے دوران کبھی سارتر کی وجودی دہشت کا اور کبھی ہومر کی "اوڈیسی" کے طلسماتی جزیرہ کا خیال آتا ہے۔ چوتھے ایکٹ میں زہرا کی ایقان کی اس منزل پر نظر آتی ہے جہاں نہ خوف کی گنجائش رہ جاتی ہے اور نہ امید کی۔ زہرا امید و بیم کے مرحلے سے آگے تلاش و حقیقت کی راہوں پر گامزن نظر آتی ہے۔ گوتم [illegible] تصویر بے کر رخصت ہو جانے کے بعد فضاؤں میں مخدوم محی الدین کا شعر گونجنے لگتا ہے ؎

تو بھی رخصت اے ہجوم آرزو آج تنہا ہیں مری تنہائیاں

ڈرامے میں اول تا آخر تغزل اور نغمگی کوٹ کوٹ کر بھرے ہیں۔ اتنی بڑی کہانی کہنے کے لئے بہ طور پر آزاد نظم کا پیرایہ اختیار کیا گیا ہے جو آغاز سے انتہا تک ایک ہی بحر کے استعمال کے باوجود عروض کا پابند ہے۔ اور مفاعلاتن جیسے حرکی رکن کی مسلسل گنگناہٹ اور نغمگی سے لبریز پاتا ہے۔ چوتھا ایکٹ چند غزلیہ اشعار (زہرا کی تخلیق) سے شروع ہوتا ہے۔ ان کی بحر یقیناً مختلف ہے۔ چار ایکٹ کے مکمل ڈرامے کو جس کا کینوس موضوع کی یک جہتی کے باوجود فکری اعتبار سے بہت کشادہ ہے۔ ایک ہی بحر میں نباہ لے جانا بجائے خود ایک کارنامے سے کم نہیں۔ مختلف ایکٹوں سے چند مثالیں ملاحظہ ہوں :-

گوتم : اسیر کر لو یہ چپنے مسترجادواں بنا کر

تجلیاں مسکراہٹوں کی یونہی گراؤ
نگاہ کے گل یونہی کھلاؤ ۔

....

گوتم : یہ دھڑکنیں جوہری زباں ہیں
زہرا : یہ کیفیت جوہری نظر ہے ۔

....

گوتم : مگر یہ دیکھو۔ کہ ساعت دید ایک دہکتا ہوا شرر ہے
مگر یہ دیکھو۔ صبا سے زیادہ سبک تو یہ شوخئ نظر ہے ۔

....

زہرا : میں صبحِ آغاز کا افق چھو رہی ہوں نادیدہ وسعتوں میں
ہراسِ انجام اب نہیں ہے ۔

....

گوتم : "تو میری آنکھوں میں تیرتے ساونوں کا افسانہ چھوڑ دینا
ادا "ا کے قدموں پہ شبنمی آنسوؤں کے موتی بکھیر دینا ۔
(مبیحہ درت والی تاثیر پر غور کیجئے)
"یہ کہنا تاروں کی چھاؤں اور چاندنی کی چادر
کسی کے بستر پہ گرم انگاروں سے بن گئی ہیں ۔
تاروں کی چھاؤں اور چاندنی کی چادر الٹریشن کا لطف دیتا ہے اور جیہ و ج کا قریب المخرج ہونا اس میں دھوپ چھاؤں
کی سی کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔
گوتم : "کچھ کہو ۔ اب بھی تم اسی راہ کی مسافر ہو
اب بھی دل کے شرار جلتے ہیں خامشی میں ۔

....

زہرا : "کسی کی آغوش منتظر وا نہیں ہے
لذتِ قرار کا راستہ نہیں ہے ۔ — یہاں زہرا کی آرزو جسمانی لذت سے آگے نکل چکی ہے ۔

....

گوتم : "گراں ہے زنجیرِ بلندئ شب ، اور مجھ تمنا کے بال و پر ہے ۔

ر زندہ تھا تو شعر کا حسن دوبالا ہو جاتا۔

تیسرے ایکٹ میں ڈرامہ اپنے عروج پر پہونچتا ہے۔ اور زیبا کا کلیدی کردار جہاں دیہاں کے متضاد رشتے کھلتا ہے۔ زیبا کی تمنا محض خود سپردگی کے بے پناہ جذبے کی کسک ہی نہیں بلکہ۔ کار جہاں کی رمز آشنائی ت عظمت بھی پوشیدہ ہے۔ عام اصطلاحات کے برخلاف جو مردوں کے قلم سے اور مردوں کے لئے ہوتے ہیں صاف ہے کہ یہاں تاریخ انسانیت کی بظاہر مظلوم اور درحقیقت عمیق روح بول رہی ہے۔ اگر محمد حسن کا متذکرہ بالا وئی نسواں کا نقیب ہے تو ساجدہ زیدی کا یہ ادب پارہ عظمت نسواں کا نقیب۔ ہماری تہذیبی روایت ہ جو بار امانت آسمان اور پہاڑ نہ اٹھا سکے اور انسان نے اٹھا لیا۔ آج اس ڈرامے کی سبک موسیقی میں صاف سے رہا ہے کہ دراصل عورت نے اٹھایا تھا۔ اور وہی اسے آج تک اٹھائے ہے۔ پریم چند کے الفاظ تھا:

• جان دینا کہتے ہیں کسے اور زندگی بھر سلگنے کو۔ (گئودان)

تی ہیں کہ عورت نے تخلیق کا بوجھ اٹھایا تو وجود کی تاریخ جب تک رہے اس وقت تک اٹھاتے رہنے کو:

"میں بنت حوا ہوں
میں نے روز ازل سے اب تک
گناہ آدم کو اپنی آغوش میں چھپایا ہے
میں انھیں پردہ داریوں کے کرم سے
کار جہاں کی رمز آشنا بھی ہوں"

....

"میں بنت مریم ہوں
میری تقدیر میں لکھا ہے
کہ نسل آدم کا بار اٹھاؤں"

"یہ ابن آدم ناز پرور"

....

"میں اس کے ہاتھوں کا زخم دیکھا ہوں
اس کے وجود کی
اس کے ہست و امکاں کی راز داں ہوں
میں اس کی بیوی ہوں، اس کی بیٹی ہوں
اس کی محبوب، اس کی ماں ہوں"

دھند کے بادل صرعے میری ایک سادہ اور جیکی نظم سے نکالا جا سکتے ہیں [illegible] گئے ہیں ..... اگرچہ ساتھ ہی کے یہ اشعار وجود کی تاریخ میں عورت کے منصب کی وسعت کو لئے ہے متعلق ہیں اس کا بیان دیکھنا [illegible] فلسفیانہ ہے۔ زہرا کے یہ الفاظ :

زہرا : میں اس کی پرواز کی امیں ہوں / میں اس کے پرواز کی امیں ہوں
نگاہ میں اس کی ہے جو پوشیدہ
میں اس آغاز کی امیں ہوں " عورت کے وجود کی گہرائی کے آئینہ ہیں ۔
پھر یہ مصرعے ہیں جہاں زہرا کے کردار " پر رستمیں " کا آگ ہے ۔

زہرا " میں ایک ماں ہوں
میں کرب امکاں ہوں
درد احساس اذیت ہوں
میں صدائے کن و مکاں ہوں
آواز لامکاں ہوں ...... "

....

" میں دشت و صحرا، دیا و دریا
فراز کہسار و قلب انساں
سے ایک اندر تی [illegible] ہوں ۔

ہمارے معاشرے بلکہ اقوامِ عالم میں بھی عورت کو اس کا جائز مقام ملا جب وہ تحریر [illegible] کی مستحق سمجھی گئی تب بھی اس کی حیثیت ہے یعنی ایسے منو وگل کے طور پر جو حسن زندگی کو جینے کے قابل بناتا ہے مگر جینے والے خالق [illegible] جنہیں اس زیادہ قیمتی نہیں سمجھتے کہ جب چاہیں اسے مسلنے سے گزر جائیں ، ساجدہ نے عورت کو ان بلندیوں تک پہنچایا ہے جہاں وہ [illegible] عظمت کا بھی اعلان کرتی ہے اور ان تعمیر بخشی دنیا کی عزت سے یہ دنیا جنت اور زندگی با معنی بنتی ہے۔ زہرا کی زبان عورت کی اس حقیقت کا عرفان ہے کہ نظام ہست و بود میں فیصلۂ عمل اور سمت عمل کا تعین اسی کے ہاتھ میں۔ اس ضمن میں [illegible] زہرا کا یہ مکالمہ بھی جب کوتم اس سے تجدید محبت پر اصرار کرتا ہے :

کوتم " میں اپنی نظروں کی تھم چادر
تمہارے پیکر پہ ڈال دوں گا
میں اپنی قربت کے سائبان میں
تمہارے غم کو پناہ دوں گا

میں اپنے بوسوں کی یاد ہی سے
تمہارے تھکے بدن کو کیف آشنا کروں گا۔"

زہرا: "نہ عزم و قوت
نہ نرم تکیے
نہ گرم بوسے
نہ تن کے صحرا پہ لذت بجلیوں کی بارش
مجھے کسی کی طلب نہیں ہے۔"

گوتم: "میں اپنے بچوں کی مسکراہٹ
تمہاری گودی میں ڈال دوں گا۔"

زہرا: "جنہیں میری کوکھ کی لحد میں سلا دیا ہے
وہ اب نہ دنیا میں آسکیں گے
نہ تم انہیں پا سکو گے گوتم
نہ آج ... تم کو پا سکیں گے ......"

پھر آگے زہرا فیصلہ کن انداز میں کہتی ہے۔

زہرا: "مری وفاؤں میں
تمہارے بچوں کا کرب بہنے دو
اب مجھے عیش جاوداں کی طلب نہیں ہے۔"

اور آگے ....

"مجھے یہ تنہا روی ہی اب راس آگئی ہے
یہاں سے تم لوٹ جاؤ۔"

اس موڑ پہ یہ نظم ختم ہو جاتی ہے لیکن اسی اختتام میں یہ حقیقت پنہاں ہے کہ حیات و کائنات کا ایک المیاتی نقطہ ہے [illegible] انسانی [illegible] بنا۔ [illegible] بعض الفاظ کھٹکتے ہیں [illegible] کی تشنگی کی [illegible] ہے۔ مجھے اسی روشنی میں [illegible]۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر ان حسین [illegible] روشنی [illegible] [illegible] بجلیوں کی بارش [illegible] جلتے ہیں [illegible] ہے۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ "بے ترتیب" نظم کے آہنگ میں کھپتا نہیں ہے۔ میرے ذہن [illegible] اہل دل حضرات بھی مانتے ہیں۔

یہ ڈرامہ کتابی پیرایہ میں بہت حسن و خوبی کے ساتھ شائع ہونے کا مستحق ہے۔ امید ہے کہ ساجدہ اس خطے کی اشاعت کے معیار پر خاص توجہ دیں گی۔

ملک و بیرون ملک کی سبھی ادبی ڈرامہ سوسائٹیوں کو خاص طور سے کہ ہنر سمجھ کر اس پر توجہ کرنی چاہئے۔ اور آل انڈیا ریڈیو اور ٹیلی ویژن کو تو اسے سنت غیر مترقبہ سمجھ کر ہاتھوں ہاتھ لینا چاہئے۔ ڈرامے کے متن پر یہ شہ پارہ ہر طرح پورا اترتا ہے۔ اسٹیج کی ہدایتیں واضح اور برمحل ہیں۔ پہلے تین ایکٹ بالکل سادہ ماحول اور فطرت کی آغوش میں، ہجرت اور آخری پورے اہتمام اور تفصیل کے ساتھ اس کمرے میں جہاں ہیروئین کی زندگی بسر کرنے کی ساری کائنات سمٹ آئی ہے ہر ڈرامہ ہدایتکار اس سے لطف اندوز بھی ہو سکتا ہے اور متفق بھی۔

اس ڈرامے کی اسٹیج پر پیشکش یقیناً ہم عصر اردو تھیٹر میں ایک نئے باب کا اضافہ کر سکتی ہے۔



بقیہ: تصور سبز واری ...

اور نظم وغیرہ کا اظہار اس سے زیادہ ہے۔ ... کے جذبہ احساس میں گہرائی کی پختگی۔ کسی قدر ضبط کا اندازہ ہوتا ہے ان کا شعری سفر جاری ہے اور ابھی ہم ان سے بڑی توقعات وابستہ کر سکتے ہیں کہ:

ٹھہرتا نہیں کاروان وجود
کہ ہر لحظہ ہے تازہ شانِ وجود

جواب کے لئے ڈاک ٹکٹ
ضرور ساتھ روانہ کیا کریں

مسودہ صاف اور خوش خط لکھا
اور کاغذ کے ایک طرف بھیجیں۔

سید احمد قادری
[illegible] گیا، بہار

ساجدہ زیدی کی نظم نگاری

اردو ادب میں خواتین کی خدمت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن افسانوی ادب میں جس طرح عصمت چغتائی اور قرۃ العین حیدر وغیرہ نے تمام تر حد بندیوں، بندشوں اور روایتوں کو توڑ کر سماج کے ہر طبقہ اور ہر مسائل پر لکھا، اور ڈوب کر لکھا، شاعری میں ایسی مثالیں کم ہی دیکھنے کو ملتی ہیں۔ مشاعروں میں شاعرات اپنی خوبصورت آواز اور حسین چہرے کی وجہ کر واہ واہی سے لیتی ہیں، لیکن معیاری ادبی رسالوں میں واہ واہی لینے والی شاذ و نادر ہی دیکھنے کو ملتی ہیں۔ ایسے ہی شاذ و نادر شاعرات میں بلاشبہ ساجدہ زیدی منفرد انداز بیان کی وجہ کر جانی پہچانی اور پسند کی جاتی ہیں۔

ساجدہ زیدی نہ صرف اردو شاعری میں خواتین کی بھرپور نمائندگی کر رہی ہیں بلکہ معیاری اردو شاعری خصوصاً اردو نظم نگاری کو اپنے گہرے مطالعے، عمیق مشاہدے اور شاعرانہ تخلیقیت کے ساتھ نئی سمت، نیا لب و لہجہ، زندگی کا فلسفہ اور اس کی حقیقت کو اپنے پر وقار انداز میں پیش کیا ہے اور پوری شدت سے اپنے احساسات و جذبات کو منفرد رنگ و آہنگ کو برقرار رکھتے ہوئے حیات و کائنات کے سربستہ راز کی گتھیوں کو سلجھانے کی کوشش کی ہے۔ اور اس عمل میں وہ سوالات کے گرداب میں ڈوبتی چلی گئی ہیں۔ اور زندگی کی ٹھاٹھیں مارتے سمندر سے تشنہ لب لوٹتی ہیں۔ ساجدہ زیدی ہستی اور نیستی میں فرق کو جاننے کے لئے مسلسل سنگلاخ راستوں میں چلیں۔ کن [illegible]۔ وہ خود لکھتی ہیں۔

"انسان اور کائنات کے تعلق سے ہزاروں سوالات میرے ذہن میں اٹھتے ہیں۔ جوابوں کی تلاش میں، میں فلسفہ، مذہب، نفسیات، ادب، شاعری، آرٹ اور انسانی ربط و تعلق کے پیچیدہ راستوں میں سرگرداں رہی ہوں لیکن جوں جوں آگے نئے راستوں پہ

تک کے بڑھتی ہوئی۔ دھند کے پھیلتے ہیں۔ سوالات کے گرداب بڑھتے ہیں اور جوابات کا پرسکون ہر نقیض راستوں نے دامن بچایا ہے۔ انسان، زندگی، سماج، مسائل اور کائناتی عوامل سے متعلق ہزاروں گتھیوں کو میں نے ذات کے وسیلے سے سلجھانے کی کوشش کی۔ لیکن ذات خود کیا ہے؟ وہ بھی کوئی منفرد و معطل اکائی نہیں۔ بلکہ ایک راز سربستہ ہے جو اسی تلاش کا ایک حصہ ہے شاعری میری تمام زندگی کی تلاش ذات اور تلاش معنیٔ کائنات میں سوالات اٹھانے ہی کا نام ہے"

(آتش سیال۔ ص ۱۰-۹)

ساحرہ زیدی چونکہ زندگی، ذات اور مسائل سے نجات خود بھی آزما رہی ہیں۔ اس لئے تجربات کی بھٹی میں تپ کر جو احساس و جذبات شاعری کی شکل میں ڈھلے وہ شاعری کے سنگ میل بن گئے۔ کچھ نمونہ دیکھئے ؎

"یہ شعور سیال آتش ہے
کہ جس کے بحر بے ساحل ہیں
جہاں ذہن بہہ جاتی ہیں
زمانے جذب ہو جاتے ہیں
اور لمحوں کی زنجیر مسلسل ٹوٹ جاتی ہے" (آتش سیال)

"کبھی لگتا ہے
میرے چاروں جانب بے کراں اندھیرا ہے
میں لاکھوں سال سے ہوں غوطہ زن
تنہائیوں، تاریکیوں کے ایک بے پایاں سمندر میں
یہ سارے فلسفے، یہ آگہی اور فکر کے رشتے
یہ تہذیب و تمدن کے بلند آہنگ ہنگامے
مذاہب اور سیاست کی فسوں کاری
یہ سب مجذوب کی بڑ ہیں
یہ ساری کائنات اک وہم ہے" (دھواں)

"کہ تم بھی اس راہ کے مسافر ہو
جہاں کی گرد جوں نے میرے چہرے پہ خاک برسوں

کہ تم نے بھی آبدوں سے پاؤں کے حدیث میں کی کھوئے اکثر
کائنات کی ایک شناسا ئے سراب کے پیچھے پیچھے چل کر
چند چیزوں نے بنا لئے ہیں حقیقت کی جھلکیاں ہیں
تمہارا بھی ان سے کوئی رشتہ ہے تم بھی ایسے ہی چند پیکر
خود اپنی فکر و رسا کے آتش کدہ میں پگھلا رہے ہو شاید "

(ساجدہ زیدی ... کشم)

ان نظموں کے یہ چند بند اس بات کے غماز ہیں کہ ساجدہ نے زندگی کے گہرے سمندر میں غوطہ لگایا ہے اور جو کچھ دیکھا اور سمجھا انہیں اپنے گہرے فکر و احساس کے ساتھ نظم کی شکل میں پیش کر دیا ہے۔

ساجدہ زیدی کی شاعری کی ابتدا ۱۹۵۰ء سے ہوئی اور ۱۹۶۲ء میں ان کا پہلا شعری مجموعہ "جوئے نغمہ" منظر عام پر آیا۔ جس میں ان کے ابتدائی بارہ سال کی شاعری کا انتخاب تھا۔ اس مجموعہ کی نظموں میں ساجدہ زیدی کے ابتدائی تفکر و تلاش کے ساتھ، سقراط سے کبیر کے کلام، نطشے، ہیگل اور سارتر، دستوئیفسکی اور چیخوف سے لے کر کافکا، بیکٹ اور نیتکوئنگ، مائیکل انجلو اور لیونارڈو ڈاونچی سے رودال، نہرو، گاندھی اور مولانا آزاد تک، غالب اور انیس سے قرۃ العین حیدر تک کی فکری وابستگی بھی نمایاں ہیں۔ لیکن آہستہ آہستہ ساجدہ نے اپنی راہ بنائی اور ... اور اس سے آگے بڑھ کر اپنی پہچان بھی بنائی۔ اور آج وہ اس مقام پر پہونچ گئی ہیں کہ فلسفہ میں ڈوبی زندگی اور احوال و کوائف کا خوب صورت اظہار نظم میں دیکھ کر بے اختیار ساجدہ زیدی کا نام ذہن میں آتا ہے جو میرے خیال میں بڑی بات ہے۔

ساجدہ زیدی کو ناقدوں سے شکایت ہے کہ ان کے قلم سے کبھی ساجدہ زیدی کا نام نہیں نکلا۔ اس کی ایک وجہ تو خود انہوں نے بیان کی ہے کہ بازار شہرت میں آنے کے لئے جو قیمت چکانی پڑتی ہے وہ کبھی ادا نہیں کر سکیں۔ دوسری وجہ جو میرے خیال میں بنتی ہے وہ ہے ساجدہ زیدی کی نظموں میں فلسفہ ہی فلسفہ اور اس کا بوجھل پن۔ اور تیسری وجہ متذکرہ بالا مشاہیر کے فلسفیانہ خیالات کا اسیر رہنا ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ زندگی خود ایک فلسفہ ہے لیکن اس فلسفہ کو زندگی کی تمام تر رنگینیوں اور رعنائیوں کے ساتھ بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ اس کے مسائل کو سمجھا جا سکتا ہے۔ ساجدہ زیدی نے فلسفہ کی اسیری سے نکل کر ... پھر بھی پیچھے نکلنے کی کوشش کی ہے۔ "اور شام، احتساب، ورثہ، انکشاف، کھڑکی، زندہ رہنے کی باتیں، گفتگو، ایک نظم، جہنم سے آگے، تسلسل یا جمود، کوئی اور کچھ کھو دو، سناٹے کی آواز، ایک سوال، ... لندن کی ایک رات، وغیرہ جیسی نظمیں حیات و کائنات کے ... کے ساتھ ... رہ گیا ہے۔ یہ گھڑی، تماشا ہے آگے، دو منظر، سمندر کے بیچ سے کے خاموش اسرار، ایک نظم، شب چراغ، بھنور، گرداب، امید، ... وغیرہ جیسی شاندار اور موثر نظمیں کہی ہیں۔ جو ... کے بعد ...

(۱) ... کی شخصیت رکھتی ہیں اور جنہوں نے اردو نظم نگاری کو ایک خاص معیار دیا۔ ص ۳۰

فیاض حالی

ساجدہ زیدی سے ایک ملاقات

ہماری تہذیب جو صدیوں سے جاگیردارانہ نظام و روایات کی گرفت میں رہی ہے اردو بھی اس سے بری نہیں رہ سکی۔ اردو ادب پر اس کے اثرات ایک لمبے عرصہ تک قائم رہے اور آج بھی ہیں۔ سماجی انقلاب کا محرک مارکسی نظریہ اور جدید تعلیم نے دوسرے ممالک کے ساتھ ساتھ ہمارے ملک کو بھی متاثر کیا اور زندگی کے ہر شعبہ پر اس نے اثر ڈالا، ہماری تہذیب اور ادب کو بھی اس نے بھرپور متاثر کیا۔

اردو ادب نے عورت کو شاعری، ناول اور افسانے کا محبوب موضوع بنایا لیکن عورت کو اس کا صحیح مقام جدید روشنی نے دیا۔ اسے شاعر و ادیب کا مقام عطا کیا اور صدیوں سے دبے احساس کے اظہار کی جرأت بخشا۔ ساجدہ زیدی ہمارے معاشرے کی ان چند خواتین میں ہیں جنہوں نے روایت سے بغاوت کی اور اردو شاعری میں نئے نئے موضوع کو منظوم کرکے اپنی منفرد حیثیت منوائی۔ محترمہ مارکسی نظریہ سے منسلک ہونے اور اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے باوجود مشرقی تہذیب کی علامت ہیں۔ ان کے تین شعری مجموعے "جوئے نغمہ" "آتش سیال" اور "سیل وجود" منظر عام پر آچکے ہیں۔ "آتش سیال" میں انہوں نے صدیوں کی سوئی ہوئی آگ کو شعلوں کی زبان میں بات کرنا سکھایا ہے۔ ساجدہ زیدی کی شاعری ان کے تخلیقی شعور، احساسات و تجربات کی بھرپور غمازی کرتا ہے۔ ان کا فن اور ان کی شخصیت مشرقی و مغربی تعلیم و تہذیب کے آمیزش سے پروان چڑھا ہے۔ ساجدہ زیدی شاعری کو تحسین و تنقید سے زیادہ ترسیل کی متمنی سمجھتی ہیں۔

میں آستانۂ وارث پاک ؒ پر عقیدت کے پھول چڑھانے کے بعد اپنے بچپن کے دوست بدرالزماں (شعبۂ تحقیقات طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی) سے ملنے علی گڑھ پہنچا۔ دوران قیام عزیز مسعود منظر کا پیغام دیتے محترمہ ساجدہ زیدی کے مکان "محمد برگ" دودھ پور ۲۰ اکتوبر کو ۶ بجے شام میں حاضر ہوا۔ محترمہ سے ملاقات ہوئی تعارف کے بعد گیا کی ادبی سرگرمیوں، ان کی مصروفیتوں اور موجودہ حالات پر کچھ دیر گفتگو ہوئی بعدہٗ میں نے دوسرے روز حاضر ہونے کے وعدے کے ساتھ اجازت لی۔ دوسرے روز دن کے گیارہ بجے محترمہ کی خدمت میں حاضر ہوا، کچھ دیر تک باتیں ہوئیں۔

میں نے ان سے چند سوالات کئے، وہ سبھی کا جواب بڑے ہی مشفقانہ انداز میں دیتی گئیں۔ دونوں ہی دن محترمہ نے خوب خاطر مدارات کی۔

س :۔ آپ کی پیدائش کس خانوادے میں کب اور کہاں ہوئی ؟

ج :۔ ۱۹۲۲ء میں میرٹھ میں پیدا ہوئی۔ دادیہال سید محمد حسین شوق سہارنپوری کا ہے۔ والد سید محمد حسن زیدی بار ایٹ لا میرٹھ، خواجہ الطاف حسین حالی کے نواسے تھے۔ خواجہ غلام السیدین اپنے ماموں و خواجہ احمد عباس چچیرے ماموں تھے۔

س :۔ آپ کی تعلیم کی ابتدا و تکمیل کہاں ہوئی ؟

ج :۔ تعلیم کی ابتدا میرٹھ میں ہوئی لیکن اسکول و یونیورسٹی کی تعلیم علی گڈھ مسلم یونیورسٹی میں ہوئی۔ ایم ایڈ لندن یونیورسٹی سے کیا جس کا موضوع "تخلیق کے نفسیات" ہے۔

س :۔ شعبہ تعلیمات سے آپ کا تعلق کب ہوا ؟

ج :۔ ۱۹۵۵ء میں بحیثیت لکچرر شعبہ تعلیمات علی گڈھ مسلم یونیورسٹی میں بحال ہوئی اور پروفیسر و صدر شعبہ کی حیثیت سے ۱۹۸۶ء میں ریٹائر کی۔

س :۔ شعبہ تعلیمات کے علاوہ اور کن کن اداروں سے منسلک رہیں ؟

ج :۔ اعزازی طور پر ادارہ "نفسیات تعلیم" و یو جی سی کی "تکنیکی اصطلاحات" کی تین کمیٹیاں "برائے فلسفہ، نفسیات اور تعلیمات" کے ممبر کی حیثیت سے رہی۔ ترقی اردو بورڈ کے تعلیمات نفسیات پینل کی طویل عرصہ تک ممبر رہی اور بہت سے تعلیمی و نفسیاتی سوسائٹی کی ممبر رہی۔

س :۔ ادب کے کن کن صنفوں میں آپ نے طبع آزمائی کی ؟

ج :۔ شاعری، ڈرامہ، ناول، اور تنقیدی، نفسیاتی، تعلیمی، مضامین لکھے، مغربی ڈراموں کا ترجمہ کیا، ناول "موج سمجھا بیچاں" نفسیات کی کتاب "شخصیت کے نظریات" انگریزی میں نفسیات و تعلیمات کی کتابیں لکھیں اور انگریزی میں بھی شاعری کی۔

س :۔ شاعری میں آپ نے کن کن صنفوں کو موضوع سخن بنایا ؟

ج :۔ شعر گوئی کی ابتدا نظم سے ہوئی، غزل گوئی بھی کی، آزاد نظمیں بھی لکھی، قطعات بھی لکھیں اور دیگر صنفوں پر بھی طبع آزمائی کی لیکن خاص میدان نظم ہے۔ جس میں شاعر ادب کو نئی جہت نئی بات دے سکتا ہے۔ غزل کو غالب نے جس بلندی تک پہنچایا ہے اس سے آگے لے جانا ممکن نہیں ہے، لیکن پھر بھی غزل کہتی ہوں، نظم کا CANVAS چونکہ بہت ہی وسیع ہے اور اس میں بہت کچھ کہنا باقی ہے اس لئے میں نے اسی میدان میں طبع آزمائی کی۔

س :۔ آپ نے شاعری میں اصلاح کس سے کرائی اور آپ کی ابتدائی نظم کونسی ہے ؟

ج :۔ شاعری کی اصلاح میں نے کسی سے نہیں کرائی اور ابتدائی نظم "گومتی کے ساحل پر" اور "سفر" ،

س :۔ آپ نے اصلاح کی ضرورت کیوں نہیں محسوس کی ؟

ج :۔ بچپن کے اشعار پر توجہ نہیں دی، باقاعدہ سنجیدہ شاعری شعور کے بالغ ہونے پر شروع کی، جب میری تعلیم مکمل ہو چکی۔ میں یونیورسٹی میں تعلیم دے رہی تھی اور مشرق و مغرب کے ادب و شاعری سے آشنا ہو چکی تھی تو میں نے ہمیشہ محسوس کیا کہ شاعر اپنا پہلا نقاد خود ہوتا ہے اس کو اپنے کلام کا

نوک پلک خود درست کرنا چاہئے۔ میرا طریقہ یہ رہا نظم و غزل لکھ کر ڈال دیتی تھی اور چند روز بعد انہیں اٹھا کر از سر نو مطالعہ کرتی تھی، کچھ اس طرح جیسے یہ اجنبی چیز ہو۔ دراصل جب شاعر شعر کہتا ہے تو اس کی کیفیت کچھ اس طرح کی ہوتی ہے کہ شعر کو شاعر سے الگ کرنا ممکن نہیں ہوتا ہے اور شاعر خود شاعری ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ اس وقت اپنے EGO سے ماورا ہو جاتا ہے۔ کچھ عرصہ بعد اپنی تخلیق کے ساتھ وہ فاصلہ قائم کرنا ممکن ہوتا ہے جو تنقیدی نظر سے دیکھنے کے لئے ضروری ہے ویسے یہ بڑا ہی دشوار گذار مرحلہ ہوتا ہے حالانکہ تبدیلی یا ترمیم بظاہر چھوٹی سی ہوتی ہے۔

س ۔ آپ کے کون سے شعری مجموعے چھپ چکے ہیں؟

ج ۔ سب سے پہلی شعری تصنیف "جوئے نغمہ" دوسرا "آتش سیال" اور "سیل وجود" چھپ چکا ہے اور دو مجموعہ چھپ رہا ہے۔

س ۔ آپ عالمی ادب میں کس سے زیادہ متاثر ہیں؟

ج ۔ میں نے دنیا کے بہت سارے ادب کا مطالعہ کیا ہے۔ انگریزی زبان کے واسطے سے امریکی، روسی، انگلش، فرانسیسی، جرمنی، اسپینی ادب و فلسفہ کا مطالعہ کیا ہے لیکن براہ راست کسی سے متاثر نہیں ہوئی، چونکہ پسند کرنا الگ بات ہے اور اثر قبول کرنا الگ بات۔

س ۔ اردو ادب کے کسی شاعر کو زیادہ پسند کرتی ہیں؟

ج ۔ میرؔ، غالبؔ، اقبالؔ اور میر انیسؔ کو بہت بڑا شاعر مانتی ہوں اور انہیں پسند کرتی ہوں۔

س ۔ ہندوستان میں اردو زبان کا مستقبل آپ کی نظر میں کیسا ہے؟

ج ۔ آزادی کے بعد سے اردو کو ہندوستان میں سب سطح پر جس طرح دبایا جاتا رہا ہے اور اس پر ظلم ہو رہا ہے وہ اس زبان کے ساتھ کھلی بے انصافی ہے، ایک غلط پالیسی کے تحت اردو کو ہندی کا حریف سمجھ کر دبایا گیا ہے تاکہ ہندی کو فروغ دیا جاسکے جبکہ منجملہ اور باتوں کے اردو زبان کے جملوں کی ساخت ترکیب (SYNTAX) اور روانی کا ہندی مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اس وقت اردو ہندوستان اور پاکستان کے علاوہ دنیا کے اور ملکوں میں بھی ایک خاص اہمیت کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ ہندوستان میں اردو اگر دبا بھی دیا گیا تو بھی اردو اپنی شگفتگی اور تازگی کی وجہ کر دوسرے ملکوں میں زندہ رہے گی اور ابھرے گی، اقبالؔ نے کہا ہے ؎

جہاں میں اہل ایماں صورت خورشید جیتے ہیں
اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے

س ۔ ہندوستان میں اردو کیا مسلمانوں کی زبان ہو کر رہ گئی ہے یا ہوتی جا رہی ہے؟

ج ۔ اردو کو مسلمانوں کی زبان کہہ کر اس کا جائز حق نہیں دیا جا رہا ہے جبکہ ہماری نسل کے لوگوں تک اردو مسلمان، ہندو، سکھ اور سب کی زبان رہی ہے، اگلی نسل میں ممکن ہے مسلمانوں کی بھی علمی زبان نہ رہے کیونکہ تعلیمی اداروں سے جس طرح اسے خارج کیا گیا ہے اس سے اس کا انجام اور کچھ ہو سکتا ہے۔ اردو بہرحال ایک ایسی زبان ہے جو ہماری مشترکہ تہذیب کی پہچان ہے جسے کوئی [illegible]

سیاستداں مشاکر خود اپنے ملک کی گنگا جمنی تہذیب
کو مٹا رہے ہیں۔

س ۔ اردو کی اکاڈمی اور دوسرے ادارے کہاں تک
اردو کی ترقی کے لئے کارآمد ثابت ہو رہے ہیں؟

ج ۔ افسوس ہے کہ اردو کی اکاڈمی اور دوسرے
سرکاری ادارے اردو کی ترویج و ترقی کے لئے کچھ نہیں
کر رہے ہیں۔ جو کچھ وہ کر رہے ہیں قطع نظر اس کے
کہ اس میں دوست نوازی اور گروہ بندی کا دخل زیادہ
ادب نوازی سے زیادہ ہے۔ موجودہ حالات میں
اداروں کو چاہئے کہ انعام و اکرام اور مالی تعاون
کے بجائے اردو کی کتابیں شائع کروائیں، اور
سیمینار و مشاعروں کی جگہ پرائمری اسکولوں میں اردو
کی تعلیم رائج کرنے کے لئے مہم چلائیں تو اردو کی ترقی
اور اس کے مستقبل کے لئے زیادہ بہتر ہوگا۔

س ۔ آپ اردو ادب میں کسی تحریک یا گروپ سے وابستہ
ہیں۔؟

ج ۔ " I am too individualistic and free to confine myself to any one of the schools of thought "

۔ شاعری ایک ایسا تخلیقی عمل ہے جس میں ذات کائنات
اور سماجی مسائل و جمالیات خود بخود شامل ہوتے ہیں
اور شیر و شکر ہوتے ہیں۔"

میں شاعری کو خانوں میں نہیں بانٹتی اور اس کی
ضرورت بھی نہیں سمجھتی ہوں، دراصل اچھی اور معتبر
شاعری میں انھیں سے کسی ایک جہت کو مکمل طور پر
علٰحدہ کرنا ممکن نہیں ہے۔ آرٹ اور ادب میں
فنکار اور شاعروں سے زیادہ تحریکیں نقادوں کی
پھیلائی ہوئی ہوتی ہیں، ادب و شاعری تنقید کی پیش
رو ہوتی ہیں اس کی طابع نہیں ہوتیں اسی لئے جو
ادیب اپنے آپ کو نمایاں طور پر کسی تحریک سے
وابستہ کر لیتے ہیں وہ غلطی کرتے ہیں اور اپنے فن
کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ زیادہ دور جانے کی ضرورت
نہیں "ترقی پسند ادب" و "جدیدیت" میں مہملیت
کے نام لیواؤں کی بڑی تعداد کا حشر ہمارے سامنے
ہے۔

اچھے فنکار کو اپنے فن سے وابستگی و خلوص ہوتا ہے
اور زندگی کی سچائیوں کی تلاش ہوتی ہے۔ اگر
نقاد اس پر کسی تحریک کے اثرات ڈھونڈیں تو یہ
ان کا کام ہے۔ اگر فنکار کو اپنے آپ پر اعتماد نہ ہو
تو وہ کسی تحریک سے وابستہ ہو کر نقادوں کی نظر
لطف پر توجہ دیں گے

دل ہی تو ہے سیاستِ درباں سے ڈر گیا

س ۔ آپ شاعری کیوں کرتی ہیں؟

ج ۔ اس سوال کا کوئی قطعی جواب میرے پاس نہیں
ہے۔ یہ میں خوب جانتی ہوں کہ میری شاعری کے بغیر
دنیا ادھوری نہیں رہ جائے گی۔ کبھی کبھی محسوس ہوتا ہے
میں شاعری نہیں کرتی بلکہ شاعری مجھے کرتی ہے اور جب
وہ یوں اپنا وجود مجھ سے منوا لیتی ہے تو پھر میں اس
سے دست و گریباں ہو جاتی ہوں۔ یہاں تک کہ
ہم دونوں میں رابطہ و آہنگ پیدا ہو جاتا ہے ——
شاعری میرے لئے تلاشِ معنی کے سلسلے کی ایک کڑی
ہے۔

ساجدہ زیدی

کاغذی ہے پیرہن

یہ بے نور ـــــ اندھی سیاست کا بازار ہے۔
مصلحت کی دکاں ہے
شناسا یہاں اجنبی ہیں
مسرت کے لمحے بھی بے جان ہیں
جسم و جاں کی حقیقت نہیں ہیں

ریاکاروں سوچوں کے جامد حصاروں میں
لپٹی ہوئی ـــــ سرزمیں کہہ رہی ہے
کہ یہ محفل تنگ داماں ہے
ساقی کا اعجاز
مطرب کی آواز
اور ـــــ نعرۂ سرمدی ـــــ کچھ نہیں ہے یہاں
تو بس ـــــ
ذوقِ ہستی کا
بیداری آرزو کا ـــــ اثاثہ سمیٹو
انہیں بے نوائی کے غاروں میں کھو جاؤ ـــــ جاکر
جہاں کونے کونے میں
ہر کنج میں ـــــ ہر قدم پر

سکوت مکمل کا آسیب ہے،
شور و غوغا کا جنگل ہے۔
اور گلشن تعلق
بے برگ و بار و شجر ہے
کہ اس محبس فکر میں ــــ خیالوں کی محشر خرامی
اندھیروں، اجالوں کی تکرار پیہم نہیں ہے

اسی کنج بیگانگی میں چھپا لو، دل و جاں
جہاں سحر خیز، بیدار روحیں
کبھی نشۂ مے سے سرشار تھیں جو
خمار تمنا گنوا کر
سبک بزم خوابوں سے دامن بچا کر
کارگاہ نیر سے نگاہیں چرا کر ......
زمانے کے نقش قدم دیکھتے دیکھتے
سو گئی ہیں
کہ وہ بار حزنیت دین و دل سے
سبک بار سی ہو گئی ہیں۔

اگر جان و دل ــــ پھر بھی
بیداری آرزو
فتنہ سازی حق بینی و
گرم رفتاری جستجو پر مصر ہوں
تو دیوار محبس کے روزن کو آنکھیں بنا لو
نگاہیں افق پر جما لو

ساجدہ زیدی

پھر کوئی طوفانِ بلا میرے لئے

حوصلے زیرِ فلک، شوق میں لرزاں بھی نہیں
دردِ بے تاب بھی، رقصاں بھی نہیں
پا بہ جولاں بھی نہیں .....

ہر طرف شورِ سلاسل ہے، بکا ہے، غم ہے
کسی معشوقِ کرم آمیز کے لٹ جانے کا اک ماتم ہے

صبح کے چہرے پہ انوارِ مسرت بھی نہیں
درد کا درماں بھی نہیں
عشق کا حاصل بھی نہیں

دوپہر سرد ہوئی یوں —— کہ جلو میں اس کے
اب کوئی شعلگیٔ درد سے تپتا ہوا پیمانِ وفا
—— دلِ گم گشتہ کی منزل بھی نہیں۔

شام، ہر کیف و کمِ زیست سے منہ موڑے ہوئے

سرمئی غم کی ردا اوڑھے ہوئے

شب کی پیشانی پہ غم خوار ستارے بھی نہیں۔
منتظر نظروں میں وارفتگیٔ شوق کے
بیدار نظارے بھی نہیں۔

کہکشاں تک شب تاریک کی تقدیر نہیں
شبنمی نور میں کیسے کھلیں
اسرار و رموز ہستی
کیسے نظارگیٔ حسن کا ساماں ہو بہم
برق احساس رواں ـــــ ریت کے ذروں کی طرح
لمحے لمحے میں بکھر جاتی ہے۔
ساعت حشر دبے پاؤں گزر جاتی ہے
در افکار پہ دستک بھی نہیں ہوتی
کہ ـــــ الفاظ خود اظہار کا دریا مڈے

اے خدا! پھر کوئی طوفان بلا میرے لیے
پھر کہیں دور سے آتی ہوئی
آوارہ صدا میرے لئے
تازیانۂ دل وحشی کے لیے
کرب و بلا ـــــ میرے لیے!

پھر کیا ہوا؟

ساجدہ زیدی

نہ کوئی مسیح
پہ ہے
نہ حسن و خیر و صداقت و لوز کی صدائیں ہیں شبنم افشاں
نہ اب کوئی قلب مضطرب ہے زوال انساں پہ گریاں ساماں
نہ اب کسی دل میں دل نوازی کا شوق پیہم
نہ اب کوئی ذہن حسن افکار سے بہاراں
نہ اب کوئی دل نگاہِ دلدار سے ہے لرزاں
نہ کوئی احساس
حسن تخلیق کی نوازش پہ مست و رقصاں
وفا کے ساماں، نہ غم کے عنواں

نہ کوئی پروانہ کے محابا
نہ کوئی آواز دلفگاراں
نہ کوئی انداز خیر و برکت
نہ عزم جاں باز کی حلاوت
نہ ذہن عقدہ کشا
نہ سر جستجو کی راہوں میں سرگراں ہے
کسی کی نظروں میں انتظار سحر کا وہ خواب اب نہیں ہے
کسی دلِ ناصبور کو
ترجمانی درد و داغ جاں کی طلب نہیں ہے
تمام آثار زیست بازار سکہ زر میں بک گئے ہیں
متاع اقدار لٹ چکی ہے
تمام وعدے، تمام دعوے، تمام حرفِ طلب کے قصے
تمام عزم سفر کے عنواں
جنس بازار بن گئے ہیں
دیے جو جلتے تھے آرزو کے، وہ جی کا آزار بن گئے ہیں

جو ہاتھ طبل و علم اٹھاتے ـ وہ کٹ گئے ہیں
جو انگلیاں چنگ و بربط و نے پہ رقص کرتیں ـ وہ خونچکاں ہیں
جو خوشے سر بہ دست ہوتے وہ جاں بلب ہیں ـ
جو نطق رجز حیات پڑھتا وہ شور و غوغا میں گم ہوا ہے
جو ذہن نیلے گگن پہ افکار خیر کی کہکشاں بناتا
وہ برف خانوں میں منجمد ہے

جو چشم، چشم نظارہ جو تھی، وہ کور راہوں میں کھو گئی ہے۔
جو ورد مضراب زندگی تھا، وہ سرد ہے
جو نگاہ تمہید زندگی تھی وہ مضمحل ہے

کسی کے لب پر کوئی صدا ہے — تو شہر باطل پرست میں
وہ صدائے ہوا بنی ہوئی ہے
کسی کے خوں میں اگر ہے سرخی — تو وہ زہر بن کر
نسوں کے اندر اتر گئی ہے
کسی کے سینے میں نغمہ جانفزا ہے لرزاں
تو شعلۂ درد بن گیا ہے۔
مسافرانِ طلسم امکاں
ہراس کے دشت میں ہراساں
نظر خلاؤں میں بے نظارہ
قدم زمینوں پہ نقش بے جاں

لبوں کے نغمے
دلوں کے شعلے
لہو کی گرمی
نظر کی جرأت
قلم کی حرمت
دلِ سحر خیز کی حرارت
طلب کی راہوں میں — نورِ حق، روشنیٔ افکار کی ضرورت
سبھی دیئے ماند پڑ گئے ہیں
چراغ حسن نظر — تجارت کی تند آندھی میں بجھ گئے ہیں

خدائے برتر
حکومت دو جہاں کے ۔ اس کاروبار کی بے کراں علامت
کوئی صداقت — کوئی صباحت!
کوئی خیال و نگاہ افکار کی امانت!
خدائے برتر
کوئی صداقت — کوئی صداقت!

ساجدہ زیدی

○

ایک نشترِ نظر کے طلب گار ہم بھی ہیں
دانا ہو تم غموں کے، تو غمخوار ہم بھی ہیں

حیران کھڑے ہوئے انہیں راہوں میں ہم ہنوز
اے رہروانِ کوچۂ دلدار! ہم بھی ہیں

دریا سمجھ لیا جسے، نکلا وہی سراب
ایک حرفِ تشنگی کے گنہگار ہم بھی ہیں

منھ راہِ سجدِ شوق سے موڑا نہیں ہنوز
ہاں جرمِ خستگی کے خطاوار ہم بھی ہیں

اس باغ میں، کہ زاغ و زغن ہیں اہلِ گل
خاموش دیکھنے کے سزاوار ہم بھی ہیں

○

حیات نارسا کی آگہی ہے
میرے سینے میں گویا خامشی ہے

ہر اک انجام سے گذرے تو جانا
کہ بے انجامیوں میں زندگی ہے

کشیدہ درد، ہر جامِ طرب سے
سرشتِ دل ہی شاید تشنگی ہے

یہ دل صحرائے اعظم، اور تقدیر
اسے اک بوند سے بہلا رہی ہے

تمہیں شبنم کی خنکی چاہئے تھی
مری پلکوں پہ آتش جل رہی ہے

ادھر دریا کی موجوں میں تلاطم
ادھر چٹان حائل وقت کی ہے

کسی بے نام افسانے کی تمہید
غبارِ وقت میں بکھری ہوئی ہے

یہ رستے ہیں کہ تحریریں دھوئیں کی
یہ منزل ہے کہ دل کی سادگی ہے

کبھی زنجیر، گاہے پایہ جولاں
عجب طرفہ تماشا زندگی ہے

○

روشِ جنوں کو عالم میں، ہمیں دوام کرتے
جو نہ راستوں میں رکتے، نہ کہیں قیام کرتے

نہ نظر میں آگ جلتی، نہ لبوں پہ حرف آتا
نہ نقابِ غم اٹھاتے، نہ صلائے عام کرتے

یہ جراحتوں کا موسم، یہ وفورِ غم کی شبنم
یہی زادِ راہ لے کر، سفر مدام کرتے

سرِ بزمِ دوستاں بھی نہ کھلی زباں ہماری
ارے رنجِ نارسائی، تجھے کیسے عام کرتے

یہ کڑا سفر گذرتا، یہ شبِ دراز کٹتی
کوئی حرفِ وعدہ ہوتا، کہ سحر کو شام کرتے

وہی خامشیٔ پیہم، وہی اک سکوتِ مبہم
کوئی ہم زباں ملتا، کبھی ہم کلام کرتے

مری کائنات کیا تھی، یہی اک فکرِ سادہ
کہ متاعِ جاں لٹاتے، بڑا اژدہام کرتے

پروفیسر ساجدہ زیدی

تخلیق شعر کی نفسیاتی تعبیر

سائنس، ٹیکنالوجی، تجارت اور مادیت کے اس بڑھتے ہوئے سیلاب میں جو بیسویں صدی کا طرۂ امتیاز ہے، آخر شعر و ادب کی جگہ کیا ہے؟ اس کی بنیاد نہ تو خالص عقلیت پر ہے، نہ سود و زیاں کے کاروبار پر، نہ ارباب حکومت و سیاست کی ترغیب پر، نہ حصول قوت و زر کی تحریک پر۔ اور نہ ہی اس انجانی و گمنام اور غیر شخصی آمریت کے جبر پر جس نے آج کے انسان کی زندگی کو بے شمار چھوٹے بڑے خانوں میں تقسیم کرکے اس کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں لے لی ہے۔ ٹیکنالوجی کی غیر مشروط فتح، اور آج کی دنیا کی وہ معرکۃ الآرا مادہ پرستی، جس نے زندگی کو تجارت اور تجارت کو فن بنا دیا ہے۔ شعر و ادب جتنی دور ہے وہ اس قدر بین حقیقت ہے کہ اس کے ثبوت کے لئے مجھے نہ کسی مثال کی ضرورت ہے اور نہ کسی منطقی طریقۂ استدلال کی ______ پھر سوال یہ پیدا ہوتا کہ ______ کہ وہ دیوانے جسے عرف عام میں شاعر یا ادیب کہتے ہیں اس نقار خانے میں اپنی آواز سنانے پر مصر کیوں ہیں؟۔ شعر و ادب کی تخلیق۔ باوجودیکہ بہت سے نقادوں نے وقتاً فوقتاً یہ حکم لگائے کہ ایٹمی توانائی، یا ہائیڈروجن بم، لمبی جسامت والے میزائلوں، کیمیائی ہلاکت آفرینی اور ستاروں کی جنگ کی اس دنیا میں تخلیق فن کی کوئی جگہ نہیں ہے۔ آج بھی جاری ہے اور عالمگیر پیمانے پر جاری ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ بنیادی طور پر اس کا منصب بھی تبدیل نہیں ہوا ہے۔ آج بھی شعر و ادب کا، اور جملہ فنون کا منصب وہی ہے۔ ذہنوں کی جلا، جذبوں کی تہذیب، احساس حسن و صداقت کی پرداخت، انسانی مسائل کا تخیلی تجزیہ، جمالیاتی حظ۔ انسانی اقدار کے بالادستی پر اصرار۔ اور اقدار شر و ہلاکت آفرینی سے انکار۔

اب اس سوال کا کہ وہ دیوانے جسے عرف عام میں شاعر و ادیب کہتے ہیں اس نقار خانے میں اپنی آواز سنانے پر مصر کیوں ہے؟۔ میرے پاس ایک ہی جواب رہ جاتا ہے کہ ...... کائنات کی ہر زندہ حقیقت اپنے اظہار و انکشاف پر مجبور ہے۔ اور تخلیق فن ایک نفسیاتی حقیقت ہے۔ کم و بیش اسی طرح جس طرح جبلت جنس اور استشہاد۔ یہ ایک ایسی نفسیاتی حقیقت ہے جس پر اگر ضرورت، اقتصادیت، سماجیت، (یا سماجی مطابقت پذیری) سیاست، افادیت

عقلیت پرستی، رائے عامہ، اور اوسطیت نوازی کے اتنے پہرے نہ ہوتے جتنے کم و بیش ہر سماج میں ہیں۔ یعنی تہذیبی زندگی میں خود بے روک تخلیقی اظہار کے امکانات مضمر ہوتے۔ تو یہ حقیقت اس سے بہت زیادہ عالمگیر سطح پر اپنا اظہار کرتی۔

اپنے اس موقف کو کہ تخلیق کا عمل ایک عالمگیر نفسیاتی حقیقت ہے اور انسان کے وجود میں مضمر ہے، میں صرف اس طرح واضح کر سکتی ہوں کہ تخلیقی عمل کا ایک سرسری سا نفسیاتی جائزہ لوں ...... اس سلسلے میں میری کوشش یہ ہوگی کہ ان پُراسرار نفسیاتی سلسلوں کو جن سے تخلیق فن عبارت ہے سہل اور عام فہم انداز میں پیش کردوں۔ اور جہاں تک ہو سکے تکنیکی موشگافیوں سے دامن بچاؤں۔

تخلیقی عمل کے ہمارے ذہن میں ایک مخصوص معنی ہوتے ہیں۔ یعنی انسان کی خلاقانہ صلاحیتوں کا مخصوص میڈیم، مثلاً شاعری، ادب، موسیقی، رقص، سنگ تراشی، اور فن تعمیر وغیرہ کے ذریعے فنکارانہ اظہار۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ برگساں کے فلسفۂ تخلیقی ارتقا اور تصور قوت حیات نے یہ بھی انکشاف کیا ہے کہ تخلیقی قوت نہ صرف فطرت انسانی بلکہ ہر جاندار شئے کی فطرت کا جزو لازم ہے۔ اور خود حیات کے ارتقائی عمل میں مضمر ہے۔ مزید برآں برگساں کے فلسفیانہ تصور اور ینگ کے نفسیاتی تصورات کے بعض پہلوؤں میں ایک معنوی ربط کا اندازہ ہوتا ہے۔ ینگ نے اجتماعی لاشعور اعذ آرکی ٹائپ کے نظریے کے ذریعے یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ ذہن انسانی کے عمیق ترین گوشوں میں ایک ایسی قوت مضمر ہے جو بلا لحاظ زمان و مکان علامتی صورتوں میں ظہور پذیر ہوتی رہتی ہے۔ اور اس لحاظ سے تخلیقی علامت ہی دراصل تخلیقی اظہار کی بنیادی شرط ہے۔ ان انکشافات کے تحت ہمیں یہ نتیجہ اخذ کرنا پڑتا ہے کہ نفسیاتی نقطۂ نظر سے تخلیقی قوت دو سطحوں پر رونما ہوتی ہے۔ ایک، تخلیق کی جبلی سطح، جس کے اظہار پر ہر انسان بحیثیت انسان قادر ہے۔ اور جو عام زندگی کے تخلیقی اور استعاراتی اعمال میں اپنا اظہار کرتی ہے۔ اور دوسری۔ تخلیق کی ارتقائی، پیچیدہ اور پُراسرار سطح، جو تخلیقی عمل کی ثانوی سطح ہے اس کا فنکارانہ اظہار شعر و ادب، رقص و موسیقی، فلسفہ و سائنس، آرٹ اور دیگر فنون لطیفہ کے مربوط اور ارفع تر وسیلوں کے ذریعے ہوتا ہے۔

تخلیق فن و ادب، ایک پُراسرار نفسیاتی لیکن مربوط اور مسلسل عمل ہے۔ یہ عمل اساسی طور پر بے شمار تضادات، مثلاً عقل و وجدان، جذبہ و فکر، شعور و لاشعور، پیچیدگی و سادگی، داخلی و خارجی، خیر و شر، زندگی کا المیہ احساس، اور رجائی امید پرستی، اندیشۂ موت و قوت حیات، اور ذہنی صحت اور ذہنی الجھنوں اور وحشتوں وغیرہ کی بنیادی کشاکش اور تصادم سے جنم لیتا ہے۔ لیکن جس نفسیاتی نقطے پر یہ متضاد حقیقتیں اور متضاد کیفیتیں باہم دگر جذب ہوتی ہیں وہاں یہ ایک ارتفاعی کیفیت سے دوچار ہوتی ہے، اور نتیجتاً ایک ایسے حرکی، ارتقائی اور معنوی اعتبار سے مکمل و مربوط عمل کی صورت میں ظاہر ہوتی ہیں جسے ہم تخلیقی عمل کہتے ہیں۔ اور جو یا تو متضاد کیفیتوں کے آہنگ سے جنم لیتا یا ارتقا کے مراحل سے گذرتا ہوا ایک نئے معنوی کشف کے سلسلے کا منتہا ہوتا ہے۔

اس ضمن میں یہ اشارہ بے محل نہ ہوگا کہ برگساں نے عقل و وجدان کا جو تضاد پیش کیا ہے وہ بھی تخلیقی عمل میں پنہاں کشاکش کے ایک بنیادی پہلو کا اظہار ہے۔ برگساں عقل یا دانش کو ایک اقلیدی رجحان سے تعبیر کرتا ہے جس کا خاص اظہار ریاضی میں اور تجریدی اظہار سائنس میں ہوتا ہے۔ وجدان عقل کی ضد ہے، اور احساس کی سطح پر ادراک کرتا ہے۔ یعنی عقلی طریقۂ ادراک منطقی ہے۔ اور وجدانی طریقۂ ادراک بہ راہ احساس، اور براہ راست ہے۔ تخلیقی فنکار عام انسان کا حامل عقل کی بنیاد پر تلاش کرنے کے باوجود خالص عقل کی حکمرانی قبول نہیں کرتا۔ اس کی نفسیاتی زندگی میں وجدان پر زیادہ اعتبار و اعتقاد مضمر ہوتا ہے۔ اگرچہ اس سے بھی انکار ممکن نہیں کہ وجدانی ادراک کے باوجود فنکار کا انداز نظر کلیتاً غیر عقلی نہیں ہوتا۔ اور ہو بھی نہیں سکتا۔ لیکن وہ خود اپنی ذات اور دوسرے افراد کے تجربات میں مضمر غیر عقلی پہلوؤں کی تنظیم کرتا ہے۔ اور ان کی اہمیت عملاً قبول کرتا ہے۔

برگساں سے کسی حد تک مماثل فرائڈ کا نظریۂ لاشعور ہے۔ جس کی رو سے ذہن انسانی کی تین تنظیموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ لاشعور، پیش شعور اور شعور۔ شعوری فکر بڑی حد تک عقلی، منطقی اور تنقیدی ہوتی ہے۔ اور انسان کے دائرہ اختیار میں ہوتی ہے۔ لاشعور اس کے برخلاف دائرۂ اختیار سے باہر ہوتا ہے۔ یہ اصول لذت کا پابند ہوتا ہے اور اس کی نوعیت جبلی ہوتی ہے۔ لاشعوری فکر ایک اندرونی "سنسر شپ" کی بنا پر عموماً شعور کی سطح پر اظہار کرنے سے قاصر رہتی ہے۔ ان دونوں حدود کے درمیان "پیش شعوری" فکر ہوتی ہے۔ جو ان دونوں قسم کی فکروں کے برخلاف حرکی اور آزاد ہوتی ہے۔ پیش شعور میں خیالات آپس میں ٹکراتے ہیں۔ ملتے بچھڑتے اور بکھرتے ہیں اور بے شمار غیر موجود فکری تشکیلیں قائم کرتے ہیں۔ نئے پیکر تراشتے ہیں۔ اور تخیلی خیالی کی بنا پر فکری انسلاکات کی لامحدود انداز سے صورت گیری کرتے ہیں۔ یہ فکری تشکیلیں پیش شعور میں نامحسوس طریقے سے موجود رہتی ہیں۔ اور جب تخلیق فن کے لئے جذباتی فضا ہموار ہوتی ہے تو شعوری اظہار پر مائل بلکہ بڑی حد تک قادر بھی ہوتی ہیں۔ یہی وجدانی فکر کا نقطۂ آغاز ہوتا ہے اور شعر و ادب کی تخلیق کے لئے لمحۂ عرفان مہیا کرتا ہے۔

نفسیاتی نقطۂ نظر سے تخلیق فن و ادب ایک لحاظ سے دائروی عمل ہوتا ہے۔ اور دوسرے اعتبار سے ارتقائی عمل۔ دائروی اس لحاظ سے کہ تخلیقی عمل کا سفر شعور سے شروع ہو کر شعور ہی پر ختم ہوتا ہے۔ یہ کچھ اس طرح کا عمل ہوتا ہے کہ عہد طفلی سے شروع ہو کر عنفوان شباب اور عہد بلوغت سے گزرتا ہوا عہد پیری تک کے فہم و ادراک، فکر و احساس اور جذبہ و عمل کا سفر، اور ان ادوار میں حاصل کئے ہوئے شعوری زندگی کے تمام تر تجربات حافظے کی انسانی سطح میں محفوظ نہیں رہ سکتے۔ بلکہ ان میں بیشتر لاشعور کے وسیع و عریض خزانے میں منتقل ہوتے رہتے ہیں۔ جہاں جبلی محرکات کی کارکردگی بھی ہوتی ہے۔ اور ان قوی ترین جنسی جبلتوں کی فعالیت بھی خصوصیت سے ہوتی ہے۔ جن کا مکمل اظہار اکثر ایک مہذب عام سماجی زندگی کے تہذیبی دائرے میں ممکن ہوتا ہے۔ ان تمام عناصر کی ہر وقت حرکت و اضطراب اور ان کے باہمی تصادم کی وجہ سے ان کی تبدیل شدہ دبیشتر اوقات علامتی اور استعاراتی شکلوں کو پیش شعور میں

پہنچنے میں مدد ملتی ہے۔ اور پیش شعور ہی وہ ذہنی تنظیم ہے جہاں تخلیقی، تخئیلی اور علامتی صلاحیتوں کی کارفرمائی ہوتی ہے۔ یہیں تخلیقی قوت کی بالیدگی کے امکانات پوشیدہ ہوتے ہیں۔ پیش شعور جیسا کہ ابھی کہا گیا، چونکہ شعور اور لاشعور دونوں کے مقابلے میں زیادہ آزاد اور متحرک ہوتا ہے۔ اس لئے تخلیقی فکر کا پہلا ہیولا پیش شعور ہی میں تربیت پاتا ہے وہ بالیدگی کی ایک خاص منزل پر پہونچنے کے بعد ایک اندرونی نفسانی دباؤ کے زیراثر شعور کی سطح پر ایک برقی کیفیت میں اچانک ابھر آتا ہے۔ اسی برقی خیال پر شعور کی گرفت "کو عرف عام میں لمحۂ وجدان، یا عرفان یا الہام کہتے ہیں۔ جذباتی اعتبار سے یہ بہت ولولہ انگیز، ہیجان خیز، پرشور اور اکثر اوقات جنون خیز لمحہ ہوتا ہے۔ جس میں انفرادی "ایگو" یا انا روحانی قوتوں کے زیراثر ہوتی ہے۔ اور شعوری ذہن یا تو نیم خوابیدگی کی کیفیت میں ہوتا ہے ..... یا پیش شعور سے آمیز ہو کر، ایک ایسی ماورائی کیفیت سے دوچار ہوتا ہے کہ وہ خود بھی زیادہ فعّال، آزاد اور خود نگر ہو جاتا ہے۔ وہ ایگو کے محدود دائرے سے نکل کر آفاقی وہمہ گیر فکر کا حامل ہو جاتا ہے .... یہی وہ لمحہ ہے جب آرکی میڈیز "پالیا" کا نعرہ لگاتا ہوا عالم بے خودی میں باتھ ٹب سے عریاں نکل کر بھاگتا ہے .... جب نیوٹن پر زمین پر گرتے ہوئے سیب کو دیکھ کر کشش ثقل کی حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے .... اور شاعر کے شعوری ذہن پر ابھر کر اس کے شعر یا نظم کا اولین خیال اس سے اپنا وجود منواتا ہے (جس کے بعد وہ رفتہ رفتہ اس خیال کو منظر تحریر میں لاتا ہے) شعوری ذہن کا بیشتر عمل یعنی تخلیقی ہیولے پر مکمل گرفت۔ تنقید۔ تصحیح۔ اور تکمیل کا عمل اس کے بعد شروع ہوتا ہے تخلیقی فکر کے سفر کی یہ آخری منزل ہے۔ اس طرح انسانی تجربات کا بڑا حصہ، شعور سے شروع ہو کر۔ کشف، جذب، اور رد و قبول کے مرحلوں سے گزرتا ہوا، اس کے لاشعور کا جز بن جاتا ہے اور پھر جذبۂ و فکر کی بھٹی میں تپ کر، تخئیل و علامت سازیوں کی وادیوں سے گزر کر، پیش شعور کی وساطت سے ۔ جہاں نفسیاتی آزادی ہے، پھر شعور کی سمت سفر کرتا ہے یوں یہ دائرہ مکمل ہو جاتا ہے۔

دوسری طرف تخلیق فن و شعر ارتفاعی عمل اس اعتبار سے ہے کہ انسان کی ہر خواہش کی تکمیل ممکن نہیں ہے انسانی خواہشات جن کی ابتدائی شکل حصول تسکین جبلت ہے، دوسرا انتہائی شکل آرزوئے ابدیت ہے۔ آسودگی کی منزل پانے کے لئے ہمہ وقت بے تاب رہتی ہے۔ اور یہ بھی انسانی زندگی کی اٹل حقیقت ہے کہ یہ خواہشات مکمل آسودگی کبھی نہیں پا سکیں۔ غالب نے انسانی نفس کی اسی ازلی محرومی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا ؎

ہزاروں خواہشیں ایسی، کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارماں، لیکن پھر بھی کم نکلے

لیکن انسانی نفسیات بھی عجیب و غریب پر اسرار حقیقت ہے۔ انسان اپنی اس ازلی محرومی پر قناعت نہیں کرتا۔ بلکہ وہ جو مخصوص صلاحیتوں کا حامل ہے تو اپنے تخئیل، محبت، جرات اور حساسیت کی قوتوں کے استعمال سے ایک بالواسطہ [illegible] کی رفت

اور جذبے کی تہذیب کا عمل ہے۔

محرومی کو آسودگی، جبلت کو عشق و وابستگی، خواہش کو آرزو، اور ملکہ جذبے کو علامت میں بدل کر ان کی ترفیع کا عمل خالص انسانی نفسیات کا کرشمہ ہے کہ اور کسی جاندار کی سائیکی میں تجربے سے آگے بڑھ کر ترفیع کی یہ قوت نہ پنہاں ہے نہ پیدا۔ یہ انسان ہی ہے جو اگر ایک طرف جنسی ناآسودگی، نا پذیرائی یا غیر تکمیلیت اور دوسری ملکی کی ناآسودگی کو آسودگی میں بدلنے کا سامان تخلیق علامت کے در و دیشا میں تلاش کرتا ہے تو دوسری طرف اپنے ارزوئے ابدیت کو تخلیق فن و شعر کے معنی خیز عمل سے تسکین بہم پہنچاتا ہے ——— اس ارتفاعی عمل کا سرچشمہ ایک ایسی نفسیاتی آزادی سے پھوٹتا ہے۔ جو ہر ایک کو نصیب نہیں ہوتی۔ صرف اس لئے نہیں کہ وہ عام انسانوں کے اختیار سے باہر ہے، بلکہ اس لئے بھی ہر شخص اس خارجی جبر سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکتا ہے جو ہر معاشرہ کی زندگی میں کم و بیش ناگزیر ہے۔ اس سے بھی زیادہ عبرت انگیز بات یہ ہے کہ بہت کم اشخاص اس نفسیاتی جبر سے آزادی کے اہل ہوتے ہیں۔ جو مطابقت پذیری، حقائق سے گریز اور چشم پوشی، ذات سے فرار، خواہش تحفظ اور طرف آزادی سے عبارت ہے۔ یہ وہ جبر ہے جو خود فرد کی سائیکی میں پنہاں ہوتا ہے۔ اور جس سے آزادی حاصل کرنے کے لئے ایک فکر کا ایمان، اور ایک خاص قسم کی آزادی فکر و احساس کی ضرورت ہے۔ جو بڑا دشوار گذار مرحلہ ہے کہ ہر نفسیاتی آزادی کا لازمہ ایک نفسیاتی ذمہ داری بھی ہے۔ کم و بیش ہر معاشرہ میں افراد کی اکثریت اس آزادی اور ذمہ داری سے خوف زدہ رہتی ہے۔ لہذا مطابقت پذیری کی راہ فرار اختیار کرنے ہی میں اپنی عافیت اور تحفظ محسوس کرتی ہے۔

ظاہر ہے کہ تجربے کی ہر سطح تخلیق کی ضامن نہیں ہو سکتی۔ انسانی تجربے کے بعض ابعاد ایسے ہیں جن کے بغیر تخلیق فن و شعر کا تصور کرنا محال ہے۔ علاوہ ان منفرد ذہنی صلاحیتوں کے جو ہر تخلیق کار کی ملکیت ہوتی ہیں اور عام افراد سے بہت زیادہ ان کو ودیعت کی گئی ہوتی ہیں، مثلاً تخیل، علامت سازی، فکری آزادی، اور فکری رسائی وغیرہ۔ یہ بھی کئی ابعاد شخصیت ہوتی ہیں جن کو نفسیاتی کیفیات یا جذبہ کی نوعیت کہا جا سکتا ہے۔ ان نفسیاتی کیفیات کے بغیر تخلیقی اظہار ممکن نہیں ہوتا۔ ان میں زیادہ اہم ابعاد حساسیت، وابستگی اور جذبۂ عظیم کی شدت یا "PASSION" ہوتی ہیں۔

حساسیت کی ابتدا، ذاتی نشاط و الم کے احساس اور اس دردمندی سے ہوتی ہے جو ایک فرد کو اس کے گرد و پیش کی دنیا میں دوسرے انسانوں کی تقدیر اور ان کے نشاط و الم سے وابستہ کرتے ہیں۔ اور اس جذبہ کی انتہا فقط کائنات کی جستجو، معنی حیات کی تلاش اور حقائق کائنات سے ہم آہنگی کے غیر مختتم سلسلے پر پہنچتی ہے۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ حساسیت کے ان پہلوؤں سے ناآشنا، علم ذہنی کے فرمائشی عمل کے غلط وہ زبان کے کاروبار میں مصروف الجھا ہوا اور اپنی ذات، اس کی صلاحیتوں، اور اس کے امکانات سے بے خبر

انسان نہ تخلیق فن و ادب کی طرف مائل ہو سکتا ہے، نہ اس کا قائل۔ اور نہ ہی اس پر قادر ـــــ کہ اس کے روز و شب میں تقیہ انسانی رشتہ رہتا ہے۔ ایک ایسی بے نیازی اور بے تعلقی پائی جاتی ہے جو اگر اس فرد میں کچھ صلاحیتیں بھی موجود ہوں تو ان کو اظہار و انکشاف کے وسیلوں سے دور ہی رکھتی ہے۔ بے تعلقی حساسیت کی ضد ہے اور انسانی زندگی کی طرف سے بے حسی کا پیش خیمہ۔

PASSION وارفتگی یا خود سپردگی کا جذبہ عظیم، وہ نفسیاتی تجربہ ہے جو انسان کو اپنی انا کی حدود سے آزاد کرتا ہے۔ امتیاز من و تو مٹاتا ہے۔ خود اور غیر خود کی درمیانی خلیج کو پاٹنے کی قوت رکھتا ہے۔ یہاں تک کہ خالق و مخلوق کے درمیان حائل پردے اٹھا سکتا ہے۔ انسانی تجربہ کا یہی وہ لمحہ ہے جہاں جذبے کی فراوانی فکر کی جولانی کا ہمنوا ہو جاتی ہے جہاں خالی کرب، تشویش، وجودی وحشت اور دردمندی کے بطن سے جمالیاتی مسرت جنم لیتی ہے۔ اور جس کی شدت کی بدولت قطرۂ خون جگر سل، کو، دل، بنا دیتا ہے ـــــ کوئی معجزۂ فن قوت، حکومت، دولت، شہرت اور جاہ و حشمت کے در پر جبہہ سائی کرنے سے وجود میں نہیں آتا۔ اس کی نمود تو خون جگر سے ہوتی ہے۔ فن شعر کی پرداخت دیر و حرم، خانقاہ و کلیسا میں بھی نہیں ہوتی۔ تخلیق فن کی بالیدگی کا سامان تو شاعر و فنکار کی شب بیداریوں میں ملتا ہے ـــ جب اس کی بے قرار روح، روح کائنات سے ہم آغوش ہونے کی جرأت کرتی ہے۔ انسانی سائیکی بعض ایسے امکانات کی حامل ہوتی ہے جو پردۂ وجود پر صرف اس کیفیت میں نمودار ہوتے ہیں جب سائیکی سکون و حفاظت کے نہیں، بلکہ اضطرار، اضطراب اور جستجو کے تجربات سے دوچار ہوتی ہے۔

قطرے سے گہر ہونے تک کے سفر کی پہلی منزل وارفتگی دل ہے کیونکہ ذہن کے عمیق گوشوں میں مضمر کیفیات (بہ الفاظ دیگر لاشعور کا خام مواد) نغمہ و شعر میں ڈھلنے سے پہلے انسانی سائیکی کے اضطراب سے ہو کر ہی گزرتا ہے کہ:-

نقش ہیں سب ناتمام خون جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خون جگر کے بغیر

ہمارے سامنے ایک بڑا سوال یہ ہے کہ وہ کیا شئے ہے جو تجربہ کے ان پہلوؤں کو ممکن بناتی ہے۔ جن کے بغیر تخلیق شعر و ادب کا تصور ممکن نہیں۔ لیکن جس کی موجودگی میں بے تعلقی، سکون و قرار اور آسائش و یکسوئی ممکن نہیں۔ انسان کو پہلے پہل اپنے وجود کا شعور اور احساس اس حقیقت کے ادراک سے ہوتا ہے کہ اس کا انجام فنا ہے۔ انسان فانی ہے، محدود ہے، اور اس لامحدود کائنات میں بہت ہی مختصر عرصۂ حیات کا مالک ہے ـــــ اگرچہ وہ اس حقیقت سے آگاہ ہوتا ہے لیکن شعور کی سطح پر اور مسائل زندگی سے نبرد آزمائی کے درمیان، یہ آگاہی بہت ہی سرسری اور کاروباری سی ہوتی ہے۔ اس کے برعکس لاشعور کی گہرائیوں میں بہت شدید اور جان لیوا ہوتی ہے اور یہیں سے اس آرزومندی کی ابتدا ہوتی ہے۔ جو تخلیق فن و شعر کا پس منظر ہے۔ "خواہش" فن کا پس منظر نہیں ہوتی۔ کیونکہ خواہش وقتی ہوتی ہے۔ شدید ہوتی ہے اور تسکین کی متلاشی ہوتی ہے۔ وہ ایک مخصوص معروض پر مرکوز ہوتی ہے۔ اور تسکین و آسودگی خواہش کی موت

ہوتی ہے ــــــــ اس کے برخلاف آرزو سائیکی کے نہاں خانوں میں ایک جاری و ساری حقیقت ہوتی ہے ۔ لیکن مبہم ہوتی ہے اس کا کوئی مخصوص معروض نہیں ہوتا ۔ اس کی قطعی تسکین بھی نہیں ہوتی ۔ اور جہاں تک ہوتی ہے آرزو کی تسکین کا سامان اس کی موت نہیں ہوتا بلکہ اس کے لئے مہمیز کا کام کرتا ہے ۔ اس کے علاوہ آرزومندی میں یہ لاشعوری احساس بھی مضمر ہوتا ہے کہ مرکز آرزو کا نہ مکمل ادراک ممکن ہے ، نہ حصول ، اور نہ ہی اس پر تصرف ــــــــ آرزو کی بے شمار جہتیں اور ان کے بے شمار مظاہر ہو سکتے ہیں ۔ لیکن تمام تر آرزوئیں (خصوصاً جو تخلیق فن میں شامل ہوتی ہیں) اظہار ذات ، ترسیل خودی ، نفسیاتی آزادی ، تلاش معنیٔ حیات اور تلاش امکان کی ہوتی ہے ۔ امکان کی تلاش میں یہ نکتہ مضمر تھا ہے کہ بعض امکانات پر گرفت شعوری ذہن کی وساطت سے ممکن نہیں ہوتی ۔ دراصل شاعر و فنکار ذات انسانی میں پوشیدہ امکانی قوتوں کی کارکردگی کی مدد سے ان وسیع تر امکانات کی تلاش پر مائل ہوتا ہے جو روزمرّہ کی زندگی کے عوامل و ضوابط میں نہیں سما سکتے ۔ ان امکانات کا کوئی قطعی تصور خود شاعر کے ذہن میں نہیں ہوتا ۔ اسے تو یہ محض مبہم سا ادراک ہوتا ہے کہ وجود و امکان کا یہ نگار خانہ بھی شاید انسانی تخیل کی حد آخر نہیں ، اور شاید یہ تمام دشت امکان " تمنا کا صرف " پہلا قدم " ہی ہے ۔ تمنا کے دوسرے قدم کی جستجو ہی آرزو کے تخلیق ہے جو کسی فرد کو فنکار یا شاعر بناتی ہے ۔

اسی طرح اپنے وجود کے فانی و محدود ہونے کا احساس انسان کو فن کے وسیلے سے انکشاف ذات اور اظہار ذات پر اکساتا ہے کہ فن جو ایک غیر مرئی حقیقت ہے اس طور پر فانی نہیں ہو سکتا جس طور پر انسان کا مادی وجود فانی ہوتا ہے ۔ تخلیق فن انسان کے اپنے ہی وجود کا اثبات ہوتا ہے ۔ انسان اپنے وجود کی ایک غیر مادی سطح کا متلاشی ہوتا ہے ۔ (کہ مادّہ کو بہر صورت فنا ہے) انسانی وجود کی یہ غیر مادی سطح اصلاً ذات کی تخلیقی جستجو ، اور ذات کے وسیلے سے معنیٔ حیات کی تخلیقی جستجو ہے کہ اس سطح پر فعالیت کسی مادی منافع یا مقصد کے زیر اثر نہیں ہوتی ــــــــ لہٰذا تخلیقی عمل کا مطلب اپنے وجود فانی کو کسی حد تک لافانی بنانے کی مبہم سی آرزو ہے ۔ یہیں سے اس سوز و ساز آرزومندی کے سوتے پھوٹتے ہیں ۔ جو فانی کو لافانیت کی آرزو سے آشنا کراتی ہے ۔ محدود کو لامحدودیت کی جستجو کی سوغات دیتی ہے ۔ ایک نظم کے آخری بند میں میں نے کہا تھا ۔

زندگی ــــ ایک تلاش بیکار ۔
ایک سناٹے میں ڈھلتا ہوا لاحاصل درد
موت ہر لحظہ نفسی کے تعاقب میں رواں
موت ــــ ہستی کے سوالوں کا جواب خاموش
میں ہوں ــــ یا تم ہو ۔
اسی حلقۂ گرداب میں ہیں ۔

اس کے ننداں بھی ہیں
اس کے مہجور تماشائی بھی ......

اسی گرداب کے محور میں بس ایک شعلہ جلائے رکھنا

اپنی تقدیر بھی ہے ـــــ اپنی مکافات بھی ہے "

اس نظم کے بند کے ابتدائی آٹھ مصرعے اس کرب سے عبارت ہیں جو انسان کو اپنے فانی ہونے کے احساس کی بنا پر پیدا ہوتا ہے۔ اور آخری دو مصرعے اس آرزو سے عبارت ہیں، جو اس احساس فنا کی بنا پر انسان کو فن کی طرف راغب کرتی ہے۔ اگر ہم موت کے زنداں نہ ہوتے تو شاید اس حلقۂ گرداب میں (موت کے بھنور میں) ایک شعلہ جلائے رکھنے کے آرزومند بھی نہ ہوتے۔ احساس موت آرزوئے حیات کا سرچشمہ ہے۔ یہی آرزوئے حیات "ا" کی یہی تلاش، جو ہر چند کہ عبث ہے (اور غالباً شاعر خود بھی یہ جانتا ہے کہ عبث ہے) شاعر و ادیب کی تقدیر بھی ہے اور مکافات بھی۔

تخلیقی اور وجودی سطح پر آرزوئے حیات ، آرزوئے ابدیت میں بدل جاتی ہے۔ لہٰذا "تخلیق فن" ـــــ "ا" کی بہت ہی گہری سطح پر دراصل اس کائنات میں، کم از کم اس دنیا میں ـ یا اپنے سماج میں (جو ایک لحاظ سے شاعر کے کائنات اصغر ہوتا ہے) اور تاریخ میں اپنی چھوٹی سی جگہ ، اور انسانوں کے دلوں پر اپنا مبہم سا نقش چھوڑ جانے کی آرزو یہی آرزوئے ابدیت ـــــ جس کے وجود میں اس کی نفی کا راز مضمر ہے یہی ہے اس سوال کا جواب۔

اس مقالے کی ابتدا میں ہم نے اٹھایا تھا کہ :

" آخر اس نقار خانے میں یہ طوطی اپنی آواز سنانے پر مصر کیوں ہے ؟ "

بقیہ: آتش سیال ۔ ایک جائزہ

انہام و تفہیم کے نئے دریچے وا کر کے ہمیں ان کیفیات سے روشناس کرایا ہے جو پہلے ساجدہ زیدی کی ملکیت تھا اور اب ہم سب کی ..... شاعری کا یہی عظیم منصب بھی ہے۔

کتاب ڈیمائی سائز میں نہایت خوبصورت طباعت اور کتابت کے ساتھ چھاپی گئی ہے۔ اور صوری و معنوی دونوں حیثیت سے اس کی پذیرائی ناگزیر ہے۔

پروفیسر ساجدہ زیدی

مصور سبزواری کی شعری جہات

مصور سبزواری کو میں نے "ماچس دیے جلے" کے مطالعے کے دوران اس وقت دریافت کیا جب ان کے اس پہلے مجموعے کے کئی اشعار نے میرے شعور کو اپنی گرفت میں لے لیا اور :

آسمانوں کے سنگھاسن سے گرا ہوں جب تو ذرا تناؤں سے نہ ہوگا میرا درمان زوال

کی طرح کے اشعار کی ایسی جدت و ندرت نے متاثر کیا جو خلاف معمول معنویت سے عاری نہیں بلکہ معنی کی کئی جہتوں سے مالا مال تھی۔ مجھے محسوس ہوا کہ اس شخص کا تخیل زمان و مکاں کے پس منظر میں انسانی تقدیر سے شناسائی حاصل کرنے کے لئے کوشاں ہے۔ مجھے خوشی اور حیرت کا ملا جلا احساس ہوا کیونکہ مصور سے میں متعارف تھی ان کے زمانۂ طالب علمی سے۔ اور حسن اتفاق سے وہ بی ایڈ میں میرے شاگرد تھے، لیکن اس سے پہلے ان کی شاعرانہ حیثیت کا کوئی خاص تاثر نہیں تھا۔

غزل جو مصور کی شعری تخیل کے اظہار کا مخصوص وسیلہ ہے اردو کی تہذیبی روایت میں اس طرح رچی بسی ہے کہ ہر زمانے میں غزل نے ایک مخصوص لہجہ اختیار کیا ہے اور اپنے دلکش موضوعات اور انداز فکر و نظر کی ترسیل و اعانت کی ہے جس طرح ترقی پسند دور کی غزل، کلاسیکی غزل اور اپنے متقدمین ——— اصغر، فانی، جگر اور اقبال کی غزل سے الگ ہے اور اپنے منفرد لہجے و موضوعات کی بنا پر پہچانی جا سکتی ہے، اسی طرح جدید دور کی غزل بھی کلاسیکی، روایتی کلاسیکی اور ترقی پسند تینوں ادوار کی غزل سے الگ اپنی منفرد حیثیت رکھتی ہے۔ یعنی اردو کی تہذیبی روایت میں غزل کا تسلسل بھی برقرار رہا اور اس کے ساتھ اس کے نئے امکانات کی بازیافت بھی ہوتی رہی۔ لیکن ایک قباحت یہ پیدا ہو گئی کہ ہر زمانے میں شعرا کے خاصے بڑے گروہ کم و بیش ایک ہی انداز میں ہم عصر غزل کی پیروی کرتے رہے، انہیں لفظیات و موضوعات اور لہجے کو دہراتے رہے جو اس زمانے کا سکۂ رائج الوقت قسم کی چیزیں بن گئی تھیں۔ بہ الفاظ دیگر ہر زمانے کی غزل نے اپنے کلیشے تراش لئے جنہیں تھوڑی سی رد و بدل کے ساتھ کم تخلیقی ذہن دہراتے رہے۔ اس ہجوم غفیر میں اپنے لہجے کی شناخت پیدا کرنا اور

اپنا منفرد مقام حاصل کرنا ہر دور کے صرف چند ہی شعراکو نصیب ہوا۔ اور مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں کہ مظفر جدید دور کے ایک ایسے شاعر ہیں جنھوں نے اپنی شناخت قائم کی ہے۔

مظفر کی شاعری صرف لہجے، ڈکشن اور موضوعات و انسلاکات کی انفرادیت کی بنا پر اپنا مخصوص مقام نہیں رکھتی۔ بلکہ ان کی حسیت و بصیرت ہی زیادہ تر شعراسے مختلف ہے۔ وہ ایک ایسے منفرد اظہار پر قادر ہیں جو انہیں سے منسوب کیا جاسکتا ہے۔ مظفر کی غزل اپنے ذہین قاری کو بھی اکثر حیرت و استعجاب کی ایسی فضا میں پہونچا دیتی ہے جو بسا اوقات ایک قسم کی ماورائی دہشت کی حدود تک پہونچ جاتی ہے:

ہے وہم جیسے کوئی نقش پہ دہائی دے   یہ ضرب تیشہ مجھے سنگ سے رہائی دے

یا:- صدائیں دیتے ہو کس کو یہاں رہا ہے کون   بس ایک دشت فنا کا اکیلا پن میں ہوں

یا:- کسے خبر تھی کہ یہ حادثہ بھی ہونا ہے   گریں گے غار میں کرنوں کو ہم پکڑتے ہوئے

یا:- اک بے وجود شئے کا تعاقب فضول ہے   پاگل طلب کا ہانپتا رہوار تھام لو

یا:- یہاں یہ کون ہے، یہ کس سے ڈرا یا ہوں میں   یہاں فقط پس دیوار جاں وتن میں ہوں

یہ اور اس نوع کے اشعار صرف جدت وندرت کی وجہ سے متوجہ نہیں کرتے بلکہ ان کی پراسرار فضا اور معنوی تہہ داری قاری کی ذات کے اندرونی گوشوں کو کبھی متحرک کرتی ہے اور کبھی کبھی تہہ و بالا کر کے ایک قسم کے تجربے سے دوچار کرتی ہے مظفر کی غزلوں کے اکثر اشعار میں معنوی تہہ داری کبھی الفاظ کی اپنی تخلیقی جہات کی دریافت کی دین ہوتی ہے۔ جو ان کی فکر وشعور کی پرداخت میں رچے بسے لگتے ہیں اور کسی فیشن یا فارمولے کے تحت غزلوں میں ٹھونسے نہیں جاتے۔ مثلاً:

دور تک لمبی چٹانوں کا پراسرار سکوت   آہٹوں کا کوئی دھوکا بھی نہ رہنے دیگا

کب نرم روشنی کے جزیرے سمٹ گئے   کس سانحے سے آنکھ میں پتھر ہوا طلوع

اک گہر میں نے ریت میں گنوایا ہے   میری کاوشیں خالی، سیپیاں نکلتی ہیں

اجنبی دربار میں ہے فیصلہ کا انتظار   میں ہوں اور اب ریزہ ریزہ ٹوٹنے کا انتظار

دہشت فلک کی طرح ہے سر پر ٹکی ہوئی   شاید سقوط جاں کا تماشا ہو شب کے بعد

اور کبھی تہہ داری مظفر کے مخصوص انداز نظر سے پیدا ہوتی ہے۔ جس میں ہر چند کہ چونکا دینے کی کیفیت موجود ہوتی ہے۔ لیکن معنی ومفہوم سے عاری۔ تجربہ برائے تجربہ کی سستی سنائشیت اور بھدے الفاظ کے ذخیرہ کی مجہولیت نہیں ہوتی۔ یہ تہہ بہ تہہ معنویت ندرت نادرئہ نظر کی دین ہوتی ہے۔ جس کا اظہار ان کے زیادہ تر اشعار میں ہوتا ہے۔ مثلاً:

دست ملال نے آخری انگلی بھی چھوڑ دی   اب جھک کے پلٹے سیل ستمگار تھام لو

اٹھو یہاں سے جادو کی خیمے اکھڑ گئے   مٹھی میں خاک سایہ اشجار تھام لو

گداز جسموں کی آہٹوں کا طلسم ٹوٹا فراخ جالا ہیں   فضا سحاب کری ہاتھ بڑھا کر چھٹے موسم میں آگ دیگا

بھلا یہ شک کہ تم نے ہمیں کو بھیجا تھا — تمہارے دکھ کوئی پاگل اٹھائے پھرتا تھا
رہے باقی ہی کیوں یہ الوداعی سایۂ رحمت — سروں سے کھینچ کے سب سایۂ اشجار لے جانا
گر جانے کا شک کر لیں دیوارِ تجسس — دل سرحدِ انجام سے ، میلوں سے ڈرے گا
اس ڈر سے کہ اس نے دھوپ میں آنسو سکھا لیے — ان پانیوں میں آگ کے جلنے کا خوف تھا
پیچھے چپ کا گہرا ، آگے سناٹا — گھومتا سایہ اندر باہر پھیل گیا

مندرجہ بالا اشعار کیفیات ، پس منظر اور احساس کی سطح پر ایک دوسرے سے کتنے مختلف ہیں ۔ لیکن ان میں اندر مشترک معنی کی وہ تہہ داری ہے جو سمعی ، بصری اور حسی پیکروں کی ندرت نے کچھ اس انداز سے پیدا کی ہے کہ وہ منصور سے مخصوص ہو کر ان کی غزل کی پہچان بن گئی ہے ۔

اس تمہید کے بعد میں یہ کہنا چاہوں گی کہ منصور کی شاعری کا بحیثیت مجموعی ادراک کرنے کے لئے ان محرکات کی طرف متوجہ ہونا اگزیر معلوم ہوتا ہے جو اپنی موجودگی پر مصر ہیں اور جن کی بازگشت ہمیں اس شاعری کے بڑے حصے میں سنائی دیتی ہے ۔ منصور کی شاعری کے ضمن میں عموماً خوف ، تحیر ، آسیبی اور طلسمی فضائیں ، دیہاتی زندگی سے ان کی وابستگی اور دیہاتی مناظر کا مخصوص اظہار وغیرہ خصوصیات کی نشاندہی کی گئی ۔ اور کسی حد تک یہ نشاندہی صحیح بھی ہے لیکن ان متفرقات میں ربط و آہنگ پیدا کرنے کی کوئی کوشش میری نظر سے نہیں گذری ۔

میرے خیال میں منصور کی شاعری بنیادی داخلی محرکات کے زاویۂ نظر سے (۱) SURRIALISTIR FORRE سرریئلسٹک قوت) (۲) انسانی رشتوں کی نارسائی کا کرب (۳) اور اپنی جڑوں کی تلاش کے نکون سے عبارت ہے ۔ جن میں ربط و آہنگ منصور کی مخصوص لفظیات اور منفرد پیکروں کے وسیلے سے پیدا ہوتا ہے جو اس شاعری میں ایک جاری و ساری کیفیت کی حیثیت رکھتے ہیں ۔

SURRIALISM بنیادی طور پر لاشعور کے پیکروں ، امیجز بالکل CONCRETE مواد ، محیر العقول نظارے اور حیرت ناک کیفیات تک ایک تخلیقی کیفیت کے زیر اثر رسائی حاصل کرکے انہیں اپنی گرفت میں لے کر بیان کا وسیلہ بنانے سے عبارت ہے ۔ اس لاشعوری مواد کا سب سے زیادہ بے ساختہ اور بھرپور اظہار انسانی خواب بنتے ہیں ۔ خوابوں سے مراد یہاں خیالوں کا رومانی تصور نہیں ۔ نہ خواب فردا ۔ نہ نرم آہنگ آرزومندیوں کے خواب ۔ خوابوں کا وہ ٹھوس و حقیقی روپ ہے جو ہمارے لاشعور کے نہاں خانوں میں اصلیت کے چہرے سے نقاب ہٹاتا ایک طلسمی فضا تخلیق کرتا ہے ۔ ایسے ایسے مناظر تخلیق کرتا ہے جو اگرچہ محیر العقول معلوم ہوتے ہیں لیکن اپنے بطون میں بے حد معنی خیز ہوتے ہیں ۔ فرائڈ نے خوابوں کو دو حصوں میں تقسیم کرکے علامات خواب اور " مواد خواب " کا نام دیا ہے ۔ ینگ نے تخلیق فن کا عمیق ترین محرک قرار دیا ہے ۔ اور آرکی ٹائپ (ARCHITY PAL) علامت سازی کا عمل جانا ہے ۔ لاشعور کے محرکات تک رسائی تو ہر تخلیقی فن کار کی ہوتی ہے خواہ وہ شاعر ہو یا آرٹسٹ ۔ لیکن لاشعور

پیکروں پر گرفت کی وجہ سے انہیں تخلیقِ فن کا فنکارانہ بنانا ان سے معنی آفرینی اور نقش کشائی حقیقت کی پردہ کشائی کا کام لینا ایک ایسا عمل ہے جو تخلیق کے ضمن میں آتا ہے۔

مصور کی شاعری میں بے شمار ایسے امیجز، پیکر، علامات، مناظر، آوازیں اور طلسمی فضائیں ملتی ہیں۔ بعض اوقات ایسے دہشت انگیز منظر نامے تخلیق ہوتے ہیں اور اشیا اور مظاہر اپنے ایسے معنوی امکانات کے حامل نظر آتے ہیں جو مناظرِ بیداری سے کہیں زیادہ مناظرِ خواب کی دین معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن اس سرّیتی قوت کے اظہار میں مجھے مسرت بخش نے متاثر کیا وہ لاشعور کے خلاؤں کو کھنگالنے سے کہیں زیادہ ان کو ترتیب و تہذیب، حسن و معنی عطا کرنے اور ان کو معنویت کو شاعرانہ تشکیل کرنے کا انداز ہے۔ جو مصور کا مخصوص انداز ہے۔ اور جو اس طور پر بہت کم شعرا کے حصے میں آسکتا ہے۔ اس لحاظ سے مصور شاگل (CHAGAL) اور سلیوڈو ڈالی (SALVIDO DALI) سے زیادہ پال کلیا (PAUL KLEA) کے قریب نظر آتے ہیں۔ اول الذکر دونوں مصوروں کے یہاں لاشعور سے حاصل انتشار، بے ترتیبی اور امیجز کی بے تحاشا فراوانی ہے۔ جنہیں ایک دوسرے سے ممیز کرنے کے لئے ان کے نقادوں اور ناظرین کو اپنی ذہنی کاوشوں پر تکیہ کرنا پڑتا ہے۔ جبکہ پال کلی ایسا مصور ہے جس کا سرّیتی تخلیقی مواد، ترتیب و تہذیب رد و قبول اور تخلیقی جمالیات سے مالا مال ہے۔ اور صرف ایک حد تک سرّیتی تحریک مصوری کے ذیل میں آتا ہے۔

مصور سبزواری کی لاشعور تک رسائی، لاشعوری پیکروں سے تخلیقی پیکر تراشی حیرت انگیز ہے۔ اس لئے اور زیادہ کہ اکثر اس نوع کے اشعار میں جمالیاتی حظ کا سر و سامان بھی موجود ہوتا ہے۔ لیکن کبھی کبھی بھدے اور غیر شاعرانہ پیکر شعروں کے حسن کو مجروح اور ان کی معنویت کو بے لوچ بھی کر دیتے ہیں۔ مصور کے دوسرے مجموعے "برگِ آتش سوار" میں ایسے پیکر آخری مجموعے "رشتے ٹوٹنے کا موسم" سے زیادہ ہیں۔ آخری مجموعے میں مصور کے لہجے میں توازن کی جھلک زیادہ نمایاں ہے۔

مصور سبزواری کے چند اشعار میں لمسی، سمعی، بصری اور حسّی امیجز کی نشاندہی کرنے سے غالباً میرا موقف زیادہ واضح ہو سکتا ہے جن میں انھوں نے پراسرار لاشعوری پیکروں اور مناظر سے تخلیقِ شعر کا کام لیا ہے۔

بہ وہ سرِ سطحِ آب پہ وہ تو میرے محبوب ہی کا نکلا — ندی کے اس پار میں نے سمجھا کنول چراغوں کے کھل گئے ہیں

لے تو ترن ہوئے سجھ دل میں قتل ہوئے — نہ جانے کون یہاں چھپتے مکان میں تھا

نہ جانے کیا کیا اس نے جدائی کی رت میں — کہ گھاؤ دور تلک گہرے آسمان میں تھا

اتر گیا تھا کسی شب میں کس کے قالب میں — کہ میرا جسم میری راہ دیکھتا تھا بہت

نہ کھینچی تھی تہیں سطحِ آب کی چادر — کبھی کا کمات میں بیٹھا بھنور نکل آیا

---

۳ ۔ پال کلی پال کلی ایک آرٹسٹ ۔ جن کی مصوری شہرہ آفاق ہے۔

الاؤ اپنی صدا کے سلگ کے ساحلوں پہ — نکل کے آؤں میں نیلے پانی کے مقبروں سے
تمام عمر میں جیسے لہو لہان رہا! — کسی نے خواب میں اک تیر مجھ کو مارا تھا
چلو یہاں سے کہ آسیب شام اتر آیا — ہے وقت قبروں سے لاشوں کے نکلنے کا
نتیجہ ورزن جیسی تھا کس قدر بے کیف — کنوؤں میں دور تک ریت ہی دکھائی دے

قلبی نظران سے تریق علامتوں اور پیکروں کے جولا شعور کے نہاں خانے کھنگالنے ہی سے ہاتھ لگتے ہیں مثلاً محبوب کا بریدہ سر سطح آب پر، صدا کے الاؤ، چیختے مکان، گہرے آسمان میں گھاؤ ہونا، کسی کے قالب میں اتر جانا، گھات میں بیٹھا بھنور، قبروں سے لاشوں کا نکلنا، کنوؤں میں ریت وغیرہ وغیرہ۔ اور اس نوع کے بے شمار پیکر جو مصوری کی شاعری میں ہر طرف پھیلے ہوتے ہیں۔ درج بالا اشعار پر غور کریں تو ان کا پورا منظر نامہ ہی خوابوں کا منظر نامہ ہے یعنی مظاہر کی ہیبت تجربے کی دہشت اور کیفیات کے خوف و تحیر کی بنا پر لاشعوری تحریک سے عبارت ہے اور تخلیق شعر کی طرف SURRIALISTIE APPROAC کے ضمن میں آتا ہے۔ اوپر جو اشعار دیئے گئے اور اس طرح کے اور بہت سے اشعار معنویت اور جمالیات دونوں کے تقاضوں پر پورے اترتے ہیں اور انسانی زندگی کی گوناگوں تجربات کی تہیں کھولتے دیتے ہیں۔ ذات کے نہاں خانوں میں غواصی کی اس قوت ہی نے مصور کو انسانی فطرت اور انسان کی لاشعور و شعور کی کشمکش کے کئی گوشوں کا شناسا بنا دیا ہے۔ اور ان کے اظہار کی جرأت عطا کی ہے جو یا تو عام انسان کے ادراک کا حصہ نہیں بن پاتے وہ ان سے چشم پوشی کرتا ہے کہ ان کے بے باک اظہار کی جرأت اپنے اندر نہیں پاتا ہے مثلاً پیمان وفا جس کی شعرا قسمیں کھاتے ہیں وہ اس کی سطحیت سے آنکھیں چار کر سکتے ہیں اور اقرار کرتے ہیں کہ وفا کا ہفت خواں طے کرنا محض لفاظی ہے۔

گلاب لمحات ہی نے اس کی تو جان لے لی — یہ ہفت خوانِ وفا تو جلتے کڑھاؤ تک تھا

انسان کی داخلی اور خارجی زندگی کے تضاد کو پہچانتے ہیں کہ اگر خارجی سطح سے "سطح آب کی چادر" کھینچ لی جائے تو نیچے سے "گھات میں بیٹھا بھنور" یا تخریبی قوتیں نکل کر شخصیت کا مسخ شدہ چہرہ بے نقاب کر سکتی ہیں۔

نہ کھینچتی تھی تمہیں سطح آب سے چادر — کبھی کا گھات میں بیٹھا بھنور نکل آیا

حرف و معنی میں تفاوت، اور تخلیقی افقوں سے غروب ہوتے ہوئے تخلیقی خلوص و جاں سوزی کی شناسائی بھی مصور کے ادراک کا حصہ ہے شاید انہیں احساس ہے کہ اہل نظر بھی دکان سجا سکتے ہیں۔

ہر لفظ غروب ہو رہا ہے — معنی کے شہاب بجھ رہے ہیں
پہلے تو حروف گل ہوئے تھے — اب اہل کتاب بجھ رہے ہیں
یہ بھی صلائے زرد کا افسوں نہ ہو کوئی — ہونے لگا ہے شاخوں سے پتوں کا پیار کم

ان کے شعروں میں یہ احساس بھی شدید ہے کہ جنسی تلذذ یا لذت پرستی کا انجام ایک بھیانک خالی پن کا احساس ہوتا ہے [illegible] آسودگی محض [illegible] کی تشنگی کا مداوا نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا مرد وزن کے اکثر جنسی رشتے جو مضامین کی تلاش میں

مردسرگرداں رہتے ہیں۔ کھوکھلے ہوتے ہیں۔ آسودگی جاں کی منزل سے بہت دور، بے جان، سپاٹ اور کبھی کبھی کریہہ اس ادراک کی چند مثالیں دیکھئے:

کیا زہر سا تھا قریۂ جاں میں، بجھا ہوا
تیزاب سب طلسم ہوا لمس لب کے بعد

(دیا قرار بہت جرات کا متقاضی ہے)

جس کو مہندی لگا ہاتھ سمجھا تھا میں وہ تو شب خون کی ساعت سرخ تھی
زلف سے خار تک کھینچ کر لے گئے ٹکڑیوں کے وہ رنگین جالے مجھے

شاید بدن ہی منکر لذت ہوا نہ تھا
در آیا خول توڑ کے شیطان سا کوئی

گھر سے وہ خواہشوں کے بھنور کا تماشا چلا
لوٹا تو ایک لاش کا قاتل خود آپ تھا

اسے جو چوما مصور تو لہو بھی بپھرا یا
موت کا ذائقہ مری زباں میں تھا

سرتی تحریت کی اس رو میں بعض اوقات مصور نے ایسے اشعار بھی کہے ہیں جن کی علامت و تشبیہات حد سے زیادہ خود بھدی، یا BIZARRE ہو گئی ہیں۔ اور مصور کے ہاتھ سے جمالیات کا دامن چھوٹ گیا ہے۔ میرے خیال میں مصور کی شاعری کے حق میں یہ بہتر ہو گا کہ وہ چونکانے کی ترغیب سے دامن بچا کر :

سکوت آب سے ڈر کر جو ماری چیخ اس نے
تو اک کٹا ہوا دریا سے سر نکل آیا

(بھدی تشبیہہ، منتشر تخیل)

تیرے ہی جسم کا ہوں اثاثہ میں بعد مرگ
تو سانپ بن کے مجھکو خزانوں میں ڈھونڈتا

(کوئی بات ہی نہ بن سکی)

میں خوشبوؤں کی لاش جیسے پی گئی ہوا
تو میری پور پور جکڑنے کو رہ گیا

(بے معنی و بے تکا شعر ہے)

گنبد بے در سا وہ دیتا ہے تعزیر سراب
دفن اس میں ہو گئیں یہ چھائیاں پاگل کئی

(بے معنی شعر ہے)

قسم کے اشعار نہ کہیں کہ ان میں معنویت محدود اور حسن کاری مفقود ہے اور امیجز بھدی اور غیر شاعرانہ ہیں۔ میں شاعر شعریت کی قائل ہوں کہ فن کار رشتہ کسی بھی تحریک سے کسی بھی صنف سے ہو، جمالیاتی حظ فن کی اولین اور بنیادی میں سے ایک ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ مصور اس کے اہل ہیں کہ برق کے چونکا دینے والے شعروں کو قلم زد کر دیں۔

مصور کی شاعری کا دوسرا اہم شعری محرک انسانی رشتوں کی نارسائی کا کرب ہے۔ مصور نے کرب پل جھیلا ہے۔ انگیز کیا ہے۔ رشتوں کی معنویت کی تلاش کی ہے۔ اور رشتوں کے کھوکھلے پن کا دکھ اپنے رگ میں محسوس کیا ہے۔ اس ضمن میں اگر ایک طرف محبت کے تعلق سے تشنگی و نا آسودگی کا کرب شامل ہے، تو دو

طرف کسی ایسے رشتے کی آرزومندی کی جھلک بھی دکھائی دیتی ہے جو قریۂ جاں میں زندگی کی لہر پھونک دے۔ اس ضمن میں مصور کے تجربات کا دامن خاصا وسیع ہے اور ان سائیوں کی حدود بڑی دور دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔

کب نرم روشنی کے جزیرے سمٹ گئے　　　کس سانحے سے آنکھ میں پتھر ہوا طلوع

نرم روشنی کے جزیروں، یا بے ساختہ جذبات کے سیل رواں کو سمٹتے دیکھنا، آنکھ میں پتھر طلوع ہوتے یا بے حسی کو جزو جاں بنتے دیکھنے کا کرب مصور کی تقدیر ہے۔

وہ محو التفات تھا کچھ دیر کے لئے　　　گرد اور ہوا کا ساتھ کچھ دیر کے لئے

وہ عشق نہیں جس کی شمع بجھا دے اجل کی پھونک تک۔ یہ تو ایک عارضی التفات ہے اور بس۔ جو ربط روح و دل کا رابطہ نہ ہو اس کا انجام ایک گرد اور ہوا کے ساتھ کے سوا کیا ہو سکتا ہے۔ یا پھر روتے ہوئے لہو کے کھنڈرات:

گزشتہ شب کے طویل بوسے مزور تھے سب بہلاوے نکلے　　　لہو کے کھنڈرات رو رہے ہیں طلب کا موسم چلا گیا ہے

بس ایک بار بھڑکتی ہے آگ تو بوسوں کی　　　دھواں لبوں سے مگر عمر بھر نکلتا ہے

(مح)بت کے رشتے کی نارسائی یا عارضی آسودگی عمر بھر کا کرب بن جاتی ہے۔ لبوں سے دھواں نکلنے کی امیج معنی خیز اور شدید ہے اور شاعرانہ بھی۔

جدت طرازی مصور کا خاصہ ہے، دو وابستہ افراد کی اجنبیت دیکھئے جس میں دبی دبی آرزو پنہاں ہے۔

مجھے یہ وہم نہ ہو لوں شکار بے خبری　　　اسے یہ خوف کہ واپس نہ خواب سا آؤں

(دو)سری طرف یہی محبت کا تجربہ یہ کیفیت بھی پیدا کرتا ہے کہ انسانی آرزومندی بے سود و لاحاصل ہے۔

ایک بحر بیکراں تک کالی شب کا سامنا تھا　　　چڑھتے پانی کے شناور صرف دو کچے گھڑے تھے

(ایک س)مت ایک بحر بیکراں کے آخری کنارے تک سیاہ شب کا سامنا ہے تو دوسری سمت عاشق و معشوق کا سرمایہ صرف (دو کچے) گھڑے ہیں، ایک ایسی استطاعت جو بحر بیکراں کے تھپیڑوں میں پل بھر بھی نہیں ٹھہر سکتی۔

مصور کا کرب یہ بھی ہے کہ شہر میں اب ہوس ہے جو پذیرائی کرنے کی آرزو رکھتے ہیں اور جن سے یہ توقع کی جا سکتی ہے (ان کے) خیمے بھی اکھڑ چکے ہیں یا وہ صرف گذرے زمانوں کا کفن ہی سی سکتے ہیں۔ محبوب ہستیوں کو پناہ نہیں دے سکتے (ان کے) لئے دل کے دروازے وا نہیں کر سکتے۔

تم آئے ہو سر چھپانے، لیکن یہ رسم شہر ہوا نہیں ہے
میں اکھڑے خیموں کا غم بچھائے، کفن گئے دنوں کا سی رہا ہوں

(تع)لق کی عارضیت و کھوکھلا پن، محبت کی نارسائی اور آرزومندی کے نقصان کا دکھ جھیلنے کے ساتھ ساتھ انسانی (ب)اہمی مصور نے منافقت، ریاکاری اور خلوص کی کمی کا درد بھی سہا ہے۔ انہیں احساس ہے کہ فی زمانہ پرخلوص رشتوں (کی) [illegible] اور تجارتی سماج میں اگر جگہ ہے تو صرف سود و زیاں کے رشتوں کی۔

ے یہاں لفظوں کے بازی گر مجھ کو — ہے خلوص کی کم کم ستائشیں کرنا
قبا طراز کیے یہ خوشبو کی بارشیں کرنا — سب کو آتی ہیں رنگوں کی نوازشیں کرنا
گھر جلا تھا دوستوں کی منافق شام میں — جب اندھیرا بڑھ چلا تو پہلا وار اس نے کیا
کہاں پہ یاران سبھی ہو گئے قدآور لوگ — ہم اپنے قامتوں میں روز گھٹتے جاتے ہیں

جب احباب و ہم نوا و ہم عصر ہی منافق رشتوں کے قیدی بن جائیں۔ معاشرہ کی تجارتی اقدار کے زیر اثر خلوص، دوست داری کے بوجھ کو سر سے جھٹک دیں، پہلا وار کرنے کے لئے اندھیرے کے منتظر رہیں، معاشرہ کی تہذیب و شائستگی اس حد تک مجروح ہو جائے کہ تخلیق فن کی صورت میں اپنے ہم عصر شمعیں بھی جلائیں تو رقیب شمعیں:

جلاکے ہم تو رقیب شمعیں نہ جانے کب سے کھڑے ہوئے ہیں
یہی ہے دونوں کو انتظار اب کہ پہلے کس کا دیا بجھے گا

تو پھر انسان کی تقدیر ایک ہیبت ناک تنہائی کا احساس، ایک ہو کا مقام ہی ہو سکتا ہے۔ جہاں وہ تشنگی اور سرابوں کے مقابلے پر، ایک فیصلہ کن محاذ پر، دن ڈھلتے تک شام کا منتظر ہے کہ

تشنگی اور سرابوں کا ایک فیصلہ کن محاذ اور ہے
آج بازو نہیں، آج کٹ جائیں گے سارے سر دن ڈھلے

یہ وہ ہو کا مقام ہے جو کسی وقتی، لمحاتی ساعت آسودگی سے ختم نہیں ہوتا۔

ذرا سی دیر جو خوف دوام ختم ہوا — یہ مت سمجھ کہ یہ ہو کا مقام ختم ہوا

اسی کے ہمراہ یہ احساس بھی معصد کی طرزوں میں جاری و ساری ہے کہ زندگی کے سب ہنگامے، یہ شور و غوغا بے ما، اعتماد و زمانہ کی بدولت انسان کی کاوشوں کا حاصل ہیں اور اسی کے سبب سے بیابانِ تنہائی و نارسائی کا وہ درد ہے جو انسان کے رگ و پے میں سما جاتا ہے:

میں بکھرے حرفوں کے آئینے میں صداؤں کے چہرے ڈھونڈتا ہوں
شکستہ سمتوں کا قافلہ ہوں، اداس نسلوں کا مرثیہ ہوں

ہمارے باطن کے روز و شب میں پڑے ہیں بے حرف و صوت رنگوں
درون دیوار بھی نہیں کوئی، خالی دیوار گونجتی ہے

دیکھا تو تھا زندگی کا دریا — سوچا تو طلسم رہ گزر تھا
جز شوق کوئی گھاٹ نہ بنے لوا کوئی چیخ — یہ کن ستاروں کے رنج شام ختم ہوا
میں سمندر کی گھٹا کی طرح برسا بے فیض — خشک ہوتے ہوئے دریا [illegible]

سینۂ شب میں یہ خنجر بھی اُتر جائے گا
صبح کے ساتھ مرا سر بھی اُتر جائے گا

جب انسان کی کاوشیں اتنی بے سود، تخلیق فن اتنی لا حاصل ہو جاتا ہے تو سنگ کی طرح بے فیض برسنے کے امکان کے باوجود وہ لوٹ کے وہاں نہیں جا سکتا جہاں سے اس نے یہ (تخلیقی) سفر شروع کیا تھا اس کی تقدیر تو بس دائرے کا سفر ہے ختم ہو جاتا ہے اور وہ اسی بھیڑ اسی میں گم ہو جاتا ہے جس کا خالق بھی وہ خود ہے۔

دور آوارہ کا گمنام سفر تھا وہ تو
اذن ملتا اسے کیا لوٹ کے گھر جانے کا
کیوں مشاکی ہو کبھیر اداسی کے مصور
اپنی ہی اکائی ہوئی منظر میں کھڑے ہو

اس بے محل سناٹے کے احساس کے باوجود، مصور نے رشتوں کے جس جذبے کی اشاعت میں صداقت نہیں کی، یا خالی ہی کی ہے وہ روح و دل و جاں کا۔ لذت روح و دل و جاں سے وصل ہے۔ جو جنسی تلذذ کی تلاش سے بہت آگے کی چیز ہے ایک دردمندی کا احساس یا ایک ماورائی سا تعلق جس کا انجام اس تعلق کی شکستگی ہی ہو تو وہ جذباتی خلا انسان کو تنہا نہیں دیتا بلکہ زندگی کا ایک المیہ احساس عطا کرتا ہے جو تخلیق فن کی ضمانت بھی بن سکتا ہے یا اسے اس کے خالق پر وار بھی کر سکتا ہے میرا خیال ہے یہ مصور کا ایسا CYNICISM نہیں ہے جو روحانی رشتوں کی تلاش عبث جانے بلکہ زمینی رشتوں سے ان کا تعلق گہرا ہے۔

اس کمی کو مصور نے دو طرح سے پورا کیا ہے۔ ایک تو یہ کہ خلوص و باضمیر رشتوں کے اس بیابان میں مصور نے اپنے تہذیبی اور عصری ماحول سے جڑے رہنے کی تمنا میں باہمی رشتوں کی دریافت کی کوشش کی ہے۔ مصور کے اپنی کسی بہن کے لئے لکھے گئے مرثیے، ہم عصروں کے نام غزلیں، ہم عصروں کی رحلت پر لکھے گئے اشعار اس کی مثالیں ہیں۔ ان مراثی اور غزلیات سے احساس ہوتا ہے کہ شاعر کہیں معصوم بے فکر بچپن کی یاد، سچے رشتوں کی بازیافت اور اپنے ہم عصروں سے قرب محسوس کرنے کے ذریعے انسانی رشتوں کی مجاز تلاش کر رہا ہے۔ ان میں معنویت کی جستجو کر رہا ہے اور ماحول سے اپنی اجنبیت کے احساس کو کم کر رہا ہے۔

"رشتے ٹوٹنے کا موسم" ڈھلتی عمر میں زمانے کی بے اعتنائیوں کا امکان اور رشتوں کی نارسائیوں کا عنوان ناکرب انگیز ہو سکتا ہے اس کی جھلک شاعر کے تیسرے مجموعے کے اس عنوان میں بھی نظر آتی ہے۔

مصور کا تیسرا مجموعہ "رشتے ٹوٹنے کا موسم" جو ایک نئے رشتے کی تلاش سے شروع ہوتا ہے تو یہ کوئی اتفاق نہیں۔ بلکہ یہ رشتہ مصور کی شاعری کا ایک جذبہ بن کر ابھرا ہے۔ مولائے کائنات حضرت علیؑ کی شان میں یہ منقبت ملاحظہ ہو:

کعبۂ دل بنانے چلو تم عرب کے اس نام کو چوم لو
تم حرم کا اک معجزہ سب سے صحیفوں کی لذت علیؑ
بخشش وہ کرتے ہاتھوں کو غیر کشائی کی ہمت علیؑ

سیدالشہداء حضرت امام حسینؑ کی بارگاہ میں یہ سلام کہنا کہ:

وہ حکمراں پانیوں کا تھا، پر سوال تطہیرِ آب کا تھا
بنا کے ہر تشنگی کو پیوندِ حلق، پیاسا ہی مر گیا وہ

منصور کی شاعری کے تیسرے بنیادی محرک، اپنی جڑوں کی تلاش کی علامت ہے۔ یوں تو منصور شروع ہی سے اپنی جڑوں کی تلاش میں سرگرداں ہیں کسی ایسی وابستگی کے لئے پابہ جولاں ہیں جو ان کے تشخص کی ضمانت بن سکے۔ جس کے ذریعے وہ اس اجنبی دنیا کے شور و شر میں اپنی شناخت قائم کر سکیں۔ انہیں اپنے ہونے کا احساس ہو سکے۔ دیہات کی فضا سے دل بستگی، وہی مناظر کی بازیافت، چیتنار درخت، کراہتی ہوائیں، اداسی کی فصیلیں، گہری سانجھ کی بیلا، ماہیے کے گیت ہیریں، رانجھے، سوہنی، گبرو بنجارے، الھڑ مٹیاریں، بہت چرخے کے نغمے اور اس نوع کے متعدد پیکر منصور کی اس تلاش کی علامت ہیں جو وہ اپنے بچپن کے فضاؤں کی بازیافت اور اس سرزمین سے اپنے بنیادی تعلق کے ذریعے کر رہے ہیں یہ اپنی مٹی کا نوسٹیلجیا ہے اپنی جڑوں کا احساس ہے جو بالآخر اپنے ہونے کا احساس دلاتا ہے اس ڈگر پہ چل کر شاعر اپنے آپ کو اس سرزمین کی لافانی کتھاؤں کے ہیروز کی تقدیر کے ساتھ وابستہ محسوس کر سکتا ہے:

اسی ڈگر پہ کتنے منصور، رانجھے خاک ہوئے — اس سنسان ڈگر پہ نہ جا سانجھ سکارے بنجارے

یہی وہ کھیت کھلیان جنگلات ہیں جہاں کبھی نہ کبھی لوٹ جانے کی امید زندہ رہتی ہے ایسی وابستگی جو کسی گھر کا احساس جگاتی ہے

جس میں پھینک آئے تھے سانپوں کی پٹاری جا کر — آج ہم بھی اسی جنگل میں چلے جائیں گے

یہی وہ ماحول ہے جہاں مانجھیوں کے گیت گونجتے ہیں:

چھیڑے ایسے ہیں کوئی گیت ان دیکھے ساحل کا — دور ہے تٹ اور گہری سانجھ کی بیلا ہے رے مانجھی

الاؤ کے گرد گاؤں کے بوڑھوں کی خوشبودار کتھائیں لہکتی ہیں اور شاعر کی محبوباؤں کی شناخت بن جاتی ہیں:

تیری خوشبودار کتھائیں لہکیں الاؤ الاؤ — تو ہر رہٹ کی، پنگھٹ کی گھر کی چوپال کی ہیر

یہی وہ مناظر ہیں جن کی دبی دبی یاد، بجھتے الاؤ کی چنگاری کی مانند کبھی کبھی چمک اٹھتی ہے:

میں تیری یاد کے ساون کو کہاں برساؤں — اب کی رت میں کوئی بادل بھی گرجا مجھ میں
پروائی بن کے چھیڑ نہ یادوں کے زخم کو — آنے لگے گی بھیگے ہوئے موسموں کی بو
دفن اب ندی کنارے ہے وہ زندہ قہقہہ — جو رت جگوں کے گاؤں میں ڈھولک کی تھاپ تھا

مختصراً یہ کہ اپنی جڑوں کے تلاش کے اس عمل سے اپنی انفرادی شناخت کی آرزو شروع زمانے سے منصور کی شاعری کا محور رہا ہے اور انہوں نے دیہاتی ماحول سے اپنی وابستگی کو اپنے تشخص کی جستجو کا وسیلہ بنا دیا ہے۔

لیکن "رشتے ٹوٹنے کا موسم" میں یہ تلاش وسیع تر تہذیبی ورثہ کی تلاش بن گئی ہے۔ جس میں ماورائی، تاریخی اور مذہبی دھارے آن ملے ہیں۔ اپنی جڑوں کی یہ تلاش اب بچپن کی وابستگیوں اور مٹی کے نوسٹیلجیا کے ذریعے ذاتی شناخت تک محدود نہیں رہا ہے اب یہ پھیل کر وسیع تر اجتماعی تشخص کی تلاش بن گئی ہے۔ شہید کربلا، واقعات کربلا اور کر

سعیدانِ وفا کا قافلہ مصور کی شاعری میں محض شعری استعارے کے طور پر نہیں آئے۔ بلکہ حضرت علی کی ذات والا صفات اور شہیدانِ کربلا پر گذری ہوئی مظلومی، وفا، حق جوئی، قربانی و تشنگی کی واردات، پس ماندگانِ کربلا پر گذری ہوئی قید و بند کی صعوبتیں مصور کا تہذیبی و تاریخی ورثہ بن کر ان کی شاعری میں جگہ جگہ نظر آتی ہیں۔ شہیدِ کربلا کی عظیم قربانی کے حوالے جہاں جہاں بھی آئے ہیں وہاں شاعر کے اپنے احساسات و واردات کو ان سے علاحدہ کرنا مشکل ہے۔ کہیں وہ اس کی ذات کا حوالہ بن گئے ہیں اور کہیں اس کے ماحول کا۔ حضرت مسلم کے بچوں کا حوالہ دیکھئے۔

ہر آنکھ سر بریدہ، یتیموں کی نہر ہے — یہ شہر بے وفا وہی کوفے کا شہر ہے

اپنی تشنگی کا احساس کربلا کے حوالے سے دیکھئے:

فرات ہار کے ہم نے تو تشنگی جیتی — یہ سلسبیل یہ زمزم اٹھالئے جائیں

یا انفرادی خودی کے تحفظ میں واقعہ کربلا سے مماثلت کی علامت دیکھئے:

مفاہمت کا کوئی راستہ نکلتا کیا — عدو کی ہم سے طلب کردہ بیعتیں ہیں بہت

امام حسین سے IDENTIFY کرنے کی آرزو دیکھئے:

میں بیٹھ موڑ لوں یہ فطرتِ حسین نہیں، — کھڑی ہیں میرے مقابل یہ کربلائیں مری

تشنگی کی شدت میں حضرت عباس کے کٹے ہاتھ اور چھلنی مشکیزہ آنا بھی اسی روایت کا حصہ ہے جس کا شاعر علم بردار بننے کی آرزو رکھتا ہے اور جس کی اپنے تجربات سے مماثلت ڈھونڈ رہا ہے۔

خیمہ ہائے تشنگی تک یہ پہنچیں گے جب لفظ ہاتھ — چھلنی مشکیزے کو پانی دیر تک یاد آئیگا
نہ بھیگے ہونٹ بھی کم ظرف دشت و دریا کے — کوئی حسین لہو کی سبیل چھوڑ گیا

اس روایت سے مصور نے یوں بھی استفادہ کیا ہے۔ واردات کربلا کو اپنی محرومیوں، وفا شعاریوں، حق جوئیوں اور خودی و عزتِ نفس کا استعارہ بنایا ہے۔ اور اس طور پر بنایا ہے کہ وہ خود اپنے آپ کو اس روایت کا حصہ محسوس کر سکیں اور اس سے اپنا بنیادی رشتہ جوڑ سکیں۔ اس ضمن میں کہے گئے اشعار زیادہ تر بالواسطہ ہیں اور اکثر یہ حوالے مبہم اشاروں ہی پر مبنی ہیں۔ کچھ مثالیں دیکھئے:

ریگِ رواں نہر سے منہ پھیر کر گذر — مشکیزہ ہے امام کا تیروں سے چھن کے چھل
نہ تیری پیاس نے دریاؤں ہی سے بیعت کی — نہ پانیوں پہ لکھا تیرا نام ختم ہوا
بزدل تھے دست و بازوئے اعدا یہ غم رہا — خود اپنی تیغ چوم کے مرنا پڑا مجھے
بلند خود کو جھکے سروں سے پہچانو — نسب ہمارے بچھی چادروں سے پہچانو
عظیم تر ہے جماعت سے انفرادیت — حسین کو دھرے لشکروں سے پہچانو

کربلا کی عظیم روایت سے وابستگی کے احساس کو خو... [illegible]

مصور کی شاعری میں جو چند مجموعے ہوئے اشعار پر مشتمل ہے لیکن ہم امید کر سکتے ہیں کہ اس تناظر میں مصور کی شاعری کے پہلے زیادہ وقیع اور گہرے ہوں گے۔

مصور کی شاعری کی جن تین محرکات کی پیچھے صفات ہیئت اندہی کی گئی ہے وہ بظاہر ایک دوسرے سے جدا حیثیت رکھتے ہیں لیکن ان میں کئی روابط باہمی بھی ہیں مثلاً مصور کا مخصوص ڈکشن اور علامت سازی کا انداز، ان کی شاعری میں کرب، دہشت، نارسائی، اور لاحاصلی کا جاری و ساری احساس، ناقدری کہ زمانہ کا تجربہ۔ پر پہل سناٹوں میں کے بکھر جانے کا احساس اور اس کو سمیٹنے کی بے تابانہ کاوشیں (جن کا وسیلہ ان کی شعری کاوشیں ہی ہیں) وغیرہ۔

مصور بنیادی طور پر حال اور ماضی کے شاعر ہیں، حال میں ان کے تجربے پیوست ہیں اور ماضی کا ناسٹیلجیا کی فضاؤں میں شخصی، ماضی اور اہل بیت سے وابستگی کی صورت میں تہذیبی ماضی) ان کے شعروں میں اکثر واقعات لہو کی گردش کی مانند رواں ہے۔ مستقبل سے شاعر کے کسی قسم کے رشتے کے نشانات اس شاعری میں کہیں نظر نہیں آتے۔ مستقبل خواہ وہ ذاتی ہو، اجتماعی ہو یا کائناتی عوامل کے تناظر میں ہو اس شاعری کا جز بلکہ سرسری حوالہ بھی نہ بن سکا۔

• مصور کی نظموں کا میں نے کہیں ذکر نہیں کیا۔ مجھے آج تک ان کی کسی نظم نے متاثر نہیں کیا۔ خصوصاً فارم کے اعتبار سے۔ آزاد نظم تجربا یا من چاہتی ہے۔ اور بحور و اوزان سے غیر رسمی شناسائی کی متقاضی ہے کہ اس میں قافیہ اور ردیف کے لیے سہارے نہیں ہوتے جو وزن کو کسی حد تک خود سنبھال لیں۔ آزاد نظم کسی تجربے کو پھیلا کر چھوٹے بڑے مصرعوں میں لکھ دینے کا نام نہیں بلکہ ایک وسیع و عمیق تجربے کو فارم کو نظم و ضبط کے ذریعے ایک مربوط اکائی میں حشو و زوائد ڈھل لینے سے عبارت ہے۔ مصور ابھی نظم کے اس معیار سے بہت دور ہیں۔ غزل ان کا خاص میدان ہے اور وہ جولانیِ طبع دکھانے کے اہل ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ مصور کی غزلوں میں اکثر اشعار یا تو معنویت کے اعتبار سے یا سلیقۂ زبان و بیان کے اعتبار سے غیر معیاری ہو جاتے ہیں مثلاً ایک دو مثالیں لیجئے ۔۔۔۔ "حباب در خیمہ سو رہا ہوں" در خیمہ حباب" معانی اخذ کئے جا سکتے ہیں لیکن حباب در خیمہ، کسی کا سونا، کیا معنی رکھتا ہے۔ قبیح معنی ہے: "ہم کیا چپ سے بیٹھا بیٹھے تھے،، ذہین جیسے چہ معنی دارد۔؟ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ذہین کسی کا نام ہے۔ اظہار کی خامی ہے۔

علاوہ بریں جدت وندرت اور انفرادیت کے جوش میں یا پھر سرعتِ اظہار کے بے قابو ہو جانے کی صورت میں اشعار دور از کار علامتوں اور ایک آسیبی قسم کی ماحول کی بنا پر بے تاثیر اور بے کیف ہو جاتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ مصور اگر تھوڑی سی توجہ اور دیں تو ایسے اشعار کو بھی CHUSLE بنا سکتے ہیں کہ وہ اس کے اہل ہیں۔

مجھے اس کا احساس ہے کسی بھی شاعر کی ہر تخلیق ایک معیار کی نہیں ہو سکتی۔ اس کی کلاسیکی مثال میر تقی میر ہیں شاعر ہے لیکن اس کے باوجود ہر اچھا شاعر اپنی شاعری کے کمزور پہلوؤں پر مزید توجہ دینے کی قدرت رکھتا ہے۔ اس میں ایک خوش آئند بات یہ ہے کہ مصور کے تیسرے مجموعے میں افراط و تفریط دوسرے مجموعے کے مقابلے میں بہت

بانی :- حافظ محمد عبد الرحمٰن بسمل سنہاروی

بیادگار :- زین العابدین احمر و ادریس سنہا

ماہنامہ سُہیل گیا

فہرست

نمود : ۵
غالبیات اور ڈاکٹر خلیق انجم ... ڈاکٹر تارا چرن رستوگی ۷
ہم مسافر جہاں جہاں گزرے ۔ ڈاکٹر علیم اللہ حالی ۲۹
کچھ نظمیں ۔ ڈاکٹر سعیدہ اریبی ۳۳
غزلیں ۔ دیپک قمر ۳۵
تنہائی ۔ شوکت صدیقی ۳۷
غزلیں ۔ ڈاکٹر حسن نظمی، خورشید سحر، رؤف محمد جاوید ۳۸
مسلمان ۔ منشور عالم ذوقی
(ترجمہ ۔ جاوید اقبال چرو آنوی) ۳۹
اُجلی مسکراہٹ ۔ حلیمہ جاوید ۴۲
نئی کتابوں کا تعارف ۔ یوسف ناظم و ...گیاوی ۴۴
شہرِ خیال ۔ ۴۸

★

چیف ایڈیٹر :- مسعود منظر
ایڈیٹر :- جمیل منظر
معاونین :- شکیل احمد جمالی، عبد القیوم ابدالی
کتابت :- سید عبد الاحد گیاوی

شمارہ نمبر ۵ — جلد نمبر ۱۵

بدلِ اشتراک

فی شمارہ	۴/= روپے
زرِ سالانہ	۴۰/= روپے
لائف ممبری	۵۵۱/= روپے

خط و کتابت و ترسیلِ زر کا پتہ

ماہنامہ سُہیل
ڈلہ ساؤتھ سائیڈ روڈ، گیا - ۸۲۳۰۰۱
فون نمبر ۲۱۵۷۳

نمود

۱۵ اگست ۱۹۹۱ء کو ہم اپنی آزادی کی ۴۵ ویں سالگرہ منا رہے ہیں۔
آج سے ۴۴ سال پہلے ۱۵ اگست ۴۷ء کو
کوئی دو سو برسوں کی غلامی سے آزاد ہوئے تھے ہم
آزادی کا احساس ہوتے ہی ہمارے دلوں میں گدگدی پیدا ہونے لگتی تھی
کیا کیا خواب دیکھے تھے ہم نے
اپنی سرکار ہوگی۔ زمین اپنی ہوگی۔ اپنی محنت اور اپنی ہی کمائی ہوگی۔ سب کچھ اپنا ہوگا
پھر کیوں کوئی بھوکا ننگا اور بیروزگار ہوگا؟

ہم نے سوچا تھا
ان پڑھ کوئی نہیں رہے گا۔ بے گھر یا زمین کے بغیر کوئی نہیں رہے گا۔ ملک کی
دولت سب کے کام آئے گی۔ معاشی غلامی کا خاتمہ ہوگا۔ برابری کا سماج ہوگا۔ نیا ملک بنائیں گے
محبت بانٹ کر جھیلیں گے۔ خوشحالی سب کے لئے آئے گی
ترقی ہوگی تو سب کی۔
لیکن ہوا کچھ بھی نہیں
سارے خواب چور ہو گئے
مگر بعض ہم لوگ
جو انگریزی راج میں بھی عوام کی محنت کی کمائی کو لوٹتے تھے
وہی آج بھی جو لاکھ پتی تھے کروڑ پتی بن گئے جو کروڑ پتی تھے ارب پتی بن گئے۔
وہ جیسا چاہتے ہیں ویسا ہی ہوتا ہے۔ انہیں کی چلتی بنتی ہے۔

ہم نے سوچا
چلو شکم نہ ملا تو نہ سہی۔ آزاد تو ہیں۔ ملک غلام تو نہیں ہے۔
مگر یہ کیا ہوا ؟

مرکز کی نئی سرکار نے سینہ پیٹنا شروع کر دیا۔ ہمارا دیوالہ ہو گیا۔
قرض لینا ہوگا وہ بھی کس سے۔
آئی. ایم. ایف. سے
اور قرض بھی یونہی نہیں ملے گا۔ اپنی معاشی آزادی گروی رکھنی ہوگی۔ اور انہوں نے گروی رکھ بھی دیا
انگریز کہتے تھے۔
ہندوستانی غیر مہذب ہیں خود راج نہیں چلا سکتے۔ اسی لئے ہم آئے ہیں۔
ہماری نئی مرکزی سرکار بھی کچھ اسی لہجے میں بول رہی ہے۔ کہتے ہیں
ہم اپنی معیشت نہیں چلا سکتے۔ آئی. ایم. ایف. کے ذریعہ غیر ملکی سیٹھوں کو لائیں گے

انگریزوں کے لئے ہندوستان سونے کی چڑیا تھی۔ ہیں، لوٹ کر وہ مالا مال ہو گئے
ہمارے موجودہ حکمراں کہتے ہیں ہمارے پاس پونجی کہاں؟
قرض لائیں گے تبھی ترقی ہوگی
سب سیڈی کاٹ کر کھاد اور چینی کو مہنگا کر دیا گیا۔ روز مرّہ کے سامانوں کی قیمت بڑھ گئی
۔ بجلی ریٹ اور ڈاک خرچ بڑھنے والا ہے۔
اسپات اور کوئلہ کی قیمت بھی بڑھے گی۔
مہاجنوں کی بھوک بڑی خطرناک ہوتی ہے۔ وہ دولت کے لئے کچھ بھی کر سکتے ہیں
۔ یہاں تک کہ
ملک ن .. ۔ کو بھی خطرے میں ڈال سکتے ہیں۔
ایسے وقت میں ہم آزادی کی ۵۴ ویں ... ر سنہ میں
بڑی جواب دہی آگئی ہے ان سب پر
جو ملک کو آزاد دیکھتے رہنا چاہتے ہیں۔
بھاری قربانیاں دینی پڑی ہیں جس آزادی کے لئے
اس کی حفاظت کرنی ہوگی

(۱ ادا۳ا ۷)

ڈاکٹر تارا چرن رستوگی

غالبیات اور ڈاکٹر خلیق انجم

غالبیات میں تین نام کالی داس گپتا رضا، شکیل رحمٰن، ڈاکٹر خلیق انجم سر فہرست ہو گئے ہیں۔

خلیق انجم کو بطور دانشور جوئے غالبیات مطالعہ میں لانے کے لئے درج ذیل تصنیفات کو پیش نظر رکھا گیا ہے

(۱) غالب اور شاہان تیموریہ (مکتبہ جامعہ دسمبر ۱۹۷۴ء)

(۲) غالب کی نادر تحریریں (" " فروری ۱۹۶۱ء)

(۳) غالب کے خطوط جلد اول (غالب انسٹی ٹیوٹ ۱۹۸۴ء)

(۴) غالب کے خطوط جلد دوم (" " " ۱۹۸۵ء)

غالب اور شاہان تیموریہ :- غالب پر کام کرنے والوں کے لئے بغایت اہم نیز افادیت سے مملو کتاب ہے۔ ایسی کتاب کو SIGN POST TO GHALIB WORKS یعنی تصنیفات و تحقیقات غالب کے رموز و معانی، افہام و تفہیم کی جانب اقدام کے لئے ایک ستون پر نصب رہنما انگشت کے مانند ہے۔ شاعر خلا میں پرورش نہیں پاتا اس کی تخلیقات کے پس منظر میں سماجیاتی عوامل و محرکات کی کارکردگی [illegible] تفہیم مطالعہ پر ضرور اثر انداز ہوگی۔ اور مطالعہ بے سود محض ہو کر رہ جائے گا۔ ہر چند کہ اپنی زندگی میں ہی غالب کو خاصی شہرت و مقبولیت حاصل ہو گئی تھی۔ پھر بھی وہ اپنے آپ کو حالات گزیدہ ہی سمجھتے تھے۔ یوسف بہ قیمت اول خریدہ، عندلیب گلشن ناآفریدہ وغیرہ کے پیچھے جو زمینیہ (BACK-GROUND) ہے اس پر خلیق انجم نے روشنی ڈالی ہے۔ غالباً اس اہم ادبی کاوش کی تلخیص پیش کرنا برمحل و مناسب معلوم ہوتا ہے۔

پہلا باب ہے " غالب اور شاہان تیموریہ " جو صفحہ ۱۱ سے شروع ہوتا ہے۔ اس صفحے پر جو فٹ نوٹ ہے وہ دلچسپ مطالعے عبارت ہے۔ خلیق انجم رقمطراز ہیں کہ " غالب نے لکھا ہے کہ میرزا فوقان بیگ عہد شاہ عالم میں ہندوستان آئے تھے۔ اگر غالب کا یہ بیان درست ہے کہ " [illegible] ہندوستان میں نواب معین الملک کے ملازم " تھے تو یہ عہد محمد شاہ کا ہوگا، " عہد شاہ [illegible] کا فٹ نوٹ [illegible] [illegible] تاریخی کتاب سے نہیں [illegible] یہ نکتہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ فوقان بیگ فی الواقع ان کے دادا تھے یہ بات بھی تصریح طلب ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ نام کبھی عمداً ایسا نہ ہو۔ ہاں غالب کے دادا مرزا

عبداللہ بیگ جو الور میں ایک لڑائی میں مارے گئے۔ عبداللہ بیگ اس وقت راجہ بختاور سنگھ والی الور کی ملازمت میں تھے۔

نواب الٰہی بخش خاں معروف نے (جو والی لوہارو نواب احمد بخش خاں کے چھوٹے بھائی تھے) اپنی لڑکی امراؤ بیگم کی شادی غالب سے کر دی۔ شادی کے دو تین سال بعد دہلی سے آکر سکونت اختیار کر لی۔ دربار شاہی سے غالب کے تعلق کی اولین شہادت اکبر شاہ ثانی کی مدح میں نظم کیا ہوا قصیدہ ہے جس کا مطلع یہ ہے ؎

دریں زمانہ کہ غالب بعہد نگار حکیم
ہزار و دو صد و پنجاہ رانمود تقویم

قصیدہ خلیق صاحب کی رائے میں ۱۸۳۴ء میں کہا گیا۔ معین آفاق حسین آفاق کی کتاب "نادریات غالب" (ص ۹۹) میں مارچ ۱۸۳۵ء کو سال تصنیف بتایا ہے۔ وہ حوالے کی غیر موجودگی میں صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ ۳۰ سال کی عمر میں دنیائے ادب میں غالب اپنا اچھا خاصا مقام بنا چکے تھے۔ اکبر شاہ ثانی کی مدح کا یہ قصیدہ اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ غالب کی بعد کی زندگی پر اس کا بہت بڑا اثر پڑا۔" (غالب اور سلاطین تیموریہ ص ۱۲)۔ اکبر شاہ ثانی شہنشاہ تھے اور ان کے گیارہ بیٹے تھے۔ در آں حالیکہ بہادر شاہ ظفر سب سے بڑے تھے۔ وہ اپنے تیسرے لڑکے مرزا جہانگیر کو ولی عہد بنانا چاہتے تھے۔ ۱۸۲۱ میں مرزا جہانگیر کا انتقال ہو گیا تو شہنشاہ نے اپنے چوتھے بیٹے مرزا سلیم کو ولی عہد بنانے کی کوشش شروع کر دی۔ شہنشاہ ان پر یہ الزام لگاتے تھے کہ بہادر شاہ [illegible] عصمت دری کی تھی۔ غالب نے یہ سوچا ہوگا [illegible] مرزا سلیم [illegible] دلی [illegible] ہو جائیں گے۔ خلیق صاحب نے قصیدہ

مرزا کے ۹ اشعار یہ ثابت کرنے کے لئے بطور مثال پیش کئے ہیں کہ یہ قصیدہ اکبر ثانی یا مرزا سلیم کے ذریعہ انگریزوں کی رائے ہموار کرنے کے لئے لکھوایا گیا۔ لہٰذا بہادر شاہ غالب سے کبیدہ خاطر ہو گئے ہوں گے۔ ۱۸۳۷ء میں اکبر شاہ ثانی کا انتقال ہوا۔ دوسرے دن بہادر شاہ کی تخت نشینی کی رسم ادا ہوئی۔ خلیق انجم کے ...... خاصے وزنی ہیں۔

۱۔ بہادر شاہ ظفر کا غالب کے ساتھ رویہ اسی پس منظر میں دیکھنا چاہیئے

۲۔ ذوق کو بہادر شاہ کے استاد ہونے کا شرف غالب کے دلی آنے سے قبل ہی حاصل تھا۔ ذوق کو خاقانی ہند کا خطاب اکبر شاہ ثانی نے دیا تھا۔ وثوق سے تو نہیں مگر امکان سے یہی نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ اسی لئے غالب نے فارسی میں شاعری کرنا شروع کر دیا ہوگا۔ اسی سلسلے میں خلیق صاحب نے ۱۹ اشعار پر مشتمل ایک قطعہ کی جانب توجہ منعطف کرائی ہے جس کا مطلع یہ ہے ؎

اے کہ در بزم شہنشاہ سخن رس گفتہ
کہ بہ پرگوئی خلاف در شہر ہم سنگ من است

اس قصیدے کے متعلق قاضی عبدالودود، ڈاکٹر یوسف حسین خاں اور ڈاکٹر خلیق انجم وغیرہ کا بھی قیاس ہے کہ قصیدہ میں ذوق سے خطاب بھی شامل ہے۔ کچھ خلیق انجم کے ہی الفاظ میں ملاحظہ ہو۔

"(۱) غالب کی مشکل یہ ہے کہ وہ ایک عظیم فنکار تھے لیکن اس پائے کے فنکار کو جو رویہ زندگی کی طرف ہونا چاہئے وہ اس سے محروم تھے ...... غالب کا المیہ ہے کہ ایک طرف ان کا آدرش عظیم [illegible] تخلیق [illegible] دوسری طرف ذوق کا سماجی وقار بھی [illegible] ناقابل برداشت ہے

بادشاہ کی قربت حاصل کرنے کی تمنا نے انہیں زندگی بھر انگاروں پر لوٹایا ..... اس قطعے میں غالب کی شخصیت کا پورا تضاد ابھر کر سامنے آگیا ہے ...... ان کے بہت سے ارمان پورے ہوئے مگر سیری نہیں ہوئی۔ غالب اکثر ذوق دشمنی میں یہ بھول جاتے تھے کہ ذوق کو استاد شہ ہونے کا شرف بھی حاصل ہے۔ انہیں جاہل بتانا خود بادشاہ کو جاہل ثابت کرنے کے مترادف ہے۔ ظاہر ہے کہ غالب کے اس قسم کے اشعار سے ظفر اور بھی کبیدہ خاطر ہوئے ہوں گے۔ غالب کو جب کبھی موقع ہاتھ آیا انہوں نے ذوق کو کمتر ثابت کرنے میں کسر نہیں اٹھا رکھی (ص ۱۹، ۲۱ شاہان تیموریہ)

(۲) غالب ۴ جولائی ۱۸۵۰ء کو خاندان مغلیہ کی تاریخ لکھنے پر مقرر ہوئے۔ اس سے تھوڑی مدت بعد انہوں نے ایک غزل لکھی جس کے کچھ اشعار یہ بھی ہیں۔

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے
تمہیں کہو کہ یہ انداز گفتگو کیا ہے
نہ شعلے میں یہ کرشمہ نہ برق میں یہ ادا
کوئی بتاؤ کہ وہ شوخ تند خو کیا ہے
یہ رشک ہے کہ وہ ہوتا ہے ہم سخن تم سے
وگرنہ خوف بد آموزی عدو کیا ہے
رگوں میں دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے
رہی نہ طاقت گفتار اور اگر ہو بھی
تو کس امید پہ کہئے کہ آرزو کیا ہے
بنا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا
وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے

ابھی تک کسی نقاد اور محقق کی نظر اس طرف نہیں گئی ہے کہ ان چھ اشعار میں غالب نے ظفر اور ذوق سے اپنے تعلقات کی پوری داستان بیان کی ہے ... یہ غزل دیوان غالب کے پہلے اور دوسرے ایڈیشن (۱۸۴۱ء اور ۱۸۴۷ء) میں شامل نہیں ہے اور پھر غالب کے لئے اس مفہوم کا مقطع اس وقت کہنا ممکن نہیں تھا جب تک وہ خود ظفر کے ملازم نہیں ہوئے تھے۔ کیونکہ بادشاہ کے استاد پر اتنی کھلی چوٹ .... ممکن نہیں تھی۔ پھر ۱۸۵۲ء میں سہرے والا واقعہ پیش آیا ....."

خلیق صاحب نے با استدلال ثابت کر دیا ہے کہ یہ غزل ۱۸۵۰ء اور اپریل ۱۸۵۲ء کے درمیان کبھی لکھی گئی۔ دلائل ناقابل تردید ہیں۔ غالب نے غزل کے ممکنہ امکانات سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے خطاب کیا ہے۔ غزل سے چند چوٹ ہی لگ سکتی مگر یہ چند چوٹ ایسی تھی کہ اس کا داغ ہمیشہ نظر کے سامنے رہا ہوگا۔ یہ چوٹ مزید ابھر کر اس سہرے کے مقطع سے آئی جو غالب نے صاحبزادہ جواں بخت کی منگنی پر زینت محل کی ایما پر مئی ۱۸۵۲ء میں نظر کیا تھا۔ مقطع ہے ؎

ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں
دیکھیں اس سہرے سے کہدے کوئی بہتر سہرا

اس تعلی کو محولہ غزل نیز درج ذیل فارسی اشعار کے تناظر میں ظفر بپھر گئے اور انہوں نے ذوق سے جواب دینے کی فرمائش کی۔

است می گو کم من برا زلیست سر نتواں کشید
در گفتار جیست از ننگ من است
... ق نظامی و خاقانیم بہ دہر
دہلی ... بہ گنجہ و ... شیرواں برابر است

(ملحوظ رہے گنجہ و شیرواں ... کے نام

میں)
قصہ کوتاہ ذوق نے اپنے سہرے میں یہ مقطع شامل
کر دیا۔

جن کو دعویٰ ہو سخن کا یہ سنا دو ان کو
دیکھو اس طرح سے کہتے ہیں سخنور سہرا

غالب ادا شناس تھے ہی بادشاہ کے تیور سمجھ گئے اور انہوں نے ایک قطعہ معذرت بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا جس میں ایک شعر یہ بھی تھا ؎

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری
کچھ شاعری ذریعہ عزت نہیں مجھے

اس کا حوالہ دینے کے بعد خلیق انجم نے بڑے نکتے کی بات کہی ہے۔ ذوق کے حسب نسب کے بارے میں کسی تذکرے سے پتہ نہیں چلتا مگر لالہ سری رام نے لکھا ہے کہ اب ذوق کے خاندان کے لوگ دہلی میں جراحی کا پیشہ کرتے ہیں۔ لہذا غالب نے گہری چوٹ لگائی تھی۔ اور یہ بات ظفر کو بھی ناگوار گذری ہوگی۔

خلیق صاحب سہرے سے متعلقہ جملہ تفاصیل فراہم کی ہیں فیصلہ یہ کہ "ذوق کی وفات ہی پر ذوق کے بارے میں یہ کلمہ خیر پہلی بار غالب کی زبان سے اپنے خط بنام نبی بخش حقیر نکلا۔

"یہاں کا حال تازہ یہ ہے کہ میاں ذوق
مر گئے۔ حضور والا نے ذوق شعر و سخن
ترک کیا۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ اپنی وضع کا
ایک اور اس عہد میں غنیمت شخص تھا۔"

(۲۴ نومبر ۱۸۵۴ء)

یہ خط ذوق کی وفات کے چند دن بعد ہی لکھا گیا تھا۔

یہاں اپنی جانب سے میں ایک بات پر توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں "حضور والا نے ذوق شعر و سخن ترک کیا" توجہ طلب ہے۔ چونکہ یہ بات بھی سننے میں آئی ہے کہ ظفر کا بیشتر کلام گفتہ ذوق ہی تھا

اس کے بعد خلیق صاحب قلعہ میں غالب کی ملازمت کی جانب رجوع ہوئے ہیں۔ منجملاً ظفر اور غالب کے تعلقات خوشگوار نہیں تھے تاہم جب غالب کو جوئے کے الزام میں ۲۵ مئی ۱۸۴۷ء کو گرفتار کر لیا گیا۔ ظفر نے انگریز ریذیڈنٹ کو ایک خط لکھ کر غالب کی سفارش کی جو فی الواقع ظفر کی عظمت کا ثبوت ہے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ سفارش نتیجہ خیز ثابت نہ ہوئی کچھ عرصہ بعد ظفر نے غالب کو خاندان تیموریہ کی تاریخ لکھنے پر مقرر کر دیا۔ "مہر نیم روز" (تاریخ کا حصہ اول) کے دیباچے میں جس طرح خلعت اور خطابات ملنے کا ذکر غالب نے کیا ہے۔ اس سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ غالب کے لئے تقرر باعث فخر تھا۔ دوسرا حصہ نہیں لکھا جا سکا۔ غالب ششماہیہ نہیں چاہتے تھے۔ بلکہ ماہ بہ ماہ تنخواہ چاہتے تھے۔ ظفر کی خدمت میں منظوم عرضداشت پیش کرنے پر غالب کو ماہ بہ ماہ تنخواہ ملنا شروع ہو گئی۔

غالب کو تعلّی کی لت پڑی ہوئی تھی سہرے کی چپقلش کے بعد اس طرح کی تعلّی سے گریز کرنا ہی بہتر ہوتا ہے۔ مگر غالب اور احتیاط سے کام لیں یہ ناممکن تھا وہ اپنے عہد کے بہترین فنکار ضرور تھے مگر وہ دوسروں سے بھی اپنی برتری منوانے پر تلے رہتے تھے۔ مہر نیم روز کے دیباچے میں تعلّی سے مملو اشعار کی کمی نہیں ہے۔

"یہ چشم کم منگر...... کہ آبروئے خلافت نگاہ بانی

شہرہ چہ نسبت۔ من نظیری را نظیر خود بہ سخن ہم فہم سخن کوتاہ"

خلیق صاحب نے ۱۸ اشعار پیش کئے ہیں۔ یہ مسئلہ ہی خاصا دلچسپ ہے بلکہ کہنا یوں چاہئے کہ خلیق صاحب کے طرز بیان نے اس کو دلکش بنا دیا ہے۔ ظفر کے آبا و اجداد سنی تھے مگر آخری عمر میں ظفر کا رجحان شیعیت کی جانب ہو گیا تھا۔ مخالفت ہوئی تو تردید کرنا پڑی ظفر کی جانب سے ایک فارسی مثنوی بھی شائع کی گئی جو اغلباً غالب کی تخلیق تھی۔ دلی میں مولویوں کا یہی خیال تھا معزول بادشاہ بہت بڑا بدعتی تھا۔ (سرسید بغاوت ہند ص ۸۰) بیماری کے دوران حضرت عباس کی درگاہ میں علم پڑھانے کی بشارت ظفر کو ہوئی اور صحت یاب ہو کر علم چڑھانے کی تیاری شروع کر دی۔ دہلی میں یہ بھی مشہور ہو گیا کہ بادشاہ شریک محفل ہوئے اور دیر تک مرثیے سنتے رہے۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ دہلی میں ایک امام باڑے کی تعمیر بھی شروع کر دی تھی۔ کہاں یہ نہیں معلوم ہو سکا ہے۔ یا کہ حالات کے تیور دیکھتے ہوئے انگریزوں نے اور شاہزادوں نے بھی بہادر شاہ کے اقدام کو پسند نہیں کیا۔ ہوا یہ کہ مرزا حیدر لکھنؤ سے دہلی آئے اور بادشاہ کی مہر ثبت کر کے چند کاغذات اپنے ہمراہ لے گئے۔ بادشاہ کی ماں نے علم شاہ عباس کے مقبرے پر چڑھایا اور مجتہد کو ایک تسلی نوٹ جس پر مہر ثبت تھی دیا جس میں لکھا ہوا تھا کہ میں شیعہ ہوں اور سنی فرقے کو اسی جانب لانا چاہتا ہوں۔ ایک ہی سال بعد یہ خبر گشت کرنے لگی کہ بادشاہ نے شاہ ایران کے نام ایک خط مرزا نجف کی معرفت رسالہ کیا جس میں تبدیلی مذہب کا بھی ذکر تھا۔ اور شاہ ایران سے انگریزوں کے خلاف مدد مانگی گئی تھی۔ بادشاہ کو انگریزوں نے مجبور کر دیا کہ وہ خبر کی تردید کر دیں

شاہان اودھ سے غالب کے تعلقات پر قاضی عبد عبد الودود نے بین الاقوامی غالب سیمینار کے لئے لکھا تھا۔ اس میں کچھ روشنی ڈالی ہے۔ غالب نے واجد علی شاہ کی خدمت میں قطب الدین کی وساطت سے ایک قصیدہ پیش کیا مگر ان کی امید بر نہ آئی۔ امیر الدین حید۔ کی وفات ہوئی۔ واجد علی شاہ سے بھی رجوع ہوئے مگر جو مثنوی ظفر کے نام سے تردید شائع ہوئی تھی۔ غالب کی تخلیق قرار پائی تو پھر غالب کے ہاتھ کچھ نہ لگا۔ غالب نے ایک سلام بھی پیش کیا مگر ہر تدبیر سعی لاحاصل ہو کر رہ گئی۔

غالب اور تیموری شہزادے :- بہادر شاہ ظفر سے ولی عہد کے زمانہ میں تعلقات یوں نہ قائم ہو سکے کیونکہ بالجملہ دیگر امور غالب نے شہزادہ سلیم کی مدح میں فارسی قصیدہ پیش کیا تھا۔ اور شہزادہ سلیم ظفر کے حریف تھے۔ ظفر کے تخت نشیں ہونے پر غالب کی حیثیت ایک شاعر سے زیادہ نہیں تھا۔

مرزا شاہ رخ سے جو ظفر کے دوسرے بیٹے تھے غالب نے تعلقات پیدا کرنے کے لئے ان کی مدح میں ایک فارسی رباعی بھی کہہ کر پیش کی تھی۔ لیکن باوجود کوشش بسیار غالب کو کامیابی نہیں ملی۔ ۱۸۴۷ء میں شہزادے ہی کا انتقال ہو گیا۔ بہادر شاہ ظفر بالآخر تخت نشیں ہو گئے تھے۔ بہادر شاہ ظفر جواں بخت کو ولی عہد بنانا چاہتے تھے۔ مگر انگریزوں نے مرزا فخرو کو پسند کیا۔ معاملہ طے ہوتے ہی غالب نے ان کی خدمت میں قصیدہ پیش کیا۔ مرزا فخرو اردو میں شعر بھی کہتے تھے اور تخلص رمز کرتے تھے۔ ذوق کے انتقال کے بعد وہ غالب

رہا ہوتا تو ۱۸۵۷ء میں مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد ... سی سے تو کچھ کہتے تھے۔ ظفر بلاشبہ شعر کہہ سکتے تھے لیکن ... م ظفر میں ذوق و غالب کی دی ہوئی اصلاحیں ہوں گی۔

اس ضمن میں میرا بھی ایک معروضہ ہے۔ ۱۸۵۷ء کی بغاوت اور اپنی جلاوطنی کے بعد ظفر نے جو کچھ کہا ہو اس کو دیکھنے کی ضرورت ہے۔ مکمل تنقیدی ژرف بینی ہی ... غزل پر سود مند نظر ڈال سکتی ہے اور غالباً ہنوز ... کا ایسا مطالعہ نہیں کیا گیا ہے۔

غالب اور ۱۸۵۷ء :۔ بغاوت سے کچھ پہلے غالب اقتصادی اعتبار سے آسودہ حال تھے۔ انگریزی سرکار سے ساڑھے سات سو روپیہ پنشن۔ بہادر شاہ ظفر سے تاریخ نویسی کے چھ سو روپے سالانہ، مرزا فخرو سے چار سو روپے سالانہ اور باقر علی اور حسین علی بچوں کے لئے ... دس روپے ماہانہ غالب کو مل رہے تھے۔ ۱۰ جولائی ۱۸۵۶ء کو مرزا فخرو کا انتقال ہوگیا۔ مگر اسی اثنا میں نواب یوسف علی خاں ناظم ... کے شاگرد ہوگئے۔ انہوں نے پہلے خط کے ساتھ ... ڈھائی سو روپے بھیجے۔ تین مہینے بعد ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ برپا ہوگیا۔ جس سے غالب کی آمدنی کے ذرائع بالکل بند ہوگئے۔ غالب دنیاوی معاملات میں خاصے ہوشیار شخص تھے۔ جب انگریزوں نے مرزا فخرو ... ولی عہد بنانا اس شرط پر منظور کیا کہ وہ قلعہ معلیٰ سے قطب صاحب کو منتقل ہو جائیں گے تو غالب تاڑ گئے کہ مغل حکومت ختم ہونے والی ہے۔ انہوں نے ملکہ معظمہ کی خدمت میں ایک قصیدہ بتوسط لارڈ الن برا پیش کیا اور خطابات و خلعت کے لئے عرضداشت بھی پیش کی۔ ۱۱ مئی ... ۱۸ ستمبر تک بڑی آزمائش کا دور تھا۔ کیونکہ دلی پر انقلابیوں کا مکمل قبضہ تھا۔ وہ لوگ جن کے انگریزوں سے اچھے تعلقات تھے بڑی مصیبت سے دوچار تھے۔ ان میں دو طرح کے لوگ تھے۔ ایک وہ جو انگریزوں کو فی الواقع پسند کرتے تھے اور دوسرے گروہ لوگ جو حالات سے مجبور و خاموش تھے۔ غالب سرسید وغیرہ کا شمار دوسری قسم کے لوگوں میں کیا جاسکتا ہے۔ ۱۲ مئی کو غالب دربار میں حاضر بھی ہوئے۔ ۱۹ مئی کو غالب نے بادشاہ کی خدمت میں سکے بھی پیش کئے۔ ۲۶ مئی کو عید کے موقع پر قصیدہ تہنیت اور ۱۳ جولائی کو فتح آگرہ کے موقع پر قصیدہ تہنیت بھی غالب نے پیش کئے۔ جب تک انقلابیوں کا زور رہا معلوم یہی ہوتا ہے کہ غالب دربار شاہی میں آتے جاتے رہے۔ جب صورت حال بدلنی شروع ہوئی تو انہوں نے انگریزوں کی خوشامد شروع کردی۔ ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کو بالکل خانہ نشیں ہوگئے۔ غالب نے انگریزی حکام کے سامنے صفائی بھی پیش کی اور بعض دوستوں کو بھی لکھا کہ وہ گھر پر بیکار رہتے ہیں۔ وہ جانتے تھے کہ انگریزوں کو قلعہ میں غالب کی آمد و رفت ناگوار گذری ہوگی۔ ۱۴ جنوری ۱۸۵۸ء کو نواب رام پور کو بھی اپنے فارسی خط میں یہی لکھا کہ ظفر سے ان کے تعلقات بس اتنے تھے کہ وہ سلاطین تیموریہ کی تاریخ لکھیں اور ظفر کے کلام پر اصلاح دیں۔ ... خوف سے وہ کھل کر انگریزوں کا ساتھ نہیں دے سکتے تھے۔ ... جان و مال کو خطرہ درپیش ہوجاتا۔ غالب نے سوچا کہ نواب ... کی سفارش سے ان کی مشکل دور ہوجائے گی۔ غالب ہر طرح صفائی پیش کرتے رہے

دستنبو :۔ غالب نے اپنی بے گناہی دکھانے کے لئے ایک قصیدہ تہنیت فتح ۱۹ فروری ۱۸۵۹ء کو ڈاک سے ارسال کیا۔ لارڈ کیننگ نے فتح دہلی کے بعد یہ

سے اصلاح لینے لگے اور ان کو چار سو روپے سالانہ کا وظیفہ
بھی مقرر کر دیا اور زین العابدین کے دونوں بیٹوں (حسین
علی خاں اور باقر علی خاں) نے پھل میوہ وغیرہ کھانے
کے لئے دس دس روپیہ ماہوار بھی مقرر کر دیئے تھے۔

غالب کے نصیبوں نے پھر دھوکہ دیا۔ فخرو کو ہیضہ ہو گیا اور
۱۸۵۶ء میں راہی ملک عدم ہوگئے۔ ظفر کے ساتویں بیٹے
مرزا فرخندہ شاہ نے انتقال پر غالب نے ۵۴ اشعار
مشتمل نوحہ نظم کیا تھا۔ مرزا خضر سلطان خضر بہادر
شاہ کے فرزند تھے اور غالب سے اصلاح لیا کرتے تھے
۲۲ سالہ جناب خضر ۱۸۵۷ کے انقلاب کے دوران انگریزوں
کے حکم سے شہید کر دیئے گئے۔ مرو ایام نے دور تیموریہ
کا خاتمہ کر دیا۔ ۱۸۵۷ء کے غدر میں شمولیت کے
الزام میں ظفر اور شاہی خاندان کے دوسرے افراد کو
جلاوطن کر کے رنگون بھیج دیا گیا۔ صرف مرزا خدا بخش
جن کو انگریزی کمشنر سنڈرس نے بالکل بے ضرر قرار دیا۔
الہ آباد ہی تک ساتھ گئے اور رنگون جانے سے انکار
کر دیا۔

۱۵ صفحات (۵۶-۷۲) میں غالب اور قلعہ سے
ان کی وابستگی کی آرزوؤں کا تنقیدی جائزہ پیش
کیا گیا۔ بہت سی غزلوں اور قصیدوں کو زیر بحث لایا
گیا جس سے کلام غالب میں شمولہ غزلیات، قصائد،
قطعات وغیرہ کے زمانہ تخلیق کی نشاندہی ہو جاتی ہے
غالب نے اپنے کلام میں ضروریات اور مصلحتوں کو پیش
نظر رکھ کر [illegible] تحریفات بھی کیں۔ ان تحریفات پر بھرپور

ظفر کی شعر گوئی اور غالب :- [illegible] ظفر کو ایک
الزام سے تک ذوق کا مرہون منت سمجھا گیا۔ اس غلط فہمی
کو ہوا دینے میں ذوق کے چہیتے شاگرد محمد حسین آزاد کا ہاتھ
تھا۔ گذشتہ چالیس پچاس برسوں میں ظفر کے کلام کا
غائر مطالعہ کرنے پر نقاد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ظفر کے
کلام پر اساتذہ کی اصلاح ضرور ہے لیکن کلام ظفر کا ہی ہے
ذوق کی وفات پر دہلی اردو اخبار ۸ نومبر ۱۸۵۴ء
میں شمولی ایک مضمون میں بالواسطہ ظفر پر یہ کہہ کر چوٹ
کی گئی کہ ان (ذوق) کی توجہات سے شاگردوں کے دیوان کئی
جلدوں میں مرتب ہوں گے لیکن طرفہ نظریہ کہ اپنا دیوان
مرتب نہیں کیا .... ہمیشہ انہوں نے مثل کرشمال ویسا
کیا تو یہ کیا حضور والا کا دیوان مقدم ہے۔" اس کے
پہلے اشپرنگر نے یادگار شعراء میں لکھا تھا کہ ظفر
مرزا ابو ظفر شاہ دہلی ایک دیوان کے مصنف ہیں جو
اصل میں ذوق کا لکھا ہوا ہے۔ آب حیات میں محمد حسین آزاد
نے لکھا

" بہادر شاہ کے چار دیوان ہیں۔ پہلے کچھ غزلیں شاہ
نصیر اصلاحی کی ہیں اور کچھ کاظم حسین بے قرار کی۔ غرض پہلا
دیوان نصف سے زیادہ اور باقی تین دیوان سرتاپا حضرت
مرحوم ذوق کے ہیں "

اسی نوعیت کی گل افشانیاں حضرت آزاد نے کیں تو
حالی کیوں پیچھے رہتے۔ اپنے استاد غالب کی عظمت میں
اضافہ کرنے کے لئے حالی بھی داستان گوئی پر اتر آئے
غرض کہ آزاد اور حالی کے بیانات نے خاصی غلط فہمی پیدا
کر دی۔ خلیق صاحب نے دو مختلف نوعیت کے نقادوں کا
ذکر کیا ہے یعنی ان نقادوں کا جو [illegible] کو
کے کلام کو ظفر ہی کا مانتے ہیں۔ [illegible]
گو کھیں [illegible] نے ثابت کیا کہ ظفر کا اسلوب [illegible]
صاحب کا استدلال درست معلوم ہوتا ہے کہ اگر غالب [illegible]

قصیدہ اور ملکہ معظمہ کو پیش کیا گیا قصیدہ دونوں واپس بھیج دیئے۔ وجہ یہ بتائی گئی کہ ایام غدر میں غالب بھی باغی بادشاہ کے مصاحبوں میں شامل رہے تھے۔ لہٰذا ان کی شرمناک شہرت پر آمیرشی منظور نہیں کی گئی۔ خلیق صاحب نے استدلال سے ثابت کر دیا ہے کہ غالب دراصل ۱۴ ستمبر تک قلعہ کے وفادار تھے۔ دستنبو سے متعلق یہ کہنا کہ روزنامچہ ہے غلط ثابت ہوتا ہے اور اس کے جملہ غلطیوں کی خلیق صاحب نے نشاندہی کی ہے۔ دستنبو کی ابتدا خدا کی مدح سے ہوتی ہے اس کے بعد غالب کے پیش نظر مطلب پرستی ہی رہی۔ غالب نے ہندوستانی افواج میں شامل لوگوں کے لئے بڑے خراب الفاظ استعمال کئے مثلاً سیاہ کینہ خواہ، بے آزرم، شرانگیز، زشت سرشت، روسیاہان گم کردہ، بدرگ اور بدگہران، سرکش در خور کشش وغیرہ۔ انقلاب کی تاریخ "رستخیز بے جا" سے نکالی۔ یعنی غالب نے اپنی وفاداری ثابت کرنے کے لئے ہندوستان کی بھرپور مذمت کی ہے۔ مزید براں۔ اس غلط بیانی سے بھی کام لیا ہے کہ شہزادوں سے ان کا تعلق نہ ہونے کے برابر ہی رہا۔ تلاش و تحقیق کرتے ہوئے خلیق صاحب نے نیشنل آرکیوز (NATIONAL ARCHIVES) میں جا کر فتح دہلی کے بعد قلعے کے کاغذات بھی بالاستیعاب دیکھ ڈالے مگر غالب کی کوئی تحریر نہ ملی۔ ملاحظہ ہو ایک اقتباس :-

"یہ حقیقت ہے کہ غالب کو بادشاہ ظفر اور شہزادگان تیموریہ سے قطعاً دلچسپی تھی۔ خطوط غالب میں کہیں کوئی ایسی بات نہیں ملتی جس سے یہ پتہ چلے کہ قلعے کی بربادی کا غالب کو کوئی صدمہ تھا۔ بلکہ انقلاب سے پہلے جس قلعہ کو وہ "قلعہ مبارک" کہتے تھے اسے انہوں نے قلعہ نامبارک کہا ہے۔ انگریزوں نے بہادر شاہ ظفر اور ان کے خاندان پر جو ظلم و ستم کئے تھے جس طرح شہزادوں کو بے رحمی سے قتل کیا تھا خطوط میں ان کا کہیں ذکر نہیں۔ (غالب اور شاہان تیموریہ ۱۱۴، ۱۱۴ـ۱۱۳)

انگریزوں سے وفاداری ثابت کرنے کی غرض سے ہی غالب یوسف مرزا کے قتل کا بھی کہیں ذکر نہیں کیا گیا ہے جبکہ بگا بیگم نے جو فخرالدین علی احمد سابق صدر جمہوریہ ہند کی نانی، عارف کی بیوی اور کاظم کی لڑکی تھیں یہ بتایا تھا کہ یوسف سرسں کی گلی میں مارے گئے تھے۔

دستنبو کی اشاعت کے چھ سات ماہ بعد مسٹر لکھنے کا الزام لگتے لگتے رہ گیا۔ غالب نے عند الملاقات کمشنر صاحب کو بتایا کہ انہوں نے سکے نہیں لکھے۔ خلیق بھی اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ غالب نے کوئی سکہ نہیں کہا کچھ بھی ہو غالب کی زندگی کا یہ پہلو بڑا افسوسناک ہے۔

اس دور مکتوب نگاری اور غالب :- اردو بھی ہر زبان کی طرح نثر کی طرف توجہ نظم کو مقبولیت ہو جانے کے بعد دی گئی۔ [illegible] ۱۸۰۲ء [illegible] ۱۸۹۰ء میں میلا رام مخزن مسیحا نے [illegible] کے سات سے [illegible] شاعر [illegible] کا [illegible] [illegible] لکھا۔ فورٹ [illegible] سے قبل کئی کتابیں [illegible] لکھ گئیں۔ کربل کتھا کا [illegible] ترجمہ، سودا کے اعزاز افتخارات۔ میر تقی کے ایک مرثیہ اور سلام پر منظوم مع ابتدائی عبارت (نثر) فصوص الحکم کا اردو ترجمہ محمد و گیتی افروز کا اردو ترجمہ سید محمد حسن شاہ کی المیہ

فارسی کہانی، ترجمہ جذب عشق وغیرہ فورٹ ولیم کالج کے معرض وجود میں آتے ہی اردو نثر نے کچھ ہی رفت کی۔ کالج کا مقصد انگریزوں کو ہندوستانی زبان سکھانا تھا۔

اس مقصد سے اردو ہندی وغیرہ میں تراجم، تالیفات شائع کی گئیں۔ ان کتابوں کی زبان اردو اہل زبان سے آہنگ نہ تھی لہٰذا وہاں کی کتابوں کو زیادہ پسندیدگی نہیں ملی مگر اہل زبان کو محرکات ضرور ملے۔ رجب علی بیگ کی فسانہ عجائب کی زبان بھی فورٹ ولیم کالج کی ... کی زبان سے زیادہ بچی ہوئی تھی۔ خلیق صاحب نے یہاں سے لے کر واجد علی شاہ اور ان کی بیگمات کے خطوط (منظوم منثور) اور خواجہ غلام غوث بے خبر کی نگارشات تک عالمانہ مگر لطافت تجرباتی نظر ڈالی ہے۔ غالب ... پس منظر سے ابھرے۔ انہوں نے سیدھی سادی ... زبان میں مکتوب نگاری شروع کی۔ "جدید نثر کی ابتدا غالب سے ہرگز نہیں ہوئی۔ ہاں جدید نثر میں غالب کی حیثیت ایک صاحب طرز کی ہے ......" (ص ۱۴۰ غالب اور شاہان تیموریہ) مینارۂ روشنی کی حیثیت کی حامل تصنیف ہے۔

۲۔ غالب کی نادر تحریریں:۔

یہ کتاب ۱۹۶۱ء میں مکتبہ شاہراہ دہلی سے شائع ہوئی یعنی یہ "غالب اور شاہان تیموریہ" سے قبل کی تصنیف ہے مگر میں نے باوجود دوسری تصنیف کو پہلا جگہ دی ہے غالب کی نادر تحریریں کا مقدمہ تجزیاتی اہمیت کا حامل ہے۔ خلیق صاحب ہی نے لکھا ہے: "اردو خطوط لکھتے ہوئے غالب کو شاید ہی یہ خیال آیا ہو کہ وہ اردو خطوط نگاری میں ایک نئے باب کی ابتدا کر رہے ہیں...... دوستوں اور شاگردوں کو خط لکھتے رہنا غالب کا دلچسپ مشغلہ تھا۔ خاص طور پر ۱۸۵۷ء کے بعد جب دہلی ان کے احباب اور تلامذہ کی تعداد بہت کم رہ گئی تو وہ آرائیوں کا لطف خطوط سے لینے لگے......" (مقدمہ ص ۹)

مقدمہ میں غالب کے خطوط پر مشتمل جو مجموعے طباعت پذیر ہوئے ان سبھی پر مجملاً روشنی ڈالی گئی ہے۔

۱۔ غالب نامہ:۔ پہلا خط جو کتابی شکل میں شائع صفحات ۱۶، مطبع محمدی غالباً ۱۸۶۵ء سے ایک دو ماہ چھپا ہوگا۔ غالب نے میاں داؤد خاں کو ۱۷ ستمبر ۱۸۶۵ء کو لکھا تھا۔ غالب کی قاطع برہان کے جواب میں رحیم بیگ نے ساطع برہان لکھا۔ جواباً غالب کو اپنا خط چھپوانا پڑا۔

۲۔ مہر غالب:۔ مرثیہ چودھری عبدالغفور سرور تاریخی نام ہے جس سے ۱۲۸۷ھ نکلتا ہے۔

۳۔ عود ہندی۔ مرثیہ غلام غوث خاں بے خبر طباعت ۲۷ اکتوبر ۱۸۶۸ء

۴۔ اردو معلیٰ:۔ ۲۶۴ صفحات، تعداد خطوط ۴۷۰ غالب کی وفات کے ۱۹ دن بعد شائع ہوا۔ تیئیس سال بعد ۱۸۹۹ء میں مطبع مجتبائی نے حالی کے تعاون سے حصہ دوم شائع کیا۔

۵۔ اردو معلیٰ کا ضمیمہ ۱۹۲۲ء میں شیخ مبارک نے شائع کیا۔

۶۔ نکات غالب:۔ خطوط سے ادبی نکات نیز مذہبی عقائد سے اقتباسات پر مشتمل یہ کتاب نظامی پریس بدایوں نے ۱۹۲۰ء میں شائع کی۔

۷۔ انتخاب غالب:۔ ۲۰ صفحات پر مشتمل نظم و نثر غالب کا انتخاب (جو غالب نے خود کیا تھا) ۱۹۲۶ء میں شائع ہوا۔ اس کا قلمی نسخہ عبدالستار کی ملکیت تھا۔

۸۔ ادبی خطوط غالب۔ محمد عسکری نے اردو معلیٰ اور

عود ہندی سے انتخاب کر کے ۱۹۲۹ء میں شائع کیا یہ
غالب کی اصلاح اور ادبی نکات پر روشنی ڈالنے والا
انتخاب تھا۔

۹۔ سرگزشت غالب کی سوانح حیات جس کو محمد بشیر
نے غالب کے خطوط کو پیش نظر رکھتے ہوئے قلمبند کیا —
۱۹۳۳ء میں عزیزی پریس آگرہ سے طبع ہوئی۔

۱۰۔ مکاتیب الغالب :- اردوئے معلی اور عود ہندی سے
مرتب کیا ہوا انتخاب ہے۔ سال طباعت ۱۹۳۶ء

۱۱۔ مکاتیب غالب :- امتیاز علی خاں عرشی نے نواب
یوسف علی خاں اور نواب کلب علی خاں کو بارہ سال کے
دوران لکھے گئے غالب کے خطوط کو ترتیب دیا۔ پہلا
مجموعہ ہے جس میں تحقیق۔ تدوین کے اصولوں کی سختی
سے پابندی کی گئی ہے۔ پہلا ایڈیشن ۱۹۳۷ء میں بمبئی
سے نکلا۔ ۱۹۴۹ء تک سات ایڈیشن نکلے اور ہر
ایڈیشن میں ترمیمات ہوتی رہیں۔ خلیق صاحب نے
جملہ ترمیمات کی نشاندہی کی ہے۔

۱۲۔ نادر خطوط غالب :- صفحات ۶۲ رسا ہمدانی
نے لکھنؤ سے شائع کرایا۔ ۲۷ خطوط ہیں جس میں سے
۲۶ خطوط جعلی پائے گئے۔

۱۳۔ خطوط غالب :- جلد اول مرتبہ مولوی مہیش
پرشاد، ۱۹۴۱ء میں ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد ہر
مکتوب الیہ کا نام۔ خطوط کی تاریخ وار ترتیب وغیرہ
معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ دوسرا جلد مہیش پرشاد
صاحب کے انتقال ہو جانے کی وجہ سے طباعت سے
محروم رہا۔ بعد کو عبد الستار صدیقی نے نظر ثانی کر کے چھپوایا۔

۱۴۔ نادرات غالب :- ۱۹۴۹ء میں ادارہ نادرات کراچی
سے شائع ہوا۔ سرنامہ عبد الحق نے لکھا۔ تمہید کے بعد
ایک طویل دیباچہ بھی شامل ہے۔ اس مجموعے میں ایک خط
فارسی کا ۱۲۳ خط اردو کے شامل ہیں۔ منشی نبی بخش
حقیر سے غالب کے نزدیکی مراسم تھے۔ مجموعہ میں حقیر
نام غالب کے خطوط شامل کئے گئے ہیں۔

۱۵۔ غالب کے اردو خطوط نویسی کے آغاز کی تاریخ
جامعہ فروری ۱۹۳۲ء میں مالک رام صاحب کا مضمون
ان کا خیال ہے کہ غالب ۱۸۴۸ء میں اردو میں لکھنا
شروع کر چکے تھے۔ خلیق صاحب کا خیال ہے کہ چونکہ
۲۱ فروری ۱۸۴۸ء کو فارسی میں خط لکھا تھا لہذا
ہے کہ اس مہینہ کے آخر میں اردو میں خط لکھا گیا ہو
میرا معروضہ یہ ہے کہ محض قیاس کافی نہیں ہوتا۔ قیاس و
تحقیق میں بعد المشرقین ہے۔

۱۶۔ خطوط غالب :- عود ہندی اور اردوئے معلی
کے تمام خطوط غلام رسول مہر نے مرتب کئے۔ ہر مکتوب الیہ کے
حالات اور حواشی وغیرہ کی فراہمی سے دو جلدوں میں
شائع ہونے والے اس مجموعے سے افادیت میں خاصا
اضافہ ہوا ہے۔ دونوں جلدیں ۱۹۵۱ء میں لاہور سے شائع
ہوئی۔

۔ غالب کی نادر تحریریں :" میں خلیق صاحب نے وہ
خطوط شامل کئے ہیں جو کسی اور مجموعے میں شامل نہ
تھے۔ تنقیدی تحقیقی اعتبار سے یہ مجموعہ خاصا جاندار ہے
اور یہ تاثر چھوڑتا ہے کہ خلیق صاحب اس سمت میں اپنی کاوش
کو جاری رکھیں گے۔ یہ تاثر صحیح تھا۔ ہوا جب خلیق صاحب
نے مزید پیش رفت دکھائی۔ غالب کے خطوط (جلد اول
۱۹۸۴ء جلد دوم ۱۹۸۵ء) میں غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی
سے شائع کیا۔

غالب کے خطوط جلد اول تا دوم :- جلد اول مع د

کتابیات ۴۸۱ صفحہ کو محیط ہے اور جلد دوم ۴۱۹ صفحات پر مشتمل ہے۔ یعنی دونوں جلدیں ۹۰۷ کی ہیں۔ آئندہ شائع ہونے والے مجموعوں کا حجم بھی غالباً ایک ہزار صفحات کو محیط ہوگا۔ دوسرے الفاظ میں دو ہزار بڑے سائز کے کتابی صفحات کو محیط غالب کے خطوط کو ایک تنظیم میں مرتب کرنے کا افتخار و تفوق صرف خلیق انجم صاحب کو حاصل ہوگا۔ اس نمو پذیر تنظیم کو اگر غالب [illegible] کہا جاتا ہے تو درست [illegible] کہا جاتا ہے۔ خلیق صا[illegible] [illegible] سا[illegible] جیلہ کا آغاز ۱۹۷۲ء سے ہوا۔ اس پر کوئی تحریر میری نظر سے گذری تھی غالباً TIM-ES OF INDIA (ٹائمز آف انڈیا) ملحوظ رہے تلفظ آف غلط ہے OFF کا تلفظ آف ہوتا ہے) میں پڑھا تھا۔ میرا خیال ہے کہ ان کے دماغ میں غالبیانہ کی جانب پیش قدمی ۱۹۶۰ء سے شروع ہوئی اور جست در جست ۲۵/۲۶ سال سے جاری ہے۔

کم از کم مکاتیب غالب پر مشتمل کم از کم ۱۹ مجموعے موجود تھے۔ لہٰذا غالب کے خطوط کو ۲۰واں مجموعہ کہا جا سکتا ہے۔ خلیق صاحب نے ابھی تک ۸۰۳ خطوط تک رسائی حاصل کی ہے جن میں سے کم از کم ۲۵ خطوط ایسے بھی شامل ہیں جو پہلے چھپے مجموعوں میں نہیں ملتے اور ان کی فوٹو کاپیاں ان کے پاس ہیں۔ مزید برآں غالب کے سرپرستوں دوستوں [illegible] جن کی تعداد ۱۹ تک پہنچتی ہے۔ ان میں سے ۸۷ فوٹو یا سکیچز (sketches) بھی خلیق صاحب نے حاصل کیے ہیں۔ جو غا[illegible] سرے اور چھوٹے مجموعہ [illegible] [illegible] ملیں گے۔ کوئی بھی مکتوب [illegible] نازک نہیں ہے [illegible] انکشاف ہے۔ خلیق انجم [illegible] صحیح متن پیش کرنے کی حتی الوسع کوشش کی ہے۔ اگر [illegible] کی اصل یہ خط تب دستیاب ہو سکی ہے تو اس کا مطبوعہ متن سے [illegible]

کیا گیا ہے۔ ماخذ کی نشاندہی کی گئی ہے۔ اختلافات نسخ درج کئے گئے ہیں۔ خطوط کا زمانہ تحریر متعین کیا گیا ہے نیز مفید اور معلوماتی حواشی سپرد قلم کئے گئے ہیں۔

جلد اول میں صفحہ ۱۳ سے لے کر صفحہ ۲۲ تک خلیق صاحب نے کچھ باتیں ایڈیشن کے بارے میں بتائی ہیں جو [illegible]ید کے اعتبار سے خاصی اہمیت کی حامل ہیں۔ پہلا نکتہ ہے متن کی تصحیح۔ خط لکھتے وقت جو سہو غلطیاں در آتی ہیں اور کیوں در آتی ہیں اس پر روشنی ڈالتے ہوئے خلیق صاحب کہتے ہیں کہ "غالب کے ہاتھ کے لکھے ہوئے اصل خطوط خاصی تعداد میں دستیاب ہیں۔ باقی خطوط مطبوعہ صورت میں ہم تک پہنچے ہیں۔ ان خطوط میں متن کی تبدیلیوں کی۔۔۔۔ مثالیں موجود ہیں۔۔۔۔ اگر ان خطوط میں مجھے کوئی ایسی بات نظر آئی جو میرے خیال سے غالب کے منشا کے خلاف ہے تو میں نے قیاسی تصحیح کر کے حاشیے میں ذکر کر دیا ہے۔"

خاصی تعداد میں غالب کے اصل خطوط رضا لائبریری رام پور اور دوسری لائبریری میں محفوظ ہیں۔ بہت سے خطوط کے عکس اس تنقیدی ایڈیشن میں شامل کر دیئے گئے ہیں۔۔۔۔ آخر میں بنیادی متن کا اشاریہ د[illegible]ا گیا ہے۔ جس میں ہر خط کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ وہ کہاں سے لیا گیا ہے۔۔۔۔۔۔ خطوط ترتیب وار ترتیب دیئے ہیں جن سے خطوں کی تاریخ کا تعین نہیں ہو سکا۔ انہیں متعلقہ مکتوب الیہ کے نام خطوط کے آخر میں اس خط کو ترتیب دیا گیا ہے۔۔۔ غالب [illegible] خطوں میں تاریخ ضرور لکھتے تھے۔۔۔۔ (لیکن) مختلف طریقوں سے لکھتے تھے (کبھی آغاز میں، کبھی آخر میں اور کبھی متن میں بھی) اور کبھی ہجری لکھتے تھے کبھی عیسوی تاریخ لکھتے تھے۔)۔۔۔۔ غالب تاریخ میں پہلے دن پھر تاریخ، مہینہ اور سنہ لکھتے کبھی [illegible] لکھ [illegible] دیئے۔۔۔۔ [illegible]

اور عیسوی تاریخوں میں ایک دن کا فرق عام ہے ..... حاشئے میں ذکر کر دیا گیا ہے .... غالب یا کاتب کا سہو .... کا بھی ذکر کر دیا گیا ہے .... غالب کے خطوط کا .... اپنی .... املا میں دیا ہے .... غالب انگریزی مراسلت کے طریقوں سے خاصے واقف تھے .... ایسے خطوط موجود ہیں جن میں غالب نے پیراگراف نئی سطر سے شروع کیا ہے۔ جس جملے سے نئی بات شروع کرتے اس کے پہلے لفظ پر (سر) کی علامت بنا دیتے۔ یہ علامت بقول امتیاز علی عرشی عربی کے لفظ "بت" بمعنی قطع کی شکل ہے .... کبھی پیراگراف ختم کرنے پر ... امت کبھی ایک بار اور کبھی دو بار لکھتے ہیں جو .... فقط کی مخفف شکل ہے۔

پیراگراف ختم ہونے پر "۱۲" کا ہندسہ کثرت سے لکھا ہے (جو ان کے اثنا عشری ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ (خاتم علی مہر کے نام خط میں یہی ... ہے) .... غالب گنتی کبھی لفظوں میں اور کبھی ہندسوں ... لکھتے تھے .... روپوں کی تعداد کے لئے بعض اوقات ... رقوم لکھتے تھے۔ ... غالب عام طور سے خط کے آخر میں تاریخ ... مکتوب نگار کی حیثیت سے اپنا نام لکھتے تھے .... مکتوب ... کے ... مختصر کر دئیے (گئے ہیں)"

اس کے بعد خطوط غالب کے مختلف ایڈیشنوں اور ... پر جو پچھلے سو سال سے شائع ہوئے ہیں سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ خوبیوں اور کوتاہیوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ پچھلی ... اتنا دلچسپ اور معلوماتی بنا دیا گیا ہے کہ غالب پر کام کرنے والے صفحہ ۲۳ سے لے کر ۵۹ صفحے یعنی پورے ۳۷ صفحوں سے روگردانی نہیں کر سکتے۔ "غالب کی اردو املا کی خصوصیات" (ص ۷۰-۷۶) عنوان کے تحت املا (میری زبان پر املا مذکر ہے مگر خلیق صاحب کے ہاں تانیث نظر آئی) اور تلفظ مرور ایام کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ اردو کو اس ضمن میں کیا کیا منازل طے کرنا پڑے۔ غالب کے یہاں اختلاف املا کی امثال غالب اغلاط املا وغیرہ پر بڑی گہری نظر ڈالی ہے جو لسانیاتی تنظیموں کے نقطۂ نظر سے خاص افادیت اور اہمیت سے بھرپور ہے۔ مثال کے طور پر غالب درج ذیل الفاظ کا املا غلط لکھتے تھے۔

بالکل - بالکل، بالفعل - بالفعل، بالله - بالله۔

غرض کہ ہر سطح پر صوتی نظام میں ہونے والی تبدیلیوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ تلفظ میں رونما ہونے والی تبدیلیاں اور غالب کے تعلق سے متعدد مروجات کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ یائے مجہول اور یائے معروف کی تفریق غالب کی تحریروں میں نہیں ملتی۔ وہ اکثر اوقات عام رجحان کے مطابق الفاظ کو ملا کر لکھتے تھے۔ غالب کے یہاں اعراب بالحروف کی مثالیں ملتی ہیں۔ مثلاً وہ اس کو اوس لکھتے علیٰ ہذا القیاس واؤ معروف اور واؤ مجہول و پیش مجہول پر التزاماً فارسی پیش لگاتے تھے۔ تم - طرفہ - جرم۔ ہائکار آوازوں کا املا ایک سا نہیں ملتا - ہات (ہاتھ) میرت (میرٹھ) رت (رتھ) مج (مجھ) سمجہ (سمجھ)۔ دیکہہ (دیکھ) - پڑہ (پڑھ) بہوکا (بھوکا) دونوں طرح ملتے ہیں۔ بلکہ کہنا یہ درست ہوگا کہ غالب دو چشمی "ھ" کا استعمال شاذ و نادر ہی کرتے تھے غالب تڑپنا کو مروجہ طور پر ترپنا لکھتے تھے۔ ... گہانس، بونٹ، چاول وغیرہ ...

گھانس، ... ، چانول ...

بعض اردو الفاظ کو ہائے مختفی سے لکھنا عام ہوگیا تھا۔ لہٰذا غالب بھی دونوں طرح لکھتے تھے۔ لالہ (لالا) پورنیہ (پورنیا) وغیرہ۔

اسی طرح کے متعلقات املا پر خاص سود مند نیز
محققانہ باتیں قارئین کو متوجہ کر لیں گی۔ غالب کی زبان
پر فارسی اثرات ۔ انگریزی الفاظ کا استعمال:۔

عنوان بالا کے تحت نہایت اہم انتقادیہ فراہم کیا
گیا ہے اردو نثر کے ارتقا کے منازل پر بھرپور روشنی ڈالی
گئی ہے۔ اردو نثر فارسی کے زیر سایہ پروان چڑھی۔ لہٰذا
ابتدائی اردو نثر پر زبان فارسی کے بہت گہرے اثرات ناگزیر
تھے۔ اردو نثر کو انفرادی حیثیت و شناخت فورٹ ولیم کالج
کے زیر اہتمام نثر نگاری سے حاصل ہونے لگی۔ سیاسی اور
سماجی حالات سے اردو کا استعمال بڑھتا چلا گیا اور اس
پر فارسی کی گرفت کمزور پڑتی چلی گئی۔ نصف صدی کی مدت
ہی میں محمد حسین آزاد، الطاف حسین حالی، ڈپٹی نذیر احمد،
سر سید وغیرہ کے ہاتھوں اردو نثر آزاد و مکمل ہو کر معرض
وجود میں آگئی۔ غالب خاصے بوڑھے ہو چکے تھے اور یہ لوگ
نوجوان تھے۔ غالب کی روزمرہ گفتگو کی زبان اردو تھی
مگر ان کے ذہن پر فارسی کا غلبہ مسلط رہا۔

خطوط غالب کی نثر پر نسبت دیباچوں اور تقریظوں
میں استعمال زبان فارسی نثر کے اثرات دیکھے تو جا سکتے ہیں
مگر بہت کم۔ بہرکیف اس دور کی اردو نثر کا لسانی تجزیہ ضروری
ہے مگر یہ کام آسان نہیں ہے مرحلہ در مرحلہ جائزہ لیتے ہوئے
خلیق صاحب نے یہ منتخبات پیش کیے ہیں۔

۱۔ غالب نے فارسی لفظوں کا استعمال برجستگی سے
کیا ہے۔ ان کی نثر نتیجتاً موثر و معنی خیز ہو گئی۔

۲۔ اسم فارسی و عربی سے مستعار لے کر افعال اردو کے
استعمال کیے جیسے کتاب پڑھی، قلم بنایا وغیرہ

۳۔ بعض ایسے فارسی محاورے اور ترکیبیں بھی استعمال
کیں جو اردو کے مزاج میں داخل نہیں ہو سکیں۔ مثالیں
بڑی دلچسپ نثر کار آمد دی گئی ہیں۔

گلہ رکھتے تھے .... گلہ داشتن کا ترجمہ
یاد نہ لانا ...... یاد آوردن " "
مشقت کھینچ کر ...... بمشقت کشیدن " "
آ پڑے ہیں ...... افتادہ اند " "
عجب آیا ...... عجب آمدن " "
نامور بنانا ...... نامور ساختن " "
وصول میں آیا ...... بہ معرض وصول آمدن " "
مجھ کو تو مفید پڑا ...... بہ من مفید افتاد " "
برہم مارے ...... برہم زدن " "
صورت پکڑ جائیں ...... صورت گرفتن " "
میرا دل بہت جلا ...... دلم سوخت " "
پیشہ رکھتا ہے (پیشہ رکھنا) پیشہ داشتن " "
نقش قبول (کرنا) ...... نقش قبول کردن " "
غم کھانا ...... غم خوردن " "
لازم آ (پڑنا) لازم آمدن " "

اب وہ مثالیں جہاں غالب نے فارسی الفاظ کو فارسی
کے مفہوم میں استعمال کیا ہے۔

فارسی لغات کا فارسی معنی	اردو معنی
فرصت (فتح، فراغت، مہلت نجات، چھٹکارہ)	ـــــ غالب نے بیماری سے نجات کے مفہوم میں استعمال کیا جو نہیں ہے۔
منشار (دوست، تصدیق، یقین دریافت، جہاں بین)	ـــــ تحقیق حال مفہوم ہوگا
جریدہ (تنہا، رسالہ وغیرہ)	غالب نے تنہا کے معنوں میں استعمال کیا
دہشت (رمیدگی، خوف سے بھاگنا، کنارہ کشی، سودا، دیوانگی	

فارسی لغات کا فارسی معنی	اردو معنی
	غالب نے کنارہ کشی کے معنوں میں استعمال کیا (آجکل دیوانگی کے مفہوم میں مستعمل ہے!)
رنجور (بیمار، غمزدہ)	غالب نے بیمار کے معنوں میں استعمال کیا
توقف (دیر، وقفہ، صبر و تحمل، رکنا	" " صبر و تحمل کے معنوں میں استعمال کیا
سیاست (ملکی انتظام، سزا)	" " سزا " " " " " "
مسترد (واپس کرنا، رد کرنا)	" " واپسی " " " " " "
ہم درد (غم خوار، دکھ درد میں ساتھ دینے والا	" " دکھ درد میں ساتھ دینے والا کے معنوں میں استعمال
قباحت (برائی، خرابی، دقت، مشکل)	" " برائی کے معنوں میں استعمال کیا
ہرزہ (فارسی میں آوارہ گردی کو بھی کہتے ہیں)	" " آوارہ گردی کے معنوں میں استعمال کیا
مگر (شاید کے معنی بھی رکھتا ہے)	" " شاید " " " " " "
احیا (دوبارہ زندہ کرنا، فارسی میں حی کی جمع احیا بہ معنی زندہ لوگ)	" " زندہ لوگ " " " " " "
علاقہ (فارسی میں نوکری ملازمت کے لئے ہے)	" " ملازمت " " " " " "
گزاف (اردو میں لاف و گزاف مستعمل ہے۔ معنی یاوہ گوئی)	" " یاوہ گوئی " " " " " "
ریب (اردو میں تنہا مستعمل نہیں ہے۔ معنی شک)	" " شک " " " "
درنگ = معنی تاخیر	غالب نے بہت کم استعمال کیا ہے
ایمن = معنی محفوظ	" " " " " " " "
بحل = معنی معاف کرنا	" " " " " " " "
کون = (تغیر، وجود میں آنا)	مثلاً (.... ماں بعد اس فساد کے بعد کون ہوگا
انفراد = تنہا	جیسا بہ انفراد بہہ رہی ہے
استعلاج = علاج	(..... اس کا استعلاج منظور ہے
مجموع = تمام	(..... ایک بہن اور اس کی مجموع اولاد یہاں
زلت = غلطی	غالب نے کہیں کہیں استعمال کیا ہے
مبطل = باطل کرنے والا	" " " " " "
مظنون = مشتبہ ہونا	" " " " " "

غالب کبھی کبھی پورے کے پورے فقرے فارسی ہی لکھ جاتے تھے۔

.... فقرہ فصلہ .... سے بہتی رسی، اتحاد اسمی دلیل خصوصیت روحانی، بہ سبب استعمال ادویہ خرہ برہم ز

فتاب صر کردہ، خونِ جگر، جگر خون کن، طریقِ خوشامد،
زمین پر سطر رفتہ تصنیف میں پورے جملے دیئے گئے
یا اور خطوط کی [illegible] نہیں کی گئی ہے۔

انگریزی الفاظ کا تلفظ املا اور اردو ترجمہ

انگریزوں کے سیاسی اقتدار سے ثقافتی سطح پر تقاضے اور اردو اخبارات میں انگریزی الفاظ اور اصطلاحیں، یا ان کے اردو ترجمے زبان میں داخل ہو رہے تھے۔ غالب کے انگریزوں سے مراسم تھے، نیز پنشن کے مقدمے کے سلسلے میں ان کی مراسلت رہی — انگریزوں کو لکھے خطوط کے فارسی مسودے وہ انگریزی میں ترجمہ کرا کے ارسال کرتے تھے۔ (غالب کے لکھے مسودے دستیاب ہیں یا نہیں اس پر قدرے روشنی ڈال دی جاتی تو بہتر ہوتا۔) انگریزی الفاظ کا املا غالب جس طرح کرتے تھے اس سے ان کے تلفظ کا بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ مثالیں درج ذیل ہیں۔

تار برقی، تار [illegible]	TELEGRAM
دخانی جہاز	STEAMER
دیا سلائی	MATCH BOX
جرنیلی بندوبست	MARTIAL LAW
حاکم اکبر	GOVERNOR GENERAL
ریپلائی خط پوسٹ پیڈ	REPLY POST CARD
آئینے کی تصویر	PHOTO GRAPH
بڑا پوسٹ ماسٹر	POST MASTER GENERAL
کمشنری	DIVISION
رجسٹری دار خط	REGISTERED

● تلفظ کا اندازہ بہم پہنچانے والے انگریزی الفاظ

لارڈ	LORD
ٹاؤن ڈیوٹی	TOWN DUTY
سکرتر، سکرتری	SECRETARY
گورمنٹ	GOVERNMENT
لیکور	LIQUOR
برگیڈئر	BRIGADIER
بارک	BARRACK
پنشن	PENSION
کیمپ	CAMP
ٹفن	TIFFIN
رپورٹ	REPORT
باہمی مشورہ	COUNCIL

● وہ الفاظ جو آجکل بھی مستعمل ہیں

کلکٹری	COLLECTORATE
رجسٹری	REGISTERED
بکس	BOX
اسپتال	HOSPITAL

● وہ املا جو اب مقبول نہیں رہا ہے

اجنٹ	AGENT
لمبر	NUMBER
اسٹامپ	STAMP

جن کا املا ابھی تک تبدیل نہیں ہوا ہے

ٹکٹ	TICKET
ڈاکٹر	DOCTOR
اگریمنٹ (غالب نے اگریمنٹ بھی لکھا ہے)	AGREEMENT
پارسل	PARCEL

ڈپٹی DEPUTY
پوسٹ پیڈ POST PAID

ان تفصیلات کے بعد مکتوب الیہ کا نام اور ہر ایک کو ارسال کردہ خطوط کی تعداد وغیرہ مندرجات پیش لئے گئے ہیں۔

خطوط نگاری کا تنقیدی مطالعہ :-

۱۸ صفحات کو محیط یہ حصہ خطوط نگاری کے موضوع پر تاریخی، سماجیاتی اور انتقادی نقطۂ نظر سے بھر پور روشنی ڈالتا ہے اجمالاً نقاط ذیل پیش کرنا بے محل نہ ہوگا۔

۱ انیسویں صدی شروع ہونے سے قبل زبان و فن کے اعتبار سے اردو شاعری پختگی سے ہمکنار ہو چکی تھی۔ میر، سودا، درد، انشاء اور مصحفی ایسے بڑے شاعر اسی دور کے جگمگاتے ستارے تھے۔ یعنی اسکی شاعری معرض وجود میں آچکی تھی۔ مگر نثر نگاری ... کی نشاندہی کرتی ہے۔ بہ مشکل تمام مخطوطات ... ہوئے ہیں اور یہ بھی امکان ہے کہ کچھ معروف ایام ... ہو کر فنا ہو گئے ہوں گے۔ کل تعداد ... سے زیادہ ... ہوتی۔ تصوف، مذہب، اخلاقیات اور داستانیں ... فارسی کے چند ایک تراجم یا فارسی سے ماخوذ ذات ... پر مخطوطات لکھے گئے۔

۲ اردو کا علاقہ وہی تھا جس پر کئی صدیوں سے فارسی زبان کو بالادستی حاصل رہی اور جہاں کھڑی بولی مستعمل ہو چکی تھی۔ کھڑی بولی میں جب فارسی عربی الفاظ داخل ہونے لگے تو اردو کا رنگ روپ ابھرنے لگا۔

۳ ۱۰ جولائی ۱۸۰۰ء سے فورٹ ولیم کالج نے کام کرنا شروع کیا۔ ۱۸ویں صدی کے نصف آخر میں ایسٹ انڈیا کمپنی کو سیاسی اقتدار حاصل ہو گیا تھا۔ اس کالج کے قیام سے پہلے اردو کی نثر فارسی الفاظ و تراکیب، فارسی قواعدی ساخت کے انداز پر چلتی تھی۔ قیام کے بعد بھی کچھ عرصے تک یہی صورت حال رہی۔ اردو نثر نے پہلی مرتبہ گلکرسٹ کی ہدایت پر یہ کہ وہ زبان استعمال کی جائے جو خاص و عام بولتے ہیں۔ میر امن نے باغ و بہار کی تالیف میں اس کا ذکر کیا ہے اور اردو نثر کی یہ اہم تحریک منزل تھی اور باغ و بہار نے اردو نثر کو شناخت بخشی۔ اس کا اثر دوسرے نثر نگاروں پر پڑنا ناگزیر تھا۔ انشا کی "رانی کیتکی کی کہانی" اور رجب علی بیگ سرور کی تصنیف "فسانہ عجائب" پر اس کے اثرات دیکھے جا سکتے ہیں۔

۴ ۱۸۴۲ء میں دلی کالج ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی قائم ہوئی جس نے نصابی کتابیں ہندوستانی طلبہ کے لئے تیار کرنا شروع کیا۔

۵ اردو کا پہلا اخبار "جام جہاں نما" ۱۸۲۲ء میں کلکتے سے نکلنا شروع ہوا۔ اس کے بعد دہلی سے "دہلی اخبار" ۱۸۳۷ء میں جاری ہوا جس کے مدیر محمد حسین کے والد محمد باقر تھے۔ اس کے بعد سید الاخبار، سراج الاخبار، دہلی اردو اخبار، مظہر حق، محب وطن، قرآن السعدین، دہلی الاخبار، فوائد الناظرین وغیرہ کا اجراء ہوا۔ ان کے خریداروں میں ہندوستانی کم انگریز زیادہ تھے۔ اس طرح صاف، سادہ آسان روزمرہ شروع ہوا۔ غالباً انگریزی زبان سے تو ناواقف تھے۔ مگر انگریزی مکتوب نگاری کے اصول و ضوابط سے ناآشنا نہ تھے۔ یہ اسلوب غالباً انہوں نے انگریزوں اور ہندوستانی انگریزی خطوں سے سیکھا ہوگا۔ یہ دلچسپ حقیقت ہے کہ غالب نے مراسلے کو مکالمے میں بدل دیا۔

ء۔ نثر نگار غالب کا ظہور ۱۸۵۰ء سے پہلے ہو چکا تھا۔ مگر اس کے بعد ہی غالب نے اردو نثر بالخصوص اردو مکتوب نگاری پر زیادہ توجہ دینا شروع کی۔

غالب کا پہلا دستیاب اردو خط :-

عنوان بالا میں لفظ "دستیاب" کلیدی حیثیت کا حامل ہے۔ خلیق صاحب نے غالب شناسوں کی آرا کے تناظر میں اور جملہ حقائق کو سامنے لاتے ہوئے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ "غالب کے پہلے خط کی نشاندہی کسی طرح کرنا ممکن نہیں۔" (ص ۱۱۸) "اب تک غالب کے جتنے خطوط بازیافت ہوئے ہیں ان میں قدیم ترین خط وہی ہے جو تفتہ کے نام ۱۸۴۷ء میں لکھا گیا (ص ۱۲۳)

مکتوب نگاری کا فن :-

مکاتیب خود نوشت حالات سے زیادہ دلچسپ ہوتے ہیں۔ خود نوشت لکھنے والا دوسروں کے لئے لکھتا ہے۔ لہٰذا وہ بہت سی باتیں پس پردہ ہی رکھتا ہے۔ نجی خط دو آدمیوں کا معاملہ ہوتا ہے اور وہ اکثر و بیشتر راز ہائے دل بھی ظاہر کر دیتا ہے۔ یہ سمجھتے ہوئے کہ مکتوب الیہ کے علاوہ کون پڑھے گا۔ نپولین کے وہ خطوط جو اس نے اپنی معشوقہ جوزفین کو لکھے خاصی اہمیت کے حامل ہیں۔ کیونکہ ان میں ہم جنگی کمانڈر نپولین سے نہیں ملتے بلکہ ایک شخص سے ملتے ہیں جو دھڑکتا ہوا دل رکھتا تھا۔ علامہ شبلی اور علامہ اقبال کے عطیہ کے نام خطوط اگر ضائع ہو گئے ہوتے تو ہم ان دونوں حضرات کے دل کی کیفیات و واردات سے محروم محض ہی رہتے۔

غالب کے خطوط بھی معلومات کا خزینہ ہیں۔ غالب نے جہاں کہیں ۱۸۵۷ء کے حالات لکھے ہیں ان کو پڑھ کر بھی ایسا احساس ہوتا ہے کہ دلی آج اجڑ رہی ہے۔

خط اور گفتگو ایک دوسرے کا نعم البدل نہیں مگر مکتوب زیادہ واضح اور زیادہ بلیغ ہوتا ہے۔

مکتوب نگاری کا کوئی اصول اور ضابطہ تو مرتب نہیں ہوا ہے مگر ادبی اعتبار سے اور اگر ادبیات کو ہم سماجیات کے پس منظر سے متاثر فرض کر لیں تو یہ فن خاصہ وسیع نظر آتا ہے۔ خلیق صاحب نے مکتوب نگاری پر یورپ ایشیا نیز متعدد زبانوں کے پس منظر میں روشنی ڈالی ہے۔ اور جلد اول کا یہ حصہ خاصہ دقیع ہے۔

شگفتنِ گلہائے ناز :-

غالب اپنی عمر کے آخری حصے میں ملتزمات شاعری مثلاً یکسوئی، جوش و ولولہ، ذہنی و جسمانی ذخیرہ سے محروم ہو چکے تھے۔ اور اس پر مستزاد ذہنی پریشانیاں جو ان کو شعر گوئی کی جانب متوجہ نہیں ہونے دیتی تھیں۔ غالب کی نثر نگاری کا آغاز فارسی کی "پنج آہنگ" سے ہوا جو ۱۸۲۵ء میں مرتب ہوئی مگر شائع ہوئی ۱۸۴۹ء میں۔ دوسری کتاب "مہر نیم روز" یعنی خاندان تیموریہ کی پہلی جلد۔ دوسری جلد مکمل ہونے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ یہ کتاب دراصل اردو مسودے کا فارسی ترجمہ ہے۔ جو غالب کیا کرتے تھے۔ ۱۸۵۰ء تک غالب کا نثری سرمایہ فارسی میں یہ دو کتابیں اور فارسی و اردو میں لکھے خطوط تک محدود رہا۔

۱۸۵۷ء کے انقلاب نے خاندان تیموریہ کا شیرازہ ہی بکھیر کر رکھ دیا۔ تنہائی اور گوشہ گیری غالب کا مقدر بن گئی۔ مسائل زندگی سے فرار حاصل کرنے کے لئے انہوں نے محمود حسین تبریزی کی معرفت انہوں نے لغت گوئی "برہانِ قاطع" اور دساتیر پر توجہ دینا شروع کیا۔ کچھ عرصہ بعد "برہانِ قاطع" پر اعتراضات اور روزنامچے کے انداز میں "دستنبو" لکھنے کا خیال آیا۔ کچھ عرصہ بعد

ہنارسہیل گیا

برہان قاطع" پر اعتراضات پر مشتمل غالب نے اپنی کتاب "قاطع برہان" شائع کی جس نے طوفان برپا کر دیا اور غالب پر اعتراضات کی توپیں داغی جانے لگیں۔ جواباً غالب نے دو رسالے نامہ غالب اور تیغ تیز اپنے نام سے اور دو رسالے لطائف غیبی اور سوالات عبدالکریم دوسروں کے نام سے شائع کئے۔ مزید برآں خطوط کے سہارے غالب نے خلوت کو جلوت میں تبدیل کر لیا تھا۔

۱۔ غالب کے خطوط میں منطقی استدلال، ٹھہرا ہوا جذبہ اور ایک مخصوص فکر و احساس کی جلوہ گری ملتی ہے اجتماعی تجربے، ذاتی واردات، اہم ترین سیاسی، سماجی اور ثقافتی تبدیلیوں اور فلو ذ نتیجتاً رونما ہونے والے ردعمل، روزمرہ کی زندگی، نئے طرز نظام کے مسائل وغیرہ کی بھرپور آواز غالب کے خطوط سے ابھرتی ہے۔

۲۔ اپنی شاعری میں پوری کائنات سے مبارزہ طلبی کی ہمت مگر خطوط میں ضرورتوں اور احتیاجوں کے حصار میں گرفتار غالب اہل ثروت کے سامنے کاسہ گدائی کے لئے کھڑا نظر آتا ہے۔ شاعری میں خود بینی و خودداری اور نثر میں تملق و چاپلوسی پر اترا ہوا غالب دیکھنے میں آتا ہے۔ خطوط میں ان کے کردار کی بلندی و پستی، خودداری و خود نگری، تملق و دریوزگی، دروغ گوئی و مصلحت کوشی واشگاف طور پر منعکس ہوتے ہیں۔ وہ تو کہئے قوت ارادی اور زندہ رہنے کے سلیقے نے انہیں مرنے سے بچا لیا ورنہ وہ بہت پہلے ہی ختم ہو گئے ہوتے۔

۳۔ خطوط غالب اس حقیقت کی نشاندہی کرتے ہیں کہ غالب کی دنیا انگریز عہدیداروں سے ان کے تعلقات کی وجہ سے بہت وسیع تھی۔ متعدد ریاستوں مثلاً رام پور بیکانیر، الور، بھرت پور، لوہارو، فیروزپور، حیدرآباد، اودھ، جے پور، باندہ کے حالات کو خطوط فراہم کرتے ہیں۔

۴۔ خطوط سے بھی ان کی انا اور انفرادیت ظاہر ہوتی ہے۔ غالب کے انا کے تین سرچشمے تھے۔ (الف) خاندانی وقار (ب) مہارت فن (د) فارسی دانی۔ خاندانی وقار نے ان کو کبھی افراسیابی الذکر دیا۔ کبھی سلجوقیوں کو ہمگوتر کا دعویٰ کرایا۔ کبھی اپنے کو سلجوقی کہا اور بالآخر تمہورہ بر کیا کی اولاد ہونے کے مدعی ہوئے۔ ڈاکٹر یوسف حسین اور قاضی عبدالودود کی رائے میں غالب اوزبک تھے۔ ان کی انا یہ بھی گوارہ نہ کرتی تھی کہ کوئی ان کا پتہ تفصیل سے لکھے صرف نام اور دلی لکھنا کافی سمجھتے تھے۔

القاب و آداب :۔

اس پر خلیق صاحب نے تجزیاتی بحث کی ہے اور ان کا یہ نتیجہ اخذ کرنا خطوط میں غالب نے القاب لکھنا بند نہیں کیا تھا بلکہ لمبے لمبے پرتکلف اور پرتصنع القاب کا استعمال بند کر دیا تھا بالکل صحیح معلوم ہوتا ہے انہوں نے ایک تو القاب کو مختصر کیا اور دوسرے کو مکتوب الیہ سے اپنے ذہنی رشتے کا ذریعہ بنایا۔ اس طرح ایک فطری انداز پیدا ہو گیا۔

غالب کا آئین نامہ نگاری :۔

ان کے خطوط کی بنیاد زیادہ تر مطلب نویسی پر ہے۔ ان کی کوشش یہی رہتی تھی کہ سیدھی سادی زبان میں بات کہیں کہ پڑھنے والا فوراً ان کا مافی الضمیر سمجھ لے۔ ان کے ہاں شوقیہ خطوط بہت کم ملتے ہیں، زیادہ تر مطلب نویسی اور مقصد براری کے لئے لکھتے تھے۔ خلیق صاحب نے بے شمار مثالیں پیش کی ہیں اور اس طرح وہ بطور محقق پوری طرح عہدہ برا ہوئے ہیں۔

خطوط میں مکالمہ نویسی :۔

۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد وہ تنہا رہ گئے تھے۔ ست، عزیز، شاگرد اور ملنے والے اکثر و بیشتر مارے گئے یا ر ہو گئے۔ اس بات کا ذکر انہوں نے بہت سے خطوط میں کیا۔ خطوط کے ذریعہ اپنی خلوت و جلوت اور تنہائی میں انجمن سی کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ خط پڑھنے، خط لکھنے اور لفافے بنانے میں خاصا وقت صرف ہو جاتا ہے۔ خطوط کو تقریر کا آئینہ بنانا چاہتے تھے اور لیے خطوط ، تو اچھے خاصے مکالمے لکھے ہوئے ملتے ہیں، جن کو دیکھ کر ازہ یہ ہوتا ہے کہ ان کی تحریروں میں شعوری کوشش خل نہ تھا بلکہ مکالمے برجستہ سپرد قلم ہو گئے۔ یہ لوب ان کا اپنا ہے۔ طرز غالب کا ہے انداز بیاں اور نئی اعبارتیں ہے:-

غالب بہت محتاط ہے۔ ایسے اردو خطوط کی تعداد ت کم ہے جو پورے کے پورے مقفیٰ ہوں۔ کہیں کہیں دو مقفیٰ فقرے آئے بھی ہیں تو بھی برجستگی اور بے ساختگی ساتھ آئے ہیں۔ گرچہ فورٹ ولیم کالج میں سادہ و سلیس دو نثر شروع ہو گئی تھی مگر اس کو حسن سادگی سے ب ہی نے آراستہ کیا۔

بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

چونکہ بنیادی طور پر شاعر تھے۔ غالب اردو میں لکھتے وقت عام بول چال اور روزمرہ کی زبان استعمال تے مگر کہیں کہیں ایسی تشبیہیں اور استعارے بھی کام میں تے جن کے استعمال سے ان کا اظہار زیادہ موثر معنی خیز لفظ اور جسہ ... تھے۔ یہ تشبیہیں اور استعارے تی بھی ہوتے تھے اور ان کی جدت پسندی ... کا نتیجہ بھی۔ تفتہ کے نام ایک خط میں ایک انگریزی ترکیب "SICK NUMBER" "سک نمبر" اس سے

مراد اس فوجی کی ہوتی ہے جو بیماری کی وجہ سے اسپتال میں داخل ہو گیا ہو۔ اس کے سہارے غالب نے اپنی سابقہ خدمات نواب رام پور سے تعلقات، خرابی صحت، پیرانہ سالی سب کچھ بیان کر دیا ہے۔ یہ سمجھتے ہوئے کہ موت قریب ہے انہوں نے لکھا

"میں تو چراغ صبح دم و آفتاب سر کوہ ہوں"

کبھی کبھی سادہ نثر لکھتے لکھتے ایک دو مقفیٰ فقرے بھی برجستہ طور پر لکھ جاتے تھے جس سے عبارت مزید بامعنی اور مؤثر ہو جاتی تھی۔

کچھ محاورے ملاحظہ ہوں:-

ہاتھ دھوئے بیٹھا ہوں، بیچ میں ایک اور پیچ آ پڑا ہے، تہہ توڑ دی ہے، باتیں بگھارتے ہیں، پیاس نہیں بجھتی، لالے پڑے ہیں، دیدے پھوٹیں۔ ایمان نصیب نہ ہوں، چھاتی پر سانپ سا پھر جاتا ہے۔

شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے:-

اس عنوان کے تحت خلیق صاحب نے وہ اشعار پیش کئے ہیں جو غالب نے اپنے خطوط میں استعمال کئے۔ اس استعمال سے بھی مزید معنی آفرینی کے جوہر کھلتے ہیں۔ اشعار فارسی کے بھی ہیں اور اردو کے بھی۔

موقع نگاری:-

غالب کے خطوط میں خاکہ نگاری کے ابتدائی نقوش بھی کہیں کہیں دیکھنے میں آتے ہیں۔ مثلاً علائی کے نام اپنے خط میں نواب رام پور کا اچھا مرقع پیش کیا ہے۔

اک ذرا چھیڑیئے پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

تاب لائے ہی بنے گی غالب واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

(بقیہ صفحہ ۲۸ پر)

حالات بر عکس

کامیابیاں حوصلہ افزا

ہماری رسائیاں ـــــــــ ہمارے عہد و پیمان

عوامی حمایت کی طاقت پر اب تک سامنے آئی ہر ابتلا اور ہر چیلنج کا آہنی ارادوں کے ساتھ مقابلہ کرتے ہوئے موجودہ سرکار بدبختی کے آہنی زنجیر کو کاٹ کر خوش بختی اور خوشحالی کے نقطہ تک بہار کو پہونچانے میں مسلسل کوشاں ہے۔ ریاست کی منصوبہ بند ترقی، سماجی انصاف کی حصولیابی۔ دلتوں اور پسماندوں کی حکومت میں حصہ داری، بدعنوانی کی روک تھام اور سماجی اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی میں استحکام کو ترجیح دیتے ہوئے منصوبہ بند ترقی کی سمت ریاستی سرکار رواں ہے۔

کوئلہ رائلٹی کی در میں مرکزی حکومت سے ۱۴ گنا اضافہ کی منظوری حاصل۔ قیمت کی بنیاد پر رائلٹی در طے کرانے کی کوشش جاری

کوئلہ سمیت اہم معدنیات پر سیس لگانے کے لئے مرکزی سرکار کے حق کو پھر سے حاصل کرنے کے لئے مرکزی سرکار سے لگاتار رابطہ

۱۰۰ میگاواٹ کے کوئل کارو بجلی پروجیکٹ مرکزی سرکار کے خرچے سے بنائے جانے کی منظوری۔ نالندہ کول بجلی پروجیکٹ کو آٹھویں پنج سالہ اسکیم میں پورا مرکزی دائرے میں شامل کرتے ہوئے کام شروع کرا دینے کی مرکز سے گزارش

● ریاست کے صنعتی ترقی کے لئے لوہے اور اسپات کی صنعتی فریٹ ایکیولائزیشن پالیسی ختم کرانے کی اپیل

● ریاست سرکار کے ذریعہ ریاست کے معدنیات مادوں پر مبنی صنعتوں کے قیام کے لئے صنعت کاروں کو ترغیب جن سے بےروزگاری کے مسئلے کا حل

● نسکو منیجمنٹ سے قریب ۱۰ کروڑ سے اوپر بقایا کی ریاست

میں قائم کرنے کی یقین دہانی حاصل۔ ٹاٹا اور آر۔پی۔جی جیسے بڑے صنعت کاروں کے تعاون سے ریاست میں صنعتی ماحول کی تعمیر کی کامیاب کوشش

● ریاست میں بجلی کی ترقی کے لئے زیادہ سے بجلی سپلائی کے لئے این۔ٹی۔پی۔سی ٹرانسمیشن لائن لگانے۔ تیز برقی کا منیجمنٹ این۔ٹی۔پی۔سی سے جوڑنے اور ناگر کرن پورا برقی بجلی پروجیکٹ کو ۸ویں اسکیم میں شامل کرنے کے لئے اعلیٰ سطح کی کوشش

● ریاست کے کسی ایک ضلع کا انتخاب کر صرف دیہاتوں میں بجلی پہونچانے کے منصوبہ پر عمل

● غریب عوام کو علاج اور صحت کی سہولت مہیا کرانے کی غرض سے فی الوقت تجربہ کے طور پر ورلڈ ہیلتھ [illegible] فنڈ سے پٹنہ میڈیکل کالج اسپتال اور ضلع اسپتالوں میں [illegible]

● پالیٹکنک، آئی۔ٹی۔آئی، انجینئرنگ، میڈیکل، فارمیسی اور زراعت جیسے پروفیشنل تعلیم کے سبھی تعلیمی اداروں میں [illegible] پسماندوں اور [illegible] پسماندہ طبقے کے لئے ریزرویشن

● حقیقی صلاحیت رکھنے والے طلبا کو [illegible] اور [illegible]

ے انتظام کے لئے خصوصی مقامی میں قسمت کے عہدوں پر
لئے سب ڈویژنل اور ضلعی سطح پر مقابلہ جاتی امتحان کا انعقاد پر [illegible]
[illegible] کی روک تھام اور سماجی ۔ اقتصادی نابرابری کو پاٹنے کے
بین اور گا رگر پروگرام [illegible] اولیت کی بنیاد پر ترجیح۔
کالا ازار وغیرہ تھام کے لئے گزشتہ سال کے مقابلے میں دوگنی
[illegible] اس سال کرنے جانے کا سک [illegible] سیاسی
ابتدائی علاج مرکز تک کالا ازار وغیرہ تھام پروگرام کے لئے
[illegible] کا انتخاب
پرائمری تعلیم کو نیا موڑ ۔ بہار تعلیمی پروجکٹ کے لئے [illegible]
روڑ روپیہ کے خرچ کا انتظام ۔ ۲۰ ہزار پرائمری ٹیچروں کی
ضابطہ تیار اگلے چند مہینوں میں بحالی کا عمل پورا کرنے کا
، اسکولوں میں بحالی کے لئے ٹریننگ کی شرط ختم
یونیورسٹی امتحانوں کے بیک لاگ ختم کرنے کی غرض سے ایسے
کی تشکیل پر غور جو سبھی یونیورسٹیوں کی طرف سے امتحان
سے ۔ [illegible] جسے [illegible] یونیورسٹی ، دربھنگہ میں [illegible]
[illegible] پورہ میں بھوپندر نرائن منڈل یونیورسٹی اور آرہ میں
[illegible] یونیورسٹی کا قیام ۔
اقلیتی کمیشن کو قانونی اختیارات دینے کا فیصلہ ۔
ت میں بہار پورے ملک میں آ گیا ہے ۔ دلتوں ۔ پسماندہ
اور کمزور طبقوں کے لوگوں کی حکومت میں [illegible] ۔ اقلیتی
[illegible] کی گھیرا بندی [illegible] میں پورا کرنے کا فیصلہ ۔ سبھی
[illegible] تشکیل شدہ انتخابی کمیٹیوں میں اقلیتی
نمائندوں کو نامزد کرنے کا عہد ۔ اقلیتی ادارے کے ٹیچروں
[illegible] اسکولوں کے برابر سہولتیں دینے کا فیصلہ
دیگر حکومت کی طرح بہار عدالتی خدمات کی بحالی میں
[illegible] کا انتظام ۔

[illegible] کمیشن اور [illegible] کمیشن کی تشکیل کا فیصلہ [illegible]
کو ترقی کے [illegible] سے [illegible]
کا سٹ کے [illegible] پبلک سروس کمیشن [illegible]
امتحانات میں کامیاب ہونے کے لئے [illegible] ٹریننگ دینے کے لئے [illegible]
اور [illegible] کے تحت [illegible]
کا انتظام ۔

- [illegible] پر [illegible] بچوں کی [illegible]
ضلع کا انتخاب
- فرقہ واریت ۔ انتہا پسندی اور [illegible]
شدہ قانون [illegible] کی حالت کا [illegible] مقابلہ
کرنے کے لئے پولس آدھنک [illegible]
- دہشت گردوں پر قابو پانے کے [illegible] پولس فورس کو
جدید ہتھیاروں سے لیس کرنے کا انتظام
- ایم سی ۔ سی ، اسٹالنسٹ سینا ، لال کھنڈ سینا وغیرہ
کو غیر قانونی [illegible]
- دنگا [illegible] کے لئے [illegible] سے [illegible]
بنانے کی منظوری اور [illegible]
- [illegible]
کر [illegible]
[illegible]
چوکیدار اور [illegible]
کرتے ہوئے [illegible]
- [illegible]
[illegible] اسکیموں [illegible]
کی ترقی اور زرعی تعلیم کی [illegible]
[illegible] ریاست کے [illegible]

میں ماڈرنائز کرنے کے لئے سرکار کے ذریعہ ٹھوس کارروائی۔ اس
منصوبہ کے تحت پل سمیت تقریباً ۱۲۰۰ کیلو میٹر نئی
سڑکوں کی تعمیر ہوگی۔

۲۰۰ کروڑ روپئے کی تخمینی لاگت پر ریاست کے
۱۷۱ بلاکوں میں ورلڈ بینک کی مدد سے آئی سی ڈی ایس
پروگرام منظور کرانے کی کوشش

سرکاری خدمات میں بحالی کی زیادہ سے زیادہ عمر
کی حد ہریجن، آدیباسی کے لئے ۴۰ سال، پسماندہ طبقہ کے
لئے ۳۷ سال اور دیگر کے لئے ۳۵ سال طے۔

★★★

● جاری کردہ ●

محکمہ اطلاعات وتعلقات عامہ بہار

P.R. No 64 D (inf-55) 91-92

[illegible]

جواب کے لئے ٹکٹ ضرور ارسال کیا کریں

(غالبیات اور — بقیہ)

غالب کی آرزوؤں کے شیش محل چکنا چور ہو گئے تھے۔
انفرادی طور پر بھی اور اجتماعی طور پر بھی ایسے اشعار
بھی موجود ہیں اور اپنے خطوط میں بھی۔ ذاتی غم کو خوش طبعی
نے کم کر دیا تھا وہ اپنی کمزوری اور بدحالیوں کا بے باکانہ
بھی اڑا جاتے تھے۔ ان کے خطوط ان کی مجبوری و بے بسی
سماجی تبدیلیاں، اخلاقیات، تصوف، برطانوی سامراج
کے اثرات وغیرہ کی نشان دہی ہوتی ہے۔ وہ مشرقی
تہذیب کے مداح ہی نہیں ماتم گسار بھی تھے۔ غالب
دستنبو میں انقلابیوں کی مذمت کی ہے مگر یہ حالات
کی ترکیب تھی اور یہ اس فکر سے بھی عبارت تھی کہ ان کی
پنشن ملتی رہے۔

عمر بھر کا تو نے پیمان باندھا تو کیا.....

غالب موت سے بہت گھبراتے تھے اور غالباً اسی لئے
نامے لکھنے سے گھبراتے محسوس ہوتے ہیں۔ خلیق انجم کی
جمیلہ کو غالبیات میں مخصوص مقام و مرتبہ حاصل رہے
گا۔

(بقیہ صفحہ ۳۲ کا)

تک رسائی حاصل کرنا ذرا مشکل ہے اس لئے ہم
بسا اوقات اس سے بھاگتے ہیں۔ لیکن ہمیں یہ بھولنا
کہ کچھ ایسے لمحے بھی ہوتے ہیں جب یہ ذرائع ترسیل
کے لئے خود کار مشینوں کی طرح کام کرنے لگتے ہیں، مثلاً
اپنا مفہوم خود بخود ظاہر کرنے لگتے ہیں۔ چہرے آپ ہی آپ
بولنے لگتے ہیں اور اسی زبان میں بولتے ہیں جسے
سننے والا کسی الجھن اور دشواری کے بغیر سمجھ لیتا ہے۔ میں
لمحوں میں اسی مطالعے میں مستغرق تھا۔ اور یہ اسی صورت

علیم اللہ حالی

ہم مسافر جہاں جہاں گزرے

(قسط ۲)

سیٹھ تو گفتگو کے درمیان معلوم ہوا کہ جناب نظر پاکستانی کمیونسٹ پارٹی کے پولٹ بیورو کے ممبر رہ چکے ہیں، انہوں نے مزدور یونین کی تحریک کو آگے لیجانے کا کارنامہ انجام دیا ہے۔ ہندوستان کے تمام اہم قائدین سے ان کے برابر کے تعلقات رہے ہیں۔ سے تلنگانہ تحریک سے ان کی پرانی وابستگی رہی ان اختلافات کے باوجود ان سے بے تکلفی اور قربت سے بھی بڑھ گئی کہ جناب اعزاز نظر اپنے اظہار میں بے باک رہیں۔ کمیونزم کو انہوں نے اوپر سے اوڑھا بلکہ اس نظریہ حیات کے تمام انسانی اور اخلاقی کا عالمانہ مطالعہ کرکے انہوں نے اسے اپنا شعار حیات ظاہر و باطن کی یہ یکسانیت بہت سے ان کمیونسٹوں میں تھی جو کمیونسٹ اقتدار سے جڑے ہوئے ہیں۔ خاص وجہ یہ ہے کہ انہوں نے کبھی کمیونزم کو اپنا کیریر نہیں بنایا۔ کمیونزم کے بنیادی اور اساسی سمجھے بغیر اور ان پر مکمل اعتقاد کئے بغیر جو حضرات پارٹی میں آتے ہیں اور خود کو کمیونسٹ کہلاتے ہیں ان پر سب سے بہترین اطلاق

جدلیاتی مادیت کو مانے بغیر جو شخص کمیونسٹ ہونے کا دعویٰ کرتا ہے وہ اسلام کے دعویدار اس شخص کی طرح ہے جسے خدا کی وحدانیت پر یقین ہی نہ ہو۔ ایسے معصوم کمیونسٹوں کی نہ پاکستان میں کمی ہے اور نہ ہندوستان میں۔

ہماری گاڑی صبح اٹاری پہنچ گئی۔ جہاں کسٹم وغیرہ کے مراحل طے ہوتے ہیں۔ مجھے اندازہ ہوا کہ ہندوستانی کسٹم کے لوگ نرمی سے کام لیتے ہیں۔ غیر ضروری طور پر جنوبی ایشیا کو تنگ نہیں کرتے۔ ایک عام احساس اور تجربہ یہ ہے کہ ہندوستانی اور پاکستانی کسٹم کے افسروں میں نمایاں فرق ہے۔ لوگوں نے مجھے بتایا تھا کہ پاکستان کے Immigration اور کسٹم کے مراحل میں ناجائز پیسے دینے پڑتے ہیں۔ رشوت ستانی میں چھوٹے بھائی بڑے بھائی سے کہیں آگے ہیں۔ اس لئے میں ہندوستانی بارڈر تو نہیں پاکستانی بارڈر سے خوف زدہ تھا اٹاری میں ہندوستانی کسٹمز اور چیکنگ کا طور طریقہ اور معیار کار دیکھ کر خوشی ہوئی۔ اس اسٹیشن کو ہندوستان نے سجانے سنوارنے میں خاصے پیسے صرف کئے ہیں۔ مسافروں کی سہولت کے لئے جملہ آسانیاں موجود ہیں۔ یہاں پانی

اور سفر کے دوسرے ضروری کاغذات کی جانچ پڑتال نیز ساما نوں کی چیکنگ کے بعد مسافروں کو دوسرے متصل پلیٹ فارم پر جانے کی ہدایت ملتی ہے تاکہ وہ اس ٹرین پر سوار ہو سکیں جو اٹاری سے لاہور لیجاتی ہے۔ ہم لوگ صبح سویرے پہنچ گئے تھے۔ اس وقت کسٹم کے عملے نہیں آئے تھے اس لئے ہمیں ضروریات سے فارغ ہونے کے لئے وافر وقت مل گیا، بڑے اطمینان سے ہم [illegible] ناشتے سے فارغ ہوئے۔ کچھ دیر تک ٹہلتے گھومتے رہے، اخبار پڑھا، آس پاس کے ماحول پر نظر ڈالی۔ نئی جگہ کے نئے لوگ بھلے لگتے ہیں، ان کو دیکھتے رہے، جن سے موقع ملا کچھ گفتگو بھی کی۔ دراصل اجنبیت خود بھی ایک حسن ہے ایک وجہ کشش ہے۔ مرحلۂ شوق تو ہر لحظہ نیا طور نئی برق تجلی سے ہی پورا ہوتا ہے مجھے نئے اور اجنبی لوگوں سے ملنے میں ایک لطف خاص ملتا ہے۔ اٹاری اسٹیشن پر پاکستانی ٹرین کا انتظار کرنے والوں میں وہ پاکستانی افراد بھی تھے جو یہاں اپنے اعزہ سے مل کر ایک غیر معینہ مدت کے لئے اپنے وطن واپس ہو رہے تھے اور میرے جیسے ہندوستانی بھی تھے جن کی آنکھیں اپنے عزیزوں کو دیکھنے کے لئے ترس رہی تھیں۔ جو اپنے احباب سے ملنے نیز ان کے احوال جاننے کے لئے سفر کی صعوبت بھی بھول بیٹھے تھے۔ انسان چھوٹی چھوٹی خواہشات اور معمولی تمناؤں کی تکمیل کے لئے کتنی بڑی بڑی تکلیفیں ہنسی خوشی جھیل جاتا ہے دراصل رنج و راحت کا سارا مسئلہ انسان کی نفسیات سے تعلق رکھتا ہے۔ سوچا جائے تو ان کا معروضی وجود صفر کے برابر ہے۔

مجھے اٹاری کے ہندوستانی چیک پوسٹ سے کوئی وحشت نہیں تھی۔ میں تو اس بات کے لئے فکر مند تھا کہ پاکستانی بارڈر پر کتنی ذہنی کوفت سے گزرنا ہوگا، پھر یہ بھی فکر تھی کہ لاہور پہنچ کر کراچی کے لئے کون سی ٹرین ملے گی۔ اس ٹرین میں ریزرویشن بھی ہو سکے گا یا نہیں۔ ایک لمبا سفر تھا جس میں سہولتوں کا تصور معدوم تھا۔ میں نے وحشت کا ذکر جناب اعزاز نظر سے بھی کیا، انہوں نے تقویت پہنچائی اور یہ بتایا کہ انہوں نے ہندوستان سے [illegible] کے وقت لاہور میں اپنے آدمیوں کے پاس ٹیلی گرام سے بھجوائی ہے۔ اگر تار انہیں مل گیا ہوگا تو وہ لاہور اسٹیشن پر موجود رہیں گے۔ اور یوں مجھے بھی آسانیاں میسر آئیں۔ میں سوچ رہا تھا کہ پتہ نہیں وہ ٹیلی گرام انہیں ملا یا نہیں۔

کسٹم کی فارملٹیز کے سلسلے کی ایک بات الجھن میں ڈالتی ہے۔ وہ یہ کہ لوگ ہر مسافر کے ساتھ جیسا سلوک کرتے ہیں، مسافروں کی حیثیت، ان کے مشاغل اور ان کے مرتبے کو نہیں سمجھتے ظاہر ہے کہ اسمگلر، سرکاری ملازمین، اساتذہ، فن کار، دانشور اور سیاست داں سبھوں کو ایک درجہ میں نہیں رکھا جا سکتا۔ کسٹم کے وقت اس فرق کو سامنے رکھنا ضروری ہے۔ اس نکتے کو مدنظر رکھا جائے تو نہ صرف بہت سے لوگوں کو زحمت سے نجات مل سکتی ہے بلکہ خود کسٹم کے عملے کی محنتوں سے بچ سکتے ہیں۔ میں وہاں یہ تجویز کس کے سامنے رکھتا اور اس تجویز کی قیمت ہی کیا بن سکتی ہے جب تک کہ ذاتی طور پر مستفید ہونے کا تصور کیا جائے۔ سخت حیرت اور مسرت ہوئی کہ پاکستانی کسٹم کے عملے سے واقف ہیں۔ اور عملہ خود پرا سے ہوتے ہیں۔ بہر حال! اٹاری کی چیکنگ بھی کچھ زیادہ پریشان کن نہ تھی۔

جب اس منزل سے گزرے تو ہم اس پلیٹ فارم پر چلے گئے جہاں سے لاہور کی گاڑی ملتی تھی۔ اٹاری

جلدی واہگہ پہنچ گئے۔ یہاں سے پاکستان کی سرحد شروع ہوتی ہے۔ یہاں گاڑی ایک اجاڑ اور بے آب و گیاہ اسٹیشن پر رکی ہوئی تھی اور مسافروں کو ہدایت دی گئی تھی کہ وہ لائن میں لگ کر اپنے پاسپورٹ پر IMMIGRATION لگوالیں میں بھی اپنے پاسپورٹ کے ساتھ ایک لمبی قطار میں پہنچ گیا۔ ایک صاحب کرسی پر بیٹھے تھے۔ جیسے جیسے لوگ آگے بڑھتے جاتے تھے وہ پاسپورٹ مانگ کر دیکھتے جاتے تھے پھر پاسپورٹ واپس کر کے امیگریشن کے لیے سامنے کے کمرہ میں جانے کی ہدایت دے رہے تھے، میں قریب پہنچا تو میں نے اپنا پاسپورٹ دکھایا۔ الٹ پلٹ کر دیکھا۔ اندر پڑھا، پھر سوال کیا۔

آپ کے پاسپورٹ میں TEACHING لکھا ہوا ہے، آپ کہاں پڑھاتے ہیں؟ میں نے جواب دیا — ریاست بہار میں مگدھ یونیورسٹی ہے۔ میں وہیں شعبہ اردو میں پروفیسر ہوں۔

میرے جواب دیتے ہی وہ صاحب اٹھ کر کھڑے ہوگئے اور برجستہ سلام کرتے ہوئے کہا کہ آپ کے یہاں جتنے پاسپورٹ ہیں مجھے دے دیں، آپ کو لائن میں کھڑے ہونے کی ضرورت نہیں۔ وہاں تشریف رکھیں میں پاسپورٹ پر امیگریشن لگوا کر بھجوا دیتا ہوں۔

میں نے اس تہذیب کی اخلاق کی ہرگز توقع نہیں کی تھی، غیر متوقع طور پر اس حسین سلوک سے بڑی خوشی ہوئی۔ حسب ہدایت ایک جگہ بیٹھ گیا۔ کچھ ہی دیر میں وہ صاحب خود [illegible] پاسپورٹ مجھے واپس کرتے ہوئے بولے۔ آپ کا کام ہوگیا ہے اب آپ ٹرین میں بیٹھیں اور میرے لائق خدمت ہو تو فرمائیں۔ اس سلوک اور طریقہ کار [illegible] خصوصاً ایسی صورت میں کہ میں نے سن رکھا تھا کہ پاکستان بارڈر پر امیگریشن کے لئے ہر پاسپورٹ پر پچاس روپے لئے جاتے ہیں۔ اور وہاں کے عملے طرح طرح سے رقم اینٹھنے کی کوشش کرتے ہیں میرا یہ تجربہ بالکل برعکس نکلا میں نے نہایت بے باکی سے کہا —

آپ معاف فرمائیں، مجھے نہیں معلوم تھا کہ پاکستان میں آپ جیسے سرکاری افسران بھی ہیں۔ میں نے تو کچھ اور سن رکھا تھا اس سے بے حد مایوس تھا، آپ نے میرے تلخ تاثرات کو خوشگوار تجربات میں بدل دیا۔ آپ کا کیا نام ہے؟ انہوں نے بتایا — منیر احمد کھوکھر — انہوں نے بڑی خندہ پیشانی سے میرا استقبال کیا اور یہ بتایا کہ ہم لوگ اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ بارڈر پر مسافروں کے درجات کے لحاظ سے ان کے ساتھ سلوک کرتے ہیں۔ منیر احمد سے مل کر بے حد خوشی ہوئی۔ میں نے پاکستان اور ہندوستان میں کئی جگہ ان کا ذکر کیا۔ اگر حکومت کے ملازمین اسی خندہ روئی، مہمان نوازی اور خوش خلقی کا ثبوت دیں تو نہ صرف ایسے افراد کے بارے میں بلکہ پوری حکومت کے بارے میں اچھے تاثرات قائم ہوتے ہیں۔

میں امیگریشن سے خوشی خوشی واپس ہوا اور ڈبے میں بیٹھے چند افراد کو یہ واقعہ سنایا تو سبھوں کو تعجب ہوا۔ اب لاہور پہنچ کر کسٹم کے مرحلے سے گزرنا تھا۔ جناب اعزاز نظر نے جن صاحبان کو اپنی آمد کی خبر دی تھی ان کی آمد کے لئے دعا گزار تھا۔ ہم جیسے ہی ڈبے سے اترے دیکھا کہ تین چار حضرات جناب اعزاز نظر کی طرف لپکے۔ اندازہ ہوگیا کہ ان کا ٹیلی گرام مل چکا تھا۔ اور یہی وہ لوگ تھے جن کا انتظار تھا۔ جن کی ضرورت تھی۔ اعزاز صاحب نے تعارف کرایا۔ معلوم ہوا کہ ان میں سے ایک صاحب پاکستان

ریلویز امپلائز یونین کے اہم عہدہ دار تھے۔ افسوس کہ مجھے
ان کا نام یاد نہیں رہا۔ انہوں نے جناب اعزاز نظر کے ساتھ
ہمارا بھی استقبال کیا اور یوں کسٹمز کی صعوبت سے بیک
اشارہ چشم نجات مل گئی۔ یہی نہیں انہوں نے لاہور ریلوے
اسٹیشن کے ایک دفتر میں ہمیں بڑی محبت سے بٹھایا، وہاں
ہم منہ ہاتھ دھو کر تازہ دم ہوئے۔ پھر ازراہ مہمان نوازی
انہوں نے ناشتے اور چائے سے ضیافت کی۔ مجھے اس انداز
ملاقات سے یہ اندازہ ہو گیا کہ جناب اعزاز نظر کی شخصیت
ان تمام لوگوں میں بڑی معتبر اور محترم ہے۔ چند افراد
باہر سے آکر ان سے ملتے رہے۔ پھر ان سبھوں کے اصرار
پر جناب اعزاز نظر نے اپنا سابقہ پروگرام بدل دیا۔ پہلے
پروگرام یہ تھا کہ وہ ہمارے ساتھ کراچی جائیں گے مگر اب
انہوں نے یہ بتایا کہ انہیں دو ایک دن لاہور میں رک جانا
پڑے گا۔ انہوں نے اپنے رفیقوں سے کہہ کر ذوالفقار ایکسپریس
کے ائیر کنڈیشنڈ ڈبے میں ہماری برتھ ریزرویشن کرا دی۔
انہیں مہمان نوازوں نے ہمیں گاڑی پر سوار کیا اور یوں
نہایت آرام و اطمینان کے ساتھ ہم کراچی کی طرف روانہ ہو گئے۔
ذوالفقار ایکسپریس کم و بیش ۷ بجے شام کو لاہور سے
روانہ ہوئی اسے دوسرے دن شام چار بجے کراچی پہنچنا تھا۔
ائیر کنڈیشن کی وجہ سے ہم سفر کی تھکان سے بچے رہے۔ مئی کا
مہینہ تھا، کبھی ڈبے سے باہر نکلے تو اندازہ ہوا کہ سندھ کے
اس ریگستانی علاقے میں گرمی کے کتنے سخت تھپیڑے چل
رہے تھے۔ اس سال سندھ میں غیر معمولی گرمی پڑی۔ وہاں
کے لوگوں کا کہنا ہے کہ اس بار کی گرمی کی شدت نے چالیس
برسوں کے ریکارڈ توڑ دیئے۔ اس سخت گرمی اور لو کے
تھپیڑوں میں ہم آرام سے سفر کر رہے تھے اور دل ہی دل
میں جناب اعزاز نظر کو دعائیں دے رہے تھے۔ اس

لئے کہ یہ ساری سہولتیں انہیں کے طفیل حاصل ہوئیں۔
ذوالفقار ایکسپریس پشاور سے چل کر کراچی
جاتی ہے۔ جو برتھیں (BERTHES) ہمیں حاصل
ان کے علاوہ سارے برتھوں پر لاہور سے پہلے کے ر
تھے۔ کچھ ضعیف حضرات تھے، کچھ [illegible] مہمان
آپس میں اپنی اپنی زبانوں میں گفتگو کر رہے تھے۔ میں آ
کے چہروں میں ان کے سماجی، سیاسی، اقتصادی اور تہذ
تلاش کرنے میں غرق تھا۔ نئے ملک کے نئے لوگ
اور جغرافیائی [illegible] کی اہم دستاویز ہوتے ہیں۔ یہ
ہیں جو کسی خاص زبان میں لکھی نہیں ہوتیں۔ لکھی ہوئی
کا مفہوم تو مقرر اور محدود ہو جاتا ہے مگر غیر نوشتہ
کی خواندگی مفاہیم و معانی اور حقائق کا ایک عظیم ذ
کرتی ہے۔ میں ناگفتنی سے گفتنی کے اس خاموش
پراسرار سفر میں منہمک تھا۔ ان لمحات کے حاصلات
اپنائیت، شوق قربت، حسرت بیگانگی، لسانی
اور اسی طرح کی بہت سی کیفیات شریک تھیں ان
پیدا ہونے والی نیم تخلیقی فضا کے اظہار کے لئے اب
صنف ادب پیدا نہیں کی جا سکی ہے۔ شاید اس
کبھی کسی شعر، نظم، افسانے، ناول یا سفرنامے
بن جاتے ہیں اور اس طرح اپنے اظہار کا کوئی نہ کو
پیدا کر لیتے ہیں۔ میں پڑھنے کا قائل ہوں وہ کتاب
تو چہرے پڑھتا ہوں، قدرت کے مناظر پڑھتا ہو
سچ تو یہ ہے کہ جو کچھ ان چہروں اور ان فطری مناظر
سے حاصل ہو سکتا ہے وہ کتابوں کے مطالعے
زیادہ قیمتی ہوتا ہے۔ کتابوں کی زبان سمجھنا اور
آسان ہوتا ہے اس لئے ہم تو آسانی کے لئے اسی نا
کا استعمال کرتے ہیں: انسانوں اور مناظر کو پڑھ کر

[یہ خیال کہاں تک درست ہے کہ تصوف کی طرح شاعری بھی غیر توریثی صفت ہے، کہیں کسی خاندان میں کوئی برگزیدہ اور خدا ترس صوفی سامنے آجاتا ہے تو اس کے یہ معنی نہیں ہوتے کہ اس کی آئندہ نسلوں میں بھی وہی خصوصیات پیدا ہوجائیں اس طرح شاعری کا ملکہ بھی خدائے بخشندہ کی بخشش ہے۔ خاندانی صوفی اور خاندانی شاعر کی اس بحث میں پڑنے کی بجائے میں صرف اتنا عرض کروں گا کہ تصوف کی طرح شاعری میں بھی اجداد کی تربیت بڑا کام کرتی ہے، شعور کی آنکھیں کھولتے ہی ایک خاص انداز کی تربیت اور مشق و مزاولت فطری صلاحیت کو جلا دیتی ہے۔

کچھ یہی بات سعید عارفی کے بارے میں کہی جاسکتی ہے۔ وہ ہماری غزلیہ شاعری کی حسین روایات کے امین اور جگر مراد آبادی کے تلمیذ صادق حضرت عارف عباسی کے خلف سعید ہیں۔ چنانچہ خلقی طور پر شعری صلاحیت سے حامل ہونے کے ساتھ ساتھ انہیں تربیت سخن کے بھی خوب خوب مواقع ملے ہیں۔

لیکن ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ "ہر کس کہ شد صاحب نظر دین بزرگاں خوش نہ کرد" اور شاید اسی لئے سعید عارفی نے غزل کے علاوہ جدید ہیئتوں میں نظمیں بھی لکھی ہیں۔ ان کی اس وضع کی چند نظمیں ایک ساتھ اس لئے شائع کی جارہی ہیں کہ ان سے اس DEPARTURE کا اندازہ لگایا جائے جو سعید عارفی نے ایک بندھے بندھائے اور مستحکم شعری ماحول سے انحراف کے طور پر کیا ہے۔ ادارہ]

دسترس

سعید عارفی

موسموں
سے
زندگی کا
یہ شکستہ رابطہ
بے حس انگلیاں
دور تک پھیلا سرابوں کی طرح
آبِ رواں
خواہشوں کے دشت میں
جیسے کہ سب کچھ کھو گیا ہے
ذات کی کالی قبا نے
سب کو
جیسے ڈھک لیا ہے

خاک پر سوئے ہوئے ہیں
برگ و بار
موسموں کی چادریں اوڑھے ہوئے
چہل قدمی کر رہے ہیں
سانپ، عفریت، اژدہے
اور
یہ سارا عذاب
ڈھل رہا ہے
میری پیشانی کی جانب

پھر بھی
میری دسترس میں
آج بھی ہے
ایک مٹھی دھوپ
پاگل آسماں

زندگی

میں اپنی بے کیف خامشی کو
دھوئیں میں اڑا رہا ہوں
خود کو مٹا رہا ہوں
یا
آہستہ آہستہ ایک ایک کش لے کر
ماضیٔ گمشدہ سے
بچھڑی ہوئی زندگی کو
بلا رہا ہوں

گریز

روح کے اندھیروں کو
خارجی اجالے
اب نگل نہیں سکتے
میں نے اپنی آنکھوں کی
آب و تاب کو دے کر
تیرگی میں بسنے کی
آرزو کی تھی
اور آج
گنبدِ بے در میں خود اسیر بیٹھا ہوں
ایک ایک کرن اجالوں کی
پھینک کر
بجلیوں کے کھمبوں پہ

زہر

یہ زندگی
جو لذیذ زہر کا پیالہ ہے
ہم بصد خلوص و نشاط
پی رہے ہیں
اور جی رہے ہیں
اسی طرح
جیسے صدیوں پہلے
کسی نے
ثبات کی خاطر
جامِ زہراب پی لیا تھا

سعید عارفی

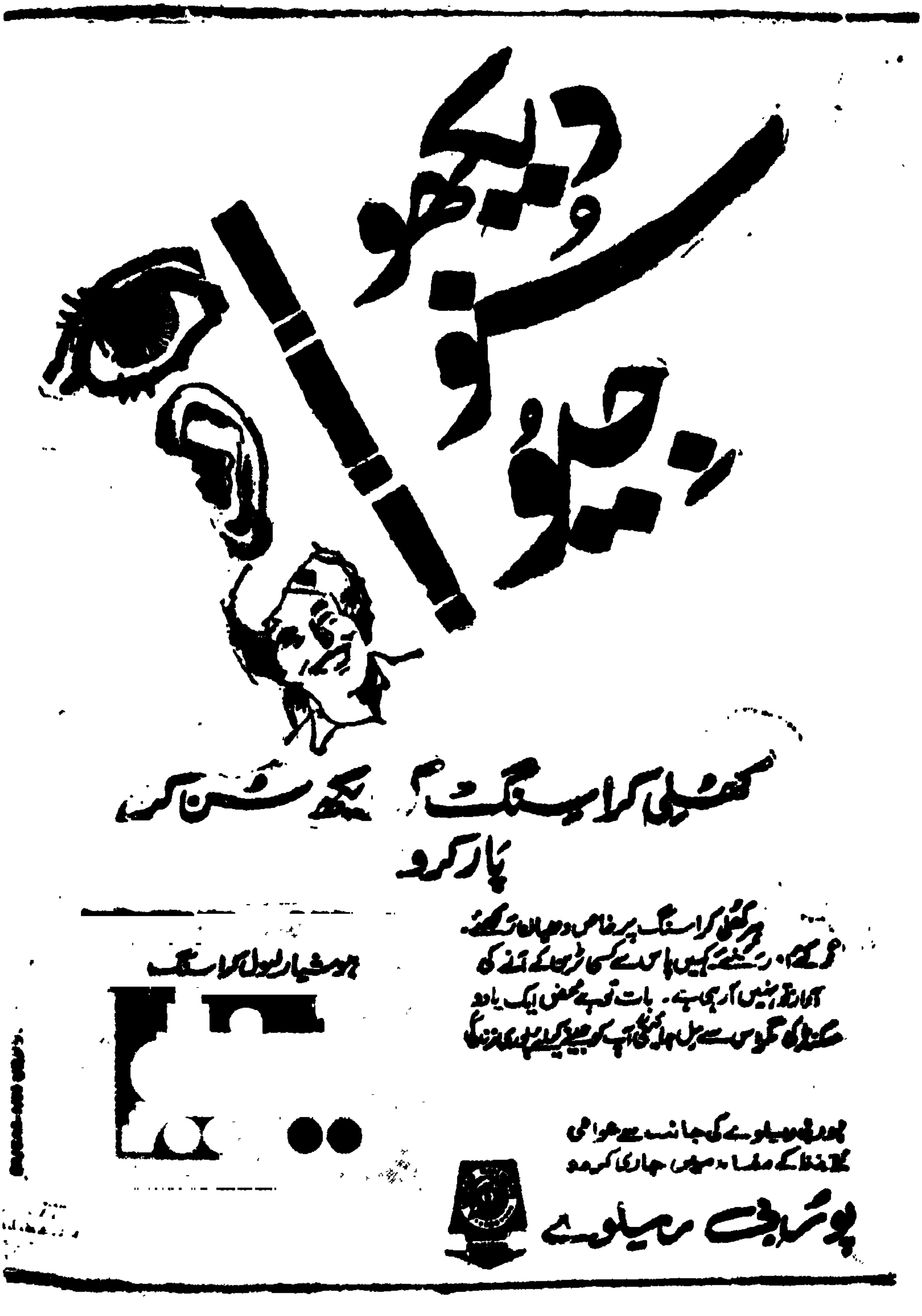
دیپک قمر

آگ کے پھول پہ شبنم کے نشاں ڈھونڈو گے
تم حقیقت کے لئے وہم و گماں ڈھونڈو گے
کون سی آس میں یہ سارا جہاں ڈھونڈو گے
ایک آوارہ سی خوشبو کو کہاں ڈھونڈو گے
ساتھ کچھ روز کا ہے راستہ چلتے لوگو
ہم چلے جائیں گے قدموں کے نشاں ڈھونڈو گے
تیر ترکش میں اگر بچ بھی گئے تو کیا ہے
دل نہ پاؤ گے کہیں اپنی کماں ڈھونڈو گے
رات کی گود میں خوشیوں کے ستارے بھر لو
پھر تو سورج کو نیا آسماں ڈھونڈو گے
جب چلے جائیں گے بنجارے بہاریں لے کر
پھول والوں کو نگر بھر میں کہاں ڈھونڈو گے
اس سرائے سے نکل کر آگے بڑھو گے جب بھی
چاند تاروں سے پرے اپنا مکاں ڈھونڈو گے

❀

سلونی شام کے آنگن میں جب دو وقت ملتے ہیں
جھلکتے ہیں ان سایوں میں کچھ ادھورے ہیں
سمندر ہے [illegible] سامنے مغرور و خودسر سا
ہمیں اک پل بنانا [illegible] سے سب پار کرتے ہیں
گزرنا ہے یقیناً ایک [illegible] کے بستی سے
کھڑی ہے پیاسا ہاتھ جوڑے ساری خوشیاں [illegible] میں
سمادھی میں مگن دونوں جہاں ٹھکرا کے بیٹھے ہیں
اندھیروں سے اجالوں تک، اجالوں سے [illegible] تک
سدا گردش ہی گردش ہے کہاں جانے وہ رہتے ہیں
زمیں کے پھول سونے اور چاندی سے نہیں کھلتے
کسی محنت کی خوشبو سے سبھی آنچل مہکتے ہیں
وہی ہیں سانپ، وش کنیا، کو ڈس کر پالنے والے
مری نگری کو رہ رہ کر وہ اب بھی [illegible] دیتے ہیں
ہر اک احساس کی پہچان، خط و خال کھو بیٹھی
وہ اپنے آپ میں ڈوبے ہوئے گم صم سے رہتے ہیں

❀



کھلی کراسنگ؟ دیکھ سن کر
پار کرو
ہوشیار! لیول کراسنگ
پوربی ریلوے

تنہائی

شوکت صدیقی

قمری چاندنی کے دامن میں
فضا، پر سکوت تنہائی
ہو رہی محفلِ جہاں سے دور
رفتہ کی بزم آرائی

چند انمول ساعتوں کی یاد
چند بیتی ہوئی بہاروں کی
چند ناکام حسرتوں کی خلش
چند دیکھے ہوئے نظاروں کی

ی سر سبز ہے اے تنہائی
ے خواب و خیال کی وادی
ے فیض کرم سے ہے شاید
ر دل کشی و شادابی

چشم و رخسار میں اسیرِ خیال
پیرہن حلقۂ نظر میں ہے
بھیگی پلکوں کی ریشمی شبنم
غنچۂ دامنِ سحر میں ہے

کبھی جاں بخش مسکراہٹ کے
جھلملانے لگے ہزار نجوم
کبھی گلنار رخ تنہائی
کر گئے لاکھ شوخیوں کے ہجوم

کبھی زلف سیاہ کے خم میں
جا کے الجھے ہیں یاد کے شانے
کبھی مخمور و مست آنکھوں کے
آ کے چھلکے ہیں لاکھ پیمانے

میرے خوابوں کے اس شبستاں پر
رنج دوراں کا کچھ اثر تو نہیں
میری بزم خیال کو شوکت
رسم دنیا کا کچھ خطر تو نہیں

غزلیں

ڈاکٹر اختر نظمی

ہاتھ میں جو مرے ڈور ہے
جانتا ہوں کہ کمزور ہے
اپنے گھر کو نیا کیوں کہوں
ہر طرف شور ہی شور ہے
خون سارا پسینہ ہوا
جسم میرا شرابور ہے
لب تو بیمار سے خاموش ہیں
میرا چہرا شگفتہ سہی
مجھ کو کمزور کرتا ہے یہ
وہ ارادہ جو کمزور ہے
صرف مجھ کو ہے نظمی تو شبہ
میرے دل میں بھی اک چور ہے

خورشید سحر

تمام عمر کا سرمایہ تجھ کو کھونا تھا
یہ حادثہ بھی مرے ساتھ اب کے ہونا تھا
مجھے پسند تھا خوش رنگ پانیوں کا سفر
کہ خود ہی اپنا سفینہ مجھے ڈبونا تھا
طلسم خواب ہوا غرق بہتے پانی میں
اندھیرے گھر کا یہی آخری کھلونا تھا
مری نظر کی کڑی دھوپ لگ گئی ہو گی
مگر نہ شہر کا منظر تو کچھ سلونا تھا
میں اپنے آپ پہ روتا ہوں کس لئے خورشید
مجھے تو اس کی جدائی پہ رونا دھونا تھا

رؤف جاوید

دریا سے اٹھے گا نہ سمندر سے اٹھے گا
یہ بارِ محبت ہے سخنور سے اٹھے گا
میدان ہمارا ہے ہمارا ہی رہے گا
ہر شخص کمر باندھ کے جب گھر سے اٹھے گا
بیدار نہیں ہوتا، تو پھر کیا کرے کوئی
یہ شخص تو اب وقت کی ٹھوکر سے اٹھے گا
فطرت سے تری، شہر کا ہر شخص ہے واقف
"فتنہ جو اٹھے گا وہ ترے گھر سے اٹھے گا"
اتنا کہ بدن پر ہے شب تار کی چادر
[illegible] صبح کے منظر سے اٹھے گا

ہندی سے ترجمہ

جاوید اقبال چروآنوی

مُسَلمان

(مشرف عالم ذوقی کے ہندی ناول کا ایک حصہ)

دوپہر میں وہ دفتر میں ہی تھی کہ شعیب کا فون آیا۔ شعیب کی آواز کانپتی ہوئی تھی۔

"شام میں ملو"

"لیکن میں آج"

"تم سے ملنا بہت ضروری ہے"

"کوئی خاص بات ہے کیا...."

"ہاں کچھ ایسا ہی سمجھو"

ادھر وہ چار ایک روز سے شعیب سے نہیں مل سکی تھی۔ ادھر کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ روز روز کی خبروں سے الجھن ہوتی تھی....

اتنے مسلمان مارے گئے....

دنگوں کی خبروں کو اس نے پڑھنا ہی بند کر دیا تھا.... یہ ساری خبریں جیسے باسی ہو گئی تھیں.... یہ سب کہاں جا رہا ہے۔ لوگوں کو یہ کیا ہوتا جا رہا ہے۔

اسے لگا سیاست نے ذہنوں کی، جیسی تقسیم اب کی ہے، پہلے کبھی نہیں کی.... اب وہ دوستوں سے ملتی تو ان کے چہروں پر بھی فرقہ وارانہ رنگ دیکھتی....

ہاں اس دن وہ ونئے کی بات پر چونکی تھی۔

"مسلمان زیادہ کمیونل (Communal) ہیں۔ ان کے مذہب میں.... !"

"کتنا مذہب جانتے ہو تم، وہ چیخی تھی"

"جھوٹ مت"

ونئے کی آواز میں کڑواہٹ تھی ـــ وہ پہلا ذہین ہے جو چاہے کہ ان میزوں پر ہمیشہ آتا ہے۔ اس سے الگ گھر کی میزوں پر ہم کیا ہیں؟ ہم ہندو ہیں افروز یا مسلمان ہیں ـــ تمہارے مذہب میں تو کافروں کو جان سے مارنا بھی گناہ نہیں۔

تھوڑا بہت مذہب تو میں بھی جانتی ہوں ونئے ـــ (Dear) اسلام میں چھوٹے سے چھوٹے ذی روح کو بھی تکلیف پہنچانے سے منع کیا گیا ہے۔

اس لئے قربانی تمہارے یہاں جائز قرار دی گئی ہے تمہارے مذہب کی یہ نس جانوروں کو مار کر کھاتی ہے وہ بھی۔

وہ ہکا بکا سی اسے دیکھ رہی تھی....

ونئے یہ کیا کہہ رہا ہے، کیا بول رہا ہے، وہ بھی

سینے پر مغرور کر سکتی تھی وہ پتہ نہیں اب ڈال کا ساتھ چھوڑ رہا ہے... اسے تو ونئے پر فخر تھا ونئے جیسوں پر کہ جب تک اس جیسے لوگ باقی ہیں یہ ملک باقی ہے اور ذہنیت کو کبھی بھی صحیح سوچ کے دائرے میں قید کیا جا سکتا ہے۔

اس نے سنا تھا ونئے کا بھائی گونڈہ کے فساد میں مارا گیا۔ ونئے یہ خبر سن کر گھر بھی گیا.... اس نے اپنے بھائی کی لاش دیکھی ہے... لیکن وہاں... فساد میں اکیلے ونئے کا بھائی ہی تو نہیں مارا گیا۔ ہندو بھی شہید ہوئے، مسلمان بھی..

پھر اچانک ـــــ یہ اس کی سوچیں اتنی زنگ آلود کیسے ہو گئیں...

نہیں سچ تو یہ ہے کہ وہ اس سلسلے میں کچھ سوچنا ہی نہیں چاہ رہی تھی....

اس واقعہ کے ٹھیک دوسرے دن ونئے نے اس کے دفتر فون کر کے اس سے معافی مانگی تھی.... مگر اس سے کیا ہوتا ہے۔

دل میں غبار جیسی کوئی چیز جم جائے تو.....!

شام میں وہ شعیب سے ملی تو وہ کافی گھبرایا ہوا لگ رہا تھا۔ داڑھی بڑھ چکی تھی۔ چہرے پر الجھن کے آثار تھے۔

"کیا بات ہے؟"

"وہاں بیٹھتے ہیں۔"

شعیب نے خالی میدان کی طرف اشارہ کیا۔ اور وہاں کی ہری ہری گھاس پر دونوں بیٹھ گئے۔ اس نے ایک ٹھنڈی سانس چھوڑی۔

"سمجھ میں نہیں آتا کیا کہوں، کیسے کہوں۔"

"برا کیا ہے:"

"مجھے لگتا ہے وہ مجھے مار ڈالے گا۔"

اس کی آواز میں خوف اتر آیا تھا

"کون ـــ؟"

انجو کا دل دھک دھک کرنے لگا

"ونئے ـــ"

یہ اس سے بھی بڑا دھماکہ تھا۔ ونئے؟ انجو جیسے تعجب میں چیخی ـــ ہوش میں تو ہو تم.... تم دونوں اتنے اچھے دوست ہو ـــ ایک ساتھ رہتے ہو...."

"یہی تو عجیب بات ہے۔ اس نے مجھ سے معافی بھی مانگ لی.... لیکن ہم دونوں ـــ کہنا چاہئے ایک دوسرے سے خوفزدہ ہیں، کیا جانے کب کون کس پر حملہ کر دے

"یہ کیا بک رہے ہو...."

"اس دن وہ اپنے بھائی کی لاش دیکھ کر آیا تھا۔ کافی غصے میں بھرا۔ میں چپ رہا۔ جانتا تھا اس کا بھائی دنگے میں مرا ہے۔ زخم تازہ ہے... وہ جو بھی بولتا ہے بولنے دو... اس لئے کہ میرا بھائی بھی مرتا تو میں بھی دو لفظ ہندوؤں کے خلاف ضرور بولتا۔ نہ بولتا تب بھی دل میں یہ بات رہتی کہ میرے بھائی کو ہندوؤں نے مارا ہے۔ یہ زہر پینا تھوڑا مشکل ہوتا میرے لئے بھی۔ اتنی نفسیات تو میں بھی جانتا ہوں ـــ پر کیا معلوم تھا کہ اچانک...."

شعیب کی آنکھیں خوف زدہ دکھ رہی تھیں۔

اس رات اچانک میری نیند کھل گئی۔ کہنا چاہئے میری چھٹی حس نے مجھے جگا دیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ونئے سبزی کاٹنے والا ہنسوا لے کر مجھ پر حملہ کرنے والا ہے۔ میرے منھ سے ایک خطرناک چیخ نکل گئی۔ میں نے اسے دھکا دیا لڑکھڑاہٹ میں ونئے گرا۔ ہنسوا اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا... میں نے اسے پوری طاقت سے جھنجھوڑا۔ ونئے تم۔

مجھے مارنا چاہتے تھے۔ اچانک وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے
لگا ـــــ شعیب مجھے معاف کردو۔ میں نے اپنے بھائی
کی جلسی لاش دیکھی ہے کر اچھے بھلے کی تمیز بھول بیٹھا۔
اس وقت مجھے صرف اتنا لگا کہ تم ایک مسلمان ہو۔
میرے بھائی کے ہتھیارے ہو.... تمہیں مار
ڈالنا چاہیے۔

شعیب کی آواز لڑکھڑانے لگی تھی۔ عجیب بات
ہے کہ ہم دونوں ساتھ ہی رہنا چاہتے ہیں۔ ہم دونوں
سے کوئی کمرہ چھوڑنے کو تیار نہیں۔ اس رات ونے نے
رو کر مجھ سے معافی مانگ لی.... لیکن اس رات
خوف کے مارے ہم دونوں میں سے کوئی سو نہ سکا...
نہیں کب کسی کی آنکھ لگ جائے اور دوسرا اپنا ہوا
دے۔ اسی کشمکش میں اس رات ہم دونوں سو نہ
سکے ـــ اس نے ٹھنڈی سانس بھری.... آج چار
تو ہو گئے ہیں افروز.... ہم دونوں باتیں تو کر
لیتے ہیں ہم ایک دوسرے سے کٹے کٹے رہتے ہیں اور جب
جانتے ہیں ساری ساری رات ہم دونوں میں سے کوئی نہیں
سو پاتا....

وہ چپ ہو گیا۔
انجو نے اس کی آنکھیں دیکھیں۔ آنکھیں سوجی
ہوئی تھیں.... جیسے کئی رات کا جاگا ہوا ہو۔
بتاؤ میں کیا کروں...؟
تو لگا وہ کہے.... اب پانی تو کمبختوں نے
سر سے اونچا کردیا ہے شعیب۔ تم یا ونے کر ہی کیا
سکتے ہو۔ ساتھ ساتھ رہنا بھی چاہتے ہو اور ایک
... ... ہو....
... کچھ نہیں کہا... اس کا ذہن بوجھل ہو گیا تھا۔

اسے لگا، تقسیم کے اتنے برسوں بعد یہاں کے
سیاستداں دلوں کو بانٹنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔



علیم صبا نویدی

اُجلی مسکراہٹ

میں کسی خارجی وجود کو اپنے وجود کی اتھاہ گہرائی میں پوری جذب کرنے کے لئے سوچتا ہوں تو میرے ذہن میں چیونٹیاں رینگنے لگتی ہیں اور سر میں خفیف سا درد شروع ہو جاتا ہے۔ چونکہ میں وقت سے پہلے عمر کے اس حصے میں پہنچ گیا ہوں کہ جہاں میرے سائے نے مجھے اپنی آغوش میں سمو لینے کے خلاف ہمیشہ صدائے احتجاج بلند کی ہے اور میرا ذہن لمحہ لمحہ مشین کی طرح سوچتے سوچتے مضمحل قویٰ کی طرف پگھل پگھل کر بہنے لگتا ہے اور رینگنے والی چیونٹیوں کی قطاریں دم توڑ دیتی ہیں۔

وہ رات گمبھیر اندھیرے کی چادر اوڑھے جب میرے مکان کے قریب سے گذر گئی تو ایسا محسوس ہوا کہ وہ بھرے سناٹے میں نہا گئی ہے۔ سناٹے کی چنچل لہروں نے اسے پکڑ کر ڈبکیاں دی ہیں۔ وہ خاموشی کے ساتھ اس طرح گذر گئی جیسے نہ وہ مجھے جانتی ہے ورنہ میرے مکان نے کبھی اس سے بات کی ہے۔ میں نے دیکھا کہ اسے پکارا اگر اس نے میری طرف ایک بھی نگاہ تک نہیں ڈالی۔ میں ایسا محسوس کر رہا تھا کہ شب کے سناٹے زور زور سے میری ناکامی پر قہقہے لگا رہے ہیں۔ میں دور تک اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ گلی کے نکڑ پر جہاں نہ جانے کب سے ایک پیپل کا بوڑھا درخت کھڑا ہے۔ میں نے دیکھا کہ پیپل کی گھنی چھاؤں نے اس کے وجود کو جذب کر لیا ہے۔ پیپل کی گھنی چھاؤں اور اس کے درمیان کوئی اٹوٹ رشتہ ہوگا۔

دوسرے دن ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ نیلے آسمان کے بے کراں وسعتوں میں بکھرے بادل ادھر ادھر لٹک رہے تھے۔ میری سوچ ایک انجانے تشنج میں مبتلا تھی اور میری آنکھیں لٹکتے ہوئے بکھرے بکھرے بادلوں کی طرف تھیں۔ میرے پیچھے دفعتاً ایک مانوس سی آواز ابھری میں نے مڑ کر دیکھا۔ وہی لڑکی تھی جس کے ساتھ میرے اندر کے اندھیروں نے کئی راتیں گذاری تھیں۔

اسے بے حد خوبصورت اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ اس کا چہرہ جغرافیائی تناسب کے لحاظ سے محدود تھا۔

۔۔ اس کی گھنی اور لانبی پلکوں کی طرح سیاہ، لیکن
ن کے اُجلے اُجلے دانتوں کی کرنیں ہونٹوں کے ترشے
ے کناروں پر نقرئی جدول پیدا کر دیتی تھیں۔ جب
وہ مسکرائی ہے میں نے منہ دوسری طرف پھیر لیا ہے۔
سکی اجلی مسکراہٹ دیکھ کر ہمیشہ میں یہ سوچنے پر مجبور
ہو جاتا تھا کہ اس کی مسکراہٹ میری زندگی مانگ رہی
۔ ویسے لوگ کہتے ہیں کہ میری زندگی میں بھنور پیدا نہیں
ہے ہیں۔ طوفان کی آہنیں نہیں سنائی دیتی ہیں۔ میری
ں کا بے کراں سمندر سمٹ کر منجمد ساحل میں تبدیل ہو
ہے۔ جھاگ کا دور دور تک پتہ نہیں ہے۔ ریت کے دھبے
ے صاف دکھائی دے رہے ہیں۔

اس نے لوچھے بغیر میز سے قلم اٹھایا۔ بوسیدہ
ذپر کچھ لکھتی رہی، وہ کیا لکھتی رہی میں نے یہ نہیں
یا۔ ہمیشہ وہ کچھ لکھتی رہتی ہے۔ پھر کاغذ تہ کر کے
احتیاط کے ساتھ اپنی پرس میں رکھ لیتی ہے۔ ہاں!
ں میں۔

دوسرے دن جب وہ آئی شاید میرا کوئی لمحہ مجھ
ی آنکھیں چرا کر اس کا انتظار کر رہا تھا۔ میں نے
سے یہ نہیں پوچھا کہ وہ مکاں کے قریب سے خاموش
گذر گئی۔ میرے چیخنے کے باوجود اس نے توجہ
نہیں دی۔ پیپل کی گھنی چھاؤں سے اس کا رشتہ
ہے۔ وہ کب تک چھاؤں کی آغوش میں جذب رہی
وہ کافی دیر بیٹھی رہی گم صم، چپ چاپ، ایسا
ہو رہا تھا کہ وہ سوچ رہی ہے کہ میں اچانک اس
سوال کر بیٹھوں گا۔ حالانکہ میرے ذہن کی جھیل
سوالات کی ہلکی پھلکی لہریں اٹھ رہی تھیں۔ اس
رائے جسم سے اٹھتی ہوئی خوشبو بتا رہی تھی کہ

اس میں گرم سانسوں کی مہک بھی شامل ہے اور اس
کی مسکراہٹ کی چند نقرئی کرنوں کو کسی نے اپنا مسہری
کی شکنوں کے نیچے چھپا لیا ہے۔ اس نے میری طرف
دیکھ کر ملائم لہجے میں کہا۔

"کیا سوچ رہے ہو؟"

میں نے بھی بڑی متانت اور سنجیدگی سے جواب دیا
دو دن پہلے پیپل کی گھنی چھاؤں نے رات کے وقت ایک
وجود کو اپنی آغوش میں جذب کر لیا تھا۔

اچھا!

ہاں۔

اس کی آنکھیں پھیل گئیں اور اجلی مسکراہٹ
کی کرنیں لرز کر اس کے ہونٹوں کے کنارے پر گم صم بیٹھ
گئیں۔

میں دور پھیلے ہوئے خلاؤں کی طرف گھورتا رہ گیا
جیسے اس کے سوا میرا کوئی مصرف نہ ہو!!

نئی کتابوں کا تعارف

تبصرہ کے لئے کتابوں کی دو جلدوں کا آنا لازمی

(۱)

نام کتاب :۔ لالۂ صحرائی

مصنف :۔ ناز صحرائی

صفحات :۔ ۱۴۴ ــــ قیمت :۔ پچاس روپے

طباعت :۔ بھارت آرٹ پریس۔ دہلی

"لالۂ صحرائی" ناز صحرائی صاحب کا پہلا شعری مجموعہ ہے جو خالص غزلوں پر مشتمل ہے۔ ایک سو چوالیس صفحات پر بکھری غزلیں فن کی کسوٹی پر پوری طرح کھری اتری ہیں۔ ان میں غزلیں آشفتہ سری اور عاشقانہ گداختگی کی بہترین مثال ہیں۔ ناز صاحب غزل کی آرائش فکر اور اس کے لوازمات شعری کے برتنے اور استعمال کرنے کے طور طریقوں سے اچھی طرح واقفیت رکھتے ہیں۔ ان کے بعض اشعار میں ایمائیت اور اشاریت کی وجہ سے ان کی غزلوں میں ایک نیا حسن نظر آتا ہے۔ ناز صاحب کا یہ شعری مجموعہ اس حقیقت کا بین ثبوت ہے کہ انہوں نے عروض کا بہت ہی وسیع مطالعہ کیا ہے۔ غزل لطیف انسانی جذبات اور نازک احساسات کا دوسرا نام ہے۔ غزل میں عمدہ مصوری بھی ملتی ہے اور نظم و الام کے ساتھ نشاط کے لمحے بھی ناز صاحب نے غزل کی جمالیاتی اساس کو قائم رکھتے ہوئے فطرت کو بے نقاب کرنے اور عصری رویئے کو پہچاننے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ مگر جناب مجھے یہ کہہ لینے دیجئے کہ ایک شاعر الگ بات ہے اور فنکار ہونا دوسری بات۔ ناز ایک شاعر کے ساتھ ساتھ ایک مکمل فنکار بھی۔ ناز صاحب کو اگر میں فن عروض کہہ لوں تو غلط نہ۔ مگر ایک بات میں ناز صاحب اور ان جیسے دوست فنکار سے معذرت کے ساتھ عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں وہ یہ کہ دیکھا یہ گیا ہے کہ جو صاحب فن پہ پوری گرفت رکھتے ہیں اور ماہر عروض کہلاتے ہیں ان کا دامن بہت اچھے اور بڑے اشعار سے خالی نظر آتا ہے اور یہی بات لالۂ صحرائی کے مطالعے کے بعد نظر آیا۔ ایسی بات نہیں کہ ناز صاحب کے یہاں اچھے شعروں کی کمی ہے۔ میں پہلے ہی یہ عرض کر چکا ہوں کہ اچھا ہونا اور بہت اچھا ہونا میں فرق ہے۔ ہاں بہت اچھا! بڑے اشعار سے ان کا دامن خالی ضرور نظر آتا ہے۔ لالۂ صحرائی کی غزلوں میں جو سب سے خاص بات نظر آتی۔ وہ یہ ہے کہ ہر صفحہ پر غزل۔ بعد غزل جس بحر میں اور جس اوزان میں کہی گئی ہے اسے غزل کے خاتمے کے بعد لکھ دیا گیا ہے تاکہ اہل فن سے انہیں فن کی داد مل سکے اور طلبہ مکتب ان سے فیضیاب ہو سکیں۔ مثال کے طور پہ ایک غزل کے دو شعر درج کئے جا رہے ہیں ملاحظہ ہو۔

۱۔ ٹھیس لگتے ہی ٹوٹ جائے گی
مثل آئینہ میری ہستی ہے

۲۔ وہ نہ سمجھیں گے زیست کی قدریں
جن کا شیوہ ہی زر پرستی ہے

خفیف : مسدس ۔ سالم ۔ مخبون مخبون ؛ محذوف مسکن
۴۸۰ ۔

ناز صاحب کے یہاں ہر مزاج اور ہر رنگ کے اشعار یار ہے۔ مگر جو اشعار ہم یہاں قارئین کے لئے درج کر رہے ن سے بھی ان کی شاعرانہ عظمت اور اسلوب شاعری کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ کس درجے کے شاعر
۔

مندرجہ ذیل اشعار میں مقصدیت سے بھرپور ایک شں پیغام بھی ہے۔ جو قاری کے جذبات و احساسات ی طرح جھنجھوڑ کر رکھ دیتا ہے۔ بعض اشعار میں احب کچھ نہ کہہ کر بھی بہت کچھ کہہ جاتے ہیں۔ رمزیت شاریت میں خوش نوائی کا امتزاج دیکھئے۔

۱۔ اس بھیڑ میں جس شخص کا قد سب سے بڑا ہے
وہ شخص کسی اور کے کندھوں پہ کھڑا ہے

۲۔ تو نے تو جو کچھ کہا جیسا کہا سب ٹھیک ہے
اور جو میں نے کہا جیسا کہا سارا غلط

۳۔ حرص کا جو ہے پرندہ مطمئن ہوتا ہے کب
اک شجر سے دوسرے پھر تیسرے اڑ جائے ہے

ت و فلسفہ سے متعلق بھی ناز صاحب نے بہت کچھ مگر آرائش بیجا سے پ ۔ ملاحظہ ہو یہ دو شعر

انحصار انتہا ہے ابتدا کے سن
یہ اگر اچھی تو وہ کبھی اچھی نہیں

جسم کو روشن بنانے کا جنوں
روح کو تاریکیاں دے جائے گا

ناز صاحب کی فنکارانہ صلاحیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا لالۂ صحرائی کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں ایک نیا اعتماد اور ایک تازہ کار حوصلہ موجود ہے۔ جو خوش آئند بات ہے مثال کے طور پر آخر میں یہ چند اشعار ملاحظہ ہو۔

زر کی بھٹی گرم رکھنے کے لئے
سوکھے پنجر اس میں ڈالے جائیں گے

دامن گل پہ موتی سجاتی رہی
رات آنسو بہاتی رہی رات بھر

جسم کا بیوپار آساں، روح کا سودا کٹھن
کشمکش میں ٹکڑے ٹکڑے آدمی بک جائے ہے

صبر کے جوڑے تو میرے دل کے آنگن میں پلے
حرص کا شاہیں مگر چاروں طرف منڈلائے ہے

ہوا کا رخ بدلتے ہی جو اپنا رخ بدلتے ہیں
یقیناً ایسے لوگوں کا کوئی چہرہ نہیں ہوتا
یہاں رہتے ہوئے اے ناز مدت ہو گئی ہم کو
ہمیں اب وادیٔ غم سے کوئی صدمہ نہیں ہوتا

کتاب کی کتابت و طباعت عمدہ ہے۔ کاغذ نفیس لیکن سرورق میں کوئی خاص بات نہیں جو قاری کو اپنی طرف متوجہ کر سکے ناز صحرائی صاحب کا یہ مجموعہ جو کہ پہلا مجموعہ ہے اچھا ہے اور امید ہی نہیں بلکہ یقین کامل ہے کہ دوسرا اس سے بھی اچھا ہوگا۔

(شمس گیاوی)

نام کتاب :۔ **بلے بلارے**
نام شاعر :۔ دیپک قمر
ضخامت :۔ ۱۲۸ صفحات، ڈیمائی سائز، قیمت :۔ ۵۰ روپئے
ناشر :۔ دیپک قمر، ۱۸۰۰ آ، البولین، میرٹھ چھاؤنی۔ ۲۵۰۰۰۱

دیپک قمر تو اچھے خاصے حسن ادبی ہیں۔ ۶۰ سے اوپر کے ہیں لیکن شاعری ایسی جوان اور البیلی کہ جو پڑھے وہ بھی ترنگ میں آجائے، بلے بلارے، دیپک قمر کا چوتھا مجموعہ ہے اور ان کی فن کارانہ صلاحیتوں کا آئینہ۔ یہ نہ غزلوں کا مجموعہ ہے نہ نظموں کا۔ اس میں نہ قطعات ہیں نہ رباعیاں لیکن یہ کتاب کچھ ایسی سوغات ہے کہ اس میں بیشتر اصناف شاعری کی خوبصورت تصویریں۔ دیپک قمر کا تعلق پنجاب سے ہے۔ اپنے وطن سے اتنی محبت کرتے ہیں کہ انہوں نے خاک پنجاب کو سمیٹ کر اور گوندھ کر چھوٹے چھوٹے ساغر و جام بنائے ہیں اور ان میں ماہیا کی شراب بھر دی ہے۔ ماہیا، پنجاب کے لوک گیتوں کا سہانا نام ہے (سہرا سے ملتا جلتا ہے) دیپک قمر نے اسے لوک گیت کو نیا پہناوا دیا ہے۔ ساری شاعری اردو میں ہے۔ کہیں کہیں پنجابی الفاظ ملتے ہیں لیکن وہ شاعر کے برتنے کے ماہرانہ انداز سے "اردووا" گئے ہیں۔ شاعر ۳ مصرعوں میں غزل بھی کہہ دیتا ہے اور مثنوی بھی۔ دیپک قمر نے گلی کوچوں اور کٹیاؤں کی سندری ماہیا کو دو آبے کے پانی میں نہلا دیا ہے۔ آسمان کی چھت تلے کھلی ہواؤں میں پرورش پانے اور رنگینیاں بھرنے والی گوری، ایسا معلوم ہوتا ہے۔ بابل کے گھر سے پیا کے گھر سدھاری ہے لیکن اپنا سگھڑاپن اور سلیقہ اس نے چھوڑا نہیں ہے۔ یہ تبصرہ نگار ماہیا کے جغرافیے اور تاریخ سے واقف نہیں ہے۔ مگر ان کے مطالعہ نے اس پر واضح کر دیا ہے کہ پنجاب میں شہر پنجاب نہیں ہوتے مست کر دینے والے اشعار کا ہیں۔ دیپک قمر کے ماہیے، پیش پا افتادہ موضوعات بھی اس خوبصورتی کے ساتھ پیش کرتے ہیں کہ وہ کے پاؤں کی زنجیر بن جاتے ہیں۔ ماہیا۔ صرف عشق کے اظہار کا وسیلہ نہیں۔ شاعر چاہے تو اس میں بہت کچھ کہہ سکتا ہے بس شرط یہ ہے کہ ۳ چھوٹی چھوٹی میں کہو۔

مثلاً آپس میں بٹے کیسے / دو بھائی تھے ماں جائے / ہیں نہیں کیسے۔

گھر گھر کی کہانی ان ماہیوں میں دیکھئے۔ وہ دیکھے کر / تن من کو کرے قابو / بچہ ہے کہ جادوگر

آنگن میں پھرے دوڑا / بانگیں میں لئے پوتا ہے بنا گھوڑا

اور محبت کی کرامات، کو یہ ماہیا گو یوں ظاہر کرتا ہے۔

پل میں وہ کیا کر دے / کیا بات محبت کی / بندے کو دے

اور اسی 'خدا' کو اس نے اس حال میں دیکھا

نانک سے عجب دیکھا / شیطان تھا محلول میں سب دیکھا

ثلاثی یعنی تثلیث، اردو شاعری کی ایک ہو گئی ہے اور اس صنف کے عاشقوں نے ثلاثی کو نہ کا روپ بھی دے دیا ہے لیکن ماہیا تو خالص دل ہے اور اس بال کا ایمان دار تاجر دیپک قمر۔ سے زیادہ اپنی سالکہ کا خیال ہے۔ یہ بال کہیں اور نہیں۔

دیپک قمر نے گھروں کے بند کواڑوں کی درازوں
سے بھی جھانک کر کچھ دیکھا ہے۔ آپ بھی دیکھئے۔
چسکا ہے خرارت کی / چنچل ہے نند نٹ کھٹ /
پلیے وہ آفت کی ــــ اور
رستے میں کھڑا پاپی / منت چھیڑ کرے مجھ سے / دیور
، بڑا پاپی۔
اب جو ماہیا آپ کو سنانا ہے اس میں ذرا گڑبڑ ہے۔
بیاں میں مہاور ہے / ہاتھوں میں لگی مہندی / گھونگھٹ بھی
ر بھی ہے
اس کی پہلی سطر خالص علاقائی ہے۔ جب کہ اس کے
لمس یہ ماہیا دیکھئے۔ آنکھوں میں چھپا گجرا / جوڑے میں
ہے وہی / باہوں میں سجا گجرا
گھنٹی، لوری، گھمکڑ، ایکانت، جشن اور
ں نوعیت کے کچھ الفاظ ہیں جو نامانوس تو لگتے ہیں لیکن ان
موتی آہنگ مصرعوں میں سج جاتا ہے۔ دیپک قمر بہر حال
دو کے چکور ہیں۔ اردو پر رانجھا کی طرح فدا ہیں۔
جائے گی کہاں اردو / پرکھوں نے جہاں چھوڑا /
ہے وہاں اردو۔
ب بہت محبت ہے۔ شاعر نے یہ بھی کہا ہے۔
دو لفظوں میں جہاں تیرے / بس ایک قلم میرا / سب
ماں تیرے
شاعر کو قلم کے علاوہ چاہئے بھی کیا ـــ۔ جوگندر پال
۲۷ سطریں لکھی ہیں اور دیپک قمر کو کھل کر داد دی
۔ محبت بھری داد ان الفاظ میں کہ میں اپنے عزیز دوست،
سن نہایت پیاری کتاب کی اشاعت پر مبارکباد۔ یہ تاخیر
مبارکباد پر تاریخ پڑی ہے ۱۸ اپریل ۱۹۹۱ء۔ اب یہ کی
/ جولائی ۱۹۹۱ء کی لکھی ہوئی مبارکباد۔ سرورق لوری

نے بھی کتاب کے نام بلے بلارے کی وضاحت یوں کی ہے
بلے بلارے، پنجابی زبان میں نشاط و طرب کے معنی میں
استعمال ہوا ہے۔ زیر نظر مجموعہ واقعی، قاری کو نشاط و طرب
سے ہم کنار کرتا ہے۔
کتاب میں اندرونی فلیپ پر شاعر کی تصویر بھی
ہے۔ صحت اچھی معلوم ہوتی ہے۔ ماہیا کی دین ہے۔
(یوسف ناظم)



شہرِ خیال

عزیزم دعائیں

'انشا' کے ایک شمارے میں میری تحریر" ادبیاتی تحقیق اور اس کے ملتزمات" ریسرچ کے موضوع پر روشنی ڈالتی ہے جس میں منجملہ دیگر نکات کے یہ بتایا گیا ہے کہ محقق کی عدم آگہی اس کی بہت بڑی حریف ہوتی ہے اور کنفیوزن CON-FUSION اس کی بدبختی۔ سہیل میں مشمولہ مضمون تلمیذ داغ۔ ناطق گلاؤٹھی کی شعری دنیا عدم آگہی اور کنفیوزن دونوں سے بری طرح مجروح و مضروب معلوم ہوتا ہے۔ نیاز فتحپوری کی تصنیف انتقادیات میں ایک مضمون ہے "منظومات ناطق" جس کا سہیل میں مشمولہ مضمون میں کوئی ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ اتفاق و اختلاف دونوں کو استدلال کے ساتھ پیش کرنا ضروری ہوتا ہے۔ کم از کم ایک ریسرچ اسکالر کو ریسرچ کے ملتزمات کا پتہ ضرور ہونا چاہئے۔

علیرانی حیرت کے مکتوب سے اذیت ہوئی۔ کیونکہ حیرت صاحب کو اتنا تو معلوم ہونا ہی چاہئے کہ ذہنی و قلبی مضمرات اور باتوں کا نوٹس لینا سعی لاحاصل ہی پر منتج ہو سکتا ہے۔ سہیل اب ایک معمولی جریدہ نہیں ہے۔ ادارہ بن چکا ہے۔

تارا چرن رستوگی

مکرمی! السلام علیکم

امید کہ مزاج گرامی بخیر ہوں گے

سہیل کا شمارہ نمبر ۲ جلد ۱۵ پیش نظر ہے۔ 'نمود' عنوان کے تحت آپ نے حسن نعیم کی یاد میں، مختصر مگر جامع خیالات کا اظہار کیا ہے۔

ہم نے چنی وہ راہ جو مردوں کی راہ تھی۔

مرحوم حسن نعیم صاحب کا فوق مصرعہ آپ دونوں بھائیوں پر بالکل فٹ نظر آتا ہے۔ جو محض مبالغہ آرائی یا جی حضوری پر مبنی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس لئے کہ آج کے اردو کش دور میں کسی خالص ادبی رسالہ کا حسن اہتمام کے ساتھ شائع ہونا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔

منثورات میں علی عباس ازل، محمد علی صدیقی اور ابراہیم اختر کے تنقیدی و تجزیاتی مقالات پسند آئے۔ منظومات میں حلیم صبا نویدی، شاہد میر، اور ڈاکٹر حنیف ترین کی غزلیں قابل ستائش ہیں۔

آپ کا مخلص — عنادر نقیب

عزیز گرامی!

سہیل کا تازہ شمارہ ملا۔ آج ہی۔

'یادوں کا سفر' کے اشتہار کی اشاعت کا دلی شکریہ۔

بھی ایک بات مجھے بہت زیادہ کھٹکتی ہے۔ سہیل کے ہر شمارے میں غزلوں اور نظموں کی تعداد اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ یہ کچھ اچھا نہیں لگتا۔ تقریباً ہر شمارہ منظومات کا ایک گلدستہ نظر آتا ہے۔ بہتر ہوگا اگر آپ دو کی جگہ تین چار افسانے شائع کیا کریں۔

سہیل میں مقالات کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ یہ اگر دو کی جگہ تین ہو جائیں تو آپ کا رسالہ اور بھی وقیع ہو جائے گا۔ اگر میرا مشورہ ٹھیک لگے تو اس پر ضرور عمل کیجئے۔ فریدہ

خط پڑھ کر خوشی ہوئی۔ میری طرف سے شکریہ ضرور ادا کر دیں

قیصر عثمانی

عزیز گرامی برادرم مسعود منظر صاحب

آپ صاحبان کے خلوص بے پایاں اور نیاز نوازی کے طفیل ادھر کئی ماہ بلکہ سال ہونے کو آیا "سہیل" کے مطالعے اور اس سے استفادہ کا موقع مل رہا ہے جس کے لئے انتہائی شکر گزار ہوں اور دعا گو بھی کہ باری تعالیٰ تادیر آپ حضرات کی خدمت میں "سہیل" اپنی آب و توانائیوں کے ساتھ جاری و ساری رہے۔ ویسے بظاہر دیکھنے میں ایک مختصر سا رسالہ نظر آتا ہے مگر مختصر اور جامع اگر یہاں استعمال کروں تو مبالغہ نہ ہوگا۔ ممتاز مشاہیرین اور دانشوروں کا قلمی تعاون اس بات کا مبین ثبوت ہے کہ سہیل ادب کے معتبر اور صاحب الرائے حضرات کے ہاتھوں میں پہنچتا ہے اور قلم کار اس سے قلمی تعاون کرکے خوشی محسوس کرتے ہیں۔ یہ ایک اچھے ماہنامے کے لئے فال نیک ہے۔ خدا کرے سہیل کا معیار اور بلند ہو۔ اور اس کو وہ تمام سہولتیں فراہم ہو سکیں جو ایک اچھے دیدہ زیب رسالہ کو ملتی ہیں۔ معنوی خصوصیت کے ساتھ صوری لحاظ سے بھی جاذب نظر ہو۔

آپکا عبد المتین شباز

مکرمی السلام علیکم

سہیل مل گیا۔ نظم منیر کی اشاعت کے لئے نہایت ممنون ہوں۔ مشہر خیال میں خط بھی شائع کیا گیا جیسے اس بات کا بھی خوشی ہے ... ہمنوا میں بھی یہ بات اختلافی ... ملک کے ادیبوں شاعروں، صحافیوں ... کے عوام سے بھی توقع ہوتی ہے کہ وہ انسانیت کو عام کرنے ... ع

سدھار کے لئے ضروری ہے کہ اچھائی کی تعریف کی جائے اور برائی کی مذمت قرآن کریم کی ایک آیت کا بھی ایسا ہی مفہوم ہے "کہ تم میں ایک جماعت ایسی ضرور ہو کہ وہ دنیا کو بھلائی کی تلقین اور برائی کی مذمت کرے" قرآن صرف مسلمانوں کے لئے ہی نہیں بلکہ سارے عالم کے لئے ہدایت ہے۔

اب کی بار سہیل کی کتابت طباعت عمدہ ہے۔ رسالہ کے لئے نیک خواہشات۔

منصور اعجاز

محترم مسعود منظر صاحب

سہیل کے دو شمارے ملے۔ واقعی اس پرچہ کی اپنی منفرد شناخت ہے۔ اس کے بلند معیار سے کسی کو اعتراض نہیں ہو سکتا۔ اس میں شامل کم و بیش تمام شخصیات ایسے ہیں جن کی کارکردگی سے اردو حلقہ واقف ہے اس دور انتشار میں اتنی اچھی پیش کش کے لئے آپ تمام کارکنان کرام مبارکباد کے مستحق ہیں۔

م۔ ع۔ اشرف، سمستی پور

محترمی سلام خلوص

خوشی کی بات ہے کہ آپ کو اصغر علی انجینئر، ذاکر شمیم سید حامد حسین، ساجدہ زیدی، رضا اشک، فضا ابن فیضی، ڈاکٹر مغنی تبسم جیسے چوٹی کے فنکار میسر ہیں۔ یوں تو فضا ابن فیضی کی پوری غزل مرصع ہے۔ سب سے بڑی خوبی ان کی یہ ہے کہ جو بات کہتے ہیں سیدھے دل میں اتر جاتی ہے یہ ان کے فن کا کمال ہے۔ ان فسانہ "چاپ" میں ایسا لگتا ہے جیسے پہلے بھی پڑھ ... دا من منزل ... ایک فلم بھی بن چکی ہے شاید میری صحت ... اس طرح کے افسانوں سے پرہیز کیا کیجئے۔

ضیاء الانجم، اچھریاں

بانی :- حافظ محمد عبد الرحمٰن بسمل شسنہاروی رحمۃ اللہ علیہ بیادگار :- زین العابدین احمد و ادریس شسنہاروی

ماہنامہ سہیل

فہرست

نمود (ادارہ) ۵
مشرق و مغرب کی تہذیبیں - اصغر علی انجینیر ۶
ہم مسافر جہاں جہاں گذرے - علیم اللہ حالی ۱۲
انجمن فکر و فن ڈاکٹر تارا چرن رستوگی ۱۵
غزلیں :- رام پرکاش راہی ۱۷
غزلیں :- علی عباس ازل، ڈاکٹر محمد علی اثر ۲۰
غزلیں :- شان بھارتی، م. ش. نجمی ۲۱
غزلیں :- ظفیر کاظمی، کرشن پرویز، حمید خاں حمید ۲۲
چچا علی حسن - قیوم خضر ۲۳
آدھے دھڑ کا آدمی - نوشاد احمد کریمی ۲۳
نئی کتابوں کا تعارف - سلیم انصاری
مناظر عاشق ہرگانوی ۳۶
شہر خیال ۳۹

شمارہ ۹ جلد ۵

بدل اشتراک

فی شمارہ ------- ۴/= روپے
زرِ سالانہ ------- ۴۰/= روپے
لائف ممبری ------- ۵۵۱/= روپے

• خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ •

ماہنامہ سہیل
ریلوے سائیڈ روڈ، گیا - ۸۲۳۰۰۱
فون نمبر :- ۲۱۵۷۳

جنگلات اور ماحولیات محکمہ، بہار

(۱) انسان اس سرزمین کی سب سے زیادہ اشرف المخلوقات اور عقلمند مخلوق ہے۔ اس کی حفاظت کرنا اس کا فرض اولین ہے۔
(۲) یہ اس کا پورا فرض ہے کہ اس کے حاصل شدہ ذرائع کا استعمال پورے طور پر کریں۔
(۳) اس کے ذرائع اور وسائل کا استعمال بے توجہی اور معمولی طور سے نہیں کرتے ہوئے، اس کی محافظت آنے والی نسلوں کے لئے کریں۔
(۴) ضبط نفس اور پرہیزگاری زندگی کا سب سے اہم راستہ ہے۔ اس کے خلاف ورزی بے شک نقصان دہ اور مضر رساں ہوگی۔
(۵) سیلاب اور محافظت کا مسئلہ تشویشناک حد تک بڑھ جائے گا۔ ماحولیات اتنا گندہ اور کثیف ہو جائے گا کہ قدرت کی تباہی کا سبب بن جائے گا۔
(۶) اس زمین کی تخلیق صرف انسانوں کے لئے ہی نہیں ہوئی ہے۔ اس پر جنگل اور جنگلی مخلوق کا برابر حق ہے۔

(۷) یہ کبھی نہ بھولیں کہ پودوں اور جنگلات کی تخلیق اس زمین پر پہلے ہوئی ہے۔

انہوں نے ہی سازگار حالات پیدا کئے کہ جن کی وجہ سے انسان کی اس

سرزمین پر ترقی ہوئی۔ آج بھی ان کی اہمیت اسی طرح بنی ہوئی ہے۔
(۸) درخت لگائیں۔ جنگل اور جنگلی مخلوقات کی حفاظت کریں۔ اور اس سرزمین

کو ناموافق حالات سے بچائیں۔

P.R. No- 79 D(INF-67) 91.92

نمود

بہار اردو اکادمی
اہم فیصلہ

اُردو کے علمی و ادبی حلقوں کو حکومت سے اسی بات کی شکایت رہی ہے کہ بہار اردو اکادمی کی تشکیل میں عام طور پر صاحبان علم و ادب اور ریاست کے باشعور ارباب قلم کو فراموش کیا جاتا رہا ہے۔ ماضی میں اکادمی کے انتظامیہ میں اہل قلم سے زیادہ اہل سیاست کی شمولیت علمی و ادبی حلقوں کے لئے سخت مایوسی اور بیزاری کا باعث بنی رہی ہے۔

یہ امر باعث اطمینان ہے کہ موجودہ حکومت نے اکادمی کے وائس چیئرمین کی حیثیت سے جناب صدیق مجیبی اور جناب شاہد احمد شعیب کو نامزد کرکے ایک صحیح فیصلہ لیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ دونوں اہل قلم اردو اکادمی کی بہبودی کے ہر ممکن کوشش کریں گے اور اسے ایک نمایاں مقام دلانے میں کامیاب ثابت ہوں گے۔ موجودہ حکومت نے بہار اردو اکادمی کے لئے ایسی شخصیت کا انتخاب کرکے ایک تاریخی کارنامہ انجام دیا ہے۔ اس لئے میں مبارکباد پیش کرتا ہوں نہ صرف ان دونوں وائس چیئرمین کو بلکہ بہار اردو اکادمی اور وزیر اعلیٰ بہار شری لالو پرشاد یادو کو بھی جنہوں نے اکادمی کے لئے ان اہم شخصیتوں کا انتخاب کیا۔ اس کے علاوہ میں یہ بھی امید کرتا ہوں کہ مجلس عاملہ کی تشکیل میں بھی اس بات کا خاص خیال رکھا جائے گا کہ اہل سیاست سے زیادہ اہل قلم کو شامل رکھا جائے۔

جناب شاہد احمد شعیب ادارہ سہیل کی مجلس مشاورت سے متعلق ہیں اس لئے ہمیں اس خوشگوار انتخاب پر خاص مسرت ہو رہی ہے۔

(ادارہ)

اصغر علی انجینیر

مشرق و مغرب کی تہذیبیں
اور ــــــ سیاسی آمیزش اور آویزش

تہذیب سے انسان کی شناخت ہوتی ہے ر ملک کی بھی۔ تہذیبی شناخت کا مسئلہ بڑا اہم ہے۔ تہذیب ری شناخت ہی نہیں، ہماری روحانی زندگی کی ضامن بھی ہے۔ ہماری تہذیبی قدریں ہی ہماری انفرادی اور مجموعی ر خصوصاً مجموعی زندگی کی سمت طے کرتی ہیں۔ اس لئے ہذیبی مسئلے کو ہماری مادی اور روحانی زندگی میں مرکزی ہمیت حاصل ہونا فطری بات ہے۔

مادی اور روحانی زندگی کا گہرا رشتہ ہے اس لئے ظاہر ہے کہ ہم تہذیبی زندگی کو مادی زندگی سے الگ نہیں کر سکتے۔ دراصل یہ رشتہ جدلی ہے۔ ایک کو دوسرا متاثر کئے بغیر نہیں رہ سکتا اور یہ کہنا غلط ہوگا کہ ایک کا ہم دوسرے کے بغیر تصور نہیں کر سکتے۔ تہذیبی اقدار کا سر چشمہ کیا ہے؟ مادی زندگی؟ وجدان؟ یا مذہب اور مذہبی محرکات؟ یہ بڑا پیچیدہ سوال ہے بلکہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اس کا جواب بھی ہماری تہذیبی تربیت یا CULTURAL - CONDITIONING - پر منحصر ہے۔

عام طور پر مشرقی تہذیب کا پروردہ یہ تصور کرتا ہے کہ مذہب اور وجدان ہی تہذیبی اقدار کے مؤثر سرچشمے ہیں اور جب تہذیب کے یہ سرچشمے خشک ہو جائیں گے وہ تہذیب دیرپا ثابت نہیں ہو سکتی اور یہی وجہ ہے کہ خود علامہ اقبال مغربی تہذیب کو دیرپا تصور نہیں کرتے اور اس کی خودکشی کی بات کرتے ہیں اور یہ ایک حد تک صحیح بھی ہے لیکن اس رائے کو انتہا پسندی کے خطرے سے بچانا بھی ضروری ہے۔ تہذیب دیرپا اسی وقت ثابت ہو سکتی ہے جب وہ چند روحانی قدروں سے فیضیاب ہو۔ اس کی تھوڑی وضاحت ہم اگلی چند سطور میں کریں گے تاکہ مشرق و مغرب کی تہذیبی اساسوں کو ہم اچھی طرح سمجھ سکیں۔

تہذیب کا مادی نظریہ یہ ہے کہ مادی اسباب و عوامل ہی تہذیب کی اصل بنیاد ہیں اور یہی اسباب و عوامل اس کی سمت کو طے کرتے ہیں۔ اس نظریئے کے حامی اس بات پر بھی زور دیتے ہیں کہ قدریں خود ان مادی اسباب و عوامل کی پیداوار ہیں اور مادی تبدیلیوں کے سا...

ہی ہماری تہذیب کو نئی سمت عطا کرتی ہیں۔ دوسرے لفظوں میں مادی عوامل جن میں پیداواری قوتیں اور رشتے بھی شامل ہیں، نئی قدروں کے خالق ہیں اور اقدار کی اس تخلیق میں وجدان یا مذہبی اور روحانی محرکات کا کوئی عمل دخل نہیں ہے۔ میرے نزدیک یہ نظریہ غلط تو نہیں لیکن انتہا پسندانہ ہے۔ ہم اقدار کی تخلیق میں روحانی اور وجدانی محرکات کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتے۔

قدروں کا رول تہذیب میں چونکہ بڑا مرکزی ہے اس لئے یہ سمجھنا بے حد ضروری ہے کہ قدریں مادی خلا میں پیدا نہیں ہوتیں لیکن اس بات کی اہمیت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ وجدانی اور روحانی سرچشمے ہی تہذیبی قدروں کو ابدیت عطا کرتے ہیں۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ ان قدروں کی تخلیق ہی مادی و روحانی عوامل اور کیفیات کے درمیان تناؤ TENSION کا نتیجہ ہوتی ہے۔

مشرق و مغرب کی تہذیبوں کے درمیان اس فرق پر بڑا زور دیا گیا ہے۔ مشرق کی تہذیب کی بنیاد روحانیت ہے اور مغربی تہذیب کی بنیاد مادیت پر ہے۔ یہ بات وہ لوگ کرتے ہیں جو یا تو فارمولوں کے تحت سوچنے کے عادی ہیں یا وہ لوگ جن کی تہذیب کے مادی اور روحانی عوامل کی پیچیدگیوں پر نظر نہیں ہے۔ نہ ہی مشرقی تہذیب مادی قدروں سے ماوراء ہے نہ مغربی تہذیب روحانی اقدار سے محروم۔ البتہ یہ فرق ضرور ہے کہ کہیں روحانی عوامل پر زور زیادہ ہے کہیں مادی عوامل پر۔

پھر فرق محض مادی اور روحانی تہذیبوں کا نہیں، جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ تہذیبوں کا بھی ہے اور جاگیردارانہ تہذیبوں کے دامن میں کئی قبائلی تہذیبیں بھی سانس لے رہی ہیں۔ مشرقی تہذیب تو ایک جامع تصور ہے۔ اس میں کئی ذیلی اور دیگر قبائلی تہذیبیں بھی پرورش پا رہی ہیں۔ اگر ہمیں مشرقی تہذیب کا جائزہ لینا ہے تو ان ذیلی اور قبائلی تہذیبوں کا بھی جائزہ لینا ہوگا لیکن اکثر ہم ان ذیلی اور قبائلی تہذیبوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں اور "مشرقی تہذیب" کو عام سے معنی میں استعمال کر لیتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ مشرقی تہذیب سے ہم پورے ایشیا اور افریقہ کی تہذیب مراد لیتے ہیں۔ اور دو براعظموں کی مختلف علاقائی تہذیبوں کا تفصیلی جائزہ لینے کی ضرورت نہیں سمجھتے حالانکہ ان علاقائی تہذیبوں میں آپس میں بڑا فرق ہے۔ اور اس فرق کو ملحوظ رکھنا بڑا ضروری ہے۔ جاپانی تہذیب، چینی تہذیب، تبت کی تہذیب، ہندی تہذیب، عربی تہذیب، افریقہ کی علاقائی اور قبائلی تہذیبیں وغیرہ، ان میں جو آپسی فرق اور تضادات ہیں انھیں مشرقی تہذیب کے نام پر ہرگز نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

ہندوستان میں بھی مختلف علاقائی تہذیبیں ہیں۔ ہم نہ آریائی اور ڈراویڈین تہذیب کے فرق کو نظر انداز کر سکتے ہیں نہ ہند آریائی اور ہندی اسلامی تہذیب کے فرق کو۔ ان تہذیبوں میں بڑے آپسی تضادات ہیں اور قدروں کا ٹکراؤ بھی۔ ہند آریائی تہذیب ایک طویل ارتقائی اور تجاذب کے دور سے گزری ہے اور اس تہذیب میں راعیانہ تہذیب PASTORAL CULTURE سے لے کر جاگیردارانہ تہذیب کے عناصر شامل ہیں۔ دوسری طرف انڈو۔ اسلامک تہذیب میں بھی ہند۔ آریائی تہذیب اور اسلامی اقدار کے عناصر سے لے کر مقامی جاگیردارانہ عناصر کی شمولیت ہے اور ظاہر ہے ان میں آپسی تضادات بھی ہیں۔ جن کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

اسی طرح مغربی تہذیب کو بھی ہم ایک منطقی تصور UMBRELLA CONCEPT کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔

مغرب میں ہم یورپ۔ روسی تہذیب کو مشرقی یورپ کی تہذیبوں کو اور مغربی یورپ کی تہذیبوں کو شامل کر لیتے ہیں اور دوسری طرف جدید امریکی تہذیب کو بھی۔ یہ صحیح ہے سرمایہ داری کی ترقی نے ان ممالک میں کچھ مشترک عناصر پیدا کئے ہیں۔ لیکن ان میں آپس میں تضادات بھی ہیں۔ جن کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ مغربی یورپ میں بھی کئی ممالک اور علاقے ہیں اور ہر علاقے کی اپنی تہذیب ہے۔ خود امریکہ میں گوروں کی اپنی تہذیب ہے اور کالوں کی اپنی اور صرف صدیوں کی اپنی تہذیب جسے کچلنے کی امریکی سامراج والوں نے پوری پوری کوشش کی۔ شمالی امریکہ میں یہ تہذیب تقریباً فنا ہو چکی ہے۔ جنوبی امریکہ میں البتہ اس کے عناصر اب بھی نظر آتے ہیں۔

(۲)

ایک عمومی حیثیت سے اور مشروط طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مشرقی ممالک کی تہذیبوں میں چند مشترک عناصر ہیں اور مغربی ممالک کی تہذیبوں میں کچھ اپنے مخصوص مشترک عناصر ہیں اور اس معنی میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مشرقی تہذیب کی کچھ اپنی خصوصیات ہیں اور مغربی تہذیب کی اپنی۔ لیکن مغربی تہذیب میں مادیت اور مشرقی تہذیب میں روحانیت کو۔۔۔ مابہ الامتیاز عنصر قرار دینا حقیقت کو ایک حد تک مسخ کرنا ہوگا۔ لیکن اس بات سے بھی انکار ممکن نہیں کہ مشرقی اور مغربی ممالک کی تہذیبیں بڑی حد تک الگ الگ ہیں۔ پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان میں مابہ الامتیاز عناصر کیا ہیں؟

اس سوال کا جواب بہت مشکل نہیں ہے۔ جیسا کہ عرض کیا گیا مشرقی ممالک کی تہذیبوں پر آج بھی زیادہ تر جاگیردارانہ عناصر طاری ہیں اور یہاں کی بعض ذیلی تہذیبوں پر قبائلی عناصر لیکن ہم یہاں کی ذیلی اور PERIPHERIAL تہذیبوں سے بحث نہیں کریں گے اور ان کے مخصوص عناصر کا جائزہ لیں گے۔ مشرقی تہذیبوں میں، چونکہ ان پر جاگیردارانہ عناصر غالب ہیں، ترتیب مراتب HIERARCHY کو بڑی اہمیت ہے اور جاگیرداری کی منطق فرمانبرداری ہے اس لئے مشرقی تہذیبوں میں فرمانبرداری اور وفاداری پر بہت زور دیا جاتا ہے۔ جو اس ترتیب مراتب کو تسلیم نہیں کرتا وہ باغی اور مرتد قرار پاتا ہے۔ یہی بات مذہبی محاورے میں عقیدتمند کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور دوسری انتہا پر پہنچ کر کورانہ تقلید بن جاتی ہے اور ان تہذیبوں میں عوامی سطح پر کورانہ تقلید پر ہی زور ہوتا ہے۔

مذہبی معاملات ہوں یا دنیوی مشرقی تہذیب میں سارا زور ایک طرف فرمانبرداری اور نمک حلالی پر ہے اور دوسری طرف سپردگی اور عقیدتمندی پر۔ اسی طرح قدیم روایات کا احترام بھی ان تہذیبوں کا لازمی جزو ہے۔ ان روایات سے انحراف یا ان کا تنقیدی جائزہ قابل گناہ سمجھا جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں عقل پر نقل کو ترجیح دی جاتی ہے۔ اسی لئے مشرقی ممالک کی تہذیبوں میں جمود طاری ہوتا ہے اور ہر تبدیلی مشکوک نظروں سے دیکھی جاتی ہے۔ تبدیلی روایت سے انحراف ہے اور انحراف قابل مذمت۔ کوئی تعجب کی بات نہیں جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ مشرقی ممالک میں صدیوں سے انجماد کی کیفیت طاری رہی۔ اس کے برخلاف مغربی تہذیبوں میں ترتیب مراتب کو بنیادی حیثیت حاصل نہیں۔ گو کہ افسر شاہی کی ساخت BUREAUCRATIC STRUCTURE میں مراتب کے عناصر اب بھی پائے جاتے ہیں اور اسی لئے میکس ویبر جیسے سماجیات SOCIOLOGIST نے مغرب میں پھیلتی بیوروکریسی کے خلاف اپنا اندیشہ ظاہر کیا تھا۔ جب

مغربی تہذیبوں میں ترتیب مراتب سے زیادہ جمہوری اقدار پر زور ہوتا ہے اس کے ساتھ ساتھ قدیم روایتوں کی طرف احترام کا نہیں تنقید کا رویہ زیادہ قابل قبول سمجھا جاتا ہے۔ ہر شے، ہر حقیقت کو عقل کی کسوٹی پر کسا جاتا ہے اور جو باتیں بھی مشاہدے کے خلاف ہوں۔ انہیں رد کر دیا جاتا ہے۔ فرمانبرداری اور عقیدتمندی کو ان تہذیبوں میں بہت مستحسن نگاہوں سے نہیں دیکھا جاتا۔ پرانی قدروں اور روایتوں کو ترک کر دینا مستحسن تصور کیا جاتا ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ مغربی تہذیبوں کا دارومدار ہی ترک روایت پر ہے اسی لئے ان تہذیبوں سے وابستہ معاشرہ متحرک DYNAMIC معاشرہ ہوتا ہے اور اسی تحرک سے اس معاشرے کو غذا ملتی ہے۔ اس معاشرے میں بقول اقبال ثبات فقط انقلاب کو ہی میسر ہے۔

چونکہ مغربی تہذیبیں روایات اور قدیم اقدار کا احترام نہیں کرتیں، نئی روایتوں اور نئی قدروں کو تخلیق کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ انتقادی رویئے سے سائنسی طرز فکر جنم لیتی ہے اور سائنس ٹکنالوجی پیدا کرتا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام کا دارومدار ہی ٹکنالوجی میں تبدیلی پیدا کرتے رہنے پر ہے۔ ٹکنالوجی جتنا ترقی کرتی ہے۔ انسانی محنت کی وقعت و اہمیت اسی تناسب سے کم ہوتی جاتی ہے۔ اس موضوع پر مارکس نے بڑی اہم بحث کی ہے لیکن یہاں ہمیں اس بحث سے غرض نہیں ہے یہ بھی ایک الگ بحث ہے کہ ٹکنالوجی کی ترقی انسانی سماج کے لئے رحمت ہے یا لعنت۔ اس پر ہم آگے چل کر تھوڑی روشنی ڈالیں گے۔

مشرقی تہذیبوں میں چونکہ پیداواری قوتیں اپنے ابتدائی مراحل میں ہوتی ہیں، اس لئے ایشیا کی پیداوار زیادہ نہیں ہوتی عیش کے سامان اوپری طبقوں تک ہی محدود ہوتے ہیں۔ درمیانی طبقہ بہت محدود ہوتا ہے اور نچلے طبقوں کو ابتدائی سطح پر جینے کے لئے بھی بڑی محنت و مشقت کرنا پڑتی ہے اس لئے صبر و قناعت کی اقدار پر بڑا زور ہوتا ہے۔ اطاعت و فاشعاری اور صبر و قناعت مشرقی تہذیبوں کی مرکزی قدریں CORE VALUES ہیں ان قدروں سے انحراف کی اجازت نہیں دی جاتی۔ مغربی تہذیبیں اس کے برخلاف، پیداواری قوتوں کے اعلیٰ مراحل کی پیداوار ہیں۔ اور سرمایہ دارانہ معاشرے میں اوپری طبقوں کے ساتھ ساتھ بڑا درمیانی طبقہ بھی پیدا ہوتا ہے اور محنت کش طبقہ بھی اتنا محروم نہیں ہوتا جتنا تیسری دنیا کے ممالک میں (آج مشرقی ممالک میں جاپان اور چین بھی شامل ہیں جو خاصے ترقی یافتہ ہیں اور کافی حد تک مغربی تہذیبی عناصر سے ماخوذ ہو چکے ہیں) پیداوار کی قوتوں کی توسیع سے اشیائے فروختنی کی بہتات ہوتی ہے اور تہذیب میں صارفیت کا عنصر بڑھتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ سرمایہ دارانہ ممالک میں صارفانہ تہذیب CONSUMER CULTURE فروغ حاصل کرتی ہے اور اس لئے صبر و قناعت کی قدریں راستے کی رکاوٹ بن جاتی ہیں۔ صبر و قناعت سے انسان میں ٹھہراؤ اور سکون کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور صارفیت اضطراب، بے چینی اور حرکت کو بڑھاوا دیتی ہیں۔ اس لئے مشرقی تہذیبوں میں محرومی کے باوجود، انسان زیادہ پرسکون اور مطمئن ہوتا ہے جبکہ مغربی تہذیبوں میں انسان کے پاس بہت زیادہ ہوتے ہوئے بھی وہ بے چینی اور اضطرار کی کیفیت میں مبتلا رہتا ہے۔

(۳)

مشرق و مغرب کی تہذیب اور سیاسی آمیزش و آویزش سے ایک درمیانی تہذیب پیدا ہوئی جسے ہم اشتراکی

تہذیب COLONIAL CULTURE کہہ سکتے ہیں۔ اس قسم کی تہذیب میں دونوں تہذیبوں کے عناصر ہوتے ہیں لیکن مشکل یہ ہے کہ استعماری تہذیب دونوں تہذیبوں کا تخلیقی امتزاج CREATIVE SYNTHESIS نہیں ہوتی کیوں کہ اس تہذیب میں سیاسی اعتبار سے استعماری آقاؤں کا تسلط ہوتا ہے۔ حقیقی معنی میں ذہنی اور سیاسی آزادی کا جوہر اس تہذیب میں پیدا نہیں ہو پاتا اور جو تہذیب اس جوہر سے محروم ہوگی، اس میں تخلیقی صلاحیت بدرجۂ اتم پیدا نہیں ہو سکتی۔ یہ ایک طرف عقل پرستی کا طرف رجحان پیدا کرتی ہے اور استعماری آقاؤں کی طرف وفاداری کے جذبے کو بھی فروغ دیتی ہے۔

اس آمیزش سے ایک طرح کی تہذیبی اور سیاسی آویزش پیدا ہوتی ہے۔ اقدار کا ٹکراؤ ہوتا ہے اور ذہن میں یا تو غلامی کا جذبہ بڑھتا ہے یا اعتذار کا یا ان مغربی اقدار کی مکمل نفی کا۔ ١٩ویں صدی کے ہندوستان کا تہذیبی نقشہ بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ ہندوستان کے لوگ ایک عجیب ذہنی اور سیاسی کشمکش میں مبتلا ہو گئے۔ کچھ لوگ نئی قدروں کی طرف کھنچے اور انگریزوں کی حکومت کو ایک نعمت تصور کیا۔ بعض لوگوں میں یہ جذبہ اس انتہا کو پہنچا کہ انگریزوں کے مذہب عیسائیت کو بھی بہتر مذہب سمجھ کر اسے اختیار کر لیا۔ بنگال کے بعض دانشوروں کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ بعض لوگوں نے ان نئی تہذیبی اقدار کو تو قبول کیا لیکن استعماری سیاست کے خلاف اپنی آواز بھی بلند کی۔ بعض لوگوں نے نہ ان نئی قدروں کو قبول کیا نہ استعماری سیاست کو۔ علما کا شمار اس آخری زمرے میں ہوگا۔ جن لوگوں نے اعتذار کا رویہ اختیار کیا ان لوگوں میں سید امیر علی جیسے افراد کا شمار کیا جا سکتا ہے۔ ہم یہاں ان باتوں کی تفصیل میں نہیں جاتے لیکن ان کی طرف چند اشارے ہی کافی ہیں۔

غالب کا ذہن بھی اسی دور کی پیداوار تھا۔ انگریزوں کی مادی ترقی اور بعض تہذیبی اقدار نے ان کے ذہن کو متاثر کیا۔ غالب نے اپنی بعض نظموں میں ان چیزوں کی کھلے دل سے تعریف بھی کی۔ غالب نے انہی اثرات کے تحت اپنے آپ کو "عندلیب گلشن ناآفریدہ" قرار دیا۔ وہ اپنی شاعری کے ذریعہ اسی گلشن ناآفریدہ کی آبیاری کرنا چاہتے تھے۔ اسی لئے دیر و حرم کو انھوں نے آئینۂ تکرار تمنا قرار دیا اور واماندگی شوق کی پناہ گاہیں۔ غالب ایک عظیم فنکار تھے اور اپنے فن کو ایک متحرک اور تخلیقی مستقبل پیدا کرنے کے لئے استعمال کرنا چاہتے تھے۔

غالب کا رویہ استعماری سیاست کی طرف کیا تھا یہ قطعی طور پر کہنا مشکل ہے۔ ان کو ایسے مشکل حالات کا سامنا تھا کہ وہ کھل کر نہ انگریزوں کی حمایت کر سکتے تھے نہ مخالفت۔ ابہام سے کام لینا ضروری تھا۔ بعض حالات میں فنکار کو ابہام کا سہارا لینا ہی پڑتا ہے۔ جہاں مرزا صاحب نے انگریزوں کی مادی ترقی اور ان کی نئی اقدار کی تعریف کی وہاں ان کی استعماری سیاست کو کھل کر نہیں سراہا۔ سیاسی غلامی کو کوئی سراہ بھی کیسے سکتا ہے۔ انہی نئی تہذیبی قدروں کے اثر کے تحت غالب کے یہاں تقلید محض یا ہیرو فاشعاری کا انفعالی تصور نہیں ملتا۔ وہ انسانی عظمت کے قائل ہیں۔ اور در کعبہ وا نہ ہو تو جبہہ سائی کرنے کے بجائے لوٹ آنے کی بات کرتے ہیں۔ غالب کے یہاں اسی طرح تحرک کا عنصر پایا جاتا ہے اور تحیر کا بھی۔ وہ اپنی غزل میں کئی بنیادی سوال بھی اٹھاتے ہیں اور محض عقیدت کے تحت سر تسلیم خم نہیں کرتے۔

(۴)

آج تیسری دنیا کے ممالک میں تو استعماری کلچر پیدا ہو رہا ہے۔ یہ کلچر کثیر قومی یعنی ملٹی نیشنل کارپوریشنز کی معیشت کا پروردہ کلچر ہے۔ غریب ملکوں پر کنزیومرزم لادی جا رہی ہے۔ یہ نو استعماری کلچر تمام اقدار کی نفی کرتا ہے اور تیسری دنیا کے سماجوں میں ایک نئی تہذیبی اور سیاسی آویزش کو جنم دے رہا ہے اس کلچر کی بنیاد استحصال پر ہے اور یہ ہر شے کو جس میں فن پارے بھی شامل ہیں بازار کی جنس بنا دیتا ہے۔ اس سے جو ذہنیت پیدا ہوتی ہے وہ ناپائیدار اور منفی ہوتی ہے یہ صارف کے ذہن میں ایک عجیب کشمکش اور اضطرار کو جنم دیتی ہے اور اسی اضطرار کے تحت شاعری و موسیقی محض چیخ و پکار بن کر رہ جاتی ہے اور ڈسکو ڈانس، تمام فنی اقدار اس سے مجروح ہوتی ہیں صارفیت ہی اس تہذیب کا واحد مقصد ہوتا ہے۔

یہ صارفیت، جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا، جدید ٹکنالوجی کی پیداوار ہے جس کی بنیاد ہی تبدیلی اور ناپائیداری پر ہے۔ اس ٹکنالوجی کا اسٹیم رولر تمام تہذیبی قدروں کو کچلتا ہوا آگے بڑھتا ہے۔ یہ ٹکنالوجی جہاں اوپری طبقوں کے لئے صارفی رجحان پیدا کرتی ہے وہیں پسماندہ محروم طبقوں کے لئے احیاء پرستی۔ آج ہم دیکھتے ہیں کہ تیسری دنیا کے ملکوں میں عموماً اور ہمارے ملک میں خصوصاً احیاء پرستی کا طوفان آیا ہوا ہے اور اس طوفان میں ہماری تمام ترقی پسند سماجی اور جمہوری اقدار بہی جا رہی ہیں اسی احیاء پرستی نے ایک معنی میں شدید فرقہ پرستی کا بھی رجحان پیدا کیا ہے۔

صارفیت بھی ایک غلامانہ ذہنیت پیدا کرتی ہے انسان صارفیت کا غلام بن جاتا ہے اور ٹکنالوجی کی طرف اس کا رویہ غیر انتقادی بلکہ عقیدہ مندانہ ہو جاتا ہے۔ نہ اسے ماحول کی آلودگی کا احساس رہتا ہے نہ انسانی برتری کا۔ عقل کا عمل بھی آلۂ کار کا بن کر رہ جاتا ہے جس کا کام بڑے سرمایہ داروں کے منافع میں اضافہ کرنا ہوتا ہے۔ منافع ہی سب سے بڑی قدر بن جاتا ہے جو تمام انسانی اقدار کو نگل جاتا ہے۔

مستقبل قریب میں ہمیں اقدار کی آویزش کا سامنا کرنا ہوگا تاکہ ہم ان قدروں کو بچا سکیں جو صحت مند مبنی بر انصاف معاشرہ پیدا کر سکیں۔ اس کے لئے سیاسی جدوجہد ناگزیر ہے۔



علیم اللہ حالی

ہم مسافر جہاں جہاں گزرے

(قسط ۳)

پتہ چلا کہ فرید خان صنعت کار ہیں۔ کراچی میں ان کا ایک کارخانہ ہے۔ جہاں بال سنوارنے کے لئے مختلف ڈیزائنوں کے برش تیار کئے جاتے ہیں، پورے پاکستان میں ان کے مال کی اچھی کھپت ہے۔ انہوں نے برش کے کچھ نمونے بھی دکھائے۔ میں نے ان سے کہا کہ ہندوستان پاکستان میں اس طرح کے جو برش بنتے ہیں وہ امریکہ، انگلینڈ، جاپان، جرمنی اور چین نیز دوسرے ملکوں کی صنعت سے کمتر ہیں۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ ہمارے یہاں کے برشوں میں اچھی FINISHING نہیں ہوتی۔ پھر یہ کہ اکثر و بیشتر بال سنوارتے ہوئے ربر کا وہ پیڈ ہینڈل سے باہر نکل آتا ہے جس پر پلاسٹک یا لوہے کی کیلیں پیوست ہوتی ہیں اس طرح ہینڈل ہاتھ میں رہ جاتا ہے اور بال سنوارنے والا کیلوں کا گچھا بالوں میں الجھ کر رہ جاتا ہے۔ فرید خان نے سوٹ کیس سے نکال کر اپنے کارخانے کے چند برشوں کے نمونے دکھائے اور اس بات کا اعتراف کیا کہ مذکورہ بالا نقائص ہمارے یہاں موجود ہیں نیز یہ کہ ان پر قابو بھی پایا جا سکتا ہے۔ مگر مسئلہ یہ ہے کہ ہم عام طور پر سستی اور کم سے کم قیمت میں چیزیں حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ یہ ہمارا قومی مزاج ہے کہ ساری چیزیں لیتے ہوئے ہم چیزوں کے معیار پر توجہ نہیں دیتے، پہلا مقصد یہ ہوتا ہے کہ کوئی چیز کم سے کم قیمت میں ملتی ہے۔ سستی چیزوں پر زندگی گزارنے والے زندگی کے ہر شعبہ میں اس کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ عام ضرورت کی اشیا سے گزرتے ہوئے اس کا سلسلہ بڑی خاموشی کے ساتھ تمام معاملات تک پہنچ جاتا ہے۔ اسی رویے ہماری جمالیات کے مخصوص نقوش بنتے ہیں۔ معاشرت سیاست، ثقافت و تہذیب، تفریح و [illegible] اور شعر و ادب سب کچھ میں رد و قبول کا یہی انداز مقرر ہو جاتا ہے۔ زندگی ایک مکمل اکائی کا نام ہے۔ اس کا ایک جزو کہیں نہ کہیں سے دوسرے اجزا کو بھی متاثر کرتا ہے۔

فرید خان راستے بھر ہماری دلجوئی کرتے رہے۔ گاڑی میں جگہ جگہ انہوں نے مہمان نوازی یا مسافر نوازی سے بھی کام لیا۔ کراچی میں اپنے مکان کا پتہ دے کر وہاں آنے

کی تاکید کی ان کی مسلسل دلچسپیوں نے سفر میں اجنبیت اور اکتاہٹ سے محفوظ رکھا اور جب دوسرے دن چار بجے کے قریب ہم کراچی پہنچ رہے تھے تو یہ احساس ہی نہیں ہوا تھا کہ ہم اتنا لمبا سفر طے کر چکے ہیں۔ کراچی کے کم و بیش ایک ماہ کے قیام کے دوران فرید خاں کئی بار یاد آئے۔ دو تین بار انہیں فون کیا مگر اتفاق یہ کہ ان سے ایک بار بھی بات نہ ہو سکی۔ وہاں کی حد سے بڑھی ہوئی مصروفیت نے اس کی اجازت ہی نہیں دی کہ میں ان کے دولت خانہ پر جا کر تجدید ملاقات کروں۔ واپسی کے ایک دن قبل بھی میں نے انہیں فون کیا، فون پر کسی اور سے بات ہوئی۔ میں نے اپنی روانگی کی تاریخ دے دی اور منتظر رہا کہ انہیں جب بھی میرا پیغام ملے گا وہ میری قیام گاہ پیر الٰہی بخش کالونی ضرور آئیں گے ــــ مگر یہ نہیں ہوا اور میں ان سے ملے بغیر دوسرے دن اسٹیشن روانہ ہو گیا۔ عین اس وقت جب گاڑی چلنے کو پانچ سات منٹ باقی تھے اور میں اپنے اعزہ و احباب سے مل رہا تھا یکایک فرید خاں نظر آئے وہ اسی سادگی اور خلوص کے ساتھ مسکرا رہے تھے۔ انہوں نے اس عرصہ میں دوبارہ نہ ملنے کی معذرت کی اور نہایت عاجزی کے ساتھ ایک پیکٹ میری طرف بڑھایا۔ یہ ان کے کارخانے میں بنے ہوئے برتنوں کا تحفہ تھا جو بہشتی آج بھی ہمارے استعمال میں ہے اور ہر بار آئینے کے سامنے کھڑے ہوتے ہوئے [illegible] ان کی پُرخلوص شخصیت [illegible]

تیرے خلوص نے سمجھا دیا کہاں مجھ کو
کسی زمیں پہ رہوں آسماں نظر آؤں

اب ہم کراچی پہنچ چکے تھے۔ بجائے اس کے کہ ہم وہاں پہنچ کر اپنے اعزہ کو اپنی آمد کی خبر کرتے ہم نے یہ طے کیا کہ لوگوں میں حیرت و استعجاب پیدا کیا جائے ــ ٹیکسی کر کے ہم پیر الٰہی بخش کالونی چلے جہاں میری بہن رہتی ہیں۔ مکان کا نمبر، سیکٹر، لین وغیرہ معلوم ہوں تو پھر کسی نئی جگہ بھی پہنچنا آسان ہو جاتا ہے ــ اور یوں کچھ لمحوں کے بعد ہم پی۔ آئی۔ بی کالونی میں اپنی بہن، بہنوئی، بھانجیوں اور دوسرے اعزہ کے درمیان حیرت و مسرت کا سبب بنے ہوئے تھے۔ کراچی کے مختلف حصوں میں میرے اعزہ کی بڑی تعداد ہے۔ ان کے علاوہ احباب بھی ہیں۔ وہ اہل قلم بھی جن سے غائبانہ طور پر مراسلت ہے، وہ بھی ہیں جن سے کوئی مراسلت نہیں مگر ہم ایک دوسرے سے واقف ہیں۔ وہ بھی جو مجھے جانتے ہیں اور میں ان سے واقف نہیں ــــ اور وہ بھی ہیں جن میں ان کی نگارشات و تخلیقات کے وسیلے سے جانتا ہوں ــ مگر میں ان کے لئے اجنبی ہوں۔ غرض مختلف شعبوں میں ملنے والوں کی ایک کثیر تعداد ہے۔ میں سبھوں سے بغیر کسی اطلاع کے نہایت غیر رسمی طور سے ملنا چاہتا تھا۔ میں یہاں اپنی ایک خامی کا اعتراف بھی کرنا چاہتا ہوں کہ میں نامور اہل قلم اور دانشوروں سے محض اس تاثر میں کہ وہ نامور اور مشہور ہیں ملاقات کرتے ہوئے کوئی فخر محسوس نہیں کرتا۔ شاید اسی وجہ سے بڑے لوگوں سے بڑھ کر نہیں ملتا، ظاہر ہے ان کی عظمت میرے لئے تو کوئی علو پیدا نہیں کر سکتی۔ میری شخصیت تو میرے اپنے کام سے متعین ہوتی ہے۔ یہ خام آنا اکثر و بیشتر مجھے مشاہیر سے از خود بڑھ کر ملنے میں مانع ہوتی رہی ہے۔ ہاں اگر کسی نشست میں ملاقات ہو جائے اور کسی کی توجہ بطور خاص میری جانب منعطف ہوتی ہو تو پھر اس سے خود سے بار بار ملنے کی چاہت ہوتی ہے۔ در اصل پتہ نہیں کیوں

میں اپنے اندر نیاز مندانہ رویہ نہیں پاتا۔ اس تحفظ ذات نے کبھی کبھی مجھے بڑی محرومی سے بھی ہمکنار کیا ہے۔ جب عالم یہ ہو کہ ؎

دنیا اگر دہند نہ جنبد ز جائے خویش
من بستہ ام حنائے قناعت بپائے خویش

تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ زندگی کے بعض دلچسپ گوشوں میں بھی راقم الحروف کی تہی دستی کی داستان کتنی طویل ہوگی ــــ لیکن فی الحال اسے جانے دیجئے ابھی تو صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ بعض مشاہیر کی طرف سے خوف بے مہری نے مجھے ان سے ملنے نہ دیا۔ میں وہاں بھی اپنے ان آزمودہ بے ریا احباب سے ملنے کے لئے مضطرب تھا جو مجھ سے ملتے ہوئے کبھی اپنے ادبی قد و قامت کو نہیں ناپتے۔ چنانچہ میں علی حیدر ملک، صبا اکرام، شہزاد منظر، اور نور الہدیٰ سید سے اولین فرصت میں ملنا چاہتا تھا۔ یہ حضرات ادبی سطح پر بھی پاکستان خاص طور پر کراچی میں خاصے متحرک ہیں۔ ادبی نشستوں، انجمنوں اور اجتماعوں میں ان کا بول بالا ہے ــــ یہ اور بات ہے کہ کراچی میں ہر جگہ "دہشت گردی" کا بول بالا ہے۔ یہ شہر بھی عجیب ہے۔ اتنے دن رہنے کے باوجود مجھے اس کے طول و عرض اور حدود حال کا اندازہ نہیں ہو سکا۔ اس شہر کا مزاج بھی کچھ عجیب ہے لوگوں سے ملئے تو سیدھے سادے، نفیس طبع، اپنے کام سے کام رکھنے والے، مناقشوں سے دور بھاگنے والے ــــ تنازعات کو گھٹانے اور رشتوں کو بڑھانے والے، زردار لیکن بے ضرر افراد ــــ مگر وہاں کا نوشتہ دیوار کچھ اور ہی بتاتا ہے۔ دیواروں پر سیاسی جماعتوں کے نعرے بین الاقوامی تغیرات کے ردعمل، مذہب کا لیبل لگائے ہوئے مغربی طرز کی جمہوریت پسند سیاسی جماعتوں کے نظریات، اتحاد المسلمین کے دل خوش کن فقروں کے ساتھ افتراق و نفاق کے شوشے ــــ غرض پورا معاشرہ ایک خاموش تضاد اور داخلی تصادم کا شکار نظر آتا ہے۔ مگر اس زیریں افراتفری میں بھی خارجی طور پر ضبط، تہذیب اور رواداری کی خصوصیت ہے۔ جس کا اندازہ اس شہر کے رہنے والوں سے ہوتا ہے۔ مجھے کراچی میں دور دور تک شیعہ سنی تنازعہ نظر نہیں آیا مگر دیواروں پر فرقہ وارانہ جذبات کو بھڑکانے والے جملے جگہ جگہ لکھے ہوئے ملے: "نام ہے میرا سپاہ صحابہؓ / کام ہے میرا دفاع صحابہؓ" جیسے ناقص مصرعے بھی نظر آئے۔ جذبات کے ان اندھوں کو وزن و قافیہ بھی نہیں سوجھتا۔

زباں بگڑی تو بگڑی تھی خبر لیجئے دہن بگڑا

ایسے نوشتۂ دیوار سے سخت بددلی پیدا ہو گئی، حیرت معلوم ہوتی ہے کہ جس ملک اور جس شہر کے لوگ ملنے جلنے میں اور نجی گفتگو میں ایسے صاف ستھرے ہوں وہاں اس طرح کی ریشہ دوانی کرنے والے عناصر کیوں کر پنپ رہے ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ اس کے در پردہ ملک دشمن کی کوئی زبردست سازش ہے اور سازش کرنے والی ان طاقتوں نے اندرون ملک بھی اپنے کچھ آلۂ کار پیدا کر لئے ہیں۔ ان تحریروں سے ملک کے مستقبل کی جو تعبیر سامنے آتی ہے وہ حد درجہ ہولناک ہے۔

کراچی اردو شعر و ادب کا ایک عظیم کارخانہ ہے ادبی تنظیموں، رسائل و جرائد، محفلوں اور مجلسوں، تحقیق، تنقید، بحث و تمحیص اور اہل قلم حضرات کا اتنا کثیر اور فعال مجمع کسی دوسری جگہ نہیں ملتا۔ کچھ ایسے لوگ ہیں جو ان مشاغل میں تفریحی انداز سے مبتلا ہیں، کچھ ایسے ہیں جو تیاگ اور تپسیا سے کام لیتے ہیں، کچھ نئے اقدار کے نفاذ کے لئے سرگرم عمل ہیں۔ کچھ ثابتہ شعری و ادبی قدروں

ڈاکٹر تارا چرن رستوگی

انجمنِ فکر و فن

یہ بھی کیسی ستم ظریفی ہے کہ میں جناب رام پرکاش راہی سے قریب بھی ہوں اور دور بھی۔

گ:- دم بہ دم با من و ہر لحظہ گریزاں از من

راہی صاحب پیکرِ خلوص و محبت ہیں۔ ان کی تمام تر کوشش یہی رہتی ہے کہ وہ دوسرے شعراء کے حوصلے بلند کرتے رہیں۔ لہٰذا، بالعموم وہ دوسروں کے ہی اشعار ہی سناتے رہتے ہیں۔ غالباً نیا سال ۱۹۹۰ء میرے لئے خوش بختی لایا ہے کہ میں پہلی مرتبہ "شاعر راہی" سے متعارف ہوا جب کہ میں برسہا سال سے ان کی محبتوں سے متمول ہوتا رہا ہوں۔ متعدد بار اصرار کرنے پر راہی صاحب نے سات غزلیات عنایت فرمائیں۔

غالب کو عمر بھر یہ شکوہ رہا کہ ؎ طرزِ بیدل میں ریختہ کہنا ÷ اسد اللہ خاں قیامت ہے

تلخ حقیقت یہ ہے کہ غالب طرزِ بیدل میں اردو تو اردو، فارسی میں بھی شعر نہ کہہ سکے۔ سوال اٹھتا ہے کہ طرزِ بیدل سے مراد کیا ہے۔ ویسے ماہرینِ غالبیات تو سینکڑوں ہیں مگر کسی ایک ماہرِ غالبیات نے بھی اس نکتہ کی وضاحت نہیں کی ہے۔ شعرِ راہی میں رنگ و آہنگ بیدل بھرپور جمالیات لئے شوخیِ افق و شفق میں کرن کرن نظر آتا ہے۔ بیدل کے یہاں شعر کا پہلا مصرعہ بالعموم کسی خاص معنویت سے ہمکنار نظر نہیں آتا مگر وہ مصرعہ جب دوسرے مصرعے کی طرف رواں دواں ہوتا ہے تو ایک نئے افق و شفق کا تناظر ابھرتا ہے۔ مثلاً

با ہر کمال اندکے آشفتگی خوش است ÷ ہر چند عقلِ کل شدہ بے جنوں مباش

یا ؎ ہر کجا رفتیم سیرِ خلوتِ دل داشتیم ÷ بیدل آغوشِ فلک ہم بعدِ ازیں خانہ بود

راہی کے شعر میں بیدل کا انداز بھی ہے اور ان کا اپنا مخصوص انداز بھی۔ راہی کی ہر غزل کا مطلع فکری و جذباتی تو لد سے طلوع ہوتا ہے۔ ذہنی آمیزش و آویزش اور دلی تموجات، محرکات، و تاثرات وغیرہ کو آغوش میں لئے ہوئے!

مزید برآں کسی غزل کے مقطع میں لفظ راہی بے معنی نہیں ہوتا۔ شعر راہی میں فلسفہ بھی ملتا ہے۔ سماجیاتی پس منظر لئے ہوئے بھی ابھرتے ہیں۔ ان کا ہر شعر صوت وصورت کا دلکش سنگم، ایسا سنگم جس میں جابجا کہکشاں عکس در عکس، قزح در قزح نظر آتی ہیں۔

دل و دماغ کی جملہ خوبیوں کے حامل راہی صاحب انگریزی، فارسی اور ہندی کے عالم وفاضل ہیں۔ پنجاب یونیورسٹی لاہور کے انگریزی آنرز گریجویٹ ہیں۔ ہماری زبان، حال ہند، فیشن وغیرہ ایسے موقر جریدوں کے ادارتی عملے سے وابستہ رہے ہیں۔ آکاشوانی پران کا کلام، تبصرے، فیچر وغیرہ نشریات اردو و فارسی بھی مشمول ہوتے رہتے ہیں۔ قارئین کرام کی خدمت میں راہی کی چند غزلیں پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں۔ ملاحظہ ہوں۔ ان غزلوں میں نئی فکر کی تہہ در تہہ اک کائنات قارئین کو سوچنے پر مجبور کرے گی۔ جدت کا ایک ایسا سلسلہ دستیاب آئے گا جو معنویت سے لبریز اور شعری جمالیات کی منہ بولتی حقیقت سے جذب واثر کا جادو جگائے گا۔

(بقیہ:۔ سفرنامہ)

کے خوگر ہیں۔

میں وہاں پہنچا تو متعدد ادبی تنظیموں اور حلقوں نے پرخلوص استقبال کیا، مخصوص نشستوں، مشاعروں ادبی ملاقاتوں کا اتنا زبردست سلسلہ شروع ہو گیا کہ میں ان مصروفیات کی وجہ سے اپنے اعزہ کے ساتھ انصاف بھی نہیں کر سکا۔ احباب کا یہ بے محابہ طرز تپاک بسا اوقات گراں بھی گزرا اور غالب کا یہ مصرعہ بھی یاد آیا کہ

خم دست نوازش بن گیا ہے طوق گردن کا

مگر اس کے باوجود اس گرم جوشی اور التفات پیشی نے اتنے دنوں تک مجھے ایک سرمدی مسرت بخشی اور شاید انہیں ملاقاتوں اور اجتماعوں کے خوشگوار اثرات کا نتیجہ ہے کہ میں سفرنامہ لکھنے پر آمادہ ہوا ہوں۔

جواب کے لئے ڈاک ٹکٹ ضرور ارسال کریں

[illegible]

غزلیں

[موضوع، بیان، لہجہ، الفاظ اور اسالیب کے لحاظ سے اردو غزل کی اتنی راہیں نکل آئی ہیں کہ انہیں [illegible] میں لانا ممکن نہیں۔ اس چورنگی پر کھڑے ہو کر سمت و رفتار کا اندازہ لگانا بھی مشکل ہے۔ جناب رام پرکاش راہی بھی انہیں راستوں کے مسافر ہیں لیکن انداز قدرے دوسروں سے مختلف ہے۔ اس بھیڑ میں اس اختصاص و امتیاز کے ساتھ جناب راہی کی اپنی شناخت بن سکے ایک بڑی بات ہے۔ جناب رام پرکاش راہی نے جو روش اپنائی ہے غزل میں جس طرح ایک نیا غنائی نظام پیدا کرنا چاہا ہے اس کے ماشاء و ماعلیہ کے بارے میں بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔ لیکن اس تفصیل میں گئے بغیر ان کی چند غزلیں ایک ساتھ شائع کرتے ہوئے ہمیں صرف یہ کہنا ہے کہ جناب راہی نے امتیاز کی جو لکیریں بنائی ہیں ان میں ماحولیاتی لب و لہجہ، ہیئت، خات، الفاظ، نئے اشارات اور ایک معنوی صوتی آہنگ کو اہمیت حاصل ہے۔ ان عناصر اور ان کی ترکیب سے تیار شدہ آمیزہ کی قدر و قیمت کا تعین قاری کی قبولیت پر منحصر ہے۔ تجربات کی نئی نئی کونپلوں کا ہمیں استقبال کرنا چاہیے اور شعر و ادب کے فطری نمو کو استحسان کی نظروں سے دیکھنا چاہیے۔ ادارہ]

رام پرکاش راہی

○

بدن کی اوٹ کے ناتے، بدن تک رہ نہ جائیں
کہیں پھر اس گھٹن سے اس گھٹن تک رہ نہ جائیں

چھوئے اوڑھ کر ہی ان خلاؤں کو ہمارے
نگاہیں، پھر نگاہیں ہی، گگن تک رہ نہ جائیں

قریب آنے کی مل جل کر کوئی صورت نکالیں
اسی دوری میں دونوں، حسن ظن تک رہ نہ جائیں

ہوا بھی روشنی کے ساتھ در آئے تو بہتر
فضائے شب کے بستر کی شکن تک رہ نہ جائیں

کڑے ہیں وقت کے سانچے تو ڈھلنا بھی ضروری
کھنکتے سر، چٹختے بانکپن تک رہ نہ جائیں

کوئی تاریخ ہی تکرار در تکرار راہی
قدم یہ آج کے، کل کی گھٹن تک رہ نہ جائیں

۲

صدائے دل بھی مری خامشی میں ڈوب گئی
بساطِ شوق یہ کس بے بسی میں ڈوب گئی

خوشی کہ دید کی خاطر کھلے تھے لب گویا
بڑے تپاک سے شبنم کلی میں ڈوب گئی

لطافتوں نے جو دیکھا کثافتوں کا خلوص
تو روحِ حسن، تنِ عاشقی میں ڈوب گئی

وہ زندگی جو پنپتی تھی دل کی وسعت میں
ہر ایک شے کی مسلسل کمی میں ڈوب گئی

سحر کے روپ میں راہی وہ پھر بحال ہوئی
غموں کی رات جو زندہ دلی میں ڈوب گئی

۳

انا کی اوٹ میں آفاقیت کا راز ہوں میں
تِرے وجود کا منہ بولتا جواز ہوں میں
ستم ظریف مناسخ بھی میرے پیچھے ہے
یہی نہیں کہ عناصر کی ساز باز ہوں میں
میں سلسلہ ہوں، تمدن کی دھوپ چھاؤں کا
کہ ہست و نیست کے مابین اک محاذ ہوں میں
مری شکست کی آواز، بس یہی ہے سخن
ہوا کے دوش پہ لرزاں سکوتِ ساز ہوں میں
تھکی تھکی سی سرِ راہ، انتظار کی آنکھ
وہی سوال کا عقدہ کہ نیم باز ہوں میں
حیات خیمۂ منعم ہے جس کے دم خم سے
اسی چراغ کا بے ساختہ گداز ہوں میں
نگارِ شعر ہے راہی وہ آئینہ جس میں
نظر، نظر ہے تو اک عکسِ امتیاز ہوں میں

۴

سائے سے حوصلے کے بدکتے ہیں راستے
آگے بڑھوں تو پیچھے سرکتے ہیں راستے
سمجھو تو، گھر سے گھر کا تعلق انہیں سے ہے
دیکھو تو بے مقام بھٹکتے ہیں راستے
آنسو ہزار ٹوٹ کے برسیں تو پی کے چپ
اک قہقہہ اٹھے تو کھٹکتے ہیں راستے
تاروں کی چھاؤں نرم ہے، سُن لیتی ہے پکار
دن بھر کی دھوپ میں جو بلکتے ہیں راستے
دامن پہ ان کے، پاؤں کے ایسے نشاں بھی ہیں
رہ، رہ کے جن کے دم سے دمکتے ہیں راستے
راہی چلیں جو ہم تو چلے آئیں یہ بھی ساتھ
قدموں کی پیٹھ پر ہی ٹھٹکتے ہیں راستے

(۵)

لذتِ کار بھی حاصل نہیں بے کاروں میں
وہ بھی سو رہے کے شامل ہے قطاروں میں
بے رخی طرزِ تغافل، وہ تکلف کیا تھا
ایک اقرار چھپا تھا انکاروں میں
کوئی شعلوں کی لپک تھی نہ دھوئیں کی پینگیں
جل بجھے آب و ہوا کرب کے انگاروں میں
وہ جو عفت ہے سراپا تو ہوا عصمت [illegible]
پوچھ لوں گا لے پازیب کی جھنکاروں میں
آنکھ لگتا تھا کبھی سانسوں سے شامیں پہنیں
کوئی لپٹا تھا گھنی زلف کی مہکاروں میں
ڈوب کر سو ہی گئے [illegible] میں رہ گئی
کوئی تنکا بھی نہ تھا کھو گئے دھاروں میں

(۶)

بانی کا زخم تھا کیا سناؤں نہ پھر نمک
ایسا چھلکا زخم کے سارا پلکوں سے بہہ گیا نمک
جلسے سارے سب بیٹھے تھے کھا کر وہ بھول گیا
تلخ عناصر پہ جو تھا رنگ رگ میں رہ گیا نمک
زخموں کے گل کیا دھوئے گی ست دریا بہتا جہاں
ہر موسم ہر آن بکھیرے چلتی پھرتی ہوا نمک
آنگنائی کی محرابوں میں سنگ دھنک کے کیوں بکھریں
جن کی ہر یہ بات نہ سیلی، جن کی ہر پروا نمک
لیکھ لفافے [illegible] سرخی [illegible] مضمون بکھت
مسکین کیا [illegible] ہے سب کچھ لادیگا نمک
جانے کیا کیا عکس اگلتے، کس کس نے آئینے
اُلٹے چہرے زخموں پہ راہی کون چھڑکتا کڑوا نمک

(۷)

کس نے کہا تھا شہر میں آ کر آنکھ لڑاؤ دیواروں سے
سایہ سایہ بھٹک بھٹک اب سر ٹکراؤ دیواروں سے
گھات لگائے بیٹھی ہیں پلکیں [illegible] کس کس کی بانجھ نگاہیں
زخموں کے لیے پھول تو بچو پھر کھاؤ دیواروں سے
قطع تعلق کے بعد بھی اکثر بھید کھلے ہے دل کا کوئی
آنکھ اٹھا کے دیکھا جو [illegible] دل بھی اٹھاؤ دیواروں سے
رستوں کی تہذیب یہی ہے [illegible] باتیں چپ کے رہنا
سب کچھ کھو جاتا ہے تو منہ نہ لگاؤ دیواروں سے
سیج گلشن میں جب [illegible]
کھل [illegible] دیواروں سے
[illegible] تک
[illegible]
کس طرح آنکھ لے آئی [illegible]
دروازوں کو [illegible] دیواروں سے

علی عباس ازل

عجیب لوگ ہیں رہتے ہیں آبگینوں میں
مگر حصار ہیں باندھے ہوئے فصیلوں میں
وہ شخص جس نے کہا تھا کہ آؤ پیار کریں
وہی فساد کا باعث بنا قبیلوں میں
جو بات سادہ تھی اور دل کو چھونے والی تھی
وہ کیسی مسخ ہوئی منطقی دلیلوں میں
کبھی ٹھہرتا نہیں کاروانِ تشنہ لبی
کہ پیاس بجھتی نہیں واہمی سبیلوں میں
کہیں ملا بھی جو انصاف کچھ عدالت سے
کھڑے کھڑے وہ وہیں بٹ گیا وکیلوں میں
اب آرزو میں تری اور لطف آئے گا
اب اعتبار نہیں ہے مجھے بخیلوں میں
کیا تو میں نے بھی گلزار آگ کو لیکن
مرا شمار نہیں ہو سکا خلیلوں میں

ڈاکٹر محمد علی اثر

ٹوٹ کر رہ گیا آئینے سے رشتہ اپنا
ایک مدت ہوئی دیکھا نہیں چہرا اپنا
کوئی طوفان ہے، نہ اب کوئی تلاطم باقی
ساحلِ درد پہ ٹھہرا ہے سفینہ اپنا
لفظ و معنی کے نئے پھول ابھر آئیں گے
نقش ہو جائے جو قرطاس پہ لہجہ اپنا
یاد خوشبو ہے چھپانے سے کہاں چھپتی ہے
موجِ گل خود ہی بنا لیتی ہے رستہ اپنا
جس کے جانے سے منور ہوئے پلکوں پہ چراغ
آج تک اس نے دکھایا نہیں چہرا اپنا
رات کے ساتھ اثر لوٹ کے گھر جاتا ہے
راستہ دیکھ رہا ہوگا دریچہ اپنا

غزلیں

شان بھارتی

آنکھیں بھی ہیں اسی کی، بصارت اسی کی ہے
جس آئینے میں دیکھوں حقیقت اسی کی ہے

بے نقص جو بھی اس میں حماقت اسی کی ہے
تخلیق جس کی ہے یہ کتابت اسی کی ہے

آتا نہیں خیال بھی ردّ و قبول کا
مجھ پر ستم اسی کا عنایت اسی کی ہے

ہر اک قدم پہ فتنے جگاتا ہے اس کا کام
پھر بھی تمام شہر میں عزت اسی کی ہے

پہنچا دیا ہے راہِ طلب نے کہاں مجھے
نفرت ہے جس سے مجھ کو، ضرورت اسی کی ہے

اس کے خلاف میں نے کیا ہے مقدمہ
یہ جانتے ہوئے کہ عدالت اسی کی ہے

م. ش. نجمی

موڑ ایسا تھا کہ پرچھائیں بھی لہرائی نہیں
انتہا یہ ہے کہ ان کی یاد بھی آئی نہیں

بے نمک پاشی ہے، زخموں کی پذیرائی نہیں
خوشنما پھولوں کے پیکر میں مسیحائی نہیں

ہم ہتھیلی پر اگا لیتے ہیں مہندی اور گلاب
خارزاروں میں علاجِ آبلہ پائی نہیں

آنسوؤں کے ساتھ شل ہیں یہ تمنائیں بجد
آنکھ سے دل تک کہیں بھی بزم آرائی نہیں

کیسی کیسی بستیاں آباد ہیں احساس میں
دور تک میرے لہو میں نقشِ تنہائی نہیں

خواب سے نجمی ہماری عمر بھر کی دوستی
ہاں مگر آنکھوں کی خوابوں سے شناسائی نہیں

دشت ہے اور کوچۂ دلدار کا سفر
پلکوں سے کر رہا ہوں در یار کا سفر

وہ موڑ ہے کہ اپنے لئے دونوں بے کشش
اقرار کا سفر ہو کہ انکار کا سفر

بھنورے کا ڈنک پھول کی ایذا رسانیاں
ہر پل بدن دریدہ رہا خار کا سفر

ہم کیسے بیٹھ رہتے کہ باندھا تھا وقت نے
قدموں کے ساتھ کوچہ و بازار کا سفر

اک ان کہی سی پیاس لبِ سنگ پہ محیط
اک بولتا سکوت ہے کہسار کا سفر

ہر جادۂ نظر سے گزرتا ہوں صبح و شام
میرا وجود ہو گیا اخبار کا سفر

نجمی بدل دو راہ، تقاضہ ہے وقت کا
مہنگا پڑے گا ورنہ یہ کردار کا سفر

غزلیں

حسیب کاظمی

نہ شامِ غم، نہ صبحِ معتبر ہوں
تماشائے جمالِ دیدہ ور ہوں
کوئی رت ہو وہی بے برگ و باری
زمیں پہ ایک بے موسم شجر ہوں
کہیں اک لمحۂ گزراں کا سایہ
کہیں آئینۂ صدیوں کا سفر ہوں
ہوں حرفِ ناشدہ بے سخن کو
شعورِ دیدۂ اہلِ نظر ہوں
کہیں صحرائے شعلِ انجم لشکر
سرِ خاراں شبِ دشتِ جگر ہوں
کبھی دل کا، کبھی دنیا کا ماتم
میں اپنی ذات میں اک چشمِ تر ہوں
نہ ہمسایہ کوئی اپنا نہ درباں
مکاں ہوں اور بے دیوار و در ہوں

پیکر شاہین پرویز

کارواں خوشیوں کا آئے گا یہاں پہ کس طرح
میرے دل میں ہے غموں کا قافلہ ٹھہرا ہوا
چھیڑ دی جس وقت دل نے عہدِ ماضی کی بات
درد کا احساس اکثر اور بھی گہرا ہوا
خامشی تو پیش خیمہ ہے کسی طوفان کا
رنگ کچھ تو لائے گا یہ دردِ دل ٹھہرا ہوا
رازِ دل کیسے عیاں ہوگا کسی کے سامنے
[illegible] پہ آئینوں کے عکس کا پہرا ہوا
کچھ نہیں احساس صحرائے وقت پتھر کی طرح
آج کا انسان دیکھو کس قدر بہرا ہوا
کیا کہیں اپنی بدنصیبی کا مآل
اب اجڑ کر پیار کا گلزار بھی صحرا ہوا

حمید خان حمید

کس طرح دیکھے کوئی خواب یہاں
ایک اک سانس ہے عذاب یہاں
پیار کا ایک بھی نہیں لمحہ
اور آفت ہے بے حساب یہاں
آگ کے مہر ہوتی ہے بارش
جب نکلتا ہے آفتاب یہاں
یہ حقیقت کا جو ملا ہے ہمیں
بھول بیٹھے ہیں سب حجاب یہاں
جس قدر جھوٹ کہہ سکے کوئی
اسی قدر ہے وہ کامیاب یہاں
شکل دیکھو گے کس طرح سے حمید
سب کے چہرے پہ ہے نقاب یہاں

قیوم خضر

چچا علی حسن!

[مندرجہ ذیل تحریر میں عام ہماری بول چال (Colloquials) کے کچھ الفاظ علاقائی لب و لہجہ کے ساتھ استعمال کئے گئے ہیں، اور ان الفاظ کے اردو معانی آخر میں دیئے گئے ہیں۔ اس تحریر سے لطف وہی اٹھا سکیں گے جن کا گیا شہر کے ایک ایسے کردار سے آپ کی واقفیت ہوگی جو بالکل اصلی ہے، اور مذکورہ تمام واقعات بھی حقیقت پر مبنی ہیں، اس تحریر سے اس زمانے کے گیا شہر کی چند جھلکیاں بھی آپ دیکھیں گے۔]

چچا علی حسن، بچپن ہی سے بڑے لنگٹ تھے۔ جوانی آئی تو اور بھی لنگٹ ہو گئے۔ ذہن کچی کی آمدنی تھی، اس کے علاوہ بھی دولت کی فراوانی تھی۔ کوٹھیوں کی تاک جھانک کا چسکا لگ گیا۔ اس زمانے میں گیا کی کشتی مشہور تھی۔ جھنیا کھلیہا (خلیفہ) کا طوطی بولتا تھا۔ چچا علی حسن بھی اس کے چیلے تھے۔

گیا چوک میں گھنسا گھر کے بگٹ نٹ بیرونے کا کوٹھا تھا، اس کی دو بیٹیاں بڑی خوبصورت اور بھولی صورت والی تھیں۔ چچا علی حسن کا دل حسرت پر آ گیا۔ اور انہوں نے ان کو اپنی بیٹی بنا لیا۔ مسرور ہو ں، گیا شہر کے نامور لونڈوں کو چچا علی حسن کی چلی

میں پیر رکھا تھا۔ دل پھینک قسم کے لوگ ان دونوں کے پیچھے لوڑا بے ہو رہے تھے۔ گیاجی کے گیوال لونڈے بھی بنٹھن، بیڑیا ڈوبے کھروں سے لگما دیا ہوا کرتا، عطر میں بھری ہوئی دھوتیاں باندھے اپنی اپنی جماجم کشتیوں پر بیٹھے چوک آتے۔ مگھی پان کھاتے۔ رنڈیوں کو تکتکی مارتے، جی میں آتا تو کسی کوٹھے پر چڑھ جاتے، ورنہ شپاشپ چابک کھاتے اور منکاری بھرتے ہوئے اپنی اپنی کشتیوں پر لوٹ جاتے۔ مشہور گیوال رئیس لٹک بھیا کا ایک لونڈا بھی تھا، وہ بھی حسرت پر آنکھ گڑائے ہوئے تھا۔ اس سلسلے میں ان سے ان کی رقیبانہ ڈوئل چلنے لگی۔ ایک رات کا حسرت کے کوٹھے پر چچا سے اسی لونڈے کی ٹھن گئی۔ بات بڑھ گئی

دھینگا مشتی کی آگئی۔ وہ گتھم گتھی ہوئی کہ کھڑکیوں کے شیشے چھن چھن ٹوٹنے لگے۔ لوہے کی کرسیاں ٹن ٹن بولنے لگیں۔ الگنی پر ٹنگے کپڑے دھپ دھپ گرنے لگے۔ ہر چیز ڈھمنا نے لگی۔ منت بھروا مزاجاً کھکھوا تو تھا ہی۔ یہ سماں جو دیکھا تو گھگھیانے لگا۔ "ارے تم بدمعاشوں نے میرا سر پایا ہوا مارا سامان تتر بتر اور چھتراکر راواں ڈاواں کر دیا۔ کسی صورت سے مکا مکی اور مارا ماری بند ہوئی۔ گیوال عاشق کر چپانے دوم دوم کر اور ڈھینٹ ڈھینٹ کر اتنا مارا کہ اسکا تنہبتر بچھ گیا بےچارہ منہ لٹکائے کوٹھے سے نیچے اتر آیا۔ مار پیٹ میں چپا کی ٹک بھی بھی ہتہ ٹہتہ لال ہوکر سوج گئی۔ کئی دنوں تک گرم پانی سے سینکنے پر سوجن اور اس کے پیڑا میں کمی ہوئی۔

ہوتے ہوتے ہوا یہ کہ ایک بھری برسات کی اندھیاری اور بھیگی رات میں چچا حسرت کو اڑا لے بھاگے اور محلہ مرادپورہ میں بجاٹے کا مکان لے کر رہنے لگے ـــــ ماڈیوری جو چچا علی حسن کے سگے چھوٹے چچا تھے۔ انہوں نے جب یہ ماجرا سنا تو پھبتی کسی۔

منت ستر کے ہاتھ سے حسرت نکل گئی
گھنٹا ڈلا کے رہ گیا ماور کے سامنے

منت تھا تو بھڑوا مگر رہتا تھا اس ٹھاٹ باٹ سے کہ ہاکوئی رئیس رہے گا۔ روزانہ ۴ بجے سانجھ کو سیر کرنے نکلتا۔ ٹھیک وقت پر بہت بڑھیا فٹن دروازے پر آکر کھڑی ہو جاتی۔ فٹن کے گھوڑے ایسے بانکے سجیلے تھے کہ شہر میں کسی نواب یا رئیس کو نصیب نہیں۔ منت کے سوار ہونے سے پہلے ایک چھریرے بدن کی بنی ٹھنی چھوکری، بڑا سا چاندی کا پاندان لے کر فٹن پر دریائیں طرف کونے میں بیٹھ جاتی۔ پیچھے ایک پہلوان ہاتھ میں سونٹا لیے بڑی بڑی خضاب آلودہ مونچھیں رکھے کھڑا ہو جاتا۔ سہاکی چکنی، جھل جھل کرتی ہوئی چندیا سے کڑوا تیل اسطرح ٹپکتا کہ ساری کنپٹی تر رہتی۔ فٹن کے آگے کوچوان اجلا وردی پہنے، بانکا ترچھا مڑیٹھا باندھے، گویہ نما سانپ کی طرح لہراتا ہوا چابک لے کر بیٹھ جاتا۔ اس کے بعد منت سر پر کامدانی زردی کی گول ٹوپی، پاؤں میں سلیم شاہی جوتا بدن پر نیلے مخمل کی زر لفتی شیروانی، اور چوڑی دار پاجامہ زیب تن کئے، اپنی کڑی مونچھوں پر تاؤ دیتا ہوا برآمد ہوتا اس کے داہنے ہاتھ میں چاندی کے بڑے مٹھے والی خوبصورت چھڑی ہوتی۔ وہ اس چھڑی کو بڑی تمکنت سے گھماتا ہوا جیسے فٹن پر پاؤں رکھتا، وہ چھوکری جو پہلے ہی سے وہاں موجود ہوتی آدھی کمر سے اٹھ کر بہ انداز معشوقانہ سلام کرتی، اور جھک بصد احترام پاندان کھول کر پان کی ایک گلوری پیش کرتی۔ منت وکٹوریہ زمانے کا ایک روپیہ اس کو انعام دیتا، اور آنکھوں سے اس کا ٹھمکا لے لیتا۔ اس کے بعد فٹن اس انداز سے چل پڑتی کہ گھوڑے کے پاؤں میں بندھے ہوئے گھنگرو بول اٹھتے ان کی ٹاپ زمین پر اس طرح پڑتی کہ سنگیت ابھرنے لگتا۔ اسی شان سے روزانہ منت اپنے گھر سے روانہ ہوتا اور کچہری روڈ ہوتے ہوئے گرجا میدان تک جاتا، اور پھر محلہ معصوم گنج اور پرانی گرام ہوتے ہوئے لوٹ جاتا۔

لوگوں کو منت کی یہ شان کھلتی تو ضرور تھی۔ مگر کوئی کیا کہے۔ مگر ایک دن ہوا یہ کہ شہر کے مشہور بانکے درباری خلیفہ اس کے کوٹھے پر چڑھ گئے اور منت سے بولے۔ "ارے بھڑوے کی اولاد بھڑوا، منہ بگاڑ! تو اپنے آپ کو کیا سمجھتا ہے، جو نواب اور رئیسوں کی نقل اتارتا ہے، اور روزانہ ریکھا شاہی سے فٹن پہ سوار ہوکر سیر کو نکلتا ہے۔ ہم تیرے سیلو تو ہیں کہ تجھکو یہ ٹھاٹ باٹ تورا سہاوے ہے؟" خلیفہ چونکہ چوک کے رنگ دار تھے اور رنڈیوں سے رعب جما کر گیشن لینا پیشہ تھا، اس لئے منت پہلے تو سٹپٹایا پھر مسکرا کے میٹھے جواب

دیا۔" خلیفہ تم بھی نرے چوتیے ہو، ارے بھئی جو لوگ ہم کو پھڑوا جانتے ہیں، ان کی بات الگ ہے، لیکن جو نہیں جانتے اور جو لوگ روزانہ دوسرے شہروں یا آس پاس کے علاقوں سے یہاں آتے جاتے رہتے ہیں، ان بے چاروں کو کہاں موقع اور فرصت کہ ہر بات کی تہہ تک پہنچیں اور کرید کرتے پھریں، وہ تو بس آئے، گھومے پھرے، دیکھا بھالا، کام کاج کیا، شام ہوئی، لوٹ گئے۔ ان بالی لوگوں کی نظر جب میری فٹن پر پڑتی ہوگی تو ضرور سمجھتے ہوں گے کہ نواب منت خان بہادر کی سواری جا رہی ہے۔" یہ بے مثل جواب سن کر درباری خلیفہ تو بھونچکا رہ گئے۔ اور یہ لاجواب فقرہ درباری خلیفہ کی زبانی جس نے بھی سنا، اس نے اس کی داد ضرور دی۔

چچا علی حسن بھی بڑے حاضر جواب اور بذلہ سنج تھے۔ مگر ساتھ ہی ساتھ پھڑ پھڑ بولنے کی ایسی لت تھی کہ جو من میں آتا بے سوچے سمجھے اور موقع محل بے دیکھے، لوگوں کے منہ پر تڑ تڑ بول دیتے۔ زیادہ پڑھے لکھے تو تھے نہیں۔ کٹر منٹر، لو، تما کے ہلکی پھلکی اردو پڑھ لیتے، مگر تھے بلا کے ذہین ـــ ان کے ملنے جلنے والوں میں ایک عطر فروش مرزا باقر حسین لکھنوی تھے جو چوک میں گھوم گھوم کر اور رنڈیوں کے کوٹھے پر جا جا کر عطر بیچا کرتے۔ ان حضرت کی بھی سج دھج دیکھنے کے قابل تھی۔ سر کے گھونگھریالے بال کاندھے تک لٹکے ہوئے، اس پر لکھنؤ کی خاص دو پلی ٹوپی، آنکھوں میں سرمے کی ہلکی سی لکیر، داڑھی منڈی ہوئی مگر مونچھ کھڑی اور تنی ہوئی۔ ہونٹوں پر پان کی گہری لالی۔ بدن پر لکھنوی انگرکھا اور خالتا پائجامہ، پاؤں میں سلیم شاہی جوتے۔ وہ جب اس وضع قطع سے ایک ہاتھ میں پان کا بڑا سا بٹوہ اور دوسرے ہاتھ میں چرمی بیگ لے کر چوک کا چکر لگاتے تو آنے جانے والے ایک گھڑی رک کر ان کو ضرور دیکھ لیتے اور ان کا جی نہ بھی چاہے تب بھی دلچسپی کی خاطر عطر کا ایک پھایا خرید ہی لیتے۔ برسات کی ایک شام کو چچا علی حسن لپکے ہوئے جا رہے تھے کہ مرزا صاحب کی نظر پڑ گئی۔ مخصوص لکھنوی لہجے میں پکار کر بولے۔ "ارے بھئی علی حسن! ایسی بھی کیا بے رخی، اماں ذرا رک کر عطر کا ایک پھایا تو لیتے جاؤ۔ تمہاری معشوق سونگھے گی تو خدا کی قسم لٹو ہو جائے گی۔" چچا ذرا ٹھہر کر بولے۔ "دیکھتے نہیں ہو یار! کیچڑ کی چھینٹ سے ہمارا کرتہ پائجامہ سب گندہ ہو رہا ہے گھر جانے کی جلدی ہے کہ کپڑا بدل کر پھر اسی گلی میں آنا ہے۔" یہ سن کر مرزا نے تیوری پر بل ڈالتے ہوئے کہا۔ "اے بھئی علی حسن! آپ ہماری حضرت کیچ کو کیچڑ کیوں بولتے ہیں؟ لفظ "ڑ" کی کرختگی سے تو میرے کان پھٹے جاتے ہیں۔" چچا نے یہ سنا تو پھریری لگ گئی اور برجستہ جواب دیا حضور مرزا صاحب! کیچڑ کی "ڑ" گرا کر آپ لکھنوی حضرات کیچ تو بولتے ہیں۔ مگر چیتھڑ کی "ڑ" گرا کر کیا بولیں گے؟ وہ تو کہئے کہ کسی کوٹھے سے مرزا صاحب کا بلاوا آ گیا، اور بات رفع دفع ہو گئی ـــ اسی طرح کا وہ واقعہ بھی بے حد دلچسپ ہے کہ جاڑوں میں کسی شادی کے موقع پر مرزا صاحب بھی مدعو تھے۔ کھانے کے بعد جب ملازم نے ان کے ہاتھ دھلوائے تو جاڑے کی وجہ سے پانی اتنا سرد تھا کہ مرزا صاحب نے ٹھٹک کر فرمایا۔ "ارے میاں! پانی اتنا ٹھنڈا ہے کہ میرے تو ہاتھ رہ گئے۔" بغل ہی میں چچا علی حسن کھڑے تھے۔ یہ جملہ سنتے ہی برجستہ کہا۔ "مرزا صاحب! خیریت ہوئی کہ پیا نہیں ورنہ پیٹ رہ جاتا۔" آخر میں چچا کی حاضر جوابی اور بذلہ سنجی کا ایک لطیفہ سن لیجئے۔ ایک دن چچا کے گھر پر ان کے بے تکلف دوست میاں رجبن نے آتے ہی فرمائش کی کہ "ارے یار! ذرا فرسٹ کلاس چائے پلاؤ!" چچا نے پوچھا کہ "سادہ پیو گے یا دودھ والی ـــ؟" میاں رجبن نے کہا کہ "ہو تو دودھ

چھوڑ دیا مگر کتنا کڑوی ہو۔ چچا جیسے شخص کے لیے ماں جی واہ وا
کتنا اچھا ہے پر اسے ملال بھی! یہ مراثیہ نامہ فقرہ سن کر
میاں علی حسن تو سن کر خفت سے لوٹ پوٹ ہو گئے۔ لیکن
تک چچا کا مزاج ایسا اور بلند ہمتی کا تذکرہ ہو گیا تھا۔ ان کی تو
اکثر محفل ہی ایسی ہوا کرتی تھی کہ بات بات پر قہقہوں کی
پھلجھڑیاں چھوٹنا شروع ہو جاتی تھیں۔

اب ذرا اس ماجرا کو سنئے جس کا تعلق چچا کی حسرت
ملاقات سے ہے۔ حسرت جب منت کے کوٹھے سے نکل بھاگی، اور
اس کی چھوٹی بیٹی حشمت بھی گیا شہر کے مشہور بیرسٹر یا ... کی
بالیکا بن گئی تو منت کی دونوں چڑیاں کے اڑتے ہی
اس کا کوٹھا اجاڑ ہو گیا۔ ہر چند کچھ مہینوں تک منت کی
بھتیجی نذیرن نے اس کے کوٹھے کی زینت بڑھا کر رکھی مگر
جب وہ بھی فضل حمید آئی۔ جی۔ (انسپکٹر جنرل آف پولیس۔
گورنمنٹ آف بہار) کی داشتہ بن کر چلی گئی تو واقعی منت
کی ساری منتیں خاک میں مل گئیں۔ تب وہ اپنی دونوں
بیٹیوں کو واپس لانے کی تدبیر سوچنے لگی۔ نرم چارہ سمجھ
کر پہلے چچا کی طرف متوجہ ہوا۔ اس نے شہر کے دوسرے
بانکے یوسف استاد کو بلایا اور چچا علی حسن کو ڈرایا
دھمکایا کہ کسی صورت سے حسرت کو واپس لے آنے پر منہ
مانگا انعام دینے کا وعدہ کیا۔ یوسف استاد کے بڑے
بیٹے جبو استاد جی باپ کا کہا عمل کر کے رنگ داری کرتے تھے۔ یہ دونوں
باپ بیٹوں نے دربار خلیفہ کا رنگ اکھاڑ کر چوک کی
رنگ داری اپنے قبضے میں کر رکھی تھی۔ یوسف استاد
نے چچا علی حسن کو پہلے بہت سمجھایا بجھایا، پھر ڈرایا دھمکایا،
مگر چچا پر تو عشق کا بھوت سوار تھا۔ وہ کاہے کو ماننے والے
تھے۔ ایک دن چچا نے یوسف استاد کو کہا: "دیکھیو استاد
مجھ لوپچ! ہم سے گھڑی مت کرو، آج کے بعد پھر کبھی تم

ادھر کا رخ کیا تو تمہاری خیر نہیں چھینا دیے جاؤ گے۔ تم اگر حسرت
زبردستی چھین کر لے جاؤ تو ہم بھی جانیں کہ تم نے اپنی ماں کا
دودھ پیا ہے" استاد نے یہ الٹی میٹم قبول کرتے ہوئے
کہا "سن رے علی حسنا! ہم پرسوں فجر کے بعد ساز
سنگ سمیت آئیں گے اور ڈنکے کی چوٹ دن کے اجالے
حسرت کو ڈولی پر بٹھا کر لے جائیں گے۔" چچا نے یہ بات
تو کیفیت ہو گئے اور گاؤں سے دس پندرہ لٹھیتوں
بلا لیا۔ یوسف استاد چند بیس پچیس جانثاروں کو لے
کر وقت مقررہ پر پہنچ گئے۔ ان کے گروہ میں مجمع
(.....) کے لیے بطور ڈھال غلام پہلوان بھی شریک
تھے۔ استاد نے پہنچتے ہی چچا علی حسن کو پکارا اور پالا
کا پیترا لے کر اپنی لاٹھی سنبھال لی۔ اتنے میں مکان
کی چھوٹی سی پٹی سے چچا کے لٹھیت نکلے۔ ایترا پیترا سے نا
ان لٹھیتوں نے، آؤ دیکھا نہ تاؤ، بس اندھادھند لاٹھ
برسانے لگے۔ کڑوا تیل سے پالش کی ہوئی لاٹھیاں بجلی
کی طرح چم چم چمکنے لگیں۔ دونوں جانب سے دو گھ
تک محلہ والوں نے اپنے اپنے کواڑوں کے پٹ بند کر
چچا کی طرف کے ایک لٹھیت نے اچھل کر یوسف است
کے داہنے پاؤں پر ایسی بے ڈھب کی لاٹھی ماری کہ استا
گھوم گئے اور تڑپ کر زمین پر گر پڑے۔ زن گھنٹہ بھر
اور بازی چچا کے لٹھیتوں نے جیت لی۔ استاد کو ان کے
چیلوں نے کسی صورت سے کھٹولی پر ٹانگ کر ہسپتال پہنچا
دیا۔ خبر ملتے ہی استاد کے چاروں بیٹے دیکھ بھال کے
پہنچ گئے۔ ان کے بڑے بیٹے جبو استاد نے پوچھا:
یہ سب کیسے ہو گیا؟ استاد نے جواب دیا۔ "سالے گنوار۔
ایترا جانیں نہ پیترا، ہم ابھی پالٹ کے پیترے پر گھوم رہے
تھے کہ جھٹ سے جا بجا ہی جا بیٹھے کہ ایک لٹھیت نے ...

ے پیترا ایسی لاٹھی چلادی جس کو ہم فنی اعتبار سے روک نہ سکے اور گر پڑے۔ بیٹے نے جواب دیا۔ بابا! موقع و محل اعتبار سے فنی پیترا بازی کی نمائش ہوا کرتی ہے ایسے گنوار ہ تو انکو پیچ لاٹھی چلا کر اپنے مقصد میں کامیاب ہو جانا اصل فن ہے۔ دنیا میں رسوائی تو ہو ہی گئی کہ یوسف استاد کھا کر گر پڑے اور مقصد بھی حاصل نہ ہو سکا۔ شہر میں تو لوگوں کا رنگ پھیکا ہو گیا۔ اب فنی پیترا بازی لے کر چاٹنا ہے۔ آپ کو جاننا چاہئے تھا کہ بے ساختہ عمل فنی نقطہ نظر سے خام ہیں۔ مگر اپنی اثر پذیری یا بے ساختگی اور برجستگی کے سبب بذات خود جادو کا اثر رکھتی ہے یوسف استاد اچھا ہونے کو تو ہو گئے مگر زندگی بھر لنگڑاتے رہے۔

اس واقعہ کے بعد چچا محلہ مراد پورہ والا مکان چھوڑ رائے محلہ میں چلے آئے۔ یہاں آ کر وہ اور بھی تنگدستی میں مبتلا ہو گئے۔ ان کے والد نے عاق کر دیا۔ وہ ساری جائیداد محروم کر دیئے گئے۔ زندگی بڑے دکھوں میں کٹنے لگی۔ جس رہ رہتے تھے وہاں نہ کھٹیا نہ بچھیا، نہ بدھنا نہ لوٹا، نہ لنگ کا کوئی بچھاون صرف ایک چیکٹ سا گندا سا ٹاٹ تھا جس پر سوتے۔ نہ کھانے کی رکابی نہ پینے کا کٹورا، روکھا سوکھا دوپہر کو پکا تو رات کو بھی، کبھی کبھار شوربہ دار آلو یا پکتی بھی تو بالکل جھر جھر پانی کی طرح۔ اس میں نہ مرچیں کھانے میں بالکل اَلونے، نہ کھٹا لگے نہ میٹھا۔ کبھی مرچ کا گچھا بھون کر کھا لیتے اور کبھی تو پیاز یا چھ پر نمک چھڑک کے کھا کے پی جاتے۔ رات کو فاقہ ہو جاتا۔ مسلسل فاقے کی نوبت آ جاتی۔ الغرض چچا کے دن بڑی سخت مشکل سے گزر رہے تھے۔ وہ انتہائی تکلیف اور سب قربان کر کے اس ڈھونی کو رکھے ہوئے تھے۔ لیکن وہ [illegible]

چچا کی گھر میں طاقت رہی، وہ اپنی شہوت کی پیاس بجھاتی رہی۔ سات آٹھ بچے بھی پیدا ہوئے۔ لیکن سب کے سب مر گئے۔ صرف ایک لڑکی بچی۔ جب وہ بالغ ہوئی تو چچا نے کسی ایسے ویسے مرد سے بیاہ دیا۔ اس طرح دس بارہ برسوں تک وہ چچا کے ساتھ رہی۔ لیکن آہستہ آہستہ رنڈی پن کا چھپاؤ دکھلانے لگی۔ بات اصل یہ تھی کہ انہی دنوں لاہور کا رہنے والا ایک کڑیل اور خوبصورت نوجوان کسی شہر میں چلوں لگ کاروبار کے سلسلے میں آیا ہوا تھا۔ چچا اس کی آڑھت میں کبھی کبھار آیا جایا کرتے تھے۔ اس طرح اس سے دوستی ہو گئی، اور وہ پنجابی بھیا ان کے گھر پر آنے جانے لگا۔ عورت کی مٹی ایسی بلا کی تھی اور چہرے پر چمک ایسا غضب کا تھا کہ سات آٹھ بچے پیدا ہونے کے بعد بھی دیکھنے میں بیس پچیس برس کی معلوم ہوتی تھی اور جاذب نظر تو ایسی تھی کہ دیکھنے والا دیکھتے ہی بہک جائے۔ اس پر طرہ یہ کہ خاندانی اور پیدائشی رنڈی تھی۔ بناؤ سنگار اور مردوں کو رجھانے اور لبھانے کے سو ہنر اس کو معلوم تھے۔ چنانچہ ہوا یہ کہ اس پنجابی کو اپنا جوبن دکھلانے لگی۔ دیکھ دیکھ کر مسکرانے لگی اور پان بنا بنا کر کھلانے لگی۔ تیر نشانے پر بیٹھا اور وہ پنجابی نوجوان لوٹ پوٹ ہو گیا۔ صورت حال کا بے حد چالاکی کے ساتھ جائزہ لے کر اس نے لچھن بدلے اور بہانے نکال کر چچا کو طرح طرح سے ستانے لگی۔ پھیکی باتیں رہ رہ کر اگلتی اور دن بھر طنزیہ لہجے میں تشبیہیں کستی رہتی۔ بالآخر وہی ہوا جو ہونا تھا۔ یعنی ایک روز جبکہ چچا گھر پر موجود نہ تھے پیٹی پٹارا سب سمیٹ کر اس نوکیرے پنجابی کے ساتھ بھاگ کر ڈھاکہ چلی گئی۔ چچا جب گھر لوٹے تو پڑوسی نے سارا ماجرا سنایا اور یہ بھی بتایا کہ دونوں بھاگ کر

ڈھاکا گئے ہیں۔ یہ سننا تھا کہ چچا پھکار پھاڑ کر رونے لگے۔
اور دو ہی دنوں کے بعد وہ بھی ڈھاکا پہنچ گئے۔ وہاں جاکر
دل کی مشق بھوئی حسرت کو بچانے کی کھکھش میں لتا پیٹ اور
تابڑ توڑ کوشش کرنے لگے۔ مگر اس شہوت پرست رنڈی کو تو
بھتار نہیں یار چاہئے تھا۔ سو وہ عیندار، بہاری بھتار
کو چھوڑ کر پنجابی یار کے ساتھ شہوت کی رہی سہی آگ کو
بجھانے میں ایسی مگن تھی کہ ایک روز چچا کو جان سے مروانے
کی اس نے اسکیم بنا رکھی تھی۔ چچا بے کا فرسے پھنسنے والے
تھے مگر کسی صورت سے اپنی جان بچا کر بھاگے۔ لوٹتے سفر
میں روتے روتے چہرہ سوج گیا۔ ساری عشق بازی تلنہ ے
گھاٹ چلی گئی۔ چہرے کی سوجن اُوبھرتے اُوبھرتے دیر لگی۔
جب کچھ مہینوں کے بعد غموں سے اُو آر ملا تو کراچی چلے
گئے۔ برس دو برس ہوئے کہ وہیں ان کا انتقال ہو گیا۔
اور یوں سارا افسانہ ختم ہو گیا۔

ان بہاری الفاظ کے اردو معانی جو مندرجہ بالا تحریر میں استعمال کئے گئے ہیں

(۱) بُنگَٹ : شریر
(۲) لُمپَٹ ۔ ایسا شریر جس میں بدکرداری کا عنصر بھی شامل ہو۔
(۳) دَھن کُٹی ۔ دھان کوٹنے کی مل
(۴) گُنڈئی ۔ غنڈہ گردی
(۵) کھلیفا ۔ خلیفہ (عام بول چال میں ان لوگوں کو کہتے ہیں جو جنوٹ کے استاد اور محرم کے دنوں میں اکھاڑے نکالتے ہیں۔)
(۶) جُمنیا ۔ گیا شہر کی مشہور و معروف بہادر شخصیت گذری ہے۔ بظاہر تو لوٹ مار اس کا پیشہ
بباطن اس کا کردار یہ تھا کہ امیروں کو
دھانسے لوٹا کرتا اور راتوں کو چپ
غریبوں، مسکینوں، مجبوروں اور خاص
اور مجبور بوڑھوں کے گھروں پر جاکر لوٹے
مال وزر کو اس طرح پھینک آتا کہ ان
کو خبر بھی نہیں ہوتی کہ بن مانگے یہ چیزیں کہ
آگئیں۔ اُن گنت غریب کنواری لڑ
اس کی مالی مدد سے بیاہی گئیں۔ جمنیا کا
غیر معمولی صفت، قدرت کی طرف سے یہ عطا
تھی کہ دشمنوں سے مبارزت کے دوران
اسے پیچھے ہٹنے کی ضرورت محسوس ہوتی تو
یعنی دشمنوں کی طرف پیٹھ کرکے نہیں بھاگا
پاؤں اس طرح دوڑتا ہوا بھاگتا کہ چہرہ
دشمنوں کے سامنے رہتا۔ بات اصل یہ
پیچھے بھاگتے ہوئے بھی پیٹھ دکھانا اپنی
مردانگی کے خلاف سمجھتا تھا۔ یاد پڑتا ہے
کے جاڑوں کے دن تھے وہ دوپہر کو گھوگھر
میں اپنے گھر کے باہر درخت کی چھاؤں میں
سویا ہوا تھا کہ چند دشمنوں نے سوتے ہو
پر پھلسا، گنڑاسا وغیرہ تیز ہتھیاروں
طرح کچل کر رکھ دیا کہ وہ بچ نہ سکا۔
(۷) نگٹ : نزدیک
(۸) ٹھیکل ۔ متوازن و متناسب عضو جسم
حسین و دلکش عورت
(۹) پَتُریا ۔ رنڈی
(۱۰) لہالوٹ ۔ بہ بہار

(۱۱) پیرنا : پریشان کرنا
(۱۲) بیریا ڈوبے ۔ سورج ڈوبنے کے فوراً بعد کا وقت
(۱۳) دوھنا ۔ نعروں سے دبانا
(۱۴) دھنیٹ دینا ۔ مارتے مارتے ایسی گت بنا دینا جیسے روئی دھنی جاتی ہو۔
(۱۵) پنہتر ۔ برا حال ہو جانا
(۱۶) گلہا ۔ ململ کے کرتے پر ابھاری گئی چُنٹیں
(۱۷) بوڑاہا ۔ پاگل
(۱۸) کنکھی ۔ عاشقانہ انداز سے آنکھیں مارنا
(۱۹) شپاشپ ۔ تیز رفتاری کی آواز
(۲۰) ٹٹکاری مارنا ۔ مستانہ وار، مزاحیہ انداز سے داد دینے کا مخصوص لہجہ
(۲۱) ٹٹکاری بھرنا ۔ ایک خاص طرح کی آواز منہ سے نکالنا، جیسے خاص طور پر یکہ بان اپنے گھوڑوں کو تیز رفتاری پر آمادہ کرنے کی خاطر منہ سے ادا کرتے ہیں۔
(۲۲) گیوال ۔ مشہور زمانہ وشنو پد مندر کے آس پاس بسے ہوئے برہمن پنڈوں کو کہتے ہیں۔ گیا کے یہ برہمن پنڈے اپنے آپ کو اتنا افضل اور بالاتر سمجھتے ہیں کہ شادی بیاہ بھی صرف اسی محدود علاقے اور صرف اپنی ہی مخصوص برہمن برادری کے درمیان کرتے ہیں۔
(۲۳) نک پھوپھا ۔ گیوال پنڈوں کے ایک مشہور و معروف پنڈا خاندان کی عرفیت
(۲۴) گڑانا ۔ جانا
(۲۵) ڈاہ ۔ حسد
(۲۶) گتھم گتھی ۔ بری طرح دست و گریباں ہونا۔

(۲۷) چھن چھن ۔ شیشہ ٹوٹنے سے جو آواز نکلتی ہے
(۲۸) ٹن ٹن ۔ لوہا گرنے سے جو آواز نکلتی ہے
(۲۹) دھب دھب ۔ کپڑے یا اس قسم کی کوئی دوسری چیز گرنے سے جو آواز نکلتی ہے
(۳۰) چر چر ۔ کپڑا پھاڑنے سے جو آواز نکلتی ہے
(۳۱) کھٹ کھٹ ۔ لکڑی کے گرنے سے جو آواز نکلتی ہے
(۳۲) لہہ لہہ لال ۔ گہرا سرخ
(۳۳) پیڑا ۔ درد
(۳۴) تل ہتھی ۔ ہتھیلی
(۳۵) دھمنانا ۔ گرنا پڑنا
(۳۶) جھگڑنا ۔ چلانا
(۳۷) سکریایا ہوا ۔ سمایا ہوا
(۳۸) ہیتر ہیتر ۔ ہنس ہنس
(۳۹) چھتڑانا ۔ بکھر جانا
(۴۰) راوان داوان ۔ برباد
(۴۱) ٹکا ٹکی ۔ گھونسہ بازی
(۴۲) کھکھوارا ۔ چڑچڑا
(۴۳) ڈلانا ۔ ہلانا
(۴۴) کا ؟ ۔ کیا ؟
(۴۵) نتّم ۔ بلا ناغہ
(۴۶) سانجھ ۔ شام
(۴۷) بڑھیا ۔ عمدہ
(۴۸) سوٹا ۔ لاٹھی
(۴۹) چملا بور ۔ چمکدار
(۵۰) مُریٹھا ۔ پگڑی
(۵۱) گوہمن ۔ زہریلے سانپ کی ایک قسم
(۵۲) کھانٹی ۔ خالص

(۵۳) کھیتی ۔ چاول کی گھوری

(۵۴) گچھا ۔ گچھا

(۵۵) بیٹھانی ۔ گھونٹ لو الیہ

(۵۶) رنگ داری ۔ رعب کا نشانا

(۵۷) منہ جلا ۔ کالا چہرہ جیسے آگ سے جل گیا ہو

(۵۸) تے ۔ تم

(۵۹) ٹھنگو ۔ ذرہ برابر۔ تھوڑی سی

(۶۰) سُہانا ۔ اچھا لگنا

(۶۱) بالی ۔ بابری

(۶۲) بھڑ بھڑ بولنا ۔ بہت زیادہ بولنا

(۶۳) بھڑ بھڑیا ۔ بہت زیادہ بولنے والا

(۶۴) تڑ تڑ بولنا ۔ جلدی جلدی بولنا

(۶۵) لَت ۔ عادت

(۶۶) رکھنی ۔ داشتہ

(۶۷) گھڑ لیچڑ ۔ جاہل

(۶۸) کٹھراگی ۔ بدمعاشی

(۶۹) نربھی ۔ نرخرہ

(۷۰) چپیٹنا ۔ دبانا

(۷۱) مائی ۔ ماں

(۷۲) دوپہریا ۔ دوپہر

(۷۳) لٹھیت ۔ لاٹھی باز

(۷۴) اَچنتے ۔ اچانک

(۷۵) ڈھابی ۔ کوئیں کی مانند جو جلوس میں تھالستہ پیراستہ کرکے محض سجاوٹ اور دکھاوے کے لئے آگے آگے رکھا جاتا ہے (نمائشی)

(۷۶) پالکٹ ۔ چوٹ کا ایک خاص پینترا

(۷۷) پالکٹ ۔ وہ کپڑے جو شادی بیاہ میں لڑکے والے دلہن کے لئے لے جاتے ہیں

(۷۸) اَنکھا اُکھی ۔ بے تحاشہ

(۷۹) گنگار ۔ شور و ہنگامہ

(۸۰) کمری ۔ سرکھپانا

(۸۱) رپھونکی ۔ پھیلاہٹ

(۸۲) بگی ۔ طرف۔ جانب۔ سمت

(۸۳) تھرملانا ۔ جھکا جانا

(۸۴) کھٹولی ۔ چھوٹی ڈولی (چھوٹی چار اور لکڑی سے بنا کر ڈولی کی طرح بنائی جا)

(۸۵) سنگیت ۔ جگت

(۸۶) رنگ پھیٹ جانا ۔ رعب ختم ہو جانا

(۸۷) چلٹ ۔ بالکل میلا

(۸۸) گیندرا ۔ ایک خاص قسم کا بچھانے والا جو جب تک آنکھوں سے دیکھا نہ جائے نقد مشکل ہے۔ آزادی سے نصف صدی پہلے میں خوشحالی ہوا کرتی تھی اور نوکر نوکرانیاں بھرا ہوا رہتا تھا۔ یہ اسی زمانے کی یادگار۔ کی زیادتی نیز دولت کی فراوانی کی علامت ان مطمئن اور پرسکون دنوں میں گھر کے بڑے باہر بیٹھے میں دوستوں سے گپیں کرتے، قصے کہانی سنتے سناتے، اور ان کی عورتیں گزاری کے لئے، شوقیہ کرتی تھیں کہ ہر قسم کے کپڑوں کی چھوٹی چھوٹی کترنوں کو جمع پھر ان رنگ برنگ ٹکڑوں کو سوئی دھاگے سے مندی کے ساتھ جوڑتی۔ جوڑ چادر سی بن جاتی۔ پھر اسی طرح کی چادروں کو لے کر تہہ جاتی، اور

ہی جا بکہ بستی سے نزدیک تر ہو یک ۔ جیجیں ہیں
سیتی ہوئی چلی جاتی ہیں کہ شکل جھکنے کے بعد اتنی
خوبصورت اور عجیب چیز تیار ہو جاتی ہے کہ ہم
بچپن سے بڑے ہونے سے بھی زیادہ والوں کے
بچھانے کے کام میں آیا کرتی ، اس کو گیندوڑا کہتے
ہیں ۔ اور جو دو تین برسوں کی محنت اور دیدہ ریزی
کے بعد تیار ہوتی ہے ۔ یہ گیندوڑے کئی عدد ہمارے
سیتے گھروں موجود ہیں ۔ بلکہ میں تو ابھی تک دوسرے
بچھاونے کے ساتھ اس کو بھی بچھاتا ہوں ۔ اب زمانہ
بدل گیا ہے ، گرانی اور معاشی بحران کے سبب یہ
چیزیں جتنا بند ہو گئی ہے ۔ گھروں میں نہ نوکر نہ ماما ۔
عورتوں کو گھر کے دوسرے کام کاج سے فرصت
ہی نہیں کہ اتنی محنت اور دیدہ ریزی کا کام کریں ۔
قریب قریب یہ چیز اب ناپید ہوتی جا رہی ہے ۔

۸) کڑمڑ ۔ کھڑا ، کھولی
۹۰) تر شتا سے پڑھتا ۔ مشکل سے رک رک کر پڑھنا
) پچ پی ۔ طبیعت میں مرچ سا لگ جانا
۹) کھنگیا ۔ چارپائی
) پچیا ۔ چھوٹی تہوں کی ایک خاص قسم
) بُھُنا ۔ ایک خاص قسم کا موٹا کپڑا جس سے ٹوپی
سی بنا کرتی ہے جو خاص طور پر بہار میں استعمال
ہوتا ہے یہ خالص لفظ ہے ... ...
... ... ہے ۔

) کچھو ۔ کچھلی
۹۲) سرپچی ۔ ابروی ۔ سبزی کی ایک قسم
۹۴) پرمل ۔ پٹوا ۔ سبزی کی ایک قسم
) ... ۔ ... کر کھانا ۔

۹۹) جُھرجُھر ۔ بالکل پانی کی طرح
(۱۰۰) مرچائی ۔ مرچ
(۱۰۱) لوکی ۔ کدو مرچ
(۱۰۲) اسے ۔ بے مزہ ، بالکل پھیکا
(۱۰۳) تیتا ۔ تلخ ۔ (میرا خیال ہے کہ کھانے میں
زیادہ مرچ ہونے کے سبب مزہ میں جو ایک خاص
قسم کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے ۔ مزہ کی اس کیفیت
کا لفظوں میں ٹھیک ٹھیک اظہار "تلخ" سے بلکہ لفظ
"تیتا" ہی سے ادا کیا جا سکتا ہے ، جو خالص
بہاری لفظ کی لائی ہے)
(۱۰۴) بھکیتا ۔ بالکل سادہ ۔ خالی
(۱۰۵) پنیا بھات ۔ دن کا پکا ہوا چاول جس کو بہاری
"بھات" بولتے ہیں وہ جب بچ جاتا ہے تو غریب
لوگ رات کو اس میں پانی دے کر رکھ دیتے ہیں
تاکہ وہ بسیاہ ہونے نہ پائے ۔ اور دوسری صبح کو
مرچ وغیرہ کے چٹنی کے ساتھ کھاتے ہیں ۔ رات بھر
پانی میں رہنے کی وجہ سے بھات میں ایک خاص قسم کی
کیفیت ہو جاتی ہے اور مزے میں بھی فرق آجاتا ہے
جب تک کوئی آدمی خود کھا کر اس بھات کو نہیں
تجربہ کرے لفظ "پنیا بھات" کو سمجھانا مشکل ہے ۔
(۱۰۶) گھسکانا ۔ بھگانا
(۱۰۷) ڈھبری ۔ چھوٹا سا ایک خاص بناوٹ کا چراغ
(۱۰۸) تتر بتر ۔ جیسے تیسے
(۱۰۹) کھچڑی ۔ دوغلی
(۱۱۰) بھسناہی ۔ بے راہ
(۱۱۱) کرم جلی ۔ بدقسمت
(۱۱۲) ... ۔ بدصورت

(۱۱۳) لوکہ جانا ۔ دلیوانہ ہو جانا
(۱۱۴) جھاکو ۔ عادت
(۱۱۵) ممُلکنا ۔ طنزاً پچھلی باتوں کو دہرانا
(۱۱۶) گبُگھنا ۔ رہ رہ کر آہستہ آہستہ طعنہ مارنا
(۱۱۷) لوٹ پوٹ ہونا : گرویدہ ہونا
(۱۱۸) لچھن ۔ طور طریقہ
(۱۱۹) لبڑی بتانا : گھریلوی ضروری روز مرہ کے سامان
(۱۲۰) بھکار پاڑ کر رونا ۔ چلا چلا کر رونا
(۱۲۱) لوکیڑا : ناتجربہ کار
(۱۲۲) گھُنگھُن ۔ انتہائی اضطرابی قسم کا جھوکا
(۱۲۳) پیٹھیا ٹھوک ۔ پیٹھ پھیرتے ہی کسی کا تعاقب، کرنا جیسے کبڈی کے کھیلوں میں ہوتا ہے ۔ اس لئے یہ لفظ خاص طور پر کبڈی کے سلسلے میں استعمال ہوتا ہے
(۱۲۴) لٹا لپیٹ ۔ یکے بادیگرے
(۱۲۵) تابڑ توڑ ۔ لگاتار
(۱۲۶) اوہرنا ۔ کم ہونا
(۱۲۷) سورج جانا ۔ بھول جانا
(۱۲۸) اوآر ۔ چھٹکارا ۔ آرام
(۱۲۹) بے کانڑے پھنسا ۔ بری طرح بے موقع پھنس جانا
(۱۳۰) تلہنڈے گھاٹ ۔ ایسا گھاٹ جو بے حد خطرناک ہو

اردو لکھئے ۔ اردو پڑھئے
اردو بولئے

بقیہ تبصرہ ـــــ

کا " قاضی مشتاق احمد " سے ہے ۔ قاضی مشتاق ا
ناول اور ڈرامے لکھے ہیں اور بیانیہ تحریروں کو پسند
والے قارئین کے درمیان بے حد مقبول ہیں ان ۔
الدین عثمان نے تخلیقی سفر کی کہانی سنوائی ہے اور
رہے ہیں ۔ اس شمارے میں تین افسانے ہیں ۔ شاہ
م ۔ ق ۔ خان اور انور خان تینوں ایک عصر کے
نگار ہیں اور معیاری افسانہ دیکر " ادبی نقوش "
ادب کی ترجمانی کو انہوں نے نمائندگی بخشی ہے ۔ بہ
پرکاش فکری، مناظر عاشق ہرگانوی، عقیل گیاوی ا
کی غزلیں ہر ذوق کے قارئین کو آسودگی بخشتی ہیں ۔
ہیں ۔ شاہد جمیل اور غلیم پانڈے کی نظموں سے اس ہ
کھٹکتی نہیں ۔ غلیم پانڈے کی نظموں کا ترجمہ شہباز
کیا ہے ۔ " احتساب " کے عنوان سے بالترتیب " آنکھ
(مناظر عاشق ہرگانوی) " فی الحال " (یوسف ناظم) " کچے
پھول " (مظہر امام) " معبر " (سلام بن رزاق) "
(اشتاق احمد نوری) " پیرا ہن جاں (منظر شہاب) "
(حمید سہروردی) " نور رقص اور تماشائی " (نور الحسنین
گندھا (شام بارکپوری) سبز پرندوں کا سفر (شفیع
اور " تھکا ہوا دن " (الیاس احمد گدی) پر تبصرے
ہیں ۔ " آئینہ " کے تحت مدیر کے نام مشاہیر کے
سید احمد قادری پچھلی دہائی سے صحا
جڑے ہوئے ہیں اسی لئے " ادبی نقوش " کا
سجا سنورا اور معیار کی بلندی کو چھوتا ہوا ہے
قیمت پانچ روپیہ زیادہ نہیں ہے ۔ کتابت
عمدہ اور نفیس ہے ۔
(ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی

نوشاد احمد کریمی

آدھے دھڑ کا آدمی

تم افسانہ نگار ہو نا؟
تو پھر اپنی کہانی کیوں نہیں لکھتے؟
خود کو کیوں نہیں دیکھتے؟ —

بے ترتیبی سے بڑھی ہوئی داڑھی، منہ میں گھسی ہوئی ہو۔ اور یہ سیاہ حلقوں کے بیچ دھنسی دھنسی آنکھیں، ہوئے گال، مرجھائے ہوئے ہونٹ، الجھے ہوئے سر بال۔ بدن پر ڈھنگ کے کپڑے نہیں — سر سے پاؤں بدحالی کی علامت، ہر سمت سناٹا، ہر طرف ویرانی، وحشی — !

اور میری طرف بھی دیکھو۔ دو پھٹے بلاؤزوں کو جوڑ یک بنا لیا ہے۔ بس کام چل رہا ہے۔ مگر یہ ساڑی، ساتھ رہی ہے۔ ہر پل مسکتی ہوئی، جسم سے اپنا رشتہ توڑتی میرے اور تمہارے بھرم کو طشت از بام کر دینے پر ۔ منہ کیوں پھیر لیا — اپنے بچوں کو بھی دیکھو۔ ہم سے [illegible] جیسے پھول کھلنے سے پہلے ہی مرجھا گئے ہوں، اور شاخ سے ٹوٹ کر زمین پر گرنے ہی والے ہوں — اب شہتیریں بھی چرچرانے لگے! ان دیواروں کو کیا دیکھ رہے ہو۔ ابھی تو پلاسٹر ہی جھڑے ہیں۔ بہت جلد اینٹیں بھی اپنی اپنی جگہوں سے کھسکنے لگیں گے۔ اور یہ چھپر — برسات کی آمد آمد ہے۔ بادل برسنا بند بھی ہو جائیں تو گھنٹوں برستا رہے گا۔ اور کئی برسوں کی طرح امسال بھی اگلے برسات تک کے لئے مرمتی کا کام ٹل جائے گا۔ پھر برسات آئے گی اور ہر سال برسات آتی رہے گی۔ اور بھاگتے ہوئے روز و شب ہماری گرفت میں آئے بغیر ہمارے کس بل ڈھیلے کرتے رہیں گے

تم تو اوروں کے معاملوں میں، مسئلوں میں پیش پیش رہنے والے ہو۔ مگر اپنے معاملے میں گم سم کیوں ہو گئے ہو؟ اپنے مسئلوں کے حل کیوں نہیں ڈھونڈتے؟ بولو۔ لکھو گے نا؟ اپنی کہانی، اپنا افسانہ؟ بولتے کیوں نہیں؟

اور — اور جیسے میرے اندر، دور بہت دور سے کوئی بولا ہو — جیسے اقبالِ جرم کر رہا ہو — لکھوں گا — ضرور لکھوں گا اپنی کہانی، اپنا افسانہ، اب میرے بس میں اس کہانی کو صرف لکھنا ہی رہ گیا ہے۔ میں جب تک زندہ رہوں گا — سانس لیتا رہوں گا، اس

کہانیاں لکھتا رہوں گا۔ مجھے — مگر افسوس — ختم نہیں کر سکتا، جاری رکھا ہے۔ مگر اس عمل نے مجھے دیا کیا ہے

سکتا ہے!

رات آدھی سے زیادہ گذر چکی ہے۔ سارا ماحول نیند کی آغوش میں مدہوش پڑا ہے۔ لیکن میری آنکھوں میں ابھی تک نیند کا کوئی نام و نشان نہیں ہے۔ اور میں بستر پر بیٹھا اپنے گرد و پیش کا جائزہ لے رہا ہوں۔ کوئی بھی اپنی جگہ درست نہیں ہے۔ بوسیدہ دیواروں کی کیلوں سے لٹکتے ہوئے میلے کپڑے جا بجا مکڑیوں کے جالے۔ میز پر الٹی سیدھی پڑی ہوئی میری لکھی ہوئی کتابیں، سادہ کاغذ، قلم اور مجھے پسند کرنے والوں کے خطوط کا انبار ... اور زمین پر بکھرے ہوئے سگریٹ کے ٹکڑے — جلی ہوئی تیلیاں — اور —!

بیوی کا ہر جملہ میرے لاشعور میں گونج رہا ہے۔ مجھے بے چین و مضطرب کر رہا ہے — میں اٹھ کر بیٹھ جاتا ہوں۔ کچھ سوچتا ہوں۔ پھر بستر سے باہر آتا ہوں، اسٹوو جلا کر چائے بناتا ہوں — سگریٹ سلگاتا ہوں۔ فضا میں ایک کے بعد ایک دھوئیں کے مرغولے بناتا ہوں اور — اور پھر کہانی لکھنا شروع کرتا ہوں —!

ابھی چند جملے ہی لکھ پایا ہوں کہ اچانک خیال منتشر ہو جاتا ہے۔ اور ذہن کہیں اور بھٹکنے لگتا ہے!

واقعی — میں نے اپنی زندگی میں کیا پایا ہے؟ ابھی تک میں فیصلہ نہیں کر سکا ہوں کہ کہانیاں میں لکھتا ہوں یا — میرے چاہنے والوں کا خیال ہے کہ کہانیاں میں نہیں لکھتا بلکہ کہانیاں خود کو مجھ سے لکھوا رہی ہیں اور میں نے اسی پر اتفاق کر لیا ہے۔ کیونکہ کہانیاں مجھے اتنی فرصت ہی نہیں دیتیں کہ میں ان سے متعلق مزید کچھ سوچ سکوں۔ بس یہ ایک عمل ہے یا میری کمزوری جسے میں نے

بے سرو سامانی، مبارکباد کے چند جملے، تعریفی دا... خطوط اور بس۔ یہ بات الگ ہے کہ تعریفیں جب ہوں تو جسم کے حدود سے بالاتر ہو جاتی ہیں اور جسم بے معنی شئے کی طرح کہیں لٹکا رہ جاتا ہے، کوئی حقیقت نہیں جسم کی حد میں تعریف و ستائش ہونے کا دعویٰ یوں بھی کر سکتی ہیں کہ جسم کو شہرت کا تجربہ کار اکثر تجربہ کا ہو جاتا ہے۔ اور اگر ایسا ہوا تو میری تعریفیں بھی خاک میں مل جائیں گی۔ اور میں ایک جیتی جاگتی لاش ہو کر رہ جاؤں گا۔

صبح ہوتے ہی میں گھر سے نکل پڑتا ہوں۔ ہر قدم رکھتے ہی کہانیاں چاروں طرف سے مجھے گھ... اور میں یکے بعد دیگرے ان کہانیوں کو اپنی آنکھو... بھرنے لگتا ہوں۔ سب سے پہلے اپنی بستی کا جا... ہوں۔

ہر روز کی طرح آج بھی — شہر کے کنارے اور اخبار کا ... بچے طبقہ کے لئے ... صبح سویرے ہی اپنے شباب پر آ گئی ہے۔ زند... ترین گندگی آرائیوں کے ساتھ بیدار ہے۔ ... خانے میں لوگوں کی کثیر تعداد جمع ہو گئی ہے۔ ... کا اڈہ ابھی سے ہنگامہ ہو رہا ہے۔ بستی کے وا... ... کے نیچے بیٹھے ... لوگ آپس میں الجھ رہے ہیں۔ ... ایک دوسرے سے ... کرتے ہوئے ... ہے اور ... سے آتی ہوئی متعلقات کی آوازیں۔ ... کے جسم سے گوشت کی ... اور ...

رہ جائیں۔ میں آگے بڑھ جاتا ہوں۔ بڑھتا چلا جاتا ہوں ——!

گاندھی میدان میں بیٹھے مردوں، عورتوں اور بچوں کی ایک لمبی قطار مجھے اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔ میں ان بھکاریوں کو دیکھتا ہوا آگے بڑھ جاتا ہوں —— ایکسچینج آفس کے سامنے پڑھے لکھے بے روزگاروں کی لمبی قطار لگی ہے۔ اور سامنے صدر اسپتال میں مریضوں کی بے ہنگم چیخ و پکار —— اور خوبصورت دکانوں میں سجے خوبصورت کھلونے اور بچوں کی دم توڑتی فرمائشیں، خواہشیں ——

میں واپس لوٹنے لگتا ہوں۔ جیب خالی ہو تو کہیں رکنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ ویسے بھی اب آگے بڑھنے کی سکت باقی نہیں رہ گئی ہے۔ جسم کچھ طلب کرنے لگا ہے —— کچھ بھی —— روکھے سوکھے دو چار نوالے ہی سہی ——

گھر سے کچھ فاصلے پر رک کر میں ایک بار پھر اپنے گرد ماحول کا جائزہ لیتا ہوں —— قریب ہی ایک مداری بندر جمورے کے ساتھ ڈگڈگی بجا کر بھیڑ اکٹھی کر رہا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے مداری کے گرد اچھی خاصی بھیڑ جمع ہو گئی۔ (جہاں کچھ کام نہ ہو وہاں بھیڑ اکٹھی ہو جاتی ہے) مداری کرتبیں دکھانا شروع کرتا ہے۔ میں اس کے پہلے ہی شعبدے پر اوب جاتا ہوں۔ اور گھر کی طرف بڑھ جاتا ہوں —— بک اسٹال پر کلپ سے لٹکے تازہ اخبار کی سرخیاں میرے قدموں کو تھام لیتی ہیں۔

فساد ——!

نسلی بغاوت ——!

قتل و غارت گری ——!

موت ——!

بھوک، بیکاری ——! اور سیاسی بازیگری سے متعلق متعدد خبریں!

میرے گھر واپس آتے آتے سورج بھی دن بھر کی مسافت کے بعد تھک ہار کر اپنے مسکن میں روپوش ہونے لگا ہے —— میں بھی اپنے کمرے میں جاتا ہوں۔ ہر روز کی طرح آج بھی میرے ٹیبل پر چند خطوط پڑے ہیں۔ میں باری باری سبھوں کو پڑھتا ہوں۔ ان میں ایک خط کسی ریسرچ اسکالر کا بھی ہے۔ اس نے مجھ سے چند سوالات کئے ہیں۔ میں جوابات لکھنا شروع کرتا ہوں۔ لکھتے لکھتے ایک سوال پر میرا قلم رک جاتا ہے۔

آپ کا شجرہ نسب ؟

اور میں سوچنے لگتا ہوں۔

دن بھر شاہراہوں پر بھٹکتے رہنے کے بعد میرے ذہن میں کہانیوں کا ایک لامحدود سلسلہ گڈمڈ ہو رہا ہے۔ اور ان کہانیوں میں ہر جگہ مجھے اپنا ہی روپ اپنا ہی کردار نظر آ رہا ہے —— صرف اپنا کردار ——!

اور میں یہ فیصلہ نہیں کر پا رہا ہوں کہ میرا شجرۂ نسب کیا ہے —— کیا ——؟ کیوں کہ میں سب کچھ بھولنے لگا ہوں —— اپنے وجود کے ہر زاویئے سے بے نیاز ہونے لگا ہوں۔ جیسے ابھی کچھ دیر پہلے مجمع لگا رہا مداری لوگوں کو اکٹھا کرنے کے بعد اچانک اپنا سارا کرتب بھول گیا ہو اور اس کا گردن کٹا لہولہان جمورا بیچ اس کے سامنے تڑپ رہا ہو۔ تڑپ تڑپ کر دم توڑ رہا ہو۔

براہ کرم مسودہ خوشخط اور صاف ارسال کریں

نئی کتابوں کا تعارف

تبصرے کے لئے کتابوں کی دو جلدوں کا آنا لازمی

نام کتاب :- بارش
نام مصنف :- نشتر اکبر آبادی
نوعیت :- شعری مجموعہ
صفحات :- ۹۶
قیمت :- ۳۵ روپے
ملنے کا پتہ :- (۱) السباق پبلیکیشنز ہیڈ [illegible]
ایوت محل - [illegible]
(۲) نشتر اکبر آبادی ۔ ۱۵۲۹ [illegible]
(۳) [illegible] - مالیگاؤں

بارش نشتر اکبرآبادی کی غزلوں کا [illegible] مجموعہ ہے جس میں ۹۲ غزلیں ہیں اس کے علاوہ ایک نظم بعنوان [illegible] بھی شامل ہے جو نشتر اکبرآبادی کا اپنی [illegible] و جذباتی [illegible] بھرپور تخلیقی اظہار ہے۔ نشتر بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں اور ایسی غزل کے شاعر [illegible] طرز و اسلوب کا خوبصورت امتزاج [illegible] کا مکمل اظہار ہے۔ نشتر اکبرآبادی کے یہاں [illegible] کی تشبیہ [illegible] [illegible] ہے۔ نشتر اکبرآبادی [illegible] محسوس کرتے ہیں [illegible] تازہ اور ساحرانہ [illegible]

شاعر کا بنیادی [illegible] ہے۔ نشتر اکبرآبادی کے تخلیقی کلام کا [illegible] بارش ہے۔ بظاہر ایک محدود سمت ہے جیسا موسم کا [illegible] لیکن اگر غور کیا جائے تو "بارش" ایک ایسے [illegible] استعارہ ہے جو خوشی اور غم کے درمیان کی سمتوں میں کہیں نہ کہیں ہے۔ مثال کے طور پر "بارش" اگر بے وقت اور مقدار [illegible] زمین کے لئے لعنت ہے لیکن اگر یہی بارش ایک حد سے تجاوز کر جائے تو طوفان و سیلاب کی صورت تباہی و بربادی اور ہلاکت کا پیش خیمہ بھی ہے۔ "بارش" سے علامت اخذ کر کے سمندر میں [illegible] زمین پر [illegible] کے معنی و مفاہیم کی [illegible] بطور استعارہ [illegible] تخلیق کے اظہار کا وسیلہ بنایا جا سکتا ہے۔ "بارش" کے [illegible] سے نشتر اکبرآبادی کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں۔

گرا مکان اچانک تو ایک شور اٹھا
دعا جو مانگی تھی بارش کی [illegible]

چھت سے [illegible]
اب کی بار [illegible]
[illegible]
[illegible]

آوارۂ حیات کو موسم کی کیا خبر
بارش کے چند چھینٹوں کو برسات کہہ گیا

مندرجہ بالا اشعار کی روشنی میں یہ بات بہت صاف طور سے کہی جاسکتی ہے کہ نشتر اکبرآبادی نے بارش کے حوالے سے نئی عصری اصطلاحات کی اختراع کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے غزل ہر دور میں شعراء کے لئے محبوب صنف سخن رہی ہے حالانکہ نظم زیادہ وسیع امکانات سے پر ہے۔ پھر بھی غزل کی مقبولیت اپنی جگہ مسلّم ہے جس کی وجہ غالباً یہ بھی ہو سکتی ہے کہ داخلی کرب و احساسات کے اظہار کے لئے غزل ہی موزوں ترین وسیلہ ہے جبکہ نظم خارجی [illegible] کرنے کا وسیلہ ہے۔

نشتر اکبرآبادی نے اپنے احساسات کے اظہار کے لئے غزل ہی کا انتخاب کیوں کیا؟ اس کے بارے میں حتمی طور پر کہنا مشکل ہے لیکن یہ اندازہ ضرور لگایا جاسکتا ہے کہ نشتر اکبرآبادی کے داخلی جذبات کے اظہار کے لئے غزل سے زیادہ موزوں دوسری صنف شاعری ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ نشتر اکبرآبادی کے یہاں غزل اپنے تہذیبی ورثوں، موجودہ کشمکش اور متوقع امکانات کی بھرپور رنگارنگیوں کے ساتھ موجود ہے۔ نشتر اکبرآبادی کی غزل بیک وقت ماضی کی شاندار قدروں کے ٹوٹنے کا المیہ بھی ہے اس کے علاوہ مستقبل کے روشن آئندہ امکانات کا اعلامیہ بھی ہے۔ نشتر اکبرآبادی کی غزل گھر سے لے کر بین الاقوامی سطح تک کے مسائل کا خوب صورت اظہار بھی ہے۔ ہجر و وصال اور حسن و عشق کے جذبات کا آئینہ بھی ہے بکھرتی ٹوٹتی تہذیبی قدروں کا مسئلہ [illegible] ہے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

بیٹھک [illegible] کب سے [illegible] ہے اللہ
[illegible] ہے [illegible] دے اللہ
[illegible] تاب [illegible] کے

لب [illegible] دوست دے [illegible] سلامت

اس عہد میں سائنس کی ترقی [illegible]
[illegible]

مسافروں سے بچھڑ کر [illegible] جہاں [illegible]
ہر اک زمین میرے حق میں کربلا نکلی

ہو سکتا ہے کہ یہ نشتر اکبرآبادی کا ذاتی کرب ہو لیکن یہ [illegible] صورت [illegible] کا کرب ہے جو [illegible] کا کرب نہیں ہے بلکہ دراصل یہ نشتر اکبرآبادی کا [illegible] ہے کہ انہوں نے "اپنے" "میں" کے حوالے سے پورے معاشرے کے کرب کا تخلیقی اظہار کیا ہے۔ نشتر اکبرآبادی کی غزل میں بکھرتی، ٹوٹتی تہذیبی قدروں اور ان کی بازیافت کی بازگشت صاف سنائی دیتی ہے۔ دیرینہ وضع داریوں کی روایتیں اور انہیں برقرار رکھنے کی خواہش شدت سے محسوس کی جاسکتی ہیں۔

کار [illegible] سہل مت جانئے
پتھر کی طرح کاٹا گیا آدمی

کچھ اپنی وضع داری کا اتنا خیال تھا
جب بھی ملے کسی سے ملے شادماں سے ہم

ہاتھ [illegible] کاٹ [illegible] کی قیمت آ گئے
[illegible]

[illegible]
سلام [illegible] آشنا کو

قیمت بھی بہت بار لگی ہے مری نشتر
ایسا بھی ہوا ہے کہ میں بے دام بکا ہوں

اس کے علاوہ نشتر اکبر آبادی عشقیہ جذبات کی نرم، گداز اور نازک کیفیات کو لہجے کی برجستگی اور بے ساختگی کے ذریعہ انوکھے شعری پیکر عطا کرتے ہیں حالانکہ خیالات، موضوعات چونکا دینے والے نہیں ہیں لیکن ان کو بیان کرنے والا اسلوب یقیناً متاثر کرتا ہے اور براہ راست قاری کے ذہن سے دل تک اترتا چلا جاتا ہے خوب صورت خواہشوں، خوابوں، تمناؤں اور بد دعاؤں کی ملی جلی کیفیات کو نشتر اکبر آبادی کے منفرد لہجے نے اور حسین بنا دیا ہے ؎

خدا تیری بھی نیندوں کو اڑا دے
مجھے بھی شعر کہنے کی سزا دے

غزل کا شعر نوحہ بن گیا ہے
بہت دن ہو گئے چہرہ دکھا دے

پھر فضا میں کوئی پتنگ کٹے
پھر کسی کو میرا دھیان آئے

ہمارے شعر پڑھ کر یاد کر لو
ہمارا راز داں کوئی نہیں ہے

نشتر اکبر آبادی نے غزل کے لوازمات کو بحسن و خوبی اپنے شعری سرمایہ کا حصہ بنایا ہے اس کا اعتراف ان کا تازہ ترین مجموعہ کلام "بارش" کے مطالعے سے ہوتا ہے وہ غزل کے مروجہ فارم کو مسلم اور مقدم مانتے ہیں۔ اسلوب و بیان کی سطح پر تجربات کے قائل ہیں اس کی ہیئت میں کسی قسم کا عمل ان کے نزدیک گناہ ہے۔ ان کا خیال ہے کہ غزل کے مروجہ فارم میں تبدیلی لا کر اچھی شاعری ممکن نہیں اور اس کا اظہار انہوں نے ایک شعر میں اس طرح کیا ہے ؎

عقل کہتی ہے آزاد غزلیں لکھو
عشق اپنا خزانہ لٹانے نہ دے

مجموعی طور پر "بارش" اچھی اور کار آمد شاعری کا بہتر مجموعہ ہے، پچھلے کچھ برسوں میں نمایاں اور خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ امید ہے کہ ہمارے ذہین ناقدین شعر و ادب اس کتاب کا غیر جانبدارانہ مطالعہ کریں گے۔

(سلیم انصاری

نام :- سہ ماہی ادبی نقوش
مدیر :- سید احمد قادری
پتہ :- نیو کریم گنج، گیا۔ (بہار) ۲۰۰۱

"ادبی نقوش" کا پہلا شمارہ ہر لحاظ سے معیاری ہے۔ اداریہ تلخ حقیقت پر مبنی ہے پھر بھی ادبی نقوش کے اجرا کا جواز پیش کرتا ہے۔ ادب میں کمٹ منٹ " مذاکرہ دلچسپ اور فکر انگیز ہے۔ رضا الجبار کا مضمون " اردو دنیا کا مافیا گروہ " اردو لونجی ہی، ادیبوں اور قلمکاروں پر ڈائریکٹ ہے کیونکہ وہ جس طرح دوسروں کا استحصال کر رہے ہیں نئے لکھنے والوں کو جس طرح کا کرب دے رہے ہیں کی بھرپور نشاندہی رضا الجبار نے کی ہے۔ امرت سید احمد قادری کا انٹرویو معلوماتی ہے۔ سوالات سیدھے سادے ہیں اس لئے امرتا پریتم کے پیچیدار نہیں ہیں بلکہ امرتا پریتم جیسا اور اپنی ذات سے نے کھل کر جواب دیا ہے۔ ایک اور انٹرویو معین الد

شہرِ خیال

○ سہیل نمبر ۱/ ا کے جملہ مشمولات بہت اچھے ہیں ساجدہ زیدی کی نظم "عجیب بلاخیز مرحلہ تھا" بڑی شاعری کی زریں مثال ہے۔ "جانِ محشر بدست" دل بالغ خطر" "عرصہ معتبر" یا "عہدِ مختصر" ایسی تراکیب کا حسن استعمال بڑا شاعر ہی کرسکتا ہے۔ موصوفہ نے گیتا میں JYANA SANVEDNA (گیان سمویدنا) اور (SANVEDNA JYANA) سمویدنا گیان) جسے صوفیا کی اصطلاح میں بقا باللہ و فنا فی اللہ کہا جاسکتا ہے ملتی ہیں یعنی ان کے کلام میں عرفاں ہم حساسیت اور ہم حساسیت عرفان ایسی خوبیاں ملتی ہیں۔ موصوفہ پر میری ایک تحریر روحِ ادب (شمارہ جنوری-مارچ ۱۹۹۱ء) میں شائع ہوئی تھی۔

رضا اشک کی نظم "سحر ہونے تک" بڑی کامیاب نظم ہے۔ شاعر کا مستقبل یقیناً بہت تابناک ہوگا۔

ادیب بنگلوری صاحب کا مختصر خط دیکھ کر ان کی موصوف نظم دسہرو یاد آگئی۔ میری استدعا ہے کہ ادیب صاحب مذکورہ نظم کو سہیل کو عنایت کرم فرمائی کریں۔ بنگلور کا دسہرہ ہندوستان میں مشہور ہے اور اسی طرح موصوف کی نظم اس موضوع پر اعلیٰ ترین نظم ہے۔

اصغر علی انجینئر مشہور صحافی بھی ہیں اور ادیب بھی ہیں۔ ان کی تحریر فرقہ وارانہ فسادات، موجودہ صورت حالات کی آئینہ دار ہے

اس تجزیہ کے متعلق ایک بات میں بھی عرض کرنا چاہتا ہوں جس طرح روس میں کمیونزم ناکامیاب ہو گیا اسی طرح بھارت میں بھی جمہوریت دم توڑ چکی ہے۔ بلذاریت کا دور دورہ ہے۔ ہمارے ملک میں ہندو مسلمان مل جل کر رہتے آئے ہیں اور رہتے رہیں گے۔ وہ لڑتے نہیں لڑوائے جاتے ہیں۔ مندر مسجد کی آڑ میں لوگ کروڑپتی ہو گئے ہیں، بھلا وہ اپنی بزنس کیونکر بند کرسکتے ہیں یہی بات عسکریت میں آلودہ لوگوں کے بارے میں کہی جاسکتی ہے۔ افسران، آفس کے عملے، وزرار، ایم۔ ایل۔ اے، ایم۔ پی سب روپیہ بٹور سکتے ہیں تو یہ لوگ اے۔ کے ۴۷ سے کام لیتے ہوئے یہی سب کچھ کر رہے ہیں۔ انگریزی میں ایک مضمون کا خاکہ تیار ہے بس ٹائپ پر بھیجنے کی دیر ہے عنوان ہوگا ۔ TERRORISM IN INDIA:

- A TRUTHFUL APPRAISAL

● تارا چرن رستوگی، گوہاٹی

○ سہیل ان دنوں ہر ماہ پابندی سے نکل رہا ہے یہ بڑی خوشی کی بات ہے۔ آپ اس کی بقا اور ترقی کے لیے ہمیشہ کوشاں رہیں تاکہ حضرت سہیلؒ اور ادریس مرحوم کی روحیں خوش رہیں۔

● قیصر عثمانی، بمبئی

○ میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ "سہیل" پابندی سے مل رہا ہے "گیا" کے لوگ تو بہرحال قابل ستائش ہیں کہ پابندی سے ادبی رسالہ بھی نکالتے ہیں اور

ہر قسم کے علمی کام بڑی سنجیدگی سے کام لیتے ہیں۔ حلیم اشتیاق
شاہد احمد شعیب، سید احمد قاسمی، پروفیسر عبدالمغنی اور حضرات
بڑے قریب ہیں اور "سہیل" کی مجلس مشاورت میں
شامل ہیں۔ شاہد احمد شعیب نے بہت دنوں سے کچھ لکھا
نہیں ہے۔ سبب؟
میں سہیل سے متاثر ہوں اسے زندہ رکھئے مگر
یادگار ان صاحبین کی تخلیقات سے اسے مزین کیجئے
● خورشید مسیح، مظفرپور

○ نور محمد اینڈ سنس کی دکان سے ماہنامہ سہیل
برابر خرید کر پڑھ رہا ہوں۔ اس وقت میرے سامنے سہیل
کے جلد ۱۵ کا تیسرا شمارہ موجود ہے۔ حسب معمول فضا
ابن فیضی صاحب اپنے تمام تر جلوؤں کے ساتھ اس شمارے
میں شامل ہیں۔ ان کے علاوہ رضا اشک صاحب، علیم صبا نویدی
اویس احمد دوراں بھی اپنی بہترین غزلوں کے ساتھ اس
شمارہ میں شامل ہیں۔ مضامین کے حصے بھی خوب ہیں۔ تسنیم
فاروقی صاحب ہمارے یہاں ایک آل انڈیا مشاعرہ میں
تشریف لائے تھے۔ بہت دنوں کی بات ہے۔ ان کا یہ شعر
اب تک یاد ہے۔

تم کیا پیوگے جھوم کے دکھ دو لبوں سے جام
تسنیم یہ شراب ہے کتنوں کو پی گئی

اس مشاعرہ کے بعد اور پھر کبھی ان کے اشعار سننے کا اتفاق
نہیں ہوا تھا۔ مگر آپ کے موقر رسالے میں ڈاکٹر سعید عارفی
صاحب کا مضمون "تسنیم فاروقی کی غزل گوئی" پڑھ کر تمام
شکایتیں رفع ہو گئیں۔
● عبدالمتین جامی، کٹک

○ تازہ شمارہ میں احسان اللہ دسنگوی، ڈاکٹر مفتی تبسم اور

جناب ظفر عبادی کی غزل بہت اچھی ہے۔ خالد عبادی کا
یہ شعر بہت قیمتی ہے۔

پانی کو بے شک [illegible]
تنا ہی [illegible]

● [illegible]، دربھنگہ

○ سہیل گیا کے دونوں شمارے (۳/۴) ملے
شکریہ۔ شمارہ (۳) میں اویس احمد دوراں کا یہ شعر:

میں ختم لمحے کا دکھ ہے مون کا شناور تھا
زمیں پہ ظلم بڑھا دھن بیل گئی میری

پڑھ کر عظیم شاعر "پابلو نرودا" اور شفیق احمد شفیق یاد
آگئے کہ ان دونوں کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہوا تھا۔ پابلو نرودا
کے بارے میں تو علی سردار جعفری لکھتے ہیں کہ "لورکا" اور
پابلو نرودا اسپانوی خانہ جنگی کے زمانے میں ایک دوسرے
کے دوست ہو گئے تھے۔ یہ آگ، یہ لہو، خون اور شاعری
رشتہ تھا۔ یہیں سے پابلو نرودا کی شاعری میں ایک نیا
موڑ آیا اور وہ انقلابی اور عوامی احتجاج پیدا ہوا جو
نرودا کا طرۂ امتیاز ہے۔" (اردو انٹرنیشنل کینیڈا
۹۰ء، ص ۱۲)
اور شفیق احمد شفیق کے متعلق صبا حسن کی یہ رائے
ہے کہ "۱۹۷۳ء میں جب عرب اسرائیلی جنگ چھڑی تو
شفیق صاحب کراچی میں تھے۔ ان کی شاعری کے عام طور پر
[illegible]
[illegible]
معلوم ہوتا ہے کہ [illegible]
اپنے دوستوں کو [illegible]
درحقیقت ان دنوں عرب [illegible] معاشرے میں

[illegible] ... [illegible]
شاعری کا فروغ ہے جو سیاسی جبر و استحصال
فسطائیت کے خلاف جدوجہد کرنے والے عوام کے
مسائل اور جذبات کی عکاسی کا کام دے سکے۔
...کا اصول ہی یہی ہے کہ ادب ... [illegible]
تخلیقات وجود میں آتی ہیں جو بہت ہی معنویت
...ت کی حامل ہوتی ہیں۔ تیسری دنیا کے زیادہ تر
...آوازوں کی ترجمانی کرتے ہیں جو ظلم کے خلاف
...ہیں۔ آج فلسطینی مزاحمتی شاعری کو دنیا
...میں ایک نمایاں بین الاقوامی حیثیت اسی لئے
...وہاں کے شعراء محمود درویش، سمیح القاسم
...، توفیق زیاد جبر و تشدد کے خلاف [illegible]
...سے بلند جاتے ہیں۔ ... ([illegible])
...ان حالات میں انسانی عظمت پر ایمان رکھتے
...انہوں کا تعلق معتزلہ، ... سر سید، منصور
...دستوفسکی اور ... سے ہے۔ اس سلسلے
...نے بھی انسانیت کو فروغ دیا ہے۔ ان کے شعری
...یت پوری دنیا کو ایک ... میں سمیٹتا ہے اور یہ
...میں عکس ہے ... [illegible] ... دنیا کے تمام
... [illegible]

...کا درد ہو اپنا ... [illegible]
...یہاں جہاں بھی ظلم ہو ... آ جاؤ

...کی انسانیت ... اور اس کے خیر
... [illegible] ... صاحب نے
... [illegible] ... اس
... [illegible] ...
... [illegible] ... ہیں۔

"تم بہادر ہو تو ظلم کے ... [illegible] ...
سنتے ہو اس سے کیا فائدہ؟" جدید ... انگریزی شاعر
پرسی بیش شیلی نے اپنی نظم ... [illegible] ... میں
یہ بات کہی کہ آج کی طرح اب شاعروں کو بھی بیدار ہونا
چاہیے کہ ان کے بغیر اصلاح، امن و سکون ممکن نہیں۔

... میں رضا اشک کی ایک نظم "سحر ہونے تک" دیکھئے جس میں انہوں نے قدیم جاہلی شاعر متمم بن نویرہ کا بطور ... استعمال کیا ہے۔ ... کی روایت کے مطابق ... نام ہے انہوں نے اپنے بھائی مالک کے قتل پر ایک دردناک اور پرسوز مرثیہ لکھا ہے جس کا یہ شعر انتہائی گہرا تاثر لئے ہوئے ہے۔

فقلت له ان الشجا یبعث الشجا
فدعنی فہذا کلہ قبر مالک

(میں نے اس سے کہا: اے رفیق غم ہی غم کے جذبے کو ابھارتا ہے، تم مجھے میرے حال پر چھوڑ دو کیونکہ یہ تمام قبریں ... [illegible] ... نظر آتی ہیں۔)

... کی خوبصورت ... میں ... [illegible] ... کیا۔ "... ان کے شعری مجموعے "ایک خواب" پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ ملک زادہ جاوید کا یہ شعر:

سفر میں خوف ... کو ... رکھتا ہے
کسی سے ریل میں اب دوستی نہیں ہوتی

... بہت پسند آیا ... کے فرقہ وارانہ فسادات کے ... کے اعتبارات ... کے سامنے ... [illegible] ... آپ ... [illegible] ... فرقہ وارانہ ... کا ... کیا۔ وقت کی

ہے بہت بڑی ضرورت کی تکمیل کی ہے آپ نے۔

[illegible] صاحب کا مکتوب گرامی میں نے پڑھ لیا ہے۔ انہوں نے جو کچھ بھی لکھا ہے اس کا صحیح فیصلہ، تجزیہ تو ادب کے باشعور قارئین ہی کریں گے۔ تاہم اقبال کی شاعری میں عظمت کے عناصر کے تعلق سے یہ بات میں بہت مناسب سمجھتا ہوں کہ وہ خود شاعرانہ عظمت کے معیار (CRITERIA) کا تعین کر دیں تاکہ ان کے رہنما خطوط کی روشنی میں اس مسئلے پر سیر حاصل بحث کی جا سکے۔ ویسے میں اس وقت اقبال کے متعلق فراق گورکھپوری کی اس رائے پر اکتفا کرتا ہوں جو جگن ناتھ آزاد نے اپنے مضمون "کچھ فراق کے بارے میں" لکھی ہے۔

"میں ساٹھ برس سے مسلسل یہ محسوس کرتا رہا ہوں کہ دنیا کی قدیم سے قدیم شاعری سے لے کر آج تک کی شاعری جو کئی زبانوں پر مشتمل ہے اس کا اونچے سے اونچا لہجہ اور اس کی انتہائی بلندی سب کچھ اقبال کے اردو اور فارسی کلام میں مل جاتی ہے اور دنیا کے بڑے شاعروں کے یہاں جو خوبیاں ہیں وہ اقبال کے یہاں بھی موجود ہیں۔"

(الکتاب نما دہلی مارچ ۱۹۸۳ء صفحہ ۱۲)

اب یہ ظاہر ہے کہ فراق صاحب کے ۶۵ سالہ تجربات کو یونہی مسترد نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اس کے لئے بہت ہی مضبوط اور مستحکم دلائل و براہین کی ضرورت پڑے گی جو میرے خیال سے اقبال کے مخالفین کے پاس نہیں ہیں۔

● حقانی القاسمی (علی گڑھ)

○ سہیل کا تازہ شمارہ اپنی آب و تاب کے ساتھ ملا۔ آپ کی محنت اور کاوشوں کا نتیجہ ہے کہ پرچہ برابر وقت پر شائع ہو رہا ہے ورنہ اکثر رسالے تو بہت کچھ ہونے کے باوجود بھی وقت پر شائع نہیں ہو پاتے ہیں۔ اور پھر اتنی معیاری تخلیق کو اپنے دامن میں سمیٹنا کوئی چھوٹی بات نہیں ہے۔

جناب علیم اللہ حالی صاحب کا پاکستانی سفر آ گے چل کر بہت اچھے لوگوں سے ملوائے گا اور بہت کام کی باتیں سامنے آئیں گی۔ جناب اظہر نیر نے جناب کرامت علی کرامت سے بہت ہی اچھی ملاقات کروائی ہے۔ ان کا انٹرویو بہت پسند آیا۔ اچھے سوال انہوں نے پوچھے اور بہت ہی خوب جواب کرامت صاحب نے دیئے۔

عثمانی صاحب نے جاں نثار اختر کو یادوں کے جس آئینے میں دکھایا ہے اس میں جاں نثار اختر بہت ہی خوبصورت لگے۔ مضمون خاصہ طویل ہونے کے باوجود بہت مختصر لگا۔ ایسا لگا جیسے بہت کچھ باقی رہ گیا۔

مجموعی طور پر اس بار اس پرچے میں بہت کچھ پڑھنے کو ملا۔

● شاہد عزیز (اودے پور)

سہیل خریدیئے اور پڑھیئے

بانی :- حافظ محمد عبد الرحمٰن سہیل شہسرامی ❀ بیادگار :- زین العابدین احمر وادیس شہسرامی

ماہنامہ سہیل گیا

چیف ایڈیٹر :- مسعود منظر
ایڈیٹر :- جمیل منظر
معاونین :- شکیل احمد جمالی، عبد القیوم ابدالی
● کتابت :- سید عبد الاحد گیاوی ●

فہرست

نمود		۵
غزلیں	رفیق جاوید	۶
احمد فراز کی شاعری	ڈاکٹر قمر رئیس	۷
ہم مسافر جہاں جہاں گزرے	ڈاکٹر علیم اللہ حالی	۱۰
کارگہِ شیشہ گری	عظیم فیروز آبادی	۱۳
...	ڈاکٹر غلام ربانی	۱۵
چند نظمیں	ارشد مسعود ہاشمی	۱۹
غزلیں :-	رؤف خیر، شفیع اللہ خان راز	۲۵
غزلیں :-	راشد انور راشد	۲۷
ہجیت	...	۲۸
...	شگفتہ فرحت	۳۳
نئی کتابوں کا تعارف		۳۹
شہر خیال		۴۱

*

شمارہ ... جلد ...

بدلِ اشتراک

فی شمارہ ———— ۲/۰ روپے
زرسالانہ ———— ۳۰/۰ روپے
لائف ممبری ———— ۵۰۱/۰ روپے

● خط و کتابت و ترسیلِ زر کا پتہ ●

ماہنامہ سہیل
ریلوے اسٹیشن روڈ، گیا ۸۲۳۰۰۱
فون نمبر ۲۱۵۷۳

[illegible]

شوریٰ

حکومت اور قومی مسائل

ہمارے یہاں مرکز میں ہر نئی حکومت نئے دعووں کے ساتھ آتی ہے۔ انتخابات سے پہلے یہ بتایا جاتا ہے کہ ہم مسائل سے گھرے ہوئے ہیں اور ان کا حل صرف ہمارے پاس ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ سیاسی جماعتیں عوام کی حمایت حاصل کرنے کے لئے گمبھیر مسائل کی جو فہرست گنواتی ہیں ان میں بہت سے ایسے ہوتے ہیں جو مسائل ہوتے ہی نہیں ہیں۔ انہیں توڑ مروڑ کر مسئلہ صرف اس لئے بنایا جاتا ہے کہ عوام حل کی خاطر اس جماعت کی طرف متوجہ ہوں، پھر یہ ہوتا ہے کہ اقتدار حاصل ہو جاتا ہے۔ جو واقعی مسائل ہیں انہیں ہاتھ لگاتے ہوئے صاحب اقتدار جماعت ڈرتی ہے اس لئے کہ اس کے پاس ان کا کوئی حل نہیں ہوتا۔ دکھاوے کے چند بیانات اور کچھ فروعی اقدامات کا اظہار کیا جاتا ہے، بات وہیں کی وہیں رہتی ہے ــــ اور پھر نئے الیکشن کا وقت آجاتا ہے۔

اس ٹال مٹول کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ہمیں واقعی قومی مسائل کے حل سے کوئی دلچسپی نہیں۔ ایک وجہ یہ بھی ہے کہ سیاسی جماعتیں اس تدبر اور جراتِ عمل سے خالی ہیں۔ جو مسائل کو سلجھانے کے لئے ضروری ہیں۔

یہ تماشہ کب تک چلے گا ؟

ہماری سیاست کب خلوص اور دانش کی حامل ہو سکے گی ؟

یہ فکر و عمل کی تاریکی کب دور ہو گی ؟

ــــ کون جواب دے ؟

(ادارہ)

غزلیں

رفیق جابر

کل اشکوں کی برسات پھر ہو گئی
غزل ایک ہاں بات پھر ہو گئی

میں خوش تھا کہ وہ درد بھی سہہ گیا
پہ ان سے ملاقات پھر ہو گئی

چلی تھی قیامت کی اس دل نے چال
بدستور لو مات پھر ہو گئی

کچھ ابلاغ کا حق ادا ہو گیا
نگاہوں میں کل بات پھر ہو گئی

کرم رفتہ رفتہ ستم بن گیا
تلافیٔ ملاقات پھر ہو گئی

یہ دل رات بھر خون روتا رہا
چلو اک مناجات پھر ہو گئی

کہے شعر ترکس نے اس دور میں
یہ مجھ سے کرامات پھر ہو گئی

غزل اہلِ مینہ کو جابر تری
کراچی کی سوغات پھر ہو گئی

مرے اشعار میں جب بھی ڈھلی ہے
وہ صورت اور دلکش ہو گئی ہے

چراغ اب اور کوئی کیا جلاؤں
محبت روشنی ہی روشنی ہے

وہ کب سے زینتِ پہلو ہے لیکن
مری تنہائی کا عالم وہی ہے

مزاجِ لیلیٔ ایام مت پوچھ
تری زلفوں سے بڑھ کر برہمی ہے

یہ سن کر زندگی پھولوں کی کم ہے
بہت برہم وہ جانِ زندگی ہے

طبیعت میں ہے جو یہ خاکساری
غرورِ عشق کی شائستگی ہے

بڑا احسان ہو گا مسکرا دو
اندھیرے میں گھٹن سی ہو رہی ہے

مجھے دردِ تہہ جام آج دے کر
کہا ساقی نے قسمت کا دھنی ہے

بتہ تو دو کوئی شہرِ وفا میں
کہاں پر لاش جابر کی گڑی ہے

قمر رئیس

احمد فراز کی شاعری میں احتجاج

فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی اور ن۔م۔ راشد کے بعد پاکستان کے جن شعراء کی آواز میں پاکستان اور ساری دنیا کے مظلوم اور مجبور انسانوں کی آواز سنائی دیتی ہے ان میں احمد فراز اور حبیب جالب کے نام نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ ان میں فہمیدہ ریاض اور کشور ناہید جیسی شاعرات کے ناموں کا بھی اضافہ کیا جا سکتا ہے۔

احمد فراز پاکستان کے سرحدی پٹھانوں کے قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں۔ انسان کی آزادی کا تحفظ ان کی شخصیت اور شاعری کا مرکزی نقطہ رہا ہے اس لئے وہ ساری زندگی ان سفاک قوتوں کے خلاف جہاد کرتے رہے جو انسانوں کی آزادی کو کچلنے کے درپے رہی ہیں۔ احمد فراز کی آگہی اور ذہانت اپنے عہد کے نوبہ نو تقاضوں سے پوری طرح سے ہم آہنگ رہی ہے۔ انھوں نے ہوش سنبھالتے ہی ظلم و استبداد کی طاقتوں کے مقابلہ میں اپنے وطن کے اور ساری دنیا کے دبے کچلے انسانوں کی طرفداری کا عہد کیا تھا اور اس ستم کش کو جہد میں مجاہدانہ بانکپن سے آگے بڑھتے ہوئے کسی قربانی سے دریغ نہیں کیا۔ انہوں نے قید تنہائی کے اذیت ناک دن بھی گزارے اور فیض کی طرح جبری ہجرت اور اپنے کنبہ سے دوری کے المناک ایام بھی بسر کئے۔ پاکستان کی عسکری آمریت کے زمانہ میں انھیں ہر طرح کی صعوبتوں سے گزرنا پڑا۔ اس کے علاوہ آزادی اور انصاف کے لئے تیسری دنیا کے عوام کی جدوجہد سے بھی وہ ذہنی اور جذباتی طور پر ہمیشہ قریب رہے۔ یہی نہیں فراز اپنا رشتہ اس عبرت انسان سے جوڑتے ہیں جو روز اول سے ہی انسانی ظلم و استحصال کے خلاف جہاد کرتا آرہا ہے۔ اپنی ایک نظم "میں زندہ ہوں" میں کہتے ہیں۔

میں ابھی زندہ ہوں / تم نے سنگ باری کی / میرے پیکر کو / دیواروں کے قالب میں چنا / ناگوں سے ڈسوایا / جلایا / پھر بھی میں ہنس کی طرح پائندہ ہوں / میں زندہ ہوں / مرا چہرہ، مری آنکھیں، مرے بازو / میرے لب زندہ ہیں / میرے
میرے خواب [illegible]

رقصندہ و درخشندہ ہوں۔

یہ وسعت فکر اور یہ اعتماد لہجہ احمد فراز کو یونہی نہیں ملا۔ گزشتہ ۴۲ سال کے عرصہ میں پاکستانی عوام کی زندگی کا قافلہ جن آزمائشوں اور المناک مرحلوں سے گزرا ہے شاعر اس میں شریک سفر رہا ہے۔ وہ بے گناہ طالب علموں کے ہجوم پر بے دریغ فائرنگ ہو یا قید خانوں میں انقلابی نوجوانوں پر بہیمانہ ظلم و جبر۔ قومی آشوب کے ہر لمحہ کی اذیتوں کو شاعر نے اپنی روح میں محسوس کیا ہے "آزادی کے ساتویں سالگرہ کی تقریب" پر وہ اپنی نظم "اے بھوکی مخلوق" میں کہتے ہیں۔

آج / تری آزادی کی ہے ساتویں سالگرہ
چار طرف جگ مگ جگ مگ کرتی ہے شہر پنہ
پھر بھی تیری روح کی بے چادر تقدیر سیہ
پھر بھی پاؤں میں زنجیریں ہیں ہاتھوں میں کشکول
کل بھی تجھ کو حکم تھا، آزادی کے بول نہ بول
آج بھی تیرے سینے پر ہے   کی صندوق
اے بھوکی مخلوق

پاکستان کے جب سامراجی طاقتوں کے فوجی معاہدوں میں شامل ہوکر اپنے آپ کو ان کی سیاسی بازیوں کا تابع بنالیا تو احمد فراز نے اسے وطن دشمن جیسا اقدام قرار دیا۔ اور کئی نظموں میں اس کے خلاف احتجاج کیا۔ صرف یہی نہیں انھوں نے دین و مذہب کے ان بیوپاریوں پر بھی طنز و تمسخر کے تیر چلائے جو پاکستان کے محنت کش عوام کو ایک دوسری طرح کی غلامی کے راستے پہلے چلانے کی کوشش کرتے رہے تھے۔

اے روشنی کے پیمبر
یہ شور یہ سر حرف زنی ہے
کہ محراب و منبر سے

فتویٰ گرو فتنہ پرداز دیں
حرف حق بیچتے ہیں
فقیہان مسند نشیں
حرص دینار و درہم میں
تیرے صحیفہ کا اک اک ورق بیچتے ہیں
یہ خلقت کا خوں
اور اپنی جبیں کا
عرق بیچتے ہیں
میں تنہا کھڑا ہوں

شاید اسی سرکشی اور احتجاج کا نتیجہ تھا کہ احمد فراز کو قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنا پڑیں۔ لیکن حق گوئی کی اس تعزیر میں وہ تنہا نہیں تھے۔ عسکری آمریت کے دور میں کتنے ہی نوجوان اور حبیب جالب جیسے فنکار قید اور قید تنہائی کی اذیتوں سے گزرے۔ احمد فراز اپنی نظم "اے شہر میں تیرا نغمہ گر ہوں" میں اپنے انقلابی زنداں معاصرین کی ترجمانی کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

اے شہر میں تیرا نغمہ گر ہوں
اب ہاتھوں میں میرے ہتھکڑی ہے
اب پاؤں میں میرے بیڑیاں ہیں
اب دست صبا ہے دست قاتل
اب ابر کرم میں بجلیاں ہیں
اب [illegible] دوام میری قسمت
یا میرا نصیب پھانسیاں ہیں
میں اپنی خطا سے بے خبر ہوں
اے شہر میں تیرا نغمہ گر ہوں

احمد فراز کی نظموں میں ظلم و جبر، قید و بند اور جلاوطنی کے تجربات کثرت سے ملتے ہیں۔ یہاں ان کی

آواز ظلم و استبداد کی طاقتوں کے خلاف جہاد کرنے والے لاکھوں انسانوں کی آواز سے ہم آہنگ معلوم ہوتی ہے۔ بقول خالد سہیل "احمد فراز کو جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ وہ جس ماحول میں پیدا ہوئے اس کی سب سے اہم قدر ظلم ہے اور سب سے اہم روایت ناانصافی ہے۔ حقدار کو اس کے حق سے محروم رکھنا اس بستی کی مسلمہ حقیقت ہے۔۔۔۔ وہ جان گیا کہ بات صرف نان شبینہ کی ہی نہیں لوگوں کو آزادی کے حق سے محروم کر دیا گیا ہے فراز نے اپنی غزلوں میں بھی کہیں اشارہ کنایہ میں اور کہیں طنز و استہزا کے پیرایہ میں اپنے وطن کی اس صورت حال کا ذکر کیا ہے۔

جس کو دیکھو وہی زنجیر بپا لگتا ہے
شہر کا شہر ہوا داخل زنداں جاناں

دربار سے وہ رشتہ رہا منتقیٔ ذہن کا
منبر سے ہر ارشاد پہ آمین ہوتی ہے

رفتہ رفتہ یہی زنداں میں بدل جاتے ہیں
اب کسی شہر کی بنیاد نہ ڈالی جائے

نہ جانے کیا ہوا زنداں نیوں کو
کہ بے آواز ہے زنجیر پا تک

امکان میں ہے تو پند سلاسل پہن کے چل
یہ حوصلہ نہیں ہے تو زنداں کے در نہ کھول

میں تو لب کھولنے کی پابند سلاسل ٹھہرا
تیری ہر بات ہے [illegible] سب مخفی ٹھہرا

احمد فراز نے پاکستانی معاشرہ میں عورت کے ساتھ ہونے والی بے انصافی اور ظلم کے خلاف بھی احتجاج کی آواز بلند کی ہے۔ "میرے خواب ریزہ ریزہ" کی طویل تمثیلی نظموں میں عورت کا وجود ہی مرکزی کردار ادا کرتا ہے۔ شاعر اسے امن آشتی اور تخلیقی جولانیوں کی زندہ علامت قرار دیتا ہے اس طرح وہ جنگ جارحیت اور تشدد کی بہیمانہ قوتوں کو بھی ملامت کا ہدف بناتا ہے۔ نظم "آخری شب کے ہمسفر" میں عورت جنگ کی تباہ کاریوں سے ایک آسیب گو شہ میں پہنچتی ہے۔ یہاں وہ اپنے شوہر کی لاش تلاش کرنے آتی ہے۔ جنگ کی تباہی تاراجی اور ہلاکت سے وہ لرزہ براندام ہو جاتی ہے اور نہایت نفرت اور حقارت کے ساتھ وہ دشمن سپاہی سے کہتی ہے

مگر تم نہیں تو تیرا کوئی ہم جنس ہوگا
کہ قاتل تو سب ایک سے ہیں
ایک سے ہیں
مجھے اس سے کیا
کس کے خنجر سے گھائل ہوئی ہوں
مجھے اس سے کیا
کس کی شمشیر کے شعلے نے مرا جسم بھی تک ڈالا
وہ خنجر ترا ہو کہ تیرے رفیقوں کا ہو
میں تو گھائل ہوئی
آگ تو نے لگائی ہو یا تیرے ہمراہیوں نے
میرا آشیاں تو جلا

الغرض استحصال اور ظلم کی طاقتوں سے بغاوت احمد فراز کی شاعری کا مرکزی نقطہ ہے۔ وہ فیض احمد فیض کی مشعل کو اور اونچا اٹھا کر ظلم و تشدد کی آندھیوں میں [illegible] [illegible]

علیم اللہ حالی

ہم مسافر جہاں جہاں گزرے

کراچی ادبی و تہذیبی سرگرمیوں کا ایک بڑا بندرگاہ ہے۔ شعر و ادب اور علم و فن کا غیر معمولی انہماک شغف زندگی کی مادی آسودگیوں سے اوپر اٹھ کر روحانی، انسانی اور اخلاقی طمانیت کی طرف لے جاتی ہے، چنانچہ شہر کراچی اس لحاظ سے دو تہوں پہ بسا رہا ہے۔ ایک تہہ تو وہ جہاں پیسوں کی فراوانی ہے، حال کی مادی خوشحالی اور مطمئن مستقبل کی خوش خیالی نے بالعموم لوگوں میں خوش معاملگی پیدا کر دی ہے۔ اخلاق و اخلاص، رواداری اور مروت وغیرہ ایسی خصوصیات ہیں کہ جب یہ ایک متوازن اور اوسط معیار سے اوپر ہو جاتی ہیں تو مصنوعی اور اجنبی دکھائی دیتی ہیں۔ کبھی کبھی اہل کراچی کے طرز تپاک سے ایسا التباس بھی ہوتا ہے۔

کراچی کو روشنیوں کا شہر کہتے ہیں۔ اس کا مفہوم مگر نظر کو خیرہ کرنے والی بجلی کی چمک دمک تک [illegible]

دلی، کلکتہ، بمبئی وغیرہ شہر بھی روشنی کی جگمگاہٹ میں اپنی مثال آپ ہیں۔ لیکن اس کے باوجود میں کراچی کو روشنیوں کا شہر مانتا ہوں، — اور وہ اس طرح کہ زبان و بیان، علم و فن، شعر و ادب اور فکر و نظر کے جو چراغ یہاں اپنی پوری تابانی کے ساتھ جگمگاتے رہتے ہیں ان کی کوئی مثال نہیں۔ اس طویل و عریض شہر کے متعدد گوشوں میں چھوٹی بڑی انجمنیں اپنی کارگزاریوں سے ہمہ وقت سبقت لے جانا چاہتی ہیں۔ یہ شہر ایک ایسا سنگم ہے جہاں قدیم و جدید، روایت پسند اور انحراف پسند ہر طرز فکر کی ادبی پود تنازع البقا میں لگی ہوئی۔ جن چند انجمنوں سے میری شناسائی ہو پائی ہے ان میں مندرجہ ذیل کے نام مجھے یاد رہ گئے ہیں۔

(۱) حلقۂ آہنگ نو (۲) بزم اہل قلم (۳) انجمن جدید مصنفین (۴) فکشن گروپ (۵) بزم احباب (۶) دبستان جگر (۷) کل پاکستان حلقۂ ادب (۸) ادارہ ادب و ثقافت (۹) ادارہ طلوع افکار (۱۰) دبستان جدید (۱۱) دبستان [illegible] (۱۲) [illegible] فکر و نظر (۱۳) ادارہ [illegible] ادب

...ہنا ۔

مخزن ادب

اس کہکشاں میں بھی متعدد ستارے ہیں جو روشنی
لے بڑے ہالے بناتے ہیں اور جب یہ سب ایک ساتھ
ے ہیں تو پورا شہر تیز روشنیوں کا امین ہو جاتا ہے ۔
رشبو است بتاں را کہ نام نیست ۔ ان میں کچھ
شاعت کتب پر زور دیتے ہیں ۔ کچھ ادبی اجتماعات
ستوں کے ذریعہ شعر و ادب کی ترویج کر رہے ہیں ۔
شعری نشستوں ، بڑے مشاعروں ، طرحی مشاعروں
ں ، مذاکروں اور سیمیناروں کا ایک لامتناہی سلسلہ
ہنی تربیت کا ایک وسیلہ بنا ہوا ہے ۔ پاکستان میں
کی اشاعت کا معیار نہایت بلند ہے ۔ بعض کتابیں
چھپتی ہیں کہ ان کے ادبی معیار پر شک ہونے
۔ بات یوں ہے کہ ہم جس ادبی نسل سے تعلق
یا اور اہل شعر و ادب کو جس کس مپرسی کے عالم
ر چکے ہیں اس کی وجہ سے ایک عام تصور یہ ہو گیا
کتب و رسائل پیش کرنے والے مالی اعتبار سے
ور ہوتے ہیں اس لئے ادبی کتابیں جیسے تیسے چھاپ
ہیں ۔ جو پیسے والے ہیں وہ ادب سے دور ہیں اور
سے وابستہ ہیں وہ غریب و نادار ہیں ۔ یہ تصور
ہو چلا ہے ، خاص طور پر پاکستان کی معاشرت
مت نے تو اسے یکسر غلط ثابت کر دیا ہے —
مطبوعات جس طرح دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں اسی
ھنے سے تعلق رکھتی ہیں ۔

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں
اب دیکھئے ٹھہرتی ہے جا کر نظر کہاں

حتا ... کی دلکشی ... دعوت مطالعہ دیتی ہے
... دوستوں اور ... ادب ... مطالعہ ...

کتب و رسائل آج بھی اس وقت زیر مطالعہ ہیں ۔ ان میں سے کچھ کتابیں تفصیلی رائے زنی کے لائق ہیں ۔ کچھ پر عام تاثر کا اظہار کافی ہے ۔

کراچی میں میری آمد کی خبر عام کرنے والوں میں میرے احباب کا ہاتھ ہے میں بنیادی طور پر گوشہ نشین اور کم آمیز آدمی ہوں ۔ لیکن ایسا بھی نہیں کہ دوستوں سے ملنے کی خواہش نہ ہو چنانچہ صبا اکرام ، علی حیدر ملک اور شہزاد منظر سے ملنا کیا تھا کہ رسوا سر بازار ہو جانے کا پورا سامان تھا ۔ ان مخلص مخبروں نے مجھے روشناس خلق کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی — اور پھر ہر بعد نئی نشستوں میں شرکت کرنے اور نئے لوگوں سے ملنے کی دعوتیں ملنے لگیں ۔ محبت بھی کبھی کبھی مصیبت بن جاتی ہے میں نے وہاں اپنے اعزہ کی ملاقاتوں میں تخفیف کر کے اہل شعر و ادب سے ملنے میں ہی عافیت سمجھی ۔ متذکرہ اصحاب ثلاثہ کے ساتھ محمد رضا کاظمی بھی مل گئے ۔ اور ان چاروں یاروں نے جانے کہاں کہاں ادبی ملاقاتوں اور شعری نشستوں میں میری شرکت کا اقرار کر لیا ۔ مجھے وہ علاقے بھی اچھی طرح یاد نہیں ، میں تو صرف ان دوستوں کے اشارے اور حکم پر عمل کر رہا تھا ۔

اہم نشستوں میں جن کے خوش گوار تاثرات اب بھی ذہن و دل میں یاد ہیں ایک ادبی اجتماع وہ ہے جو فکشن گروپ نے منعقد کیا تھا ۔ یہ اجتماع ناظم آباد میں منعقد کیا گیا تھا ۔ اس نشست کے اہم شرکا میں علی حیدر ملک ، صبا اکرام ، شہزاد منظر ، مسلم شمیم ، احمد ہمدانی ، شاہین بدر ، محمد رضا کاظمی ، نسیم رحمانی ، ... ، ڈاکٹر ممتاز احمد خاں ، پروفیسر آفاق صدیقی جیسے نامور گرامی حضرات کے نام لئے جا سکتے ہیں ۔ جلسے کی صدارت

جناب عبد[illegible] اسپیکر سندھ اسمبلی نے کی۔ اپنی صدارتی تقریر میں جناب عبدالرزاق نے ادب زندگی اور سیاست کے واسطے سے جو عالمانہ گفتگو کی اسے سن کر نہایت خوشی ہوئی۔ اس سے یہ اندازہ ہوا کہ وہاں اہل سیاست صرف سیاسی توڑ پھوڑ اور حصول اقتدار کے چکر میں نہیں رہتے بلکہ وہ سیاست کو ایک مثبت اور تعمیری اشارہ نما بنانا چاہتے ہیں۔ جناب صدر کے خطاب سے شعر و ادب کے اس GENUINENESS پر بھی روشنی پڑتی ہے جس کی بنیاد پر وہ دیگر شعبہ ہائے حیات پر اسے بالادستی حاصل ہے۔ عملی سیاست میں رہنے والے اس دانشور سے مل کر خوشی ہوئی جو ادب کے سماجی افادیت کا اس خوبصورتی کے ساتھ اعتراف کرتا ہو۔ جلسے کا مکالماتی سیشن خاصا دلچسپ تھا۔ مسلم شمیم اور شہزاد منظر نے ترقی پسندی اور جدیدیت کے حوالے سے متعدد سوالات سامنے رکھے۔ ترقی پسندی اور مابعد ترقی پسندی کے مسائل پر بڑے جھگڑے کھڑے ہو چکے ہیں۔ آج تک یہ موضوع محفلوں کو گرماتا رہتا ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ جو لوگ ترقی پسندی کی روح سے واقف ہیں وہ ایسے مناقشوں میں نہیں پڑتے۔ اس لئے کہ وہ جانتے ہیں کہ ہر تحریک کچھ مخصوص عوامل کی دین ہوتی ہے۔ زندگی کا حرکی نظام عوامل کی شکست و ریخت بھی کرتا ہے اور نئے عوامل کی افزائش و نمو بھی، کوئی نقطۂ نظر ان معنوں میں دائمی نہیں ہو سکتا کہ ہمارے معاشرے میں اخذ و قبول کی شرائط بدلتی رہتی ہیں معاشرے کی ADOPTIBILITY کو نظریہ کی اساسی سچائیوں سے اس قدر تعلق نہیں ہوتا جتنا کہ ان شاخوں سے جو متغیر معاشرتی ڈھانچے پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ ترقی پسندی کے بنیادی عقائد میں سے ایک یہ بھی ہے کہ تبدیلیوں پر یقین ہی

نہیں ان کا احترام بھی کیا جائے۔ فکشن گروپ کے جس جلسہ میں اس موضوع پر مکالمات ہو رہے تھے اس میں جناب احمد ہمدانی بھی تشریف رکھتے تھے بلکہ اس سیشن کی صدارت وہی فرما رہے تھے۔ انہوں نے اپنی صدارتی تقریر میں بڑے عالمانہ انداز سے ترقی پسندی اور جدیدیت کے فکری سرچشمے پر روشنی ڈالی اور یہ بتایا کہ یہ دونوں رجحانات دراصل ردعمل میں ہیگل کے اس فلسفے کے جس میں انسان کو تاریخ کی ادعائیت اور غیر استدلالیت کا ایک نحیف و معذور عضو سمجھا جاتا ہے۔ مارکس نے یہ بتایا کہ انسان تاریخ کا غلام نہیں ہوتا بلکہ وہ تاریخ بناتا ہے، مادی و عقلی اعتبار سے انسان جب معاشرہ کی تکمیل کر لیتا ہے تو وہ پختہ تر ہو جاتا ہے اور بقول اقبال ا[س] منزل میں پہنچ جاتا ہے جسے جبریل زبوں صید سے لے ہمت مردانہ کہا جا سکتا ہے۔ اس سے کچھ ہٹ کر کیر کے گارڈ نے (جسے جدیدیت کا بانی کہا جاتا ہے) موجودیت EXIS-TENTIALISM) کا فلسفہ پیش کیا۔ یہاں بھی انسا[ن] کی افضلیت کا اعتراف ہے مگر ایک دوسرے انداز میں جہاں فرد کو جماعت پر تفوق حاصل ہے۔ غرض ترقی پسن[دی] ان دونوں شقوں میں ظاہر ہوتی ہے اور یہ دونوں کی [یکجائی] کے خلاف احتجاج کی آواز ہیں۔

مکالمہ کو جب کسی خاص موضوع کا پابند نہ بنا[یا] جائے تو پھر ادب کے حوالے سے کسی پہلو پر گفتگو ہو سکتی ہے۔ فکشن گروپ کے اس سوال و جواب سیشن کو بھی آزاد[ی] دیا گیا تھا اور میں مختلف جہتوں سے الگ الگ نوعیت کے سوالات کی بوچھار برداشت کر رہا تھا۔ اس درمیان نہ جانے کیسے بات فکشن کی آ گئی۔ اور پھر قرۃ العین کے ناول چاندنی بیگم نے نشست میں گرمی پیدا کر دی خصوصاً اس وقت جب میں نے اسے ایک ناکام ناول کہہ دیا۔ (جاری)

عظیم فیروز آبادی

کارگہہ شیشہ گری

"آجکل" جون ۱۹۹۱ء کے شمارے میں فاضل مبصر پروفیسر نثار احمد فاروقی صاحب نے میرؔ کے شعر

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہہ شیشہ گری کا

کا جو مفہوم بیان کیا ہے اور اسی سلسلے میں جناب شمس الرحمان فاروقی کی سخن فہمی اور فنی بصیرت کی جو تعریف کی ہے میں اس سے متفق نہیں۔ موصوف فرماتے ہیں۔

"بظاہر سیدھا سادا شعر ہے۔ مگر اس کا صحیح مفہوم وہ سمجھ سکتا ہے جسے معلوم ہو کہ پہلے زمانے میں کانچ کے برتن اس طرح بنائے جاتے تھے کہ شیشے کو ایک کڑھاؤ میں پکایا جاتا تھا۔ وہ گاڑھا سیال مادہ بن جاتا تھا۔ پھر ایک لمبی نلکی کا سرا کڑھاؤ میں ڈال کر دوسرے سرے کو منہ میں لے کر سانس اوپر کھینچتے تھے وہ سیال شیشہ نلکی میں بھر جاتا تھا۔ پھر اس نلکی کا ایک سرا لکڑی کے سانچے میں رکھ کر سانس پھونکتے تھے تو وہ سیال اس سانچے میں منتقل ہو جاتا تھا اور ٹھنڈا ہو کر برتن کی شکل میں نکلتا تھا۔ یہ سب کاریگری سانس کی تھی۔ اگر کڑھاؤ سے شیشہ لیتے وقت سانس زور سے کھینچ لیں تو آدمی مر سکتا تھا۔ اور سانچے میں چھوڑتے وقت سانس کا دباؤ زیادہ ہو جائے تو برتن بے ہنگم بن جاتا تھا۔ میرؔ نے دنیا کو کارگہہ شیشہ گری سے تشبیہ دی ہے اور نہایت عزم و احتیاط کے ساتھ زندگی گزارنے کی تلقین ایک نہایت خوبصورت تمثیل کے ذریعے کی ہے۔"

جن حضرات کو شیشہ گری کی صنعت کو دیکھنے یا اسے جاننے کا موقع نہیں ملا، وہ میرؔ کے شعر میں فاروقی صاحب کی بتائی ہوئی تشریح یا تمثیل سے فاروقی صاحب کی وسیع معلومات اور ان کی سخن سنجی کے معترف ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ جبکہ واقعہ یہ ہے کہ گلاس ٹکنولوجی تو ایک طرف، معلوم ہوتا ہے فاروقی صاحب کو شیشہ گری کی صنعت کو دیکھنے کا بھی کبھی موقع نہیں ملا۔ نثار صاحب کو جاننا چاہیئے کہ فاروقی صاحب نہ تو شیشے یا کانچ کی ماہیت سے واقف ہیں اور نہ شیشہ گری کی صنعت سے۔ کانچ کی دریافت کا شرف دراصل قدیم عرب فنیقیوں کو پہنچتا ہے جس کی تفصیل یا تاریخ بیان کرنے کا یہ موقع نہیں۔

کانچ کیا ہے اور کیسے بنتا ہے؟ ریہہ (ریح) جس
سے دھوبی کپڑا دھوتے ہیں، اسے ایک خاص مقدار میں گرمی پہنچائی
جائے تو وہ کانچ بن جاتا ہے۔ ریہہ میں سوڈا اور سینڈ (بالو)
ملا ہوتا ہے اور جب اسے مطلوبہ گرمی دے کر پگھلایا جاتا ہے تو
وہ کانچ کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ کوئی ساٹھ ستر سال پہلے
ہندوستانی شیشہ گر بنجر زمینوں کا ریہہ اکٹھا کر کے، اینٹ
اور گارے کی بھٹی بنا کر (جسے ہود یا حوض کہا جاتا تھا) جنگلی
لکڑی کے ذریعہ دھواں دھار آگ پیدا کر کے اس ریہہ کو
پگھلاتے تھے۔ یہی کانچ ہوتا تھا۔ مٹیالا سا، دھندلے —
(OPAQUE) قسم کا۔ بعد میں اس کانچ کو ہندوستانی مسالوں
سے مختلف رنگ دیا جاتا تھا۔ فی زمانہ کانچ کی انڈسٹری
نے بہت ترقی کر لی ہے۔ پہلے جو بھٹیاں دس پندرہ روپے میں
تیار ہو جاتی تھیں۔ اب ان کی لاگت پر ایک لاکھ سے لے کر
دس لاکھ روپے تک خرچ ہوتا ہے اور ریہہ کی جگہ سوڈا،
ریت اور اعلیٰ قسم کا کیمیکلز کے ذریعہ دیدہ زیب کانچ کی
کوالٹی تیار کی جاتی ہے۔ دلوں میں جھنکار پیدا کرنے والی
چوڑیاں، کانچ کے برتن، سائنس کے آلات، جھاڑ فانوس
وغیرہ تیار کئے جاتے ہیں۔

معلوم ہوتا ہے شیشے کی صنعت کو نہ تو ابتدائی مدارج
اور نہ آج کی موجودہ ترقی یافتہ صورت میں فاروقی صاحب کو
دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ [illegible] ہی نہیں، کسی بھی زمانے میں شیشے
کو کڑھاؤ میں نہیں پکایا گیا۔ ہود میں ریہہ سے تیار شدہ
کانچ کو ایک دوسری بھٹی میں مٹی کے برتن میں (جسے فنی اصطلاح
میں کٹی ([illegible]) کہتے ہیں) دوبارہ پگھلایا جاتا ہے اور یہ
جب سیال مادہ میں تبدیل ہو جاتا ہے تو لوہے کی ایک نلکی
(پائپ) کی نوک پر اس سیال کانچ کی ایک ہلکی مقدار اٹھائی
جاتی ہے۔ زیادہ مقدار میں یہ سیال کانچ اٹھانا ممکن نہیں
ہوتا۔ پھونک کے ذریعہ اس پائپ کے دوسرے سرے پر ایک
گولی بنائی جاتی ہے جسے ببل کہتے ہیں یہ ببل جب کسی قدر
ٹھنڈا ہو جاتا ہے تو اس پر دوبارہ تلی سے کانچ کی مطلوبہ
مقدار اٹھا کر اسے پھونک لیا جاتا ہے۔ اب اس پوری گولا
کو لوہے کے سانچے میں ڈال کر جس قسم کا چاہتے ہیں برتن
بنا لیتے ہیں۔ فاروقی صاحب نے لکھا ہے کہ وہ سیال کانچ نلکی
میں بھر جاتا تھا اور کبھی کبھی پھونکنے والے کاریگر کے منہ میں چلا
جاتا تھا جس سے اس کی موت ہو جاتی تھی۔ ناواقفیت کی بنا پر
ایک معمولی کام کو فاروقی صاحب نے ایک مہلک کرتب میں
تبدیل کر دیا ہے۔ کانچ چھ یا سات فیٹ کی دوری پر پائپ
کی نوک پر ہوتا ہے اور پائپ گرم ہونے کی وجہ سے اس سے
اس قدر چپک جاتا ہے کہ اس کے گزرنے کا امکان نہیں رہتا
فاروقی صاحب کا یہ خیال صحیح نہیں کہ سیال کانچ نلکی یا پائپ
کے اندر گھس جاتا ہے۔ سانس یا پھونک کے عمل (PROCESS)
کے ذریعہ بجلی کے بلب، گلاس، چھوٹی شیشیاں، بڑی بوتلیں
مرتبان، لالٹین کا چمنی کے شیشے یا ایسے برتن بنائے جاتے ہیں
جن میں پانی یا کوئی سیال چیز بھری جا سکتی ہو۔ رکابیاں
پلیٹیں، ایش ٹرے، گلاس شیٹ یا دوسری ٹھوس قسم کی
چیزیں تیار کرنے میں پھونکنے کے عمل سے واسطہ نہیں پڑتا۔ فاروقی
صاحب کی طرح میر کی نظر سے بھی شیشے کی صنعت نہیں گزری تھی
اس لئے وہ شیشے کی تیاری کے دوران جان لیوا PROCESS
سے واقف نہیں ہو سکتے تھے اور نہ اس کی ہلاکت آفرینی کو
تشبیہ کے طور پر استعمال کر سکتے تھے۔

دراصل میر نے فارسی کے مشہور دوہے ——
"یک لحظہ غافل بودم و صد سالہ راہم دور شد" کو اپنے
مخصوص پر تاثیر لہجے میں پیش کیا ہے۔ شعر کا سیدھا سادہ
مفہوم وہی ہے جو عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔ یعنی یہ دنیا

(بقیہ صفحہ [illegible] پر)

ڈاکٹر غلام ربانی

قومی یکجہتی کی تعمیر و تشکیل میں اردو کے کردار کا پس منظر

منگریزوں کی غلامی کا طوق آج سے بیالیس سال
ے اپنے گلے سے اتار پھینکا تو ہم آزاد ہو گئے اور
ہندوستان، دنیا کے نقشے میں ایک، سیکولر،
یت سے ابھرا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ہماری آزادی
مجبوری میں جا اٹکنے کی مترادف تھی یعنی ہماری
عیت سیاسی تھی مگر فکری اور ذہنی اعتبار سے
زاد نہیں ہیں۔ جبکہ سمندر پار سے آئے انگریز
لامی سے نجات حاصل کرنے کے لئے لگ بھگ
[illegible] تا ۱۹۴۷ء) تک ہم جس طرح تن من دھن
رہے اور ان کے ظلم و جبر کو جس صبر و تحمل سے
ئے وہ ہماری یکجہتی کی بے مثال نمونہ اور اتحاد
وشن باب ہے۔ کیونکہ ہمیں اس کا شدید احساس
ے

ملک میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جیسے کہ اب
در آزادی میں بحر بیکراں سے ہے زندگی

چنانچہ حصول آزادی کا مقصد ہماری نظروں میں یہ تھا کہ
آزادی کی جو کرن نمودار ہو اس سے ہمارا ملک، ہماری
قوم اور ہمارا مستقبل نمایاں طور پر روشن ہو نیز ہم میں
اتحاد و اتفاق اور باہمی یکجہتی کا جذبہ بھی برقرار رہے جو
ہماری ترقی اور ملک کی تعمیر کے لئے لازمی ہے۔ مگر جب آسمان
افق پر صبح آزادی کی کرن نمودار ہوئی تو وہ ہمارے لئے
داغ داغ اجالا لئے آئی۔ چنانچہ اس امید شکن اور نفاق
آمیز آزادی سے نہ صرف مادر وطن کے ٹکڑے ہوئے بلکہ ہمارے
اتحاد و یکجہتی پر بھی فالج گر پڑا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے مادر وطن
کی آنچل نفاق و فساد اور قتل و خون سے سرخ آلود ہو گیا۔

زمیں نے خون اگلا، آسماں نے آگ برسائی
جب انسانوں کے دل بدلے تو انسانوں پہ کیا گزری

اب ہمارے نفاق کی بنیاد سیاسی ہی نہیں مذہبی اور سماجی
بھی ہو گئی اور اس تنگ دلی و تنگ نظری سے ہماری قومی
یکجہتی میں جو دراڑ آیا آج تک اسے پاٹا نہ جا سکا۔ مگر ہم

نے اپنے وطنِ عزیز سے اپنی محبت کا ہمیشہ اعادہ یہ کہہ کر کہا ہے ؎

اے وطن خاکِ وطن، تجھ کو وہ بھی دیدیں گے
بچ رہے گا جو لہو اب کی فسادات کے بعد

اب تصویر کا دوسرا رخ۔ آزادی کے بعد ہمارا ملک، سیکولر، قرار پایا تو یہاں کی اکثریت کی زبان، ہندی کو قومی و سرکاری زبان کا درجہ عطا ہوا تو ہمارے نفاق و فساد میں ایک اور اضافہ جو ہوا وہ لسانی تھی۔ یعنی اردو کو مسلمانوں سے منسوب کرکے اسے غیر ملکی، زبان کہا جانے لگا۔ چنانچہ احیائے تہذیب کے جوش میں اردو اور ہندی کے مشترک حصہ کو نظر انداز کرکے تفریق پیدا کرنے والے اجزا کو جس طرح ہوا دی گئی اس سے اردو ہندی کا تنازعہ پیدا ہو گیا۔ جس کا مظاہرہ آج بھی ہوتا ہے۔

مزید وضاحت ڈاکٹر تارا چند کی زبانی۔

"انیسویں صدی سے ہندو اور مسلمان دونوں (اردو کو) اپنی مشترک زبان سمجھنے لگے تھے۔ تاہم سیاسی پیچیدگیوں کی وجہ سے گاندھی جی کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔ اور اس ہندی کو ہندوستانی جمہوریہ کا سرکاری زبان قرار دے دیا گیا جو صرف دیوناگری رسم الخط میں لکھی جائے......... لیکن اردو کا نام دستوری حیثیت سے اس طرح باقی رہ گیا کہ اسے کشمیر کی سرکاری زبان بنا دیا گیا اور اسے ہندوستان کی چودہ زبانوں میں ایک جگہ دی گئی۔ اردو جو ایک جدید ہندوستانی زبان ہے اور ہماری مشترکہ تہذیب کی علامت بھی ہے۔ اس کی بنیاد گرچہ ہندوستان کی سرزمین میں پڑی، یہیں پھلی پھولی اور قدیم تا حال کثرت میں وحدت پیدا کرنے کا فریضہ بھی رہی۔ مگر اس کی خمیر ہندو اور مسلمان کے صدیوں سے آباد، باہمی ربط اور میل جول سے تیار ہوا اور اس کی اشاعت و آبیاری میں ملک کے تمام طبقوں نے بلا لحاظ مذہب و ملت، رنگ و نسل اور فکر و نظر کے اپنا تعاون دیا۔ چنانچہ ذہنی و علاقائی حد بندیوں سے بالاتر اس مخلصانہ خدمات نے اردو کو ایک مکمل زبان کا درجہ عطا کیا۔ جو وسیع و عریض ہندوستان کے تمام خطوں میں اور سبھی طبقوں کے لوگوں کے لئے ذریعۂ اظہار تھی۔ اور آج بھی یہ زبان بہ آسانی بولی اور سمجھی جاتی ہے اور اس کی ادبی حیثیت بھی مسلّم ہو چکی ہے اور اپنی ان ہی خصوصیات کے سبب دنیا کی دوسری ترقی یافتہ زبانوں کے مدمقابل کھڑا ہو سکنے کی پوری صلاحیت رکھتی ہے۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی اردو کی خصوصیات کے سلسلے میں رقم طراز ہیں۔

"ہندوستان کو سلطنتِ مغلیہ کی سب سے بڑی دین
تاج محل، غالب اور اردو زبان ہیں۔ اردو نہ صرف
ہندوستانی قومیت کے تقاضوں کی تکمیل کرتی ہے
بلکہ اس ملک کی دوسری زبانوں پر اس کو یہ فوقیت
حاصل ہے کہ یہ مشرق وسطیٰ سے تعلق رکھنے کی
وجہ سے ایشائی تہذیب کی نمائندہ زبان ہے۔"

بہرکیف یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ ہماری مشترکہ تہذیب کی تعمیر و تشکیل میں اردو کا بہت بڑا اور اہم حصہ رہا ہے۔

ہماری قومی تہذیب کی تعمیر و تشکیل میں اردو کے کردار کا پس منظر کا تعلق ہندوستان کی تاریخ ماضی سے بھی بہت گہرا رہا ہے۔ ہندوستان کی سرزمین زمانہ قدیم سے ہی تہذیب و ثقافت اور علم و ادب کا گہوارہ رہا ہے اور جغرافیائی لحاظ سے بھی یہ سرزمین دنیا کے تمام ملکوں اور خطوں میں منفرد، ممتاز اور شہرت یافتہ سمجھی جاتی رہی ہے

لہٰذا ہر دور میں دنیا کے مختلف اقوام خواہ حملہ آور کی صورت میں ہو یا گروہ در گروہ جتھے کی شکل میں یہاں آئے۔ ان میں دراوڑ، آریہ، مسلمان اور انگریز خاص طور پر قابلِ ذکر اقوام ہیں۔ جن کی آمد و رفت سے نہ صرف ہندوستانی زبان کا فروغ ہوا بلکہ یہاں کی تہذیب و تمدن، سیاست و معاشرت اور علم و ادب پر بھی گہرے اثرات مرتب ہوئے۔

دراوڑ ہندوستان میں آباد ہونے والی سب سے پہلی قوم تھی جو گروہوں اور قبیلوں کی صورت میں تقریباً ساڑھے تین ہزار سال قبل مسیح میں وارد ہوئی اور ان کی آمد کا سلسلہ بعد کے مختلف زمانوں تک جاری رہا۔ یہ قوم تہذیب و تمدن کے لحاظ سے کافی ترقی یافتہ تھی لہٰذا مشترکہ تہذیب کی بنیاد اسی قوم نے ڈالی جن کی نسل آج بھی ہندوستان کے جنوبی حصے میں آباد ہیں۔ [illegible] کنڑی، تلنگی، تامل، اور ملیالم زبانوں کا سرچشمہ اسی قوم کو سمجھا جاتا ہے اور دراوڑی تہذیب کے نمونے آج بھی پاکستان کے صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان میں ملتے ہیں۔ بقول سید [illegible] حسین:

اس کی تہذیب (دراوڑی تہذیب) نے اتنی ترقی کر لی تھی کہ دریائے سندھ کی وادی میں کئی ریاستیں بنالی تھیں۔ (دراوڑی تہذیب کا مسئلہ [illegible])

... حالانکہ میں آریہ آئے اور پورے ہندوستان [illegible] میں پھیل گئے۔ گو کہ مشترکہ تہذیب کی بنیاد دراوڑوں نے ڈالی تھی مگر آریائی زبان کو دراوڑی تہذیب کا [illegible] اور [illegible] [illegible] فروغ [illegible] ہے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد بھی بحیثیت تاجر، حملہ آور اور مبلغین کی صورت میں ہوا۔ ان میں یا سنتائے ہند، اکثریت نے اس سرزمین کو اپنا وطن بنایا۔ یہیں آباد ہوئے اور پیوندِ خاک بھی ہو گئے۔ اس لحاظ سے ہندوستان کی سرزمین صوفیا، ولی اللہ کا مسکن بھی ہے۔ جن کی [illegible] سے نہ صرف یہاں اسلام کی اشاعت ہوئی بلکہ انہوں نے اپنے حسنِ سلوک اور محبت و یگانگت سے انسانیت [illegible] کا جو کارنامہ انجام دیا وہ ہماری قومی یکجہتی کی تعمیر و تشکیل کا ابتدائی درجہ تھا اور انہوں نے اظہارِ بیان کے لئے جس زبان کا استعمال کیا وہ اردو فروغ میں پہلا قدم تھا۔ حملہ آور کی صورت میں مسلمان وارد ہوئے تو اس سرزمین میں جابجا اپنی خود مختار ریاستیں قائم کیں اور صدیوں حکومت کرتے رہے۔ متحدہ ہندوستان کا وجود مسلم بادشاہوں کے حکمتِ عملی کا نتیجہ تھا جو انگریزوں سے [illegible] ورثے میں ملا۔ ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش کے نام پر تین ٹکڑوں میں بٹ گیا۔ بہرحال مسلمانوں کا تہذیبی و لسانی رشتے کا سرچشمہ گرچہ عرب وسطی جو عربی و فارسی سے منسلک ہو گئے تھے [illegible] برِ صغیر مسلمانوں اور دیگر اقوام کے باہمی طور طریقے، رہن سہن، رسم و رواج، زبان و بیان اور علمی و ادبی [illegible] سماجی ذوق و ارتباط سے جو نئی زبان وجود میں آئی وہ اردو تھی اور جو نئی تہذیب پیدا ہوئی وہ خالص ہندوستانی تہذیب کہلائی۔ بقول تارا چند:

" مسلم ذہن ہندوانہ رنگ و روپ قبول کرنے لگا اور اس نے فارسی و ترکی کی جگہ مقامی زبانوں کو سیکھا اور استعمال شروع کیا۔ ہندوؤں نے عربی، فارسی اور ترکی الفاظ کو مقامی [illegible] جگہ دی۔ اس لین دین کا [illegible] [illegible]

خزانے میں "اردو زبان" کی شکل میں شامل ہوا۔
(ہندوستانی کلچر کا ارتقا۔ ڈاکٹر ستار احمد صفحہ ۴۲)

چنانچہ ہماری قومی یکجہتی کی تعمیر و تشکیل میں اردو زبان اور مشترکہ ہندوستانی تہذیب کا تعلق ایک دوسرے کے ساتھ چولی اور دامن کی طرح ہے۔ مسلم حکمرانوں کی سرپرستی میں اردو زبان کو پروان چڑھنے اور ترقی کرنے کا جو موقع فراہم ہوا اس سے اس زبان نے علم و فن، شعر و شاعری اور سنگیت و موسیقی میں نمایاں مقام پیدا کر لی اور آداب و گفتگو و زبان و تہذیب میں بڑی حد تک نکھار آ گئی۔ انگریز حکمرانوں نے اردو زبان کے فروغ و ارتقا میں جس طرح نمایاں کردار ادا کیا اور اسے نکھار نے سنوارنے میں اپنا تعاون دیا۔ کلکتہ کے فورٹ ولیم کالج اس کی زندہ مثال ہے۔ جس نے ہماری قومی یکجہتی کو کافی تقویت پہنچائی۔ دیگر زبانوں کے فنکاروں کی طرح اردو زبان کے شعراء اور ادیب نے بھی انگریزی جارحیت کے خلاف آواز بلند کیا۔ اور عوامی بیداری کی خدمات و باہمی یکجہتی کے ترانے بھی جوشِ جذبہ سے سنائے اس کی ایک مثال ملاحظہ ہو ؎

میں یکجہتی ہوں

قومی اتحاد و ایکتا کا پیکر رنگین
وطن ہندوستان، میرا
یہاں ہر اہل فن ہے ترجمان میرا
یہاں کا ہر بشر ہے پاسبان میرا
مجھے تاریخ نے خود اپنے ہاتھوں سے سنوارا ہے
عوامی قوتوں نے روپ کو میرے نکھارا ہے
(عروس یکجہتی۔ رفعت سروش)

اس نے ہماری یکجہتی کو مستحکم کیا اور جنگ آزادی کی لڑائی کی راہ بھی ہموار کی۔

آزادی کے بعد مختلف تنازعات یکے بعد دیگرے جس طرح پیدا ہوئے اس سے ہماری یکجہتی میں رخنے اور زبان کے مسئلے سے اردو زبان کے وجود کو بھی خطرہ ہو گیا۔ مگر سچ کو کیا آنچ اردو زبان اپنی گوناگوں اور خصوصیات کی بنا پر آج بھی زندہ و پائندہ ہے اور نوع بنوع زندگی و اتحاد کا آئینہ دار ہے اور بیرون کے ترقی یافتہ زبانوں کے مدمقابل کھڑا ہونے کی صلاحیت بھی رکھتی ہے۔



ارشد مسعود ہاشمی

چند نظمیں

ارشد مسعود ہاشمی نے مندرجہ ذیل منظومات روانہ کرتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ "چند نظمیں (بظاہر) ارسال کر رہا ہوں۔" گویا ان تخلیقات کو نظمیں کہتے ہوئے خود شاعر کو بھی تامل ہے۔ ہم خود بھی اس بحث میں پڑنا نہیں چاہتے، نہ اپنا فیصلہ کسی کے سر تھوپنا چاہتے ہیں۔ مگر ہم صرف یہ یاد دلانا چاہتے ہیں کہ تخلیق اور مروجہ تخلیقی ہیئت میں جنگ ہو تو تخلیق کی فتح ہوتی ہے۔ ہیئتیں تخلیق کے بعد ہی وجود میں آتی ہیں، اس لئے فنکار کو تخلیقی فارم پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ بچے کا نام اس کی پیدائش کے بعد ہی رکھا جاتا ہے۔ کسی عورت پر یہ شرط عائد نہیں کی جا سکتی کہ وہ کسی خاص جنس یا مخصوص خد و خال کی اولاد پیدا کرے۔ اس لئے فنکار کو ہیئتوں کی زنجیر پہنانا اس کی تخلیقی آزادی کو سلب کرنے کے مترادف ہے۔ اسے اس طرح باندھ کر جو فن پارے حاصل کئے جاتے ہیں ان کی عظمت یقیناً مشکوک ہو جاتی ہے۔

ذیل میں ارشد مسعود ہاشمی کے جو فن پارے پیش کئے جا رہے ہیں انہیں منظومات نہ بھی کہئے تو یہ تخلیقات ضرور ہیں۔ ان میں فن کار کا CREATIVE SOLITUDE اس امر کی نشاندہی کرتا ہے کہ وہ بھیڑ بھاڑ اور روش عام سے ہٹ کر اکیلے رہ کر فن پیش کرنے کی جرأت رکھتا ہے۔ عام طور پر یہ احساس ہوتا ہے کہ میں بولوں اور کوئی سننے والا نہ ہو یا ہو بھی تو کوئی سمجھنے والا نہ ہو ــــ تو ایسی صورت میں انسان گنگ ہو سکتا ہے۔ اس تاریکی میں بھی چراغ صدا کو روشن رکھنا حد درجہ جری لوگوں کا کام ہے۔ ارشد مسعود کو اس کی داد ملنی چاہئے۔

ان تخلیقات کی زیریں لہریں ذہن اور سنجیدہ قارئین پر کیا اثرات مرتسم کرتی ہیں اور ان کی رگِ احساس کو کہاں کہاں سے چھیڑتی ہیں، تاثرات سے بصیرت تک کی مسافت طے کرنے میں یہ کہاں تک مساوی ہوتی ہیں ــ یہ بات ہمارے قارئین بتائیں گے۔ (ادارہ)

دعا

میری ہڈیوں میں جمے گودے
سیال ہوا چاہتے ہیں
دعا گو ہیں کہ
میرے جسم کے اگلے اور پچھلے حصوں پر جمے
گوشت کے گرم لوتھڑوں کو
کوئی بھیڑیا اپنے نوکیلے دانتوں سے
ادھیڑ ڈالے
میں چاہتی ہوں کہ میرے ہونٹ
ایک بار پھر
گرم نال سے بہتی روح زندگی کا
عرق عرق چوس لیں
اب کہ جسم کی سلوٹوں میں
بستر کے شکن پیوست ہیں
میں چاہتی ہوں کہ کوئی ان سلوٹوں میں
مانند ہوتی ہوئی
آگ کی تپش کو محسوس کرے
اس سے جلے اور جلا پائے
میری بے نور آنکھیں
پھر کسی کے دل پر سیل تیزاب رواں کریں
میرے جسم میں چھپی بھنی کے دہانے سرد ہیں

ارشد مسعود ہاشمی

میں چاہتی ہوں کہ کسی دہکتی ہوئی سلاخ کا سر
اب بھی انہیں چوم کر جھوم لے
سہلانا چاہتی ہیں میری ہتھیلیاں
اس منبع حرارت کو
آج میں نے اپنے بستر کی چادر بدل لی ہے
ایک بار پھر بڑی مدتوں کے بعد
میرے ہاتھوں میں ایک قلم اور
چادر کے اندر وائبریٹر پڑا ہے
میری پیچ کی انگلی خون آلود بنی ہے اور چھپی
وی سی آر میں مرد اور عورت کی متحرک تصویریں
رسائل کے رنگین صفحات پر
نمایاں ہیں
میری جانگھوں میں خارش
اور ایک گھڑی میں
میرے ماضی کی لاش پڑی ہے ۔

مہنیات

شہر
تو احساس تا کیوں نہیں
تیرے بطن سے اب بھی
اناج کی سنہری بالیوں سے سنوری
آنسوؤں سے نم
سوندھی خوشبوؤں والی کئی پگڈنڈیاں
کتنی ہی مرجھائی ہوئی انکھیوں کو گرماتی ہیں
اور
رنڈیوں کی بل کھاتی زلفوں کی مانند تیری اندھی سڑکیں
سڑی پرانے، بوسیدہ خوابوں کی کرچیاں سہارتی ہیں
اور، جانتا ہے تو ؟
تیرے لالہ زاروں میں
سرخ عرق آلود چہروں
تھکی بانہوں کی ہتھیلیوں
اور بھنچی مٹھیوں نے
نہ جانے کتنے اجسام کی تخریب کی ہے
تو کون سا نام دے گا انہیں ؟ ۔

تازیانہ

ان سب نے
یکے بعد دیگرے
اپنے جسم کے ٹکڑے طاق پہ سنجو دیئے
ٹکڑے مل بیٹھے
دیواروں نے کان کھولے
سلاخوں کے پیچھے
کچھ اجنبی انکھیاں
ٹکڑوں میں اپنا جسم تلاشا کیں
لہو بہا کیا
دیواریں نم ہوئیں
جھکیں
ڈھے گئیں
تبھی
ٹکڑے اپنی شناخت کھو چکے
اور اپنے اجسام و اصنام کی جستجو لئے
طاقتوں پہ سر مارا کئے
اور
دور
کچھ مدفوق جوان چہرے کے جسم
ناف تلک زمیں میں سما گئے
چند آفاقی صورتیں نما ہوئیں
دیدے پھٹ گئے
اجسام تنے
ہتھیلیاں بھنچیں
اور کونپل سب مرجھایا کئے ۔

شاہِ ازل

(فیض کی روح سے معذرت کے ساتھ)

میں اپنے لہو کا ہر قطرہ
منسوب کرتا ہوں تجھ سے
تو،
جو آبلہ پا ہے، مجنوں ہے
تو،
جس کی ہتھیلی کی لکیروں پہ زخموں کے نقش ہیں
تو،
جو میرے وجود کا ایک حصہ ہے
تو،
جس نے اس کے ہر اشارے پر اپنا لہو بہانا فرض جانا ہے
جسے ہر لمحہ تیرے باغی ہو جانے کا خوف ستائے رکھتا ہے
آ، اس سے قبل کہ
شہ ظلمات اپنے چراغ کی لو تیز کرے
میری ہتھیلی کی شہ راہوں کے سنگ
شکست و ریخت کی دنیا سے دور ہو لے
میری زندگی کی سب کروٹیں منسوب ہیں تجھ سے
اور میری درخشندہ جبیں کی نمایاں شکن
اس وجود کے نام جسے
اپنے بکھر جانے کا احساس بھی نہ رہا
اور جس کے جسم پر میرے ہونٹوں کے پھولوں کی جگہ
شہ وقت کے غلاموں کے قمقموں کی لہریں ثبت ہیں
میں ان بوڑھی آنکھوں کے سب آنسو دیتا ہوں اسے
جس نے ازل سے لا رو کر آنسوؤں کی قدر بڑھا دی۔
آ، بزعم خود
مجھے اپنے بال و پر سے منسوب کر لے
کہ رقاص ہوں میں موت کا
اپنی ہزار باہوں کو پھیلا کر جب محوِ رقص ہوتا ہوں میں
زندگی موت کی دھنوں پر اپنا سر پیٹتی ہے

تناسل

بادلوں سے نرم و نم
گیلی مٹی کے تودے کی ہم شکل
تیری سپید و سیاہ چھاتیوں سے رستے سیال سے دنیا جلا پاتی ہے
ملوک و ملائکہ، اصحاب و بیگمات، غلمان و باندیاں
ان سب کی حسین، لہو سے رنگی بستی آباد ہے تیرے ہی دم سے
تیرے گداز سینے کے اندر تلاطم جو موجزن ہے سسکاریوں کا
وہ تقدیر ہے ان کی شکستہ ہستی کی
لیکن محبت
طائر امن کی مانند جو تیرے قلب یار سے سوئے منزل رواں ہوتی ہے
اسے ان کے ہی شکستہ وجود سے ملتا ہے نمود
اپنے سینے کو دبا کر آج تو ہنسا مت
اے کہ تو جو محض سڑے ہوئے گوشت کا بدبودار لوتھڑا ہے
تو ہنسا مت کہ ہنگام جفا سے ذہن سب کے مفلوج ہوئے ہیں
تمام راہیں جو مسعود ہیں، مسدود ہو چکی ہیں
ان پر تیری آنکھوں سے ٹپکے لہو کے قطرے جمے ہیں
تجھے لہو کے سوکھے قطروں کی قسم
تو اپنی پرواز بھول ان غلمان و باندیوں میں کھو جا
تو اصحاب و بیگمات کے ذلیل اذہان
کریہہ خد و خال، طلسم نگاہ کے دائروں سے نکل
تو ملوک و ملائکہ کے تاجوں میں جڑے نگینوں کو
اپنی کھردری انگلیوں سے مس کر دے
فرحت کی دیوی خوش ہوگی تجھ سے، آفتاب کی شعاعیں چومیں گی تجھے

ایک لمحہ ٹھیر، میں بتاتا ہوں تجھے
میں جتاتا ہوں تجھے، پرواز امن کیا ہوتی ہے، طائر امن کیا شئے ہے
تو اپنی کشادہ پیشانی پر ایک شکن لا
تاریکی کا غازہ چہرے پہ مل
مہ و انجم کی انجمن سے نکل، لہو کی بستی میں آوارہ پھر
لیکن میرے لئے تو تیری ہر حرکت فرسودہ ہوگی

تیری سپید و سیاہ چھاتیاں، جو
برگ خزاں کی مانند لرز جاتی ہیں اکھڑتی سانسوں میں الجھ کر
سکت نہیں ان میں مجھ پہ سایہ کرنے کی
میں کہ تارک وطن
میری سرخ چھاتیاں بگڑی ہوئی، ویران ہیں
اور میرا قدیم لہو ثمر خیز
تو لہرا محبت کا پرچم، ہواؤں سے بھی ہلکا ہو جو
جس کی لہریں ہوں میری پلکوں کی جنبش
تو ادوار و ساعتوں کی قید و بند سے نکل اپنے مثل ہوتے ہوئے اپنے بازو سے سہارا دے اسے
میں تیرے قدموں میں شبنم کے قطروں کی مانند بچھ جاؤں گا
آنے والی نسلوں کا دکھ
(جو تیرے تمام دکھوں پر حاوی ہے)
تبھی منتقل ہو سکے گا میرے قلب میں
تو محسوس کر، دوش پہ تیری ہی لاش لدی ہے
اور اونچائیوں پہ ٹمٹماتے ستارے خمیازہ ہوا چاہتے ہیں
شکست و ریخت کا شور خوابوں میں گونجتا ہے
کہ وہ اپنی سمندر کی گہرائیاں سماتی ہیں

بادلوں سے نرم و گرم
گھنی مٹی کے تودے کی سی شکل
اپنی سپید و سیاہ چھاتیوں کو تو سینے سے الگ کر کے ہاتھوں میں سنبھال
چھاتیوں کو سنبھالے ہاتھ اپنے ہزاروں سروں سے اونچا اٹھا
دم بھر اس پر نگاہ کر انسانیت سکون پائے گی
زمیں اپنی تنزل پائے، اس سے قبل رقص ہوئی تجھے دیکھ کانپنے لگی اک بار
برگ نم سے سارے آنسو جھڑ جائیں گے
فضائیں نغمہ زا، آسمان خندہ زن ہو جائے گا

رؤف خیر

آسماں کے نہ ہوئے اور زمیں کے نہ رہے
آج ہم تجھ سے بچھڑ کر تو کہیں کے نہ رہے

کون کہتا ہے کہ اصحاب یمیں کے نہ رہے
ہم وہ حر ہیں جو کبھی شمر لعیں کے نہ رہے

لوگ کیا سادہ ہیں [illegible] کہتے ہیں
بے نقاب [illegible] کے نہ رہے

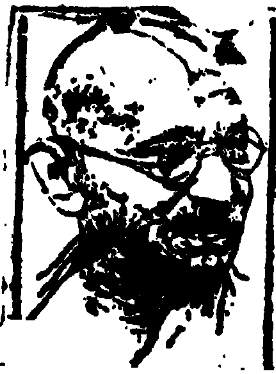
آسمانوں کی بلندی پہ نظر ہے اس کی
اب وہ انداز ترے خاک نشیں کے نہ رہے

نام لکھتے ہیں فقط پرکھوں کی دیواروں پر
خوش گماں ہیں وہ کچھ اتنے کہ کہیں کے نہ رہے

خیرہ وہ چہرے نقابیں ہیں انا کی جن پر
آئینے کے نہ رہے، آئینہ بیں کی نہ رہے

شفیع اللہ خاں راز

سنگ زادے جو گھروں سے نکلے
شیش محلوں سے لرزتے نکلے
[illegible] کی برکت سے
آسمانوں سے [illegible] نکلے
ہر طرف قاتلوں کے پہرے ہیں
کون اپنے مکان سے نکلے
[illegible]
[illegible]
[illegible] نہ ملا
وہ سرابوں کو ڈھونڈنے نکلا
دیکھئے کون اس زمانے میں
زلف دوراں سنوارنے نکلے
قاتلوں کی مراد بر آئی
خوب جی بھر کے حوصلے نکلے
لو اگلتے ہوئے مکانوں سے
رازؔ، لاشے جلے ہوئے نکلے



کل کی دنیا
باپو کی نظر میں



"آنے والے کل کی دنیا عدم تشدد پر مبنی ہوگی، ہونی بھی چاہیئے۔ یہ بنیادی اصول ہے باقی سب کچھ خود بخود ہوتا چلا جائے گا۔ شخص، جماعتوں اور قوموں سب کو عدم تشدد اور پیار محبت کا راستہ ہی اختیار کرنا پڑے گا۔

اگر ایسا ہوا تو آنے والے کل کی دنیا میں نہ غریبی ہوگی، نہ لڑائیاں ہوں گی، نہ انقلاب اور نہ ہی قتل و غارت ہوگا۔"

ترقی کے راستہ پر — امن کے ساتھ

غزل

راشد انور راشد

داستاں دل کی سرِ شام سناتا کیوں ہے
شاخ پہ بیٹھے پرندوں کو اڑاتا کیوں ہے
آگ کی جھیل میں تو موم کی کشتی لے کر
ناسمجھ روز ہی پیچھا میرا کرتا کیوں ہے
تیرا شاگرد نکل جائے نہ تجھ سے آگے
دل میں اس بات کا ڈر ہے تو بڑھاتا کیوں ہے
زلزلہ دیکھنا آجائے گا مجھ میں اک دن
ہو کے بے تاب مرا دل یوں تڑپتا کیوں ہے
تو نے ہی شوق سے ہمراز بنایا تھا مجھے
آج پھر مجھ سے ہر اک بات چھپاتا کیوں ہے
کل تو آزاد کرانے میں بہت آگے تھا
آج راشد کے لئے جال بچھاتا کیوں ہے

دل کی دنیا اور حسینوں کی رانی میں
فرق سمجھ نہ پایا کچھ نادانی میں
اک دن کی ہے بات کہ میں حیرانی میں
آتش بن کر کود گیا تھا پانی میں
سجدے ہزاروں کرتے جاتے ہیں لیکن
نور کہاں ہے لوگوں کی پیشانی میں
من کی موجیں اور کہاں مل پائیں گی
ڈھونڈو ان کو جذبوں کی طغیانی میں
ریشمیں خوابوں کی ناؤ پہ بیٹھ کے ہم
دیکھ رہے ہیں صورت اپنی پانی میں
تیری حفاظت کا ذمہ کیسے لے لوں
میں طعنیات ہوں خود اپنی نگرانی میں
مشکل مانی ہے راشد جب پہ ہنر کروں
دشواری پیش آئے کیوں آسانی میں

ہنس راج رہبرؔ

بلجیت

★ بلجیت کور اپنے گھر میں اپنے پریمی جگدیو کے بیاہ کا جشن منا رہی تھی۔ یہ ایک عجیب جشن تھا کیونکہ بلجیت اور جگدیو دونوں میں سے کوئی بھی خوش نہ تھا۔ کمرے میں بجلی کی روشنی تھی لیکن ان دونوں کے من بجھے ہوئے تھے ... اماوس کی رات کا گھپ اندھیرا تھا۔ بیاہ سے پہلے دونوں میں جو اعتماد، اخلاص اور رفاقت تھی اب ... میں اس کا یکسر فقدان تھا اور یہ فقدان ان کے لئے کوفت کا باعث بنا ہوا تھا۔ ہونٹوں پر جو مسکراہٹ تھی وہ اصلی نہیں نقلی تھی۔ ... میں ... شہد کی مکھی کے ڈنک سے پیدا ہوا درد تھا۔ لیکن وہ خوشی کی نمائش کر رہے تھے۔ عہد محبت کرتے وقت جو سپنے سنجوئے تھے اور چار سال میں خواب محل میں رنگ رلیاں مناتے ہوئے گزار رہے تھے۔ جگدیو کے بیاہ سے وہ سپنے بکھر گئے تھے اور خواب محل تاش کے پتوں سے بنے محل کی طرح ڈھ گیا تھا۔ دراصل یہ جشن نہیں پریم پرتگیا کی تباہی کا ماتم تھا۔ پھر بھی وہسکی، تلی ہوئی مچھلی، آملیٹ اور کاجو وغیرہ جگدیو کی من پسند چیزیں موجود تھیں۔ اور خوبصورت میز پوش پر سجا ہوا پھولوں کا گلدستہ ماتم کو جشن میں بدلنے کی کوشش تھا۔

بلجیت کور نے تیسرا پیگ بنا کر جگدیو کی طرف بڑھایا اور کہا "پیو، پیو، اپنی سہاگ رات کے نام پر پیو۔"

جگدیو نے ایک نظر پیگ پر ڈالی اور پھر ایک نظر بلجیت کی اور (आग्रह) دیکھا۔ وہ پیگ کی طرف ہاتھ نہیں بڑھا سکا۔ ایک ٹک بلجیت کور کی اور دیکھا۔ دیکھتا رہا۔ چند لمحے یوں ہی گزر گئے آخر دھیرے دھیرے گلاس اٹھایا اور ایک ہلکا سا گھونٹ بھر کر بولا ——

بلجیت ... م ... مجھے اس طرح م ... ت ستاؤ۔ ... ت ... ستاؤ۔ میرا دل شی ... شے ... کی ... ط ... ر ... ح نازک ہے۔ بیاہ ... م ... ... ری مجبوری ہے۔ بیا ... ہ ... ہ میں نے خوشی ... سے ... ن ... ہیں ... سما ... ج کے دباؤ سے کیا ہے۔ بہت ... ن ... پت ... ق ہوتی ہے۔ یہ ...

....میکا....نہیں....ہوتی۔ میں صرف....تم....
زرا ہوں۔ ہم....ہمیشہ....ت....مہارا....
ہوں گا....میں نے تم....ہیں اپنے....خ....ط.....
....لکھ دیا تھا کر بیا....ہ سے ہما....ر سے....
تم....ہارے پریم میں زرا بھی فر....ق نہیں آئے گا.....
ہ جیسا....پ....ہلے تھا۔ ویسا ہی....ر....ہے
م....ے....ری بات کو سچ جا....نو۔ اور میں
نے بیا....ہ کے....فو....راً بعد تم....ہارے پا....
..س آکر من با....ت کا....ث....بوت دیا تھا۔
....جیت....م....مجھے....مت....س....تاو..
..مت....س....تاؤ۔ تم....ہارے....طرح....نے
رے من کو چھے....دتے ہیں۔ بل....جیت.....
بے مت....بس....تاؤ۔"

جگدیو نے گلاس اٹھا کر دو لمبے لمبے گھونٹ ایک
ساتھ بھرے اور بلجیت کی اُور دیکھنے لگا۔

جگدیو تم اپنی پرچھائیں سے ڈر رہے ہو۔ شاید
ہارے اپنے من میں چور ہے۔ ورنہ مجھے تم سے کوئی شکایت
ہیں۔ کوئی گلہ نہیں۔ مجھے تمہارا خط پڑھ کر ہی تمہاری وفا
ہارے سچ کا یقین ہو گیا تھا۔ آدمی کو دنیا میں رہتے
ئے دنیا داری کا دھیان بھی رکھنا پڑتا ہے۔ بیاہ تمہارا
ہوری ہے مرضی نہیں اس سے ہماری محبت میں کوئی فرق
نہ آئے گا۔ آ ہی نہیں سکتا جتنی چتنی ہے وہ گھر میں داسی
کر رہے گی۔ اس بیاہ کی آڑ میں ہم تم پریم کی پتنگ
بھی اونچی بہت....چڑھائیں گے۔ دنیا کی آنکھوں
دھول جھونکیں گے۔ سماج اور برادری کا منہ چڑھائیں
جس طرح نئی نویلی دلہن کو گھر پہنچا کر تمہارا میرے
..انا تمہاری وفا کا ثبوت ہے۔ اسی طرح جشن کا

یہ سامان میرے وشواس کا ثبوت ہے۔ لو کھاؤ۔

بلجیت نے مچھلی کا ایک ٹکڑا اٹھا کر جگدیو کو
دیا اور ایک کا جو اپنے منہ میں ڈال کر دانتوں تلے چبا ڈالا۔

جگدیو کا چہرہ کھل اٹھا اور نشہ گہرا گیا۔ اسے
بلجیت بیاہ سے پہلے کی الہڑ اور شوخ دوشیزہ دکھائی
دی۔ مچھلی کھا کر گلاس میں جو شراب بچی تھی اسے گٹک
کر جھومتے ہوئے بولا۔

"بل....جیت....پیا....ری بلجیت کالج کی وہ
با....ت....ایک بار پھر....س....نا دو۔"

"کون سی بات"

"وہ....ہی....جب تم....تی تا....ن
کر چلتی تھیں تو امبو....لنس سا....تھ رہتی تھی تا....کہ
....تم....ہاری مسکرا....ہٹوں....سے گھا....ئل
ہونے....وا....لوں کو....فو....راً....ہسپتال
....پہنچا....یا جا....سکے۔" جگدیو نے خود ہی بات
دہرائی اور کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ ایک نظر بلجیت کی اور
دیکھا اور ایمبولنس....ایمبولنس کہتا ہنستا رہا۔

بلجیت نے یہ بات جگدیو کو کئی بار سنائی تھی۔ سن
کر جگدیو ہنستا تھا تو وہ بھی ہنستی تھی اور ہنستے ہنستے دونوں
خود رفتہ ہو جاتے تھے۔ لیکن آج یہ بات بلجیت کے بجائے
جگدیو نے خود سنائی اور خود ہی ہنستا رہا۔ بلجیت نے
ہنسی میں اس کا ساتھ نہیں دیا۔ وہ ہونٹ بھینچے چپ
بیٹھی رہی۔ اس سلسلے کی ایک دوسری بات اس
کے ذہن میں کوند لا گئی۔

وہ ہیم کنڈ کی جاترا پر گئی تھی۔ بوڑھے گوبند
گڑھ سے ہیم کنڈ گھوڑوں یا پالکیوں پر جاتے تھے۔
لیکن نوجوان لڑکے لڑکیاں ہنستے کھیلتے قدرت کے مناظر

سے لطف اندوز ہوتے ہوئے پیدل جاتے تھے۔ بلجیت کور بھی گوبند گھاٹ سے ہیم کنڈ تک پیدل گئی تھی۔ اور پیدل ہی لوٹی تھی۔ لوٹتے وقت راستے میں تیز بارش ہوئی اور پہاڑ کے ڈھلواں راستے میں پھسلن تھی۔ بلجیت کور اور اس کی عمر کا ایک نوجوان دوسرے جاتریوں سے آگے نکل آئے تھے۔ نوجوان کے پاس چھتری تھی۔ مینھ برسا تو وہ نوجوان اور بلجیت ایک پیڑ کے نیچے کھڑے ہوگئے۔ نوجوان جان بوجھ کر اس سے سٹ گیا اور مسکراتے ہوئے بولا۔

"میں نے تمہیں پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔"

"سپنے میں دیکھا ہوگا۔"

"ہاں! شاید سپنے میں۔ لیکن سپنے کی بات آج سچی ہوگئی۔" اس نے للچائی نظریں بلجیت کے چہرے پر گڑا دیں۔

"آخر تم چاہتے کیا ہو؟" بلجیت نے آنکھیں جھپکا کر پوچھا۔

"میں صرف تمہیں چاہتا ہوں اور کچھ نہیں۔"

"سچ؟" بلجیت نے گردن اٹھا کر خودداری کا اظہار کیا۔

"ہاں! جیسے اب ہم ایک ہی چھتری تلے ساتھ ساتھ کھڑے ہیں۔ میں چاہتا ہوں زندگی اسی طرح ایک ہی چھت کے تلے گزار دیں۔"

نوجوان نے کندھے ہلائے اور بلجیت کی کلائی پکڑ لی۔

"میری زندگی تیرے جیسے دل پھینک شہدوں کے ساتھ گزارنے کے لئے نہیں۔"

بلجیت کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ ہاتھ جھٹک کر کلائی گرفت سے آزاد کی اور ایسا زور کا دھکا دیا کہ نوجوان چھتری سمیت نیچے لڑھک گیا۔

بلجیت منہ میں بھیگتی ہوئی وہاں سے چلی۔ نہ راستے میں کہیں سستائی اور نہ پیچھے مڑ کر دیکھا۔ سیدھی دھام آپہنچی۔ صبح جب لنگر میں چائے بٹ رہی تھی، نوجوان بھی لاٹھی ٹیکتا اور لنگڑاتا ہوا آیا۔ بلجیت کو سامنے کھڑی دیکھ کر گردن جھکا لی۔ آنکھ ملانے کی جرأت نہیں ہوئی۔

بلجیت کور نے جگدیو کو یہ بات بھی کہی تھی اور پہلی بات کی اس بات پر بھی دونوں خوب ہنسے تھے۔ لیکن اب بلجیت کا من بجھا ہوا تھا۔ نہ کوئی بات سنائی اور نہ وہ ہنسی۔ اس کے اندر آندھی چل رہی تھی۔ یہ غصہ بیاہ کے متعلق سوچ کر پیدا ہوا تھا۔ اور پل پل تیز سے تیز تر ہو رہا تھا۔ جگدیو نے بلجیت کے گلے پر چھری پھیری تھی۔ اس نے اس کے گلے پر چھری پھیرنا طے کیا تھا۔ جیسے جال میں پھنسانے کے لئے دانہ دنکا ڈالا جاتا ہے۔ بلجیت نے جگدیو کو اپنی تجویز کے جال میں پھنسانے کے لئے جشن کا ناٹک رچا تھا۔

اس نے چوتھا پیگ بنا کر جگدیو کی طرف بڑھایا اور مسکراتے ہوئے کہا۔ "لو پیو۔ خوب پیو اپنے اعتماد کے نام پر پیو اور پھر اپنی کنول کی نال جیسی انگلیوں سے جلترنگ ساز بجاتے ہوئے مدھر تم پریم کی پینگ بڑھائیں گے۔"

سانپ جیسے بین پر جھومتا ہے۔ جگدیو مدھر سُر پر جھوم گیا اور گلاس اٹھا کر بولا۔

"پی... اوں... گا۔ ب... بلجیت... تو... پا... کو... نگا۔ جت... نی تم... پی... و... نگا... تم... ہاسے... ہاں... ملے میں... م... ... آتا ہے۔"

جگدیو نشے میں مست جھوم رہا تھا۔ گھونٹ گھونٹ
ہا تھا۔ اور نشہ گہراتا چلا جا رہا تھا۔ اس کی نظر میں
ہر چیز گھوم رہی تھی۔ در و دیوار گھوم رہے تھے۔ بوتل گھوم
تی اور بلجیت کا چہرہ گھوم رہا تھا جو کبھی چھت کی طرف
اٹھ رہا تھا اور کبھی چڑیا کی طرح پھریری لگاتا ہوا نیچے آ
تھا۔

بلجیت کنکھیوں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ دیکھتی
اور طنز و حقارت میں بھری من ہی من میں ہنستی رہی۔
یو بلاشبہ لمبا تگڑا بانکا جوان تھا۔ بلجیت نے اس
ساتھ محبت اور جاں نثاری کے چار برس گزارے تھے۔
ار برس زندگی کے سب سے سنہرے برس تھے۔ ہنسی
اور قہقہوں کے برس تھے۔ دل کھول کر کی گئی چھوٹی
ی باتیں بھی کتنی دلکش اور دلفریب ہوتی تھیں۔ ان کی
ب بھی کانوں میں رس گھولتی جان پڑتی تھی۔ محبت میں
چھپاؤ کی کوئی گنجائش نہیں۔ پریمی ایک دوسرے کی
ح کے کونے کونے میں جھانک کر دیکھتے اور ایک من
ایک جان ہو جاتے ہیں۔ ایک بار اتوار کے دن بلجیت
جگدیو بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ بلجیت کے ہاتھ میں
ر تھا۔ پہلے ہی صفحے پر ایک خبر پڑھ کر بلجیت یکایک
ملا اٹھی اور چہرے کا رنگ بدل گیا۔ اس نے نہ
اخبار پرے پھینک دیا بلکہ پیر دیٹ اٹھا کر یوں
نکا کہ پرچ پیالے ٹوٹ گئے۔ اور چائے بکھر گئی۔
حرکت وہ دو تین دفعہ پہلے بھی کر چکی تھی۔ جگدیو
پنی پتلون اور بشرٹ پر گری چائے رومال سے صاف
ہوئے کہا تھا۔ "تم ایسا کیوں کرتی ہو بلجیت ؟
یا کس بات کا ڈر ہے ؟ کس بات کا غم ہے ؟
بلجیت شانت اور ساکت بیٹھی تھی۔ پرچ پیالے
ٹوٹ جانے اور چائے بکھر جانے کا اسے ذرا بھی احساس
نہیں تھا۔ چند لمحے خاموشی سے گزرے۔ سورج کی ایک
کرن روشندان سے اندر آ رہی ہے جس میں دھول کے
ذرے ناچ رہے تھے۔ وہ ان کی اور (گھورتی) دیکھتے
ہوئے بولی۔ "میں کسی سے نہیں ڈرتی جگدیو۔ میں نہیں
ڈرتی۔ میرے دل میں غم نہیں نفرت ہے۔ گہری نفرت چھل
فریب سے نفرت۔ مکاری اور خباثت سے ... ت میں
زندگی کو صاف ستھرا دیکھنا چاہتی ہوں۔ کمینگی اور کم
ظرفی کی کسی بھی حرکت سے میری یہ نفرت جھنجھلا اٹھتی ہے
اور میں آپے سے باہر ہو جاتی ہوں۔"

بلجیت کور نے اخبار جگدیو کی طرف بڑھا دیا۔
اور وہ جس خبر کو پڑھ کر جھنجھلا اٹھی تھی اس پر انگلی
ٹیک دی۔

جگدیو نے خبر پڑھی کسی بڑے نیتا نے ہوائی جہاز
میں سفر کرتے ہوئے شراب پی کر ائیر ہوسٹس سے چھیڑ
چھاڑ کی۔ جب ہوسٹس نے اسے پھٹکارا تو نیتا نے الٹا
اسے بیسوا اور بدچلن کہا۔

"ایسے ایسے نیتا بنے ہوں تو سوچو دیش کا کیا
بنے گا ؟"

جگدیو سے بلجیت کی پہلی ملاقات ایک ادبی محفل
میں ہوئی تھی جس میں مشہور ادیب سوم پرکاش کے تازہ
ترین ناول پر بحث ہوئی تھی
ناول کا موضوع تاریخ کا وہ عہد تھا جب سکھ گورو بلے
جنگلوں اور پہاڑوں میں چھپ کر مغلیہ سلطنت کے خلاف
لڑ رہے تھے۔ سو سو سکھوں کو پکڑ کر لاہور لایا جاتا
تھا اور انہیں نخاس چوک میں کھڑے کر کے دھرم بدلنے کو
کہا جاتا تھا۔ نہ بدلیں تو موت۔ لیکن کسی بھی سکھ نے دھرم بدلا

نہیں بدلا۔ وہ واہ گرو جی کا خالصہ واہ گرو جی کی فتح کا نعرہ لگاتے ہوئے شہید ہو جاتے تھے۔

جگدیو نے بحث میں حصہ لیتے ہوئے کہا تھا "ناول کی خوبی یہ ہے کہ اس میں جو فرضی واقعات اور فرضی کردار ہیں وہ بھی فرضی محسوس نہیں ہوتے۔ حقیقی اور جاندار ہیں ان کے ذریعہ ہم اس وقت کی عوامی زندگی اور کلچر سے روشناس ہوتے ہیں۔ اور روایت سے جڑ کر ایثار اور شجاعت کا سبق لیتے ہیں۔"

جگدیو کی بات بلجیت کے من لگی اس نے تاریخ میں ایم۔ اے کیا تھا اور کالج کی بی۔ اے کلاسوں کو تاریخ پڑھاتی تھی۔ تاریخ کے اس عہد سے وہ خاص طور پر متاثر تھی۔

دھرم بدلنے کا مطلب تھا قوت ارادی سے محروم کرنا۔ قوت ارادی نہ ہو تو انسان کا رہ ہی کیا جاتا ہے۔ پیٹ کے لیے رینگ کر جینا بھی کوئی جینا ہے" بلجیت نے اس فقرے پر خاص زور دیا۔ جگدیو کی اور دیکھا اور بات جاری رکھی "آپ نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ فرضی کردار بھی تاریخی کرداروں کی طرح گرو رشکھیا کے اس جذبے سے سرشار ہیں۔"

وہ جگدیو کی اور دیکھ کر مسکرائی اور دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں۔

اس دن سے جگدیو کا بلجیت کے یہاں آنا جانا شروع ہوا۔ وہ کالج میں پڑھاتی تھی۔ چنڈی گڑھ کے پندرہ نمبر سکٹر میں دو کمرے کا مکان کرایہ پہ لے رکھا تھا۔ اور اس میں اکیلی رہتی تھی۔

"اکیلے رہنا تمہیں ناگوار نہیں گذرتا" جب واقفیت گہری ہوئی تو جگدیو نے ایک دن بلجیت سے پوچھا۔

"گذرتا ہے" بلجیت نے مختصراً جواب دیا۔ چند لمحے خاموشی کے گذرے اس نے گھنی لانبی پلکیں اٹھا کر جگدیو کو دیکھا اور پھر مضبوط لہجے میں بولی۔ "اکیلے نہ میرا آدرش ہے نہ سنکلپ بلکہ مجبوری ہے۔ چھچھلے کو ساتھی بنانے سے تو اکیلا رہنا ہی اچھا ہے۔"

جگدیو پہلا شخص تھا جس سے بلجیت نے دل کی بات کہی اور رستا ہوا گھاؤ دکھایا۔ جگدیو گمبھیر ہو گیا اور دیر چپ بیٹھا ٹھوڑی کھجلاتا سوچتا رہا۔ اور پھر تحمل انداز میں کہا۔ میں نے کسی رسالے میں آئنسٹائن کا قول پڑھا تھا کہ دنیا میں سچے دل والے وفادوست سے بہتر کوئی دوسری چیز نہیں۔ مجھے اس دن سے ایسے ساتھی کی تلاش ہے۔ لاؤ ہاتھ ملاؤ ہم نے ایک دوست کو پالیا ہے۔"

بلجیت نے جھٹ ہاتھ جگدیو کی طرف بڑھا دیا۔ دونوں میں عہد محبت قرار پایا۔

جس دن پریچ پیارے لوٹنے والی واردات ہوئی بلجیت نے پھر اپنے دل کی بات کہی اور رستا ہوا گھاؤ دکھایا۔ "جس شخص سے میری شادی ہوئی تھی اسے میں اتنا جانتی تھی کہ وہ شکل وصورت سے اچھا ہے اور ایک جانے مانے نیتا کا بیٹا ہے" بلجیت نے لوٹنے ہوئے پریچ پیارے کی طرف دیکھا اور سپریٹ [illegible] ہتھیلیوں سے بھینچتے ہوئے بات جاری رکھی "کارتی، نولکھی ستی، زندگی کے تمام تکلفات تھے اور سماج میں عزت تھی۔" بلجیت اور ایک لمبی سانس بھر کر لہجہ بدل کر کہا۔ "لیکن دور کے ڈھول سہانے نزدیک آکر پول کھلی۔ عزت کی آڑ میں کوٹھیاں اور سیروں کی اسمگلنگ کا دھندا چلتا تھا۔ چھپانے کے لئے پولس آفیسروں اور سیاسی لیڈروں کو لڑکیاں مہیا کی جاتی تھیں۔ اس غلاظت بھرے ما

میں میرا دم گھٹنے لگا اور میں رشتہ تڑا کر بھاگ آئی۔ تب سے اسی فلیٹ میں زندگی گزار رہی ہوں۔"

ان چار برسوں میں عہد محبت کی سالگرہ یوں منائی جاتی تھی کہ بلجیت پیگ بنا کر دیتی اور جگدیو پی پی کر بہکتا۔ بلجیت پیار اور محبت میں سرشار اٹھتی اور شوخ دوشیزہ بن کر دل کی بات کہتی اور جگدیو گھاؤں پر ہونٹ رکھ کر ان کا درد چوس لیتا۔

لیکن آج وہ گھاؤ رس رہے تھے، دکھ رہے تھے۔ جگدیو انہیں دیکھنے اور درد چوس لینے کا حق کھو چکا تھا۔ بلجیت کو اس کی شکل تک دیکھنا گوارا نہ تھی۔ اسے یہ افسوس ہو رہا تھا کہ کیسے من کے وفادار ساتھی کا دم بھرنے والے دھوکی کے سامنے دل کھول کر اپنے زخم دکھائے۔ آج اس کی نظر میں جگدیو بھی تسکری کا دھندہ کرنے والے ہی کی طرح ذلیل و حقیر تھا۔

"ب... ل... جیت... پیا... ری۔ جگدیو چیختا ہوا سسک کر لڑکھڑایا ہوا اٹھا اور بلجیت کے گلے میں باہیں ڈالنے کے لئے جھکا لیکن بلجیت نے اپنے پرے دھکیل دیا۔ وہ اوندھے منہ فرش پر جا گرا۔ وہ کچھ دیر ٹوٹے پھوٹے بے جوڑ الفاظ منہ سے نکالتا رہا۔ پھر ایک کروٹ لی۔ ٹانگیں پھیلا دیں اور ایک طرف لڑھک گیا۔

بلجیت اپنے اندر نفرت اور غصے کی آندھی کو دبائے، چپ بیٹھی اس کی طرف دیکھ رہی تھی، دیکھتی رہی۔ پھر یکایک اٹھی اور لمبے لمبے ڈگ بھرتی ہوئی دوسرے کمرے میں گئی اور الماری سے وہ چھرا نکال لائی جو وہ پچھلی دفعہ وقت خرید لائی تھی۔

"لے، یہ تیری محبوبہ کا تحفہ، یہ گھر میں بیٹھی بیٹھی چھالی کھانے والی باندی کا تحفہ اور یہ جھوٹ اور پاکھنڈ میں جینے والے سماج کا تحفہ..." بلجیت کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔ وہ چنڈی تھی وار پر وار کر رہی تھی۔

چھرا تیز تھا۔ ٹانگیں، باہیں، سر کٹ کر دھڑ سے الگ ہو گئے۔ بلجیت نے ان کٹے ہوئے اعضا کو اٹھا کر ایک کونے میں پھینک دیا۔ پانی کی چار پانچ بالٹیاں انڈیل کر فرش کو دھویا۔ صابون سے ہاتھ صاف کئے۔ کپڑے بدلے اور دلہن کی طرح سج کر پلنگ پر لیٹ گئی۔ اب وہ خوش تھی۔ نہایت خوش۔ خوشی کے علاوہ کوئی جذبہ دل میں نہیں تھا۔

تھوڑی دیر میں دستک ہوئی۔ اٹھ کر دروازہ کھولا۔ جگدیو کا بڑا بھائی سچدیو سامنے کھڑا تھا۔

"کیا جگدیو یہاں آیا تھا؟" اس نے پوچھا

"ہاں آیا تھا۔"

"کہاں ہے"

بلجیت منہ سے کچھ نہیں بولی۔ ہاتھ سے کٹی ہوئی لاش کی طرف اشارہ کر دیا۔

(بقیہ۔ کارگہ شیشہ گری)

اس کا کاروبار شیشے کی طرح نازک ہے۔ ایک ذرا ٹھیس لگی اور شیشہ ختم۔ اس طرح ایک معمولی سی چوک یا بے احتیاطی سے دنیا کا سارا کام بگڑ جاتا ہے۔ لے سانس بھی آہستہ کا مطلب ہے یہاں پھونک پھونک کر قدم رکھنے کی ضرورت ہے۔ اور شیشہ گری سے مراد یہاں شیشے کی صنعت نہیں صرف شیشہ یا آئینہ ہے جس کی نزاکت محتاج بیان نہیں۔ شیشے کی جگہ شیشہ گری کے لفظ کا استعمال میر نے محض قافیہ کی رعایت سے کیا ہے

رانگ نمبر

شفیقہ فرحت

ٹون ۔ ٹرن ۔ ٹرن ۔ ٹرن

ہلو

• تم آئے نہیں۔ ہم صبح سے انتظار کر رہے ہیں۔"

ابھی ہم اس جبر سے پوری طرح مسرور بھی نہیں ہو پائے تھے کہ کبھی ہمارا انتظار ہو رہا ہے اور وہ بھی صبح سے کہ پھر ادھر سے ایک نیز بلبلی اطلاع ہوا۔

• کتو نے دن بھر بہت ستایا۔ ہم نے اس کی بہت پٹائی کی۔"

• ہائے بیچاری کتو۔" بے اختیار ہماری زبان سے نکلا۔ اور تب شاید انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوا۔

" سوری — رانگ نمبر" کہہ کے سلسلہ منقطع کر دیا اور ہم کتو کی حالت زار پر تڑپنے کے لئے اکیلے رہ گئے۔ کاش پس منظر سے کوئی درد بھرا ریکارڈ چیخ پڑا۔

ہم رہ گئے اکیلے

سو اکیلے ہی اکیلے ہم دن میں کیشن کی طرح کتو کے بارے میں سوچتے رہے۔ ہر کیشن کی طرح ہمیں ظلم و ستم کی وارداتوں سے قطعی دلچسپی نہ تھی۔ ہم صرف یہ جاننا چاہتے تھے کہ آخر کتو ہیں کون؟ کیونکہ ہم بفضل ربی مہذب ہوتے جا رہے ہیں تب سے جانور اور انسان کے درمیان غیریت کے پردے جا رہے ہیں!

ہمارے پڑوس میں ایک اونچے درجے کے ا... رہا کرتے تھے جن کے یہاں یہ دو نام دن بھر لئے

• جوتی — پریتی —"

خیال ہوا کہ ان کی دو لڑکیاں ہیں۔ بعد راز کھلا کر لڑکی تو صرف ایک ہے۔ جوتی — او لاڈلی کتیا کا اسم گرامی ہے۔

دو سال وہ اس مکان میں رہے۔ ہم تو محلہ کبھی جوتی اور پریتی میں تفریق نہ کر سکا۔ کبھی کو پریتی — کبھی پریتی کو جوتی۔

تو پھر کون جانے یہ کتو —؟

ٹرن — ٹرن — پھر گھنٹی بجی

• بھیا لال پوسٹ مین کو بلا دینا ذرا۔"

یہاں کوئی بھیا لال ۔ چاچا لال نہیں ہے ۔ ہم نے جھنجھلا کے جواب دیا ۔

" نہیں ہے — مگر وہ تو ہم کو یہی نمبر دیا ہے "

" دیا ہوگا ۔"

" کیا بدلی ہو گئی ۔"

" نہیں بھاگ گیا ۔"

" کیا کہا — بھاگ گیا — کب

" کل "

" غضب ہو گیا — ہم سے پانچسو روپیہ لیا تھا ۔ ہم تو تھانے میں رپٹ کرتے ہیں جا کے ۔"

" ہاں ہاں ۔ کر لینا ۔ مگر پہلے ٹھیک نمبر پہ فون تو کر لو ۔"

" سوری ! "

ٹرن — ٹرن —

ہلو

دیکھئے جی ۔ وہ بنٹی آپ کے گھر آئی تھی ۔ اس کو جلدی بھجوا دیجئے ۔

اندھیرا ہو رہا ہے "

" بنٹی یہاں نہیں ہے ۔"

کیسے نہیں ہے جی ۔ آپ کی بیلی تو ساتھ لے گئی ہے ۔ میں تو جی ۔ بھیج نہیں رہی تھی ۔ پر وہ ضد کرنے لگ پڑی ۔ کہ انٹی جی بھیج دو ۔ میں خود پہنچا جاؤں گی لیے میں اپنی لڑکی کو کہیں نہیں بھیجتی ۔

" مگر یہاں تو بیلی بھی نہیں ۔"

ہائے رام ۔ بیلی گھر نہیں آئی ۔ پھر کہاں لے گئی میری لڑکی کو ۔ میری بنٹی تو بڑی سیدھی ہے ۔ ذرا اپنی بٹیا کو سنبھال کے رکھئے ۔ کسی دن خاندان کی ناک کٹوائے گی ۔"

" خاندان کی ناک کی طرف سے تو آپ بے فکر رہئے ۔ جب میری کوئی لڑکی ہی نہیں تو ناک کیسے کٹ سکتی ہے

کیا کہا جی ۔ بیلی آپ کی بیٹی نہیں ۔

" نہیں "

" تو کیا آپ مسز آہوجہ نہیں ۔"

" اجی مسز آہوجہ تو کیا میں مس آہوجہ بھی نہیں ۔"

" سوری بہن جی ۔ سوری ۔ رانگ نمبر ۔"

یہ تو ہیں ٹیلیفون کے رانگ نمبر ۔ جو موت کی طرح برحق ہیں اور موت ہی کی طرح جن کے آنے کا کوئی وقت مقرر نہیں ۔ اور جن سے نجات حاصل کرنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ آپ ٹیلیفون کٹوا دیں ۔ مگر زندگی میں اور بھی بہت سے نمبر ہیں جو موقع بے موقع رانگ ہو جاتے ہیں ۔ اور جن کا علاج دادا لقمان تک کو ڈھونڈنے کا خیال نہیں آیا ۔ بات یہ کہ ان کا نمبر بھی رانگ ہو گیا ہو ۔

سٹے اور مٹکے اور صراحی مرتبان کی بات چھوڑیئے کہ یہ تو نمبری ہیں ۔ نمبر تو لگے گا ہی ۔ رائٹ یا رانگ — رائٹ لگ گیا تو دسوں انگلیاں ڈالڈا میں ۔ رانگ لگ گیا تو سر کڑھائی میں تیراکی کے ناکام نمونے دکھاتا پھرے گا —!!

امتحانوں کے موسم میں رائٹ اور رانگ کا بازار معمول اور ضرورت سے کچھ زیادہ ہی گرم رہتا ہے ۔ جن پرچوں میں امداد غیبی حاصل ہو جائے وہاں تو لگ گیا رائٹ نمبر ۔ اور جہاں فقط نام اللہ کا ۔ وہ رانگ نمبر ۔ طلبا اور طالبات مع متعلقین سال کے اس چوتھائی حصے میں اس رانگ نمبر کو صفحۂ امتحان اور کرۂ شہر سے مٹانے کی کوشش میں جٹے رہتے ہیں ۔

مگر — کوششوں کے تیر بھی تو جا کے رانگ نمبروں پر لگ سکتے ہیں !!

طلبا کا کیا ہے۔ دو چار ہڑتالیں کریں گے۔ دس بیس نعرے لگائیں گے۔ آپ ہی سارے نمبر صحیح ہو جائیں گے۔ اور نہ ہوتے تو کیا — دو چار سال کالج کی بہاریں اور لوٹ لیں گے۔ مگر یہ اہل حرفہ — یہ خرد و کلاں بزنس مین؛ ان کی روداد غم اور داستان ستم نہ پوچھئے۔ نمبر صحیح لگتے جائیں تو اوپر والے بھی خوش اور نیچے والے بھی — اور جو کہیں بھی ذرا سی بھول چوک سے ایک آدھ نمبر غلط لگ گیا یا کوئی رانگ نمبر کی طرح کا ناعاقبت اندیش افسر اپنی اور ان کی بدقسمتی سے نازل ہو گیا تو پھر سارے دھندے اندھا دھند چھوڑ کمنڈل ہاتھ میں لے گاتے بجاتے OVER SEAS جاتے ہی بنے گی۔

مملکت عشق بھی کچھ ان نمبروں کے ٹونے ٹوٹکے سے محفوظ نہیں۔ حضرت 'ا' 'ب' صاحبہ کے عشق میں دن رات سگریٹ کے دھوئیں کی آہیں بھر رہے ہیں۔ اور 'ب' صاحبہ مسٹر یمان 'س' کی یاد میں ساری ساری رات مثنوی زہر عشق منظوم۔ تحت میں پڑھ پڑھ کر اہل محلہ کو چور ڈاکوؤں سے محفوظ رکھتی ہیں۔ اور جناب 'س' مثنوی زہر عشق اور قہر عشق پر انگریزی فلموں کو ترجیح دیتے ہیں۔ کہ ان میں عشق کی مقدار مثنوی سے کہیں زیادہ ہے۔

ہیں نا سارے نمبر رانگ — ؟

مگر خیر — فکر کی کوئی بات نہیں — عشق کی دنیا میں بھی بڑی تیزی سے سماج سدھار کا کار یہ ہو رہا ہے۔ ذرا صبر اور جبر سے کام لیجئے۔ سارے بگڑے کام بن جائیں گے۔ اور سب کی آشائیں مع ابھیلاشاؤں کے پوری ہوں گی۔ اور سارے رانگ نمبروں پہ رائٹ کا نشان لگ جائے گا۔ اگر حضرت 'ا' اسی مستقل مزاجی سے سگریٹ پی پی کر دھواں 'ب' کماری کے منہ پر چھوڑتے رہے تو وہ ایک دن مسٹر 'س' پر لعنت بھیج کر اسی دھوئیں کو اپنے نتھنوں میں inhale کرنے لگیں گی۔ اور جناب 'س' بھی اپنے Standard کو ذرا نیچا کر کے کسی ہندوستانی ایکسٹرا پر سمجھوتہ کر لیں گی۔

عشق کے امتحانوں اور ستاروں سے آگے والے جہانوں میں بھی نمبروں کا سکہ چلتا ہے۔ اور بڑے دھوم دھڑکے سے چلتا ہے۔ صحیح نمبر لگ گیا تو خانہ آبادی ورنہ خانہ بربادی۔

ایک والدہ صاحبہ اپنے گلفام کے لئے کہ جو قطعی گلفام نہ تھے کسی سبز پری کی تلاش میں تھیں۔ اسی تلاش و جستجو کے چکر میں وہ شہر میں ہونے والی ہر تقریب میں پہنچ جاتیں۔ حالانکہ ان میں سے اکثر میں وہ مدعو بھی نہ ہوتیں۔ ایسی ہی ایک محفل میں انہیں 'شئے مطلوبہ' نظر آئی۔ انکھوں سے اشارہ کر کے پاس بیٹھی ہوئی خاتون سے لڑکی کا نام پتہ دریافت کیا۔ حسب نسب سن کر تو تلاش کنندہ کے پہلے ہوش اڑے پھر ہاتھ پاؤں خوشی سے پھولے۔ لڑکی بڑے افسر۔۔۔۔

محفل ادھوری چھوڑ وہ تو ہانپتی کانپتی گھر پہنچیں۔ صاحبزادے اور صاحبزادے کے والد ماجد کو داستان دستیاب ہونے۔ ایک پری Cum شہزادی کی سنائی گھریلو کیبنیٹ کی ایمرجنسی میٹنگ بلائی گئی اور دوسرے دن بڑی رازداری سے پیام دے دیا گیا۔ جو فوراً منظور ہو گیا۔ اور چٹ منگنی پٹ بیاہ۔

اب جو دولہے میاں بصد ارمان گھونگھٹ

الٹے ہی تو ایک کالی بھجنگ چڑیل کو دیکھ کر ڈر کے مارے
گھگھی بندھ گئی اور رنج کے مارے بے ہوش ہو گئے۔

پتہ یہ چلا کہ محفل مذکورہ میں آپ اس حسینہ
کے پہلو سے لگی بیٹھی تھیں۔ اب خدا جانے اشارہ کرنے
والی انگلی کا زاویہ غلط تھا یا دیکھنے والی نگاہ کا۔
بہر حال نمبر تو رانگ ہو گیا۔

خیر اسے آپ حادثہ کہہ لیجئے۔ بڑے رحم والا مگر
حقیقت یہ ہے کہ دیر سویر ہر شادی رانگ نمبر ہی ثابت
ہوتی ہے۔

اور شادی ہی کیا۔ بعضوں کا تو وجود ہی رانگ
نمبر لگتا ہے۔ ہمارے ایک ہمدم دیرینہ گو کہ اس دور
سے تعلق رکھتے تھے جب کہ والدین صرف اپنی اور خدا کی
مرضی کے پابند تھے۔ پھر بھی ان کا وجود ایک بھیانک رانگ
نمبر ہے۔ داستان تولد ہونے جناب کی یہ تھی کہ والدہ صاحبہ
طاق عدد کو مبارک خیال کرتے ہوئے گیارہ کے بعد فل
سٹاپ لگانے کے جشن کر رہی تھیں۔ نمبر رانگ لگا
اور آپ والدین کی مرضی کے خلاف محض خدا کی رضا کے
سہارے تشریف لے آئے اور ساری عمر رانگ نمبر ہی
کی طرح زندگی بسر کرتے رہے۔ کچھ الجھے الجھے، کچھ پریشان
پریشان۔ اپنے آپ سے خفا۔ سارے زمانے سے بیزار۔
اور ہر لمحہ ایک نئی اور مہلک بیماری میں گرفتار۔

ایک اور صاحبہ ہیں جو سرتاپا ہی نہیں بلکہ بالوں
کے آٹھ انچی مینارے سے لے کر سینڈل کی چھ انچی نوک
تک رانگ نمبر دکھائی دیتی ہیں۔ ناک نقشہ رنگ سب اچھا
خاصہ رہا ہوگا اور یقیناً اب بھی اچھا ہوگا۔ مگر کیا کریں
انہیں برسوں سے اصلی حالت میں دیکھنے کی سعادت نصیب
نہیں ہوئی اور بھلا ۱/۲ انچ موٹی پاؤڈر کی تہہ دار ایک
انچ کی روز کی تہہ سے کوئی چہرہ دیکھا اور جانا پہچانا
جا سکتا ہے۔ ؟ ہاں کبھی کھودائی ہو تو آرکیالاجی والے
بڑی اعلیٰ درجہ کی چیزیں حاصل کر سکتے ہیں۔

بالوں میں اگر آٹھویں دسویں دن کنگھی ہو جایا
کرے تو وہ بلاشبہ لمبے اور چمکیلے کہلائے جا سکیں۔
مگر وہ تو مہینے کے مہینے جب سر دھلتا ہے تب ہی دو چار
ہاتھ کنگھی کے پھیر لیتی ہیں۔ اگر بالوں کی ڈرائی کلینک
کا کوئی طریقہ ایجاد ہو جائے تو یقین ہے وہ برسوں سر
نہ دھوئیں۔ سر میں اب بھی اچھا خاصہ بیا کا گھونسلہ بن
چکا ہے جس میں سوتے میں چڑیا دو ایک بار انڈے بھی
دے چکی ہے۔

کپڑے قیمتی پہنیں گی مگر نہایت بے ڈھنگے۔ کہ
رنگ کی ساڑی، کسی رنگ کا بلاؤز، کہیں سے ادھڑا
کہیں سے پھٹا۔ کہیں سیفٹی پن سے کام چلا لیا کہیں آل
سے۔ بلکہ ہمیں تو ڈر ہے کہ آپ مستقبل قریب میں کہیں
گوند کی امداد حاصل کرنا نہ شروع کر دیں۔

دفتر وہ کبھی ٹھیک وقت پر نہیں پہنچ پاتیں۔ ہر
روز غلط بس میں بیٹھیں گی یا غلط اسٹاپ پر اتریں
ہر روز آفس میں کوئی نہ کوئی غلط فائیل نکالیں گی
صحیح فائیل پہ غلط نوٹ لگا کے غلط آدمی کے پاس
بھیج دیں گی۔ اور گھر میں کھانا ٹھیک طرح سے ان سے
آج تک نہیں پک سکا۔ کبھی جلا دیا۔ کبھی کچا رکھ دیا۔
کوئی چیز ابال دی، کوئی گرا دی کوئی پھینک دی۔

روایت ہے کہ غلط کام کرنے والا باتیں صحیح بناتا
ہے۔ مگر ان کے خالق سے یہاں بھی چوک ہو گئی۔ حالانکہ
باتیں بنانے کی ان کی قوت وصلاحیت میں کسی قسم کی
Personality نہیں ہی گو صرف ان کی انفرادیت

ہے کہ وہ غلط بات کو صحیح وقت پر اور صحیح بات غلط وقت پر کہہ کے اپنی جادوگری کے تماشے دکھاتی ہیں اور خود بھی تماشا بن جاتی ہیں۔ اور ان جملہ اوصاف کے نتیجے میں یوسف بے کارواں کی طرح آج تک اکیلی پھر رہی ہیں۔

ایک اور ایسی ہستی بھی ہمارے حلقۂ ارادت میں شامل ہے جو نہ صرف دوستوں کے دوست ہیں بلکہ دشمنوں کو بھی اپنا دوست سمجھتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ دوسرے بالخصوص دشمن، دوستی کی اس تعریف اور آل راؤنڈری سے اتفاق نہ کریں۔ غرض یہ کہ دوستی کو ٹیڑ لوکال کے ساتھ سنبھالنے میں آپ کا ثانی اس عالم فانی میں تو ملنے سے رہا۔ دولت تو خیر ویسے بھی آنی جانی ہے۔ دفتر سے ان کے پاس آئی اور ان کے پاس سے اوروں کے پاس گئی۔ البتہ جان ہے۔ سو وہ لبقدر ضرورت اور لبقدر ظرف اپنے پرایوں پر نثار ہوتی رہتی ہے۔

یہی ایک حماقت آپ میں ہوتی تب بھی صبر کر لیا جاتا مگر آپ تو خیر سے ایسی ہی حماقتوں کا چلتا پھرتا کوآپریٹو بینک ہیں۔ خوشامد کا فن آپ کو آئے نہ رشوت لینے دینے کا آرٹ۔ نہ سیاہ کو سفید اور نہ سفید کو سیاہ بنانے کی جادوگری سے آپ واقف۔ نہ باتیں بنانے کا سلیقہ نہ دنیاداری کا۔ پھر بھی آج نی ماڈرن۔ کیوٹ اور نازک سی دنیا میں آپ کہیں فٹ ہو سکتے ہیں ——؟

تو پھر رانگ نمبر ہی ہوئے نا۔

چلتے چلتے ذرا راگ درباری سرکاری کے بھی سُر ملا لیں۔ مگر سرکاری دربار کچھ ہم سے الگ تو ہے نہیں۔ یہاں کا حال بھی اتنا ہی گفتنی ناگفتنی ہے۔ کیا ایوان ریاست۔ کیا ایوان سیاست۔

جو نمبر ہے سو رانگ

——

قارئین کے لئے

ماہنامہ سہیل کی دو اہم پیش کش

فن اور فکر و نظر کے ناقابل فراموش،

★ مشرف عالم ذوقی کا ناول ۔ مسلما[ن]

★ پریم چند کے سلسلے میں اصغر علی ا[نجینئر]

— کا نیا زاویہ مطالعہ —

● جنوری ۱۹۹۲ کے شمارے سے ہر قسطوں میں ملاحظہ کیجئے

ادار[ہ]

بقیہ نئی کتابوں کا تعاد[ف]

اکتاہٹ محسوس کی جائے۔ بہترین طباعت قیمت ... حسب ذیل پتوں سے دستیاب۔

(۱) مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ اردو بازار جامع مسجد دہلی ۶

(۲) " " " پرنس بلڈنگ جی آر روڈ بمبئی

(۳) " " " یونیورسٹی مارکیٹ علی گڑھ

(۴) موڈرن پبلشنگ ہاؤس گولا مارکیٹ دریا گنج،

غمزہ بغمزہ کا جاذب نگاہ بے فلیپ پر شمس الرحمٰن ... تاثرات ہیں جن سے اس مجموعہ کلام کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ امید ہے کہ جناب شوخ کی اس کاوش کو ... میں قدر کی نگاہوں سے دیکھا جائے گا۔

نئی کتابوں کا تعارف

تبصرہ کے لئے کتابوں کی دو جلدیں آنا لازمی ہے

نام کتاب : غمزہ غمزہ
صنف :- شاعری + فنکار :- آر۔ پی۔ شوخ
ضخامت :- + قیمت :- پچاس روپے
پتہ :- مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی
مبصر :- اسلم حنیف

آر۔ پی۔ شوخ۔ ایم۔ این۔ کالج شاہ آباد۔ مارکنڈہ (ہریانہ) میں انگریزی ادب کے استاد ہیں لیکن ان کا ذہن اردو زبان و ادب کی خدمت کے لئے ناقابل شکست جذبات سے معمور ہے۔ موصوف کا مجموعۂ کلام غمزہ غمزہ کے عنوان سے ۸۸ء میں چھپ کر منظر عام پر آچکا ہے۔ ایک سو بیتالیس صفحات کو محیط اس مجموعۂ کلام کی اشاعت میں کسی بھی اردو اکاڈمی یا کمیٹی کا مالی تعاون شامل نہیں ہے اس سے ان کے غیر معمولی ادبی شغف کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

شوخ صاحب نے اپنے جذبات، خیالات، افکار و تجربات کی ترسیل کے لئے غزل کو اہم وسیلہ کے طور پر قبول کیا ہے۔ اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ دیگر اصناف شعری کے مقابل غزل ان کی محبوب ترین صنف ہے۔ اگرچہ شوخ صاحب کی غزل کلاسیکی انداز فکر کی حامل ہے مگر اسلوب کے انفرادی جوہروں نے اسے وہ شان امتیاز عطا کی ہے جو جدید غزل کے خصوص میں شامل ہے۔

وہ تو اک خواب ہے اور خواب بھی ریشم ریشم
نیند آجائے تو وہ نیند کو مخمل کر دے

آج تو آنکھ میں آنسو بھی نہیں
کاٹ دی کس نے یہ نہر او پہ سے

وہ چھوڑ گیا راہ میں یہ اس کی رضا تھی
ویسے بھی کسی پاؤں کا زنجیر نہ تھا میں

باہر چہرہ تھا پھاگن کی ہنستی مسکاتی دھوپ
اندر اندر ہوتی رہی برسات بچھڑنے کی

جو لوگ روایت میں درایت کے بجائے بغاوت کے تصور پیش کرتے ہیں ان کی فنی تخلیقات قابل اعتبار نہیں ہو سکتیں۔ اگرچہ ادب تغیر پزیر ہوتا ہے لیکن اس کی مخصوص اصناف کے تقاضے ممکن تغیرات کو ہی راہ دینے کی گنجائش رکھتے ہیں خاص طور پر غزل کا مسئلہ دیگر اردو اصناف شعری کے مقابل زیادہ پیچیدہ اور کافی حد تک نازک ہے اس لئے اس میں اجتہاد بے معنی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ چھوٹے بڑے مصرعوں کی

آزاد غزل کی ناکامی کے اسباب بھی یہی ہیں۔ شوخ صاحب اس سلسلے میں بہت محتاط رہے ہیں۔ انہوں نے روایت و جدت کے متوازن انضمام سے اپنی شعری کائنات کو جلا بخشی ہے۔

نرم ہواجب پاس سے گذری برگد نے ماری پھنکار
اندھیارے میں جو رسنہ تھا کنڈلی مار کے بیٹھا تھا
آتی جاتی روشنیاں کرتی تھیں اس کا سینہ چاک
ریل کا پل تھا رہ رہ کر وہ دھاڑیں مار کے روتا تھا

موجودہ دور کے سامان عیش و طرب اور دیگر وسائل حیات کے مطالعے کے بعد اس خوشگوار حقیقت کا اعتراف ضروری ہے کہ عصری انسان ترقی کے جس منہاج پر گامزن ہے انسانی تاریخ میں ایسا اہم موڑ کبھی نہیں آیا لیکن بات یہیں ختم نہیں ہوتی اس کے خلاف یہ اقرار بھی لازم و ملزوم ہو جاتا ہے کہ آج کی طرح گذشتہ ادوار میں حیات انسانی کسی بھی مقام پر اتنی منتشر اور خائف نہیں رہی۔ سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقی نے بہت کچھ دینے کے باوجود روحانی سکون و آشتی کو چھین لیا ہے۔ روحانی انخلا ہی آج کی تیز رفتار زندگی کا سب سے بڑا المیہ ہے۔ اس المیہ کو ہر فنکار نے اپنے اپنے طریقے پر اجاگر کرنے کی سعی ہے۔ شوخ صاحب کے یہ اشعار اسی جہت کی تلاش کا نتیجہ ہیں۔

بے رنگ جاں کو بچاؤں تو بچاؤں کیسے
سانس چلتی ہے تو تلوار لگے ہے وہ کیں

ایک گرتے ہوئے ایواں کا بھروسہ کیا ہے
بس اسی خوف سے وہ شخص نہ ٹھہرا مجھ میں

ہم تو ہر لمحہ کو دیتے رہے سانسوں کا حساب
ہم پہ ٹوٹا ہے ہر اک لمحہ قیامت کی طرح

آزادیٔ ملک کے بعد ملک کے وقار کو ٹھیس پہنچانے کے لئے مفاد پرست عناصر نے طبقاتی کشمکش کو استحکام بخشا ہے۔ جس سے معاشرتی نظام اور فرد کی فردیت کو زبردست نقصان پہنچا ہے۔ سلسلہ اب بھی جاری ہے اور اس کے اختتام کی کوئی راہ ابھی تک ہموار نہیں ہو سکی ہے جس سے عہد سے پیدا ہونے والے باطنی خلاء پر یہ عمل مستزاد سے کم نہیں۔ ہندوستانی فنکاروں نے ان انسان سوز واقعات کو کہیں براہ راست اور کہیں بالواسطہ صورت میں فن کا جز بنایا ہے۔ شوخ ان حساس شاعروں کی صف سے جدا فنکار نہیں ہیں۔ انہیں اپنے وطن کی اس تباہی کا گہرا احساس ہے۔ اتحاد کی قدیم روایات کو مسخ کرنے والی قوتوں سے شدید اختلاف ہے اس لئے وہ اپنی صدائے احتجاج کو روک نہیں سکے ہیں۔

یہ جن کے منہ کو لگا ہے اب آدمی کا لہو
یہی وہ لوگ تھے کرتے تھے جو خدا کی تلاش

دوستوں سے مل رہا ہوں صبح خنداں کی طرح
اور دل میں رو رہی ہے زرد مدھم چاندنی

اس لوٹ مار میں میری آنکھیں تو چھوڑ دو
اتنا تو ہو کہ مجھ کو اندھیرا دکھائی دے

سمجھے ہو مجھ کو دکھ کا شناور تو سچ کہوں
پانی پہ لاش ہے یہ مری تیرتی ہوئی

لوگ ملتے تھے بہم، فاصلے تنے تو نہ تھے
تنگ دل تھا نہ کبھی اتنا جہانِ مذہب

شوخ صاحب کی غزل کا مطالعہ متنوع تجربات کا نقیب ہے۔ غزل کے نگار خانے میں انہوں نے جو شمع روشن کی ہے اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ زبان و محاورے میں ان کے ذاتی تصرفات سے البتہ مجھے اختلاف ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ اجتہاد غزل کی فضا کو اتنا بوجھل نہیں ہونے دیتا کہ ان کے مجموعے کے مطالعے کے دوران

شہر خیال

افسانوں میں سید احمد قادری اچھے لگے۔ کرامت علی کرامت کا انٹرویو پڑھ کران کی عظمت کا قائل ہونا پڑا۔ جاں نثار اختر پر قیصر عثمانی کا مضمون دل کو چھو گیا۔ ایک فنکار کی ڈھیر ساری چیزیں شائع کرنے کا سلسلہ پسند آیا۔ اسے ضرور جاری رکھئے۔

● راشد انور راشد، رانچی

○ آپ کا خط ملا اور سہیل بھی۔ اس سے قبل قیصر عثمانی
نمبر مل چکا ہے۔ شکر گذار ہوں۔

سہیل (جلد ۱۵) کے نمود میں اس بار ادب کی پہچان میں تبدیلیوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ صاحب نمود نے لکھا ہے۔ "صحیح اور سچی ترقی پسندی اسی میں ہے کہ ادب کو زندگی سے ہمکنار کرتے ہوئے زندگی کی سمت و رفتار کا انعکاس ادب میں بھی تلاش کیا جائے۔" صحیح اور سچی ترقی پسندی کی یہ تعریف نئی نہیں ہے۔ وقت نے ثابت کر دیا کہ جس فکر و خیال کا رشتہ انسانی فطرت سے نہ ملتا ہو اس کا انجام سوائے پژمردگی اور ندامت کے اور کچھ نہیں۔

مشرف عالم ذوقی اردو افسانے میں اپنا مقام بنا رہے ہیں اور مزید بلندیوں کی طرف مائل ہیں۔

ہاں، ایک شاعر کی مختلف تخلیقات کا سلسلہ اچھا ہے۔ اسے جاری رکھئے لیکن صرف شعراء ہی نہیں، افسانہ نگار و مضمون نگار کو بھی اس کالم میں شریک کیجئے۔

● عطا عابدی، دہلی

○ سہیل کا تازہ شمارہ نظر نواز ہوا شکریہ
ویسے سبھی شمارے سہیل کے غیر معمولی فکر انگیز ہوتے ہیں لیکن زیر نظر شمارہ نہایت وقیع ہے اور اس کو وقیع بنایا ہے علیم اللہ حالی صاحب۔ لائق مطالعہ مقالہ "ہم مسافر جہاں جہاں پہونچے" جو خیر سگالی موضوع پر اہل نظر کو دعوت فکر دیتا ہے۔ اس کے ساتھ قیصر عثمانی صاحب کا جاں نثار اختر کے تعلق سے یادوں کے آئینے میں، اختر صاحب کی پہلو دار اور تہہ دار شخصیت کو اجاگر کرتا ہے۔ کاش کے اس کے فکر و فن سماجی، سیاسی اور ادبی شعور پر بھی توجہ دی جاتی تو مزید مضمون بہتر ہو جاتا۔ اس طرح ڈاکٹر کرامت علی کرامت صاحب سے اظہر نیر صاحب کی ملاقات اور چبھتے ہوئے اور کارآمد سوالات اور کرامت صاحب کا محتاط اور نپے تلے جوابات قارئین کی دلچسپی کا سبب ہیں۔ اور خصوصیت سے آپ کا اداریہ ارتقائی ادب کی پہچان آج کے ادیب اور دانشور کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔ گوشہ فردوس گیاوی میں فردوس صاحب کا سماجی، عصری، سیاسی اور ادبی شعور سمجھنے اور پرکھنے بڑا معاون ہے۔ جس پر آئندہ تبادلہ خیال ہوگا۔ اس طرح پورا پرچہ کی ترتیب و تہذیب آپ کی گہری بصیرت نمایاں ہے۔ مبارکباد قبول کریں۔

● عبد المتین نیاز، بھوپال

○ سہیل کا تازہ شمارہ دستیاب ہوا۔ معیاری تخلیقات کی اہمیت نے ضخامت کی کمی کا احساس نہیں ہونے دیا —

○ آپ جن نامساعد حالات میں سہیل کو زندہ رکھے ہوئے ہیں یہ آپ کا کارنامہ ہے اور کار ثواب بھی۔ ثواب اس لئے کہ آپ کے بزرگوں کی روح کو خوشی حاصل ہوتی ہوگی کہ ان کے روشن کردہ چراغ کو آپ نے بچائے رکھا ہے۔

● منظر شہاب، جبلپور

○ آج سہیل موصول ہوا۔ یاد آوری کا شکریہ۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ آپ "سہیل" کو روز بروز خوب سے خوب تر بناتے جا رہے ہیں۔ خدا کرے کہ آپ کی محنت راس آجائے۔

● راز اعظمی، گورکھپور

○ سہیل مئی مواد، کتابت و طباعت کے لحاظ سے کافی پسند آیا۔ علیم اللہ حالی، قیصر عثمانی اور اظہر نیّر کے مضامین و ملاقات دلچسپ اور معلوماتی ہیں۔

فردوس گیاوی میرا دوست ہے۔ کیا اس کی نمائندہ تخلیقات پیش کی گئی ہیں؟ ایسی جلدی بھی کیا تھی؟ فردوس کے مندرجہ ذیل اشعار نظر ثانی کے محتاج ہیں ؎

وہ شخص تڑپا نہ چلایا اور مر بھی گیا
پتہ چلا نہیں کب وار کر گئی ہے ہوا

کس طرف جائیں ہم کہاں ڈھونڈیں
کہیں تیرا نشاں نہیں ملتا

چلو فردوس اس جگہ سے چلو
کچھ سکون اب یہاں نہیں ملتا

لوگ تیری ہنسی اڑائیں گے
دل کی باتیں کہا نہیں کرنا

پیاس لب پر لئے گزر جانا
تشنگی کا گلہ نہیں کرنا

ابھی نہ چھیڑ خدارا خموش رہنے دے
پڑا جو وقت تو لے زندگی سزا دوں گا

مندرجہ بالا شعر تو بالکل مہمل معلوم ہوتا ہے

دیکھا جو غور سے تو وہ جھونکا ہوا کا تھا
تم خود ہی جسم سے آئی ہو ایسا لگا مجھے

ایک مشہور و معروف شعر ملاحظہ کیجئے ؎

انداز ہوبہو تری آواز پا کا تھا
گھر سے نکل کے دیکھا تو جھونکا ہوا کا تھا

"زیبا کے نام" جیسی نظموں کا زمانہ کب کا لد چکا شاید مندرجہ ذیل مصرعے کتابت کی نذر ہو گئے ہیں۔

کھنچ گئی جب لکیر دوری کی
تم بھی اسے وفا نہیں کرنا

کاتب نے نعمان شوق کے اتنے عمدہ شعر کا ختنہ کردیا

کیسے کیسے دریا دیکھ رہے ہیں ان ہونٹوں کا خواب
اس کی پیاس کا رشتہ کب جنگل گھر سے آئے گا

معروف عالم ذوقی نے اچھی کہانی دی ہے۔ کنول کی غزل پڑھ کر ہنسی آگئی۔

● منیر سیفی، پٹنہ

بانی :۔ حافظ محمد عبد الرحمٰن بسمل شمسہاروی ● بیادگار :۔ زین العابدین احمر وادریس شمسہاروی

ماہنامہ سُہیل گیا

شمارہ ۱۱ جلد ۱۵

بدل اشتراک

- فی شمارہ .... ۴/= روپے
- زر سالانہ .... ۴۰/= روپے
- لائف ممبری .... ۵۵۱/= روپے

فہرست

نمود ———— ۵
بادہ کہن ملوک چند محروم ۶
مغلیہ تہذیب کا عروج و زوال ۔ ڈاکٹر تاراچرن رستوگی ۷
مولانا ابو الکلام آزاد... تعلیمات ۔ سید شہاب الدین دسنوی ۱۳
ہم مسافر جہاں جہاں گزرے ۔ ڈاکٹر علیم اللہ حالی ۲۰
غزلیں ۔ شباب للت ۲۵
غزلیں ۔ ضیاء الانجم، پرکاش تیواری ۲۶
غزلیں ۔ علیم صبا نویدی ۲۷
غزلیں ۔ فرحت قہری، فراغ روہوی ۲۸
غزلیں ۔ مقبول منظر، قسیم سہرامی ۲۹
خوراک ———— جوگندر پال ۳۰
جنٹلمین (تمل کہانی) جی ترولوں
(ترجمہ۔ شعیب احمد کاف مرحوم) ۳۳
نئی کتابوں کا تعارف ———— ۳۶
شہرِ خیال ———— ۳۹

▲ خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ ▲

ماہنامہ سُہیل
ریلوے سائڈ روڈ، گیا۔ ۸۲۳۰۰۱
فون نمبر ۲۱۵۷۳

کالا آزار

آپ اسے پھیلنے سے روک سکتے ہیں

بالو مکھی اس مرض کی جراثیم بردار ہوتی ہے۔ گیلی اور نمی والی جگہوں، گھر کی دیواروں کے شگاف یا سوراخوں، گوبر کے ڈھیر یا جیسے کوڑا کرکٹ پر انڈے دیتی ہے اور اپنی نسل بڑھاتی ہے۔

• علاج •

کالا آزار ہونے کا خدشہ ہوتے ہی مریض کو قریبی اسپتال یا ہیلتھ سنٹروں میں ڈاکٹروں کی صلاح کے مطابق علاج کرانا چاہئے۔

اگر جانچ کرنے پر کالا آزار نکلے تو اس کا بروقت پورا علاج کرنا چاہئے۔ کم سے کم ۲۰ سوئی ضرور لگوائیں لگاتار — سرکاری اسپتال اور ہیلتھ سنٹروں میں مفت علاج ہوتا ہے — ڈی۔ ڈی ٹی کا چھڑکاؤ گھروں اور گوہالوں میں ضرور کرائیں۔

سال میں دو بار فروری، مارچ اور مئی جون میں ڈی ڈی ٹی کا ۵ فیصد محلول چھڑکاؤ کے لئے استعمال میں لائیں اس کیلئے تین پاؤنڈ ڈی ڈی ٹی (۵۰ فیصد) پاؤڈر کے تین گیلن پانی میں محلول تیار کریں۔

روک تھام

(۱) گھر کو صاف ستھرا رکھیں (۲) گھر میں حتی الامکان روشنی داخل ہو (۳) زمین پر نہیں سو کر، چوکی یا کھاٹ پر سوئیں۔ (۴) ننگے جسم نہ رہیں (۵) رات کو باریک مچھردانی کا استعمال کریں (۶) گھر کے آس پاس پانی کا جماؤ نہیں ہونے دیں (۷) سونے والے گھر سے گوہال کو دور رکھیں (۸) گھر کے آس پاس گوبر کا ڈھیر جمع نہیں کریں (۹) سرسوں تیل سے بنائے گئے چکنے لوشن کا رات میں استعمال کرنے سے بھی اس مرض سے آپ کی حفاظت ہو سکتی ہے

۵ پہچانیں ۵

مرض کی علامت

- رک رک کر تیز بخار آنا۔ بخار کسی بھی قسم کا ہو سکتا ہے
- کمزوری محسوس کرنا
- جسم میں خون کی کمی ہونا
- جسم کا وزن گھٹنا
- بھوک میں کمی ہونا
- تلی (اسپلین) اور جگر (لیور) کا بڑھنا
- پیٹ کا بڑھ جانا
- پرانے مریضوں کے ہاتھ پاؤں اور چہرے کے چمڑے کا کالا پڑ جانا۔

کالا آزار لاعلاج نہیں۔ وقت پر مناسب علاج سے یہ مرض پوری طرح ٹھیک ہو سکتا ہے۔

جاری کردہ:- محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ بہار — PR-111 ??? (0 97) 91-92

بیل گیا

نمود

کل کا ہندوستان

★ ہندوستان میں آج کیا ہو رہا ہے — پورے منظرنامے کو سامنے رکھا جائے تو آنے والے کل کی تصویر بھی بن جاتی ہے۔ سیاسی بحران، گرانی، زراندوزی، چوربازاری، رشوت ستانی، استحصال، فرقہ پرستی، اقتصادی طبقہ واری، ذات پات، کشمیر، پنجاب، آسام، جھارکھنڈ، لوٹ مار، غنڈہ گردی، پولیس انتظامیہ کی جانب داری یہ اور ایسے بیسیوں امراض ہیں جو اس ملک کو تیزی کے ساتھ کمزور کرتے جا رہے ہیں۔ کیا مرکزی حکومت ان کے تدارک کے لئے کچھ کر رہی ہے یا صرف یہ اقتدار کی مدت میں توسیع سے ہی دلچسپی رکھتی ہے؟

ہمیں یہ سمجھ لینا چاہئے کہ ہمارے ملک کی سالمیت کی حفاظت کے فیصلے کی گھڑی بس یہی ہے۔ اقتداری جماعت کو چاہئے کہ وہ اب اس روش کو بدل کے دو مختلف نظریات کی پارٹی بازی سے حمایت کرے۔ اسے سخت رویہ اپنانا ہوگا اور یہ طے کرنا ہوگا کہ ہندوستان کی حفاظت اور سالمیت کے لئے کون سا قدم اٹھانا ہے۔ یہ طے ہو جائے تو نظریات پر سختی سے عمل کرتے ہوئے پوری شدت کے ساتھ فسطائیت اور ملک دشمن عناصر کو زیر کرنا ہوگا۔ اس کام میں تھوڑی سی غفلت اور مصلحت پسندی اب ہمیں ایک تاریک تر دور میں پہنچا دے گی۔

[ادارہ]

تلوک چند محروم

بادۂ کہن

(۱)

ارماں سمٹ کے دیدۂ بسمل میں آ گئے
بارے کبھی تو منظرِ قاتل میں آ گئے
"نے مژدۂ وصال نہ نظّارہ جمال"
دل سے گئے ہے کب جو کبھو دل میں آ گئے
احساس کمتری سے ہیں شاید یہ سرنگوں
خورشید و ماہ کس کے مقابل میں آ گئے
ساحل نے بڑھ کے غرق سفینے کو کر دیا
سمجھے تھے ہم کہ دامنِ ساحل میں آ گئے
نکلیں گے، جیسے چاند گہن سے نکل پڑے
انوارِ حق جو سایۂ باطل میں آ گئے
آوارگانِ دشتِ بلا پر بھی ایک نظر
چشمِ امید لے کے جو محفل میں آ گئے
محروم اب تو جاگیے غفلت کی نیند سے
ایامِ زیست آخری منزل میں آ گئے

(۲)

نہ سوز و ساز کے پیری میں چھیڑ افسانے
سحر ہے، شمع کہاں اب، کہاں ہیں پروانے
بگڑ گئے ہیں وہ نقشے، بدل گیا عالم
اُجڑ گئے ہیں خیالات کے پری خانے
خزاں فسردگی کس کی ہے، کوئی کیا سمجھے
بہار کس کا تبسم ہے، کوئی کیا جانے
خرد پناہ اسیر امید و یاس رہے
نجات پا گئے ان الجھنوں سے دیوانے
بہت عزیز تھے غربت کے سبزہ زار و دشت
جنوں نواز وہ اپنے وطن کے ویرانے
جو دل کی بات زباں تک نہ آئے تو اچھا
کہ اس سے اپنے بھی اکثر ہوئے ہیں بیگانے
دیارِ غیر ہو محروم یا وطن اپنا
وہی ہے دوست ہمارا جو ہم کو پہچانے

تارا چرن رستوگی
پیرو باری، گوپال

مغلیہ تہذیب کا عروج و زوال

استفہامیہ و تجزیہ

مغلیہ سلطنت کا آغاز بھی ہوا اور سلطنت زوال پذیر ہو کر اختتام کو بھی پہنچ گئی۔ مگر مغلیہ تہذیب چونکہ اساسًا ہندوستانی تہذیب ہے عروج و زوال دونوں سے نا آشنا ہی سمجھی جائے گی۔ مغلیہ تہذیب کا استعادیاتی جائزہ لینے کے پیش تر تہذیب و ثقافت کے مشتملات پر روشنی ڈالنا غالبًا بے محل نہ ہوگا۔ تاریخ تمدن ہند میں پروفیسر محمد مجیب مرحوم نے درج ذیل تشریح کی ہے:

"تمدن یا تہذیب کے معنی ہیں انسان کا اپنی ذہنی اور اخلاقی قوتوں کو ترتیب دینا اور انہیں کام میں لانا، جماعتوں کی تہذیب، افراد کی محنت، صلاحیت، ذوق یا فکر کی پیدا کی ہوئی چیزوں کا مجموعہ ہوتی ہے..... قدریں داخلی ہوتی ہیں اور خارجی۔ ان کا علم، ان کی استعداد، ان کے حوصلے اور وہ اصول جن کے مطابق ان کے باہمی تعلقات متعین ہوتے ہیں داخلی ہیں..... تاریخ انسانیت کی عقل نہیں ہے، صرف اس کی آنکھ ہے، جس میں یہ صفت ہے کہ وہ اسی چیز کو نہیں دیکھتی جو کہ موجود ہو بلکہ جستجو اور تحقیق، قیاس اور تخیل کا سرمہ لگا کر ایسی دوربین ہو جاتی ہے کہ موت اور نیستی کا بھاری آنچل بھی اس سے کچھ چھپا نہیں سکتا......"

تہذیب و تمدن کی بنیاد امن و آشتی کے بغیر نہیں ڈالی جا سکتی۔ دیکھئے پانچ ہزار سال قبل مسیح کے دوران قلم بند کئے گئے اتھرو وید ATHARVA VEDA. میں پرتھوی شوکتم PRITHIVI SUKTAM کو عالمی رومن رسم الخط میں ملاحظہ فرمائیں:

"JANAM BIBHARATI AHUDHA VAVACHSA NANA DHARM-
-ANAM PRATHIVI YA THAUKASAM SAHA[illegible]SRAM D[illegible]ARA

DRAVINSYA ME SARVA DHARMA SAMRAMA BH DUHAM DHRUVEVA DHENU ANADPASPHURANTI-" (12-1-45)

یعنی : • یہ دنیا ایک گھر ہے جس میں مختلف زبانیں بولنے والے افراد رہتے ہیں ان کے مفادات و افکار علاحدہ ہو سکتے ہیں۔ لیکن وہ اسی گھر کی گائے کے دودھ سے پرورش پاتے ہوئے دنیا میں دولت و صلح کل کے نورانی چشمے نکالتے رہتے ہیں۔

مغلیہ سلطنت کی تاریخ پر غائر مطالعہ کرنے پر ترغیبات بھی حاصل ہوتی ہیں اور تنبیہات بھی۔ مغلیہ سلطنت کی ہندوستانی سماجیات کی تاریخ بھی ہے تاریخ سے متعلق گوئٹے کا یہ مشورہ کتنا صالح اور سود مند ہے کہ:

تاریخ کو وقت وقت پر از سر نو لکھا جانا چاہیے۔ صرف اسی لئے نہیں کہ نئے واقعات دریافت ہوتے رہتے ہیں بلکہ اس لئے بھی کہ کچھ ایسے پہلو جو اس زمانے کو ترقی پذیر کرنے میں شریک و سہیم ہوئے ہماری نظر کے سامنے آتے رہتے ہیں۔ الغرض نو بنو مطالعہ نئے نئے نقطہ ہائے نظر بھی فراہم کرتا رہتا ہے ایسے نقطہ ہائے نظر جو عہد گذشتہ کا صحیح تجزیہ کرنے کے لئے رہنما اصول بھی فراہم کرتے ہیں۔

جادوناتھ سرکار نے اپنی معروف تصنیف MOGHAL ADMINISTRTION میں تحریر کیا ہے

THE TWO HUNDRED YEARS OF MUGHAL RULE GAVE TO THE WHOLE OF INDIA AND TO MUCH OF THE DECCAN ALSO ONENESS OF OFFICIAL LANGUAGE ADMINISTRATIVE SYSTEM AND COINAGE AND ALSO A POPULAR LINGUA FRANCA FOR THE CLASSES EXCEPT THE HINDU PRIESTS AND THE STATIONARY VILLAGE FOLK EVEN OUTSIDE THE TERRITORY DIRECTLY ADMINISTERED BY THE MUGHAL EMPERORS THEIR ADMINISTRATIVE SYSTEM OFFICIAL TITLES COURT ETIQUETTE, AND MONTARYTYPE WERE BORROWED .... ALL THE TWENTY INDIAN SUBAHS OF THE MUGHAL EMPIRE WERE GOVERNED BY EXACTLY THE SAME ADMINISTRATIVE MACHINERY WITH EXACTLY THE SAME PROCEDURE AND OFFICIAL TITLES---

PERSIAN WAS THE ONE LANGUAGE USED IN ALL OFFICIAL RECORDS, ETC .... OFFICIALS AND SOLDIERS WERE FREQUENTLY TRANSFERRED FROM ONE PROVINCE FELT HIMSELF ALMOST AT HOME IN ANOTHER PROVI-NCE TRADERS AND TRAVELLERS PASSED MOST EASILY FROM CITY TO CITY SUBAH TO SUBAH AND ALL REALISED THE IMPERIAL ONENESS OF THIS VAST COUNTRY "

"یعنی، مغلیہ دور جو تقریباً دو صدیوں پر محیط رہا ہندوستان ایسے وسیع ملک کو ایک سرکاری زبان، ایک نظام حکومت، مشترک آداب، یکساں رویہ وغیرہ دے کر متعدد صوبوں کو قطعاً ہم رشتگی عطا کی۔ حکومت کے ارکان کا ایک جگہ سے دوسری جگہ تبادلہ، تاجر و سیاح کو آمد و رفت کی سہولتیں وغیرہ ایسی برکات ثابت ہوئیں کہ ہندوستان ایک واحد ملک بن کر ابھرا۔ حکومت کا استحکام، فرماں رواؤں کی تحمل، رواداری اور ان کے غیر جانبدارانہ انصاف نے خالص ہندوستانی تہذیب کو پروان چڑھایا۔ عہد اکبری کے معروف شاعر فیضی نے اپنے درج ذیل دو اشعار میں اس پہلو پر روشنی ڈالی ہے۔

خداوندے کہ ما را خسروی داد　　دل دانا و بازوئے قوی داد
بہ ما داد و ما را رہنموں کرد　　بجز عدل از خیال ما بروں کرد

ملک میں امن و امان اور خوشحالی کا دور دورہ رہا اور ایسی سلامتی نصیب ہوئی جو صدیوں سے کسی دوسرے خاندان کو حاصل نہ ہو سکی۔

اپنی تصنیف INDIA UNDER THE CRESCENT میں ایس آر شرما نے متعدد مستند تاریخی تصانیف کا غائر مطالعہ کرتے ہوئے مغلیہ تہذیب کا قابل قدر جائزہ لیا ہے۔ ملاحظہ ہوں متعلقہ حصے سے چند اقتباسات۔

MUGHAL CULTURE IS A VERY VAST SUBJECT ...... THE EMPIRE OF THE MUGHALS HAS VANISHED FOR EVER BUT THEIR PERSONALITY ENDURES IN A THOUSAND FORMS VISIBLE AND INVISIBLE IN OUR DRESS, SPEECH ETIQUETTE THOUGHT, LITERATURE, MUSIC, PAINTING AND ARCHITECTURE. THE IMPRESS OF THE MUGHALS IS EVER PRESENT, IT IS NEITHER PURELY HINDU NOR

PURELY MUSLIM, BUT A HARMONIOUS BLENDING OF THE TWO OUR HINDUSTANI DRESS .... WHEN NOT HYBRIDISED WITH EUROPEAN MISFITS .... IS THE SAME .... WESEEM MUGHAL PAINTINGS .... OUR HINDUSTANI MUSIC AND MUSICAL INSTRUMENTS ARE THOSE THAT GAVE PLEASURE TO MUGHAL SOVEREIGNS .... AMONG THE THOUSANDS OF ARTIST ARTISIANS AND MASTERBUILDERS THATWERE ENGAGED THROUGHOUT THE MUGHAL PERIOD IN THE CONSTRUCTION OF THE NUMEROUS BUILDINGS. PALACES AND MOSQUES, THERE WERE BOTH HINDUS AND MUSLIMS WHO WORKED IN UNISON IN ORDER TO PRODUCE THE EXQUISTTE EFFE--CTS .... IN SOME, AS IN JAHANGIR MAHAL THE HINDU PREDOMINATED, IN ORTHERS AS. IN THE TEMPLES OF BRINDRABAN THE MUSLIM RESTRAINT IN EXTERNAL ORNAMENTATION SHOWED ITSELF, THE PERFECTION WAS REACHED WHERE THE HINDUAND MUSLIM BOTH MERGED THEIR INDIVIDUALITIES IN A SUBLIME FORM LIKETHAT OF THE TAJ MAHAL WHICH IS NEITHER, HINDU NOR MUSLIM BUT INDIAN A FEW WORDS .... ON LITERARY AND SCIENTIFIC HERITAGE HINDU MATHEMATICAL WORKS LIKE 'LILAVATI' WAS TRANSLATED IN TO PERSIAN SAWAI RAJA JAI SINGH OF AMBER CONSTRUCTED .... ASTRONOMICAL OBSERVATORIES AT JAIPUR, MATHURA, BANARAS AND DELHI. SANSKRIT PANDIT LIKE JAGANNATH

WAS PATRONIZED BY EVEN .... SHAH JAHAN, THE HINDU EPICS AND THE VEDAS AND UPANISAD, AND SEVERAL OTHER WORKS ON THE HINDU RELIGION AND PHILOSOPHY, LIKE THE YOGAVASISTHA AND GITA WERE-NOT MERELY TRANSLATED .... IN TO PERSIAN BUT WERE ALSO STUDIED WITH GREAT AVIDITY BY MUGHAL PRINCE DARA SHAKOH AND EVEN MUGHAL PRINCES-SES LIKE JAHAN ARA LIKE WISE PERSIAN LITERATURE WAS (STUDIED AND PRODUCED) BY BOTH COMMUNITIES ....(BY) UNIVERSAL ACKNOWLEDGEMENT THE EMPEROR OF HINDU LITERATURE IN, THE AGE OF THE MUGHALS WAS TULSI DAS .... THE MUGHALS NO DOUBTS CONQUERED HINDUSTAN ESTABLISHED THEIR EMPIRE .... BUT A SURVEY OF THEIR CULTURE LEADS ONE TO BELIEVE THAT THEIR HEARTS WERE TAK-EN CAPTIVE BY THE SPIRIT OF .... HINDUSTAN IN ALL AGES.,, (P.P. 617-690)

یعنی ، مغلیہ تہذیب ایک بہت وسیع موضوع ہے ، اور یہ تہذیب آج ہماری پوشاک ، اگر مغربی انداز کے لباس سے اس کو غیر مخلوط رکھا جائے تو مغلیہ انداز وطرز ہی کی ابھرتی ہے ۔ ہندو ان کی مندروں کی تعمیر میں ہندو اور مسلمان صنعت کاری نظر آتی ہے اور اس کا شاہکار ہے تاج محل ۔ ہندوستان فکر و نظر کی بے شمار کتب کا ترجمہ ہوا ہے ۔ ملک بھر میں ایک طرز نظام اور ایک زبان سے جو فارسی تھی نصائح اشاعات مرتب ہوئے ۔ اور ہندوستانی قومیت کی داغ بیل پڑنے لگی ۔ سرمد ایسے خدا مست شاعر کے قتل کے بارے میں مولانا ابوالکلام آزاد نے "حیات سرمد" میں تحریر فرمایا ہے کہ :

" اصل بات تو یہ ہے کہ عالمگیر کی نظروں میں تو سرمد کا سب سے بڑا جرم دارا شکوہ کی معیت تھی اور اسے وہ کسی نہ کسی بہانے قتل کرنا چاہتا تھا ...... اسلام کے تیرہ سو برس کے عرصے میں فقہا کا قلم ہمیشہ تیغ بے نیام رہا ہے اور ہزاروں حق پرستوں کا خون ان کے فتووں کا دامن گیر ہے ۔ اسلام کی تاریخ کو کہیں سے پڑھو سیکڑوں مثالیں ملتی ہیں کہ جب بادشاہ کسی کو مٹانا چاہتا تھا تو علما کا قلم اور

سپہ سالار کی تیغ دونوں یکساں طور پر کام دیتے تھے"۔ (حیات سرمد ص ۲ اور ص ۱۲)

سرمد کا ذکر ہے تو چندر بھان برہمن کا ذکر کرنا غالباً بے محل نہ ہوگا۔ سرمد کو جب جام شہادت پلا دیا گیا تو چندر بھان برہمن نے جو بہ حیثیت میر منشی دارا شکوہ سے وابستہ تھا راہ فرار اختیار کی۔ سنیاسی ہوکر اس نے اپنی عمر بنارس کے سادھوؤں میں کاٹ کر بالآخر اورنگ زیبی عتاب سے بچ سکا۔ یہ ذکر یہاں ضمنی طور ہی پر کیا گیا ہے۔ اپنی تصنیف غبار خاطر میں مولانا آزاد کے یہ الفاظ خاص معنویت کے حامل ہیں:

"اورنگ زیب کے فقیہانہ تقشف سے اگرچہ فنون لطیفہ کی گرم بازاری سرد پڑ گئی۔ مگر جو کچھ ہوا صرف دربار شاہی تک محدود تھا۔ پچھلی آبپاشیوں نے ملک کے ہر گوشے میں جو نہریں رواں کر دی تھیں، وہ اتنی تنک مایہ نہ تھیں کہ شاہی سرپرستی کا رخ پھرتے ہی خشک ہو جائیں۔" (غبار خاطر لاہور ص ۱۳۶)

بہرکیف ہندوستانیت کی داغ بیل پڑ چکی تھی اور وہ سدا بہار پروان چڑھتی رہی۔ مضمون کے شروع میں اتھروید کی ایک رچا کا حوالہ دیا گیا ہے بالکل ان ہی سطور پر ابوالفضل نے اپنی تصنیف اکبر شاہی کے تیسرے حصے "آئین اکبری" میں "آئین راہ نمونی" کے تحت "صلح کل" یعنی مکمل امن و آشتی کو ہماری سماجی و معاشرتی زندگی میں جز لازم قرار دیا۔ ARVA DHARMA SAMRAVABH یعنی دھرم کے ساتھ بلا امتیاز سلوک رکھنا ہی ہماری فوقیت کی بنیاد ہے جو آج تک ہے۔ یہاں ایک بات اور قابل ذکر معلوم ہوتی ہے۔ بدایونی کی تصنیف "منتخب التواریخ" اور ابوالفضل کی کسی تصنیف میں "دین الٰہی" کا دور دور پتہ نہیں چلتا۔ قیاس یہ ہے کہ یہ حرکت بلاک مین نے "آئین اکبری" کا ترجمہ کرتے ہوئے کی تھی۔ معلوم ہے کہ بلاک مین BLOCK MMAN نے ROYAL ASIATIC SOCIETY کے زیر اہتمام آئین اکبری کا انگریزی ترجمہ کیا تھا۔ ابوالفضل کی اصطلاح "آئین راہنمونی" کا ترجمہ DIRECTIVE PRINCIPLES تو درست کیا مگر اس کے آگے بریکٹ میں DIN-E-ILAHI لکھ دیا۔ دین الٰہی کو معرض وجود میں لانے کا سہرا بلاک مین کے سر ہے کیا شر مگر مخفی حملہ کیا ہے ہندوستانی تاریخ پر۔ بدایونی جو اکبر اور ابوالفضل کو قابل نفرت تصور کرتا تھا اس نے بھی دین الٰہی کا کہیں ذکر نہیں کیا ہے۔ اسی طرح ہماری تاریخ کو مسخ کیا جاتا رہا ہے۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ ہم "دین الٰہی" کا الزام اکبر اعظم پر لگاتے رہے ہیں بلا امتیاز مذہب و ملت سرکاری نظم و نسق چلانے کو آج کی اصطلاح میں SECULAR POLICY کہتے ہیں۔

ہندوستانی تہذیب ہمیشہ سے اسی طور و طریق پر گامزن رہی ہے۔ دور مغلیہ میں اس پالیسی کو مزید فروغ عطا کیا گیا۔ ہندوستان کی دو بڑی زبانیں یعنی ہندی اور اردو دونوں مغلیہ تہذیب سے عبارت ہیں۔ لہٰذا مغلیہ تہذیب ایک "زندہ رود" ہے جو ہمیشہ ہماری زندگی کی آبیاری کرتا رہے گا۔ مغلیہ سلطنت کا چراغ بجھ جانے کے باوجود اس کی بصیرتیں آج تک ہماری رہنمائی کرتی رہی ہیں اور کرتی رہیں گی۔

سید شہاب الدین دسنوی

مولانا ابوالکلام آزاد بحیثیت وزیر تعلیمات

مولانا ابوالکلام آزاد کی غیر معمولی شخصیت کے کثیر الجہت پہلوؤں کا ایک پہلو وہ بھی تھا جس کا آغاز ان کے وزیر تعلیمات مقرر کئے جانے پر ہوا۔ ستمبر ۱۹۴۶ء میں عبوری حکومت بنائی جانے لگی تو مہاتما گاندھی اس میں مولانا آزاد کی شمولیت چاہتے تھے۔ مگر مولانا رضامند نہ ہوئے۔ جنوری ۱۹۴۷ء میں ڈاکٹر راجندر پرساد دستور ساز اسمبلی کے صدر بنائے گئے تو مرکزی حکومت کی کابینہ میں تبدیلی عمل میں آئی۔ شری راجگوپال آچاریہ کو مالیات کا شعبہ دیا گیا۔ اور ان کی خالی کی ہوئی جگہ پر مولانا آزاد کو قلم دان تعلیمات سپرد کیا گیا۔ مولانا اس عہدے پر جنوری ۱۹۴۷ء سے اپنی وفات یعنی ۲۲ فروری ۱۹۵۸ء تک فائز رہے۔

وزارت میں شمولیت سے قبل مولانا آزاد کی زندگی سراسر یا تو سیاسی رہی یا مذہبی۔ سیاست ان کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ کچھ مدت تک انہوں نے صحافت کے میدان میں گزارا۔ مگر وہ بھی سیاسی مقصد کی خاطر۔ صوبوں میں ۱۹۳۷ء میں کانگریس پہلی بار برسر اقتدار ہوئی۔ لیکن مکمل آزادی کی تحریک اپنی جگہ جاری رہی۔ ان دنوں اگرچہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ آزادی کی منزل کب آئے گی۔ پھر قدم آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھ رہے تھے۔ دوسری عالمی جنگ اور "ہندوستان چھوڑو" کی سرگرمی، کانگریس کا صوبائی حکومتوں سے الگ ہو جانا، پھر قید و بند کی صعوبتیں، یہ ساری باتیں حالات کو اور سخت بنائے جا رہی تھیں۔ ایسی صورت میں ملک کے تعمیری کاموں پر توجہ دینا، وقت کی ترجیحات میں داخل نہ تھا۔ البتہ مہاتما گاندھی نے، جو خاص انداز میں سوچتے تھے ۱۹۳۷ء میں اپنا تعلیمی نظریہ "وردھا اسکیم یا بنیادی تعلیم" کی شکل میں پیش کیا۔ اس میں ابتدائی تعلیم ایک حرفہ کے ذریعہ دیا جانا بتایا گیا۔ اسکیم میں بچوں کی دماغی، جسمانی اور روحانی تربیت مربوط انداز میں اس طرح تھا کہ ان کی مکمل شخصیت ابھر آئے۔ اسکیم کا ایک اہم پہلو یہ تھا کہ بنیادی تعلیم کا ذریعہ مادری زبان تھا

نے کی مدد سے خود کفیل ہو سکے، تاکہ بدیسی حکومت تعلیم کو عام اور لازمی قرار دینے میں مالیات کا بہانہ پیش نہ کر سکے۔
ء میں مولانا محمد علی، حکیم اجمل خاں اور ان کے ساتھیوں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ قائم کیا۔ اس کی پشت پر بھی بڑی
سیاسی مقاصد کارفرما تھے۔ سابق ریاست مدراس میں راجہ گوپال اچاریہ نے وزیر تعلیمات کی حیثیت سے
نا پیشہ" کو مرکز بنا کر ایک تعلیمی اسکیم کو رواج دینے کی کوشش کی جو ناکام رہی۔ دوسرے لیڈر تعمیری مسائل
ف نظر کر کے زیادہ تر سیاسی سرگرمیوں میں الجھے رہے۔ ان کا خیال تھا کہ بالخصوص تعلیم ایسا مسئلہ ہے
حصول آزادی کے بعد ہی غور کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ ملک کے دو تعلیمی نظام جو پہلے سے رائج تھے اپنی اپنی
تے رہے۔ ایک برطانوی حکومت کا مرتب کیا ہوا سیکولر نظام تعلیم اور دوسرا دینی تعلیم کی تحصیل کے لئے
علوم، پاٹھ شالے، مدرسے، ودیالے وغیرہ کا نظام۔ برطانوی نظام کا مقصد وہی تھا جو لارڈ میکالے کے
سے پیدا ہوا تھا یعنی سرکاری مشینری کو فعال اور متحرک رکھنے کے لئے مناسب کل پرزوں کا اسکولوں اور
میں تیار کرایا جانا۔ ان میں ملک کی آرزوؤں اور تمناؤں، محسوسات اور رجحانات کے نشوونما کی کوئی گنجائش نہ
ہی تعلیم کا کوئی واضح نظریہ یا فلسفہ پیش نظر نہ تھا۔ حکومت ہند نے سرجان سارجنٹ کی صدارت میں جو کمیٹی
تھی اس کی محنت سے تیار کی ہوئی رپورٹ موجود تھی۔ جس میں ہندوستان میں تعلیم کا چالیس سال کا منصوبہ
دیا تھا۔ اس کا چرچا تو بہت ہوا لیکن عمل نہیں کے برابر رہا۔ کیونکہ یہ بہانہ موجود تھا کہ تعلیم کا موضوع ریاستی
ن کا ہے۔

مولانا آزاد وزیر تعلیمات بنے۔ تو انہوں نے قلمدان وزارت کو صرف کابینہ میں ایک ممتاز رکن بنائے جانے کا
نہیں سمجھا۔ اپنے لئے اسے طرۂ امتیاز نہیں سمجھا۔ انہوں نے پوری سنجیدگی اور اپنی عادت کے مطابق غور و فکر کے
حالات کا جائزہ لیا۔ اپنی پوری سیاسی زندگی کے تجربے کی روشنی میں پہلے یہ طے کرنے کی کوشش کی کہ آزاد
ستان کے تعلیمی نقشے میں کیا رنگ ابھرنا چاہئے۔ برطانوی حکومت کی نوآبادی پالیسی نے ہندوستانیوں
ذہنی غلامی میں ڈال رکھا تھا اس سے کیسے چھٹکارا دلا کر انہیں باعزت، مہذب اور صحیح معنوں میں تعلیم یافتہ
لئے۔ میکالے کا ایک تضحیک آمیز فقرہ مشہور ہے کہ "مغربی زبان کے علوم کی ایک الماری مشرقی
کی ساری کتابوں سے بڑھ چڑھ کر ہوتی ہے۔" سوال یہ تھا کہ ہندوستانیوں کو اس اہانت آمیز صورت سے
انہیں اپنے ورثے پر اعتماد اور فخر کیونکر دلایا جائے۔

مولانا آزاد کو مغربی علوم و فنون سے کوئی بغض یا عداوت نہ تھی۔ وہ تنگ دل ہرگز نہ تھے۔ اپنے وسیع مطالعے
وہ مغربی فلسفہ، علوم و فنون کی قدر کرتے تھے۔ بلاشبہ مشرقی علوم ان کی گھٹی میں پڑے ہوئے تھے جو انہیں
عزیز تھے۔ لیکن یہ قدر دانی اور شیفتگی انہیں دوسری زبانوں میں علوم کے اکتساب میں حارج نہیں ہونے
تھے۔

مشرق و مغرب کا امتزاج مولانا آزاد کی طبیعت کا خاصہ تھا۔ یہ امتزاج ان کے خیال میں صرف ثقافتی اقدار تک محدود نہیں بلکہ دنیا بھر میں نسل انسانی کو وطنی اور قومی افتخار سے بالاتر کرنے کا وسیلہ بھی تھا۔ اس اعلیٰ مقصد کو حاصل کرنے کی خاطر مولانا آزاد بین الاقوامی سطح پر تعلیم کو ذریعہ بنانا چاہتے تھے INDIAN NATIONAL COMMISSIONL FOR COOPERATION WITH UNESCO کے ایک افتتاحی جلسے کو خطاب کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا: "دراصل تعلیم ہی وہ ذریعہ ہے جس سے ایسی فضا تیار ہو سکتی ہے جس میں انسان انسان سے دوستی اور مساوات کی سطح پر مل سکتا ہے"۔ انہیں اس کی شکایت تھی کہ ان کے زمانے میں تعلیم اس طرح دی جاتی رہی تھی جس سے انسان طبقاتی اور وطنی بھید بھاؤ کے تنگ دائرے میں پھنس کر اس سے باہر نکل نہ پا رہا تھا۔ اس حصار سے طلبا کو باہر نکالنے کے لئے مولانا آزاد کی تجویز تھی کہ اسکولوں میں تاریخ اور جغرافیہ کی تدریس کا طریقہ بدل ڈالا جائے۔ دنیا کے نقشے کو صرف ایک ہی رنگ میں رنگ کر ملکی اور علاقائی حدود کا تصور ختم کر دیا جائے۔ تاریخ کی تعلیم انسانوں میں وصل کے بجائے فصل پیدا نہ کرنے پائے۔

مولانا آزاد کا خیال تھا کہ مشرق اور مغرب دونوں میں نظام تعلیم کچھ اس انداز سے مرتب ہوا کہ نتیجے میں ایک تضاد سامنے کھڑا ہو گیا ہے۔ مشرق میں "فرد" کی نجات کو غیر متناسب حد تک اہمیت دی جاتی ہے یہاں انسان علم کا مقصد اپنی نجات (SALUTION) کا ذریعہ سمجھتا ہے۔ اس کا طریقۂ فکر اور انفرادی نجات کی کوشش میں بحیثیت مجموعی سماجی فلاح اور بہبودی ترقی کی طرف سے اکثر بے پروا کر دیتی ہے۔ اس کے برخلاف مغرب میں سماجی فلاح اور ترقی پر ضرورت سے زیادہ توجہ دی جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے بعض سوسائٹی آمریت کا راستہ اختیار کر لیتی ہے۔ اور "فرد" دب کر رہ جاتا ہے۔ آج جبکہ سائنس نے مشرق و مغرب کو ایک دوسرے سے قریب کر دیا ہے ضرورت اس بات کی ہے کہ انفرادی نجات ہو یا سماجی فلاح، ان میں سے ہر ایک کی معمول سے زیادہ اہمیت اور عصبیت کو ختم کر دیا جائے۔ اور ایک ایسا نظام تعلیم عمل میں لایا جائے جس ان دونوں کے درمیان توازن پیدا ہو سکے۔

مولانا آزاد کا یہ بھی خیال تھا کہ مشرق اور مغرب یا مختلف نسلوں اور ثقافتوں کے درمیان فی الحقیقت کسی تصادم کی گنجائش نہیں ہے۔ خود ہم نے ان کے بیچ مناقشے کی فرضی دیوار کھڑی کر رکھی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہم آرزومند تو عالمی وحدت کے ہوتے ہیں مگر حقیقت میں وطن پرستی کے تنگ حصار سے باہر نہیں نکل پاتے۔ اور لطف یہ کہ اس بات کا بار بار اعادہ کئے جاتے ہیں کہ اس کرۂ ارضی پر اپنی روش بدلے بغیر انسان کا مستقبل تاریک ہوتا جا رہا ہے۔

مولانا آزاد نے مشترکہ بشریت اور جدید سائنس کی تکنیکی ترقی سے تکنیکی وحدت کی ضرورت پر بار بار زور دیا۔ ہندوستان نے بدقسمتی سے اپنے آپ کو صدیوں تک عالمی ترقی سے محروم رکھا۔ سائنس کے جدید تقاضوں اور [illegible] کو اپنانے کی ضرورت کی طرف توجہ کم دی۔ آزادی سے کچھ عرصہ پہلے ایک پریس کانفرنس کو خطاب کرتے ہوئے مولانا نے فرمایا۔ "ہم صحیح قسم کی لبرل اور انسانیت پر مبنی تعلیم سے ہی ہندوستانیوں کے تناظر میں وسعت پیدا کر سکتے

سب لئے ترقی اور خوشحالی کے راستے کھل سکیں گے اس کے برعکس غیر سائنسی طریقہ تعلیم سوجھ بوجھ کے بغیر ان مقاصد کی
ب ہم کو نہیں لے جا سکے گا۔ جس کا خواب ہمارے جانثاران آزادی کرتے رہے۔

تعلیم کے ان بنیادی تصورات کو سامنے رکھتے ہوئے مولانا آزاد نے محسوس کیا کہ ملک میں نظام تعلیم کو ابتدائی سے لے کر ہر گام پر معیار اور وسعت دونوں لحاظ سے بہتر بنانا ضروری ہے۔ چنانچہ ۸ جنوری ۱۹۵۵ء کو سینٹرل ایڈوائزری بورڈ کو خطاب کرتے ہوئے انہوں نے اپنی وزارت کا جو لائحہ عمل پیش کیا اس میں ان امور کی طرف خاص توجہ دلائی:

(۱) بیسک ایجوکیشن کے ذریعہ لازمی اور مفت تعلیم کا انتظام

(۲) نہایت وسیع پیمانے پر تعلیم بالغان کا انتظام جس سے ناخواندگی کا داغ دور ہو سکے۔

(۳) صنعت کی ٹیکنیکل ضروریات کے مد نظر ٹیکنیکل ایجوکیشن کے معیار کو بہتر بنانا اور اسے بڑے پیمانے پر پھیلانا۔

(۴) یونیورسٹی کی تعلیم کی نئی تنظیم اور اس کے معیار کو قومی نقطہ نظر سے بلند کرنا۔

حصول آزادی کے بعد ملک کے اقتصادی استحکام کے لیے صنعتی محاذ پر قومی حکومت کے سامنے دو مرتبے مطلوبے ہے۔ بجلی کی طاقت میں معتدبہ اضافہ اور بھاری صنعتوں HEAVY INDUSTRIES کا قیام۔ بعض بیرونی ممالک کے تعاون سے فولاد کے بڑے بڑے کارخانے قائم ہوئے۔ ان میں پیدا ہونے والے مال کو مصرف میں لانے کی تجویزیں۔ بجلی کے لیے بڑی بڑی ہائیڈل اسکیمیں، اس طاقت کو استعمال کرنے کی خاطر انجینیروں کی ضرورت۔ ان باتوں نے وزیر تعلیمات کی حیثیت سے مولانا آزاد کی توجہ مبذول کرائی۔ ۱۹۴۷ء تک ملک بھر میں ۲۸ انجینیرنگ کالج تھے جن میں ۲۵۰۰ طلبا کے داخلے کی گنجائش تھی۔ مولانا کی وزارت کے آٹھ سال کے اندر انجینیرنگ کالجوں کی تعداد بڑھ کر ... ہو گئی۔ اور طلبا کی گنجائش ۵۰۰۰ تک آ گئی۔ ان کالجوں کے ماسوا ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ کی تعداد ۶۱ سے بڑھ کر ۸۵ ہو گئی ... درجہ اعلیٰ سطح کی درسگاہیں تھیں۔ اس طرح انجینیروں اور ٹیکنیکل عملے کی اتنی بڑی کھیپ نکلنے لگی کہ جس سے وزیر اعظم جواہر لال نہرو کے پنج سالہ منصوبوں کے تحت نئی نئی صنعتوں کی بیشتر ضرورتیں پوری ہونے لگیں۔

یونیورسٹیوں میں اعلیٰ سطح پر جو تعلیم دی جا رہی تھی اس کا انتظام ریاستی حکومتوں کے شعبۂ تعلیمات کے ہاتھ میں تھا۔ ۱۹۴۵ء میں یو۔ جی۔ سی کا قیام عمل میں آ چکا تھا۔ لیکن اس کا میدان عمل صرف تین یونیورسٹیوں تک محدود تھا۔ مولانا آزاد نے اس ادارے کی نئے سرے سے تشکیل کی اور اس کا تعلق مرکزی کے علاوہ ملک کی دوسری تمام یونیورسٹیوں اور دیگر اعلیٰ سطح کی درسگاہوں سے قائم کر دیا۔ اب U.G.C نہ صرف یہ کہ انہیں فنڈ مہیا کرتا ہے بلکہ اس کے ساتھ دوسرے معاملات پر بھی حکومتوں کو اور ان یونیورسٹیوں کو مشورے دیتا ہے جو اس سے طلب کئے جاتے ہیں۔ اس طرح سے مرکزی حکومت کی وزارت تعلیمات اور ریاستی اور مرکزی یونیورسٹیوں کے درمیان رابطہ قائم ہو گیا جس کی ضرورت تھی۔

مولانا آزاد یہ بھی چاہتے تھے کہ اسکولوں میں طلبا کو بہترین قسم کی متوازن مذہبی تعلیم دی جائے۔ ان کا خیال تھا

ستان میں دیگر ممالک کے مقابلے میں مذہبی تعلیم دینا زیادہ ضروری تھا۔ وہ اس کے قائل تھے کہ مذہبی تعلیم چاہے کسی
کی ہو کے عقیدے کے مطابق دی جا رہی ہو اس میں لبرل اسپرٹ ہونی چاہیے۔ اس طرح کی تعلیم کا مقصد ذہنی وسعت
فاداری پیدا کرنا ہو۔ ایسا کام مناسب طریقے پر حکومت کے ذریعے ہی ہو سکتا تھا۔ مولانا نے ۱۶ فروری ۱۹۴۸ء کو
EDUCATION OF NATIONAL RE-CONSTRUC کے موضوع پر پریس کانفرنس میں اپنا خیال
کیا اور دوبارہ C.A.B.E کے چودھویں اجلاس میں اسے دہرایا۔ اپنے خطبۂ صدارت میں انہوں نے فرمایا: "کوئی
حکومت اپنے آپ کو اس اہم ذمہ داری سے بری نہیں کر سکتی ہے"۔ اس مسئلہ پر غور کرنے اور سفارشات پیش کرنے
طر انہوں نے دو کمیٹیاں بھی بنائیں۔ لیکن ان دونوں کی رپورٹوں میں شدید اختلافات پایا گیا۔ مولانا کی اسی تجویز کا
خسانہ وہ دینی تعلیم کنونشن تھا جو جنوری ۱۹۵۴ء میں مولانا حفظ الرحمٰن کی قیادت میں بمبئی میں منعقد ہوا۔ اس
شن کا جس میں ہر مکتب خیال کے علما شریک تھے، فیصلہ یہ تھا کہ حکومتوں کی جانب سے مذہبی تعلیم کا انتظام کیا
مناسب ہوگا۔ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے اس کا انتظام خود انہیں کرنا چاہیے۔ خواہ وہ کیسی بھی ہو۔ اسی
کے مطابق "دینی تعلیمی کونسل" اور اس کے تحت بڑی تعداد میں (خصوصاً اتر پردیش میں) دینی مکاتب کا قیام
یں آیا۔

مولانا آزاد کی خواہش تھی کہ ہر ہندوستانی دیوناگری اور اردو دونوں رسم خط سے واقف ہو۔ مرکزی حکومت
نب سے جو مطبوعات شائع ہوتی ہیں مولانا چاہتے تھے کہ وہ رومن رسم خط میں ہو۔ وہ رومن رسم خط کو بر قرار
کے حق میں تھے۔ ان کی دلیل تھی کہ ہندوستان کے فوجیوں نے لاکھوں کی تعداد میں رومن رسم خط میں "ہندوستانی"
سیکھی۔ لام ہندی کے خاتمے پر اس کے بغیر وہ سب بے علموں میں شمار کئے جانے لگیں گے۔ لیکن مولانا کی یہ
بی شرمندۂ معنی نہ ہو سکی۔ اور ہوتی بھی کیسے؟ جبکہ مہاتما گاندھی کے اس اپیل پر کہ اردو اور دیوناگری دونوں رسم
" ہندوستانی" لکھی جائے۔ اس کے عالی عقیدت مندوں نے قابل اعتنا نہ سمجھ کر اسے ٹھکرا دیا تھا تو پھر مولانا
بات کون مانتا۔

مولانا کی ایک اور تجویز بھی قبول نہ کی جا سکی ان کا خیال تھا کہ سرکاری ملازمتوں کے لئے یونیورسٹی ڈگری کی شرط
جائے وہ چاہتے تھے کہ تعلیم کا نظام اس طرح ہو کہ سیکنڈری اسکول کی تعلیم کی تکمیل کے بعد طلبا کی بڑی تعداد
سٹیوں کا رخ کرنے کے بجائے مختلف پیشہ ور تعلیم میں لگ جائیں۔ سرکاری ملازمتوں کے لئے پبلک سروس
یسے امتحانات لیا کرے جن میں آسامیوں کی ضرورت کے لحاظ سے امیدواروں کی متعلقہ صلاحیتوں کا اندازہ
سکے۔ ان امتحانات میں بیٹھنے کے لئے ڈگری کی شرط نہ ہو۔ اپنے اس خیال کو مولانا آزاد نے ۴ ستمبر ۱۹۵۰ء
یا ریڈیو کے ذریعہ نشر کیا۔ لیکن ان کی یہ آواز بھی صدا بصحرا ثابت ہوئی۔
مولانا آزاد کا ثقافتی کینوس وسیع اور عریض تھا۔ اس میں بعض ایسی سرگرمیوں کی بھی گنجائش تھی جو شاید ان کے

ذاتی عقیدے سے ٹکراتی رہی ہوں گی ۔ لیکن وزیر تعلیمات کی حیثیت سے ان پر پورے ملک اور اس کے سارے باشندوں کی ثقافت کو فروغ دینے کی ذمہ داری عائد ہوتی تھی ۔ اس ملک میں ماضی کی عظمت کی شاندار روایتیں تھیں۔ اور وہ اس تاریخ کو بھلا نہیں سکتے تھے ۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے ثقافتی مقاصد کے لئے کئی ادارے قائم کئے ۔ ہندوستانی زبانوں کے ادب کو فروغ دینے کے لئے " ساہتیہ اکاڈمی " مصوری مجسمہ سازی وغیرہ کا معیار بلند کرنے اور ہونہار فنکاروں کی تربیت کے لئے " للت کلا اکاڈمی " موسیقی، رقص اور ڈراما کو ترقی دینے کے لئے " سنگیت ناٹک اکاڈمی " قائم ہوئیں ۔ پہلے جہاں ثقافتی سرگرمیوں پر دو کروڑ روپے کا بجٹ ہوا کرتا تھا وہاں مولانا نے اپنے دور میں اسے ۳۰ کروڑ تک پہونچا دیا ۔ ان اداروں کے علاوہ مولانا نے " انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز " کے ذریعے عرب ممالک کو ہندوستانی ثقافتی سرگرمیوں سے باخبر رکھنے کی خاطر عربی جریدہ " ثقافۃ الہند " اور انگریزی میں " INDIO - ASIA " کا اجرا کیا ۔

تعلیمی تنظیموں میں U.G.C کا ذکر پہلے آچکا ہے ۔ مولانا نے نیشنل میوزیم اور صنعت اور ٹیکنالوجی کے فروغ کے لئے بنیادی ریسرچ (FUNDAMENTAL RESEARCH) اور آثار قدیمہ کے تحقیقی مطالعے کے لئے کافی فنڈ مہیا کئے ۔

۱۹۵۰ء میں C.A.B کو خطاب کرتے ہوئے مولانا نے فرمایا تھا " وزیر تعلیمات کا عہدہ سنبھالنے کے بعد میں نے جو پہلے فیصلے کئے ان میں ایک یہ تھا کہ اس ملک میں اعلیٰ سطح کی ٹیکنیکل تعلیم اس طرح دی جائے کہ ساری ٹیکنیکل ضروریات کے لئے ہم بڑی حد تک خود کفیل ہو جائیں " اس کے ایک سال بعد کھڑگپور کے آئی آئی ٹی کا افتتاح کرتے ہوئے اپنی بات کا اعادہ کرتے ہوئے بڑے اعتماد کے ساتھ فرمایا " میں نے محسوس کیا کہ مالی دشواریاں کچھ بھی ہوں راہ میں دقتیں کیسی بھی حائل ہوں اعلیٰ سطح کی ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ ہمیں ہر حال میں قائم کرنے ہیں " اسی عزم کے ساتھ انہوں نے " آل انڈیا کونسل آف ٹیکنیکل ایجوکیشن " کے دستور میں ترمیم کرکے اسے ملک بھر میں ٹیکنیکل ایجوکیشن کا ذمہ دار بنایا ۔ ملک میں نیشنل لیباریٹریز قائم ہوئیں جن سے تحقیقی سائنس اور صنائع کو بڑی مدد ملی ۔

مولانا آزاد کے دور وزارت کے اس جائزے کے بعد ایک سوال یہ اٹھتا ہے کہ مولانا آزاد کو تعلیمی میدان کے کس خانے میں جگہ دی جا سکتی ہے ۔ ایجوکیشنل فلاسفر یا ماہر تعلیم (EDUCATONIST) ماہر تعلیم کی حیثیت سے ؟ ۔ ان کے مشیر خواجہ غلام السیدین نے انہیں شروع سے آخر تک ایک ماہر تعلیم (EDUCATIONIST) قرار دیا ہے ۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ مولانا جو کہتے تھے اس پر عمل کرتے تھے ۔ معلوم نہیں کتنے لوگوں کو اس رائے سے اتفاق ہوگا ۔ مولانا نے ملکی یا قومی تعلیم کے لئے کوئی مخصوص فلسفہ نہیں پیش کیا ۔ کوئی ایسا مربوط فلسفہ جس کی بنیاد پر ہمارے طلبا کی شخصیت بنانے میں مدد مل سکتی ہو ۔ اور جو ہندوستانی تعلیم کی شناخت ہوتی ہو جو دوسرے ترقی یافتہ ملکوں کے طرز تعلیم سے ہمیں ممیز کر سکتی ، جو مولانا آزاد کو امریکہ کے جان ڈیوی ، انگلستان کے پرسی نن ، جرمنی کے

وائیٹ ہیڈ، شیلر اور دیگر کی صف میں لاکر کھڑا کر دے۔ تعلیمی فلسفے پر تو مولانا آزاد نے کوئی مستقل تصنیف اور کوئی مضمون چھوڑا۔ انہوں نے کچھ عملی تجویزوں کی طرف اشارے کئے مگر انہیں عملی جامہ نہیں پہنایا جا سکا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین اور ڈاکٹر [illegible] حسین کی طرح انہیں درس و تدریس کا بھی موقع نہیں ملا۔ اس لئے انہیں ایجوکیٹر (EDUCA-TOR) بھی ہم نہیں کہہ سکتے۔ البتہ اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ نے فلسفیانہ ذہن اور تفکر کے ساتھ اپنے ملک کے تعلیمی ڈھانچے کو دیکھا اور سمجھا اور عمارت کو استوار کرنے کی کوشش کی اس کی بنا پر انہیں مفکر تعلیم ــــ ایک مفکر تعلیم (EDUCATIONAL THINKER) ضرور کہہ سکتے ہیں۔ اگر ان کی زندگی نے وفا کی ہوتی اور وہ چند سال اور زندہ رہ گئے ہوتے تو ممکن ہے کہ ہمارے ملک کی تصویر اور مستقبل کی تعلیمی [illegible] کچھ اور ہوتے۔

(بقیہ: جنٹلمین)

میں ان بدبخت مسافروں کو روک روک کر ان سے کہہ کہتا جواب میں اسے پانچ یا دس روپے ملتے اور کوئی تولیہ یا کنگھا اس بیگ میں پہنچ جاتا۔

ٹرین نے سیٹی دی اور جنٹلمین نے وہ بیگ سنبھالا اور باز و کھڑے شخص سے ایک دوسرے سے کہا مجھے رزرویشن مل گیا ہے چاہو تو دس روپے دے دو جو میں نے قلی کو دے کر برتھ حاصل کی تھی اور دس روپے جنٹلمین کے ہاتھ میں پہنچ گئے۔ اور وہ جنٹلمین ٹرین سے اتر گیا۔

ٹرین چل دی گئی اور [illegible] اسٹیشن سے باہر آیا تو اسی جنٹلمین کو سڑک پر دیکھ کر اس کا دماغ چکرا گیا [illegible] کا [illegible]۔

[illegible] سے ملاقات ہوئی تو [illegible] ہنستے ہوئے [illegible]۔

وہ جنٹلمین! در اصل ریلوے میں [illegible] ملازم تھا لیکن رشوت اور عیش کی لت نے اسے ملازمت سے دھلوا دیا۔ احباب گزر اوقات کے لئے یہ کرتا ہے [illegible] ریلوے کا [illegible] کہاں ہے [illegible] حیرت سے [illegible] [illegible]۔

ڈاکٹر حلیم اللہ حالی

ہم مسافر جہاں جہاں گھومے

(قسط ۵)

کراچی کے عجائبات اور مراکز سیاحت کے بارے میں زیادہ علم نہیں ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ قدیم عمارتوں، کھنڈرات، میناروں، فطری مناظر اور قدرت کی عجیب و غریب تخلیقات کا مشاہدہ انسانی ذہن میں ایک پاکیزہ INSPIRATION پیدا کرتا ہے۔ لیکن میری افتاد طبع کی نوعیت یہ ہے کہ مجھے کبھی SIGHT SEEING PLACES سے دلچسپی نہیں رہی ہے۔ خارجی مناظر و مشاہدات اور آثار و باقیات میری روح میں انبساط و انشراح پیدا کرنے کی بجائے مجھے ایک بے نام سا دکھ دے جاتے ہیں۔ یہ سب مجھے تفریح کی بجائے جائے عبرت معلوم ہوتے ہیں انہیں دیکھ کر اپنے ماضی سے اپنا رشتہ ٹوٹنے کا اندازہ ہوتا ہے۔ وقت کی سفاکی اور انسان کی بے بسی کا احساس اور محرومیت کی فضا میں اضافہ ہوتا ہے اور ان مناظر میں میں خود کو زیادہ تنہا اور بے پناہ محسوس کرنے لگتا ہوں۔ ممکن ہے یہ کوئی مریضانہ کیفیت ہو مگر ہوتا ایسا ہی ہے۔ چنانچہ بیش تر اسٹیشنوں میں بھی جہاں مشاہدے کے بڑے مواقع ہوتے ہیں میں اکثر و بیشتر اپنے مستقر پر ہی وقت گزار دیتا ہوں اور جنہیں اپنی خارجی آنکھوں سے نہیں دیکھتا انہیں دل کی آنکھوں سے دیکھ لیتا ہوں۔ اس دروں بینی کا ایک مثبت پہلو یہ ہوتا ہے کہ میں اس احساس زیاں سے بچ جاتا ہوں جس کا ذکر ابھی کر چکا ہوں۔

کراچی پہنچ کر بھی میں نے یہ جاننے کی کوشش نہ کی کہ یہاں دیکھنے کی کون کون سی جگہیں ہیں، تفریح کا نام کیا کیا گیا۔ میری تفریح کے لئے احباب و اعزا، متعلقین ا کافی بہت تھے اور یہ واقعی بہت قیمتی — اور اسی سلسلے کی دو یادیں اب بھی تازہ ہیں۔

ہوا یوں کہ میرے وہاں پہنچنے کی خبر جناب ظفیر الحسن کو غالباً اخبارات سے ہوئی یا دوستوں سے میں ان سے پہلے سے واقف تھا مگر ان کی شخصیت اور ان کے کارناموں کا کوئی تاثر [illegible] تھا۔ ایک روز جب ان کا فون آیا اور انہوں نے ملاقات

خواہش کا اظہار کیا اور اس کے ساتھ ہی بیدل لائبریری دیکھنے کی دعوت دی تو بے حد خوشی ہوئی۔ مصروفیات نے چند دنوں تک ان سے ملنے نہ دیا۔ لیکن دلوں کی راہ گذر اتنی بے صدا بھی نہیں ہوتی چنانچہ انہوں نے شاید میرے شوق ملاقات کے ساتھ ساتھ میری مصروفیات و مسائل کا اندازہ بھی لگا لیا اور ایک روز بہ نفس نفیس تشریف لے آئے۔ محمد ظفیر الحسن صاحب پرانی وضع کے بزرگوں میں ہیں۔ مزاج میں محبت و شفقت ہے [illegible] کرتے ہیں [illegible] تحقیق میں ہیں مگر ایسے محقق نہیں جو تخلیق کاروں سے بیر رکھتے ہیں۔ تحقیق و تنقید میں اپنی شخصیت کی طرح مرنجان مرنج ہیں۔ اخلاق و اخلاص کے پیکر ہیں۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ علمی و ادبی شغف کے دلدادہ ہیں۔ خود بھی اردو ادب کے ہمہ وقت خدمت گذاروں میں ہیں اور چاہتے ہیں کہ دوسرے لوگ بھی لگن سے کام کریں۔ کراچی کے علمی عجائبات میں بیدل لائبریری بھی ہے میں ظفیر الحسن اور بیدل لائبریری کو دو الگ الگ چیز نہیں سمجھتا۔ دونوں ایک دوسرے سے زندہ ہیں۔ اگرچہ میں اپنی وحشت [illegible] مصروفیات کی وجہ سے جناب ظفیر الحسن صاحب کی پیہم دعوتوں کے بعد بھی بیدل لائبریری نہ دیکھ سکا لیکن جناب ظفیر نے اس کے بارے میں مجھے اتنی اطلاعات بہم پہنچا دیں کہ شنیدہ بھی مانند دیدہ ہو گیا۔

بیدل لائبریری کو حکومت کا مالی تعاون حاصل نہیں ہے۔ یہ کوئی حیرت کی بات نہیں ہے۔ اس لئے کہ حکومت خواہ یہاں کی ہو خواہ وہاں کی علمی و ادبی مراکز اور لسانی ثقافتی خدمت کرنے والے اداروں کو تعاون دینے میں ہمیشہ محتاط رہتی ہیں۔ بات یہ ہے کہ امداد و تعاون کی تجویزیں تیار کرنا اور اس پر حسب خواہ NOTING دینا تو ان اعلیٰ افسران کے ذمہ ہے جن کے نزدیک ROUTINE WORK ہی سب کچھ ہے۔ کوئی بڑا منصوبہ جس کے ذریعہ ہماری ثقافت و تہذیب اور زبان و ادب کا تحفظ و استحکام ہو سکتا ہے ان کے ذہنی دائرہ کار سے باہر ہوتا ہے اس لئے اضافی درد سر کون لینا چاہتا ہے۔ پھر افسروں کا ایک بڑا طبقہ ایسا بھی ہے جو تہذیب و ثقافت، کلچر، شعور [illegible] یہ ہے کہ ان چیزوں سے گریز کرنے کے لئے ہی ہم قومی کلچر کی بات کرتے ہیں۔ پاکستان میں تو قومی کلچر، پاکستانی کلچر اور پاکستانی ادب کے سلسلے میں لوگ کچھ زیادہ ہی حساس ہیں۔

غرض بیدل لائبریری حکومت کے تعاون کے بغیر اہم خدمت انجام دے رہی ہے۔ پاکستان اسے کچھ نہیں دے رہا ہے مگر یہ ۱۹۷۲ء سے مسلسل قومی خدمت کر رہی ہے اہل نظر اور صاحب علم اس کی اہمیت کے قائل ہیں متعدد لوگوں نے بیدل لائبریری کی اہمیت کا اعتراف کیا ہے [illegible] اللہ نے Dawn اور [illegible] جیسے انگریزی اخبارات میں اس کی افادیت پر اظہار کیا ہے۔ اپنے ایک [illegible] مضمون مطبوعہ ڈان میں انہوں نے لکھا ہے کہ۔

"An unusual Library with a rich Collection of rare books and magazines run by a group of dedicated volunteers with practically no financial aid from the government or any philanthropic organization."

پیام ادارہ بہار مسلم [illegible]

کی دین ہے۔ اور اس کے قائم کردہ شرف آباد کلب ، کا ایک جزو ہے۔ ایک اندازے کے مطابق اس میں ۱۵ ہزار سے زیادہ کتابیں ہیں۔ ان کے علاوہ مخطوطات اور نوادر کا اچھا خاصا ذخیرہ بھی ہے۔ یہاں تحقیق و تنقید کے لئے تمام ممکنہ آسانیاں مہیا کی جاتی ہیں۔ ماہنامہ ساقی (دہلی) کے وہ تمام شمارے موجود ہیں جو ۱۹۳۰ء سے شائع ہوئے تھے۔ ہفت روزہ ندائے ملت [illegible] کا نپور [illegible] کا مکمل فائل۔ دل گداز (عبد الحلیم شرر) کا مکمل فائل ماہنامہ ہمایوں اور نیرنگ خیال کے تمام سالانہ شمارے [illegible] کے علاوہ دوسرے متعدد رسائل کا جو خزانہ بیدل لائبریری میں مل جاتا ہے اس کا تصور کسی ایسی لائبریری سے نہیں ہو سکتا ہے جس کی سرپرستی [illegible] کے باذوق حضرات چلاتے ہوں۔ بیدل لائبریری کے عطیات یا چند شخصیتوں کے عطیات سے پورے ہوتے ہیں یا شرف آباد کلب کی ملکیت کے اس کرائے سے جو خاص طور پر مختلف تقریبات میں استعمال کیا جاتا ہے۔ جناب ظہیر الحسن بیدل لائبریری کے روح رواں ہیں۔ انہی کی بدولت یہ [illegible] نکلا ہے۔ جب حضرت [illegible] کا پتہ چلا ہے تو ظہیر الحسن [illegible]۔ [illegible] اور مسلسل خدمت ادب کرنے والے افراد کی تعریف کیا ہو سکتی ہے۔ ظہیر الحسن صاحب نے دیوان دل کی ترتیب و تدوین کی ہے اور اسے شائع کیا ہے [illegible] ہے کہ اب تک یہ سمجھا جاتا تھا کہ عابد دل کا دیوان نایاب ہے۔ گو کہ بعض تذکرہ نگاروں اور محققین نے عابد دل کا ذکر کیا ہے ان کے کچھ اشعار بھی نقل کئے ہیں۔ ان کے مختصر حالات بھی [illegible] ہیں مگر دل کا دیوان مفقود الخبر

تھا۔ قاضی عبد الودود کو بھی عاجز آکر لکھنا پڑا کہ دیوان نہیں ملتا"

جناب ظہیر الحسن نے یہ مہم سر کرلی۔ انہیں سید محمد احمد بلگرامی کی وساطت سے اس کا معتبر قلمی نسخہ مل گیا۔ وہ عرصہ دراز سے دل کے دلدادہ رہے ہیں اور ان کی کلیات کے متلاشی تھے۔ ان کے اشعار کو یکجا کر کے انہوں نے ۱۹۷۱ء کے "مہر نیمروز" میں ارمغان دل کے نام شائع بھی کرایا تھا۔ لیکن اب جو دیوان دل انہیں ملا ہے تو اس میں وہ اشعار موجود نہیں ہیں جو انہوں نے ادھر ادھر سے جمع کئے تھے۔ کلام کو دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے اور خود مرتب نے بھی یہی لکھا ہے کہ

> "اس سے یہ خیال ہوتا ہے کہ ابھی اور بہت کلام بصورت غزلیات ، رباعیات ، قطعات مثنویات و قصائد ہے جو ابھی تک نایاب ہے۔ شوق عظیم آبادی نے اپنے تذکرے میں لکھا ہے کہ "در غزل گوئی و قصیدہ و مثنوی قدرت تمام دارد" اس لئے بہت ممکن ہے کہ بقیہ اصناف سخن کا دوسرا مجموعہ مرتب ہوا ہو اور وہ بھی موجودہ دیوان کی طرح کہیں پڑا ہو۔"

بہرحال ارمغان دل اور دیوان دل نے مل کر محمد عابد دل کو بہت حد تک دریافت کر لیا ہے اردو دنیا کو جناب ظہیر الحسن کی اس کاوش و تحقیق کے لئے ممنون ہونا چاہئے۔

دیوان دل میں ایک دلچسپ تحقیقی حصہ وہ ہے جہاں دل کے اشعار کا غالب کے اشعار سے موازنہ کیا ہے۔ [illegible] سے دل [illegible] ۔۱۱

...سکھلانے سے پہلے شعر نشر کیا ہے۔ اس سلسلے میں پاکستان
برٹ انگلینڈ ... ملاحظہ کیجئے۔ ایک نمونہ
حفظ کیجئے :

جب تلک ہستی ہے تب تک یاں دوئی کو راہ ہے
نیستی جب آ گئی پھر اللہ ہی اللہ ہے
(درد)

دم واپسیں بر سر راہ ہے
عزیزو اب اللہ ہی اللہ ہے (غالب)

شکوہ مری وفا کا کبھو ہر آن ہے
بس چپ ہو یار میرے بھی منہ میں زبان ہے
(درد)

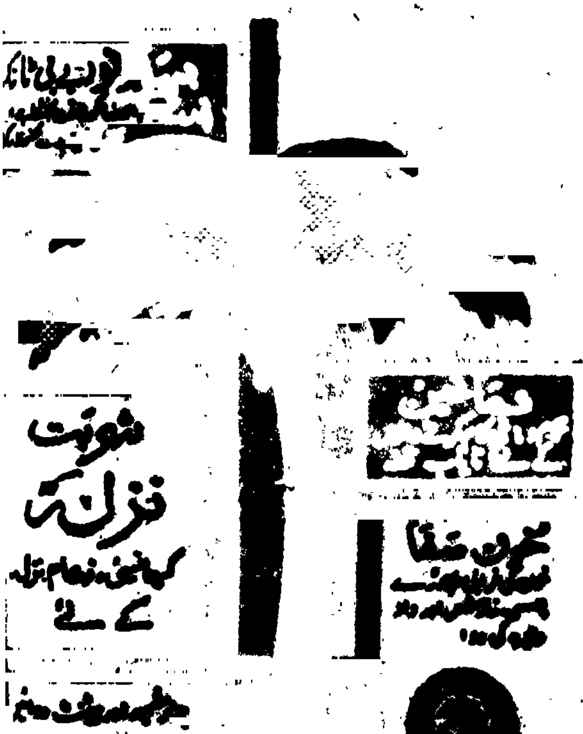
کیا خوب تم نے غیر کو بوسہ نہیں دیا
بس چپ رہو ہمارے بھی منہ میں زبان ہے
(غالب)

...ہیک لائبریری کے علاوہ پاکستان کے اردو ادب میں جناب
لطف اللہ خاں کی وہ لائبریری ہے جس میں مشاہیر
کی آوازیں محفوظ ہیں۔ مختلف شعبوں کے نمایاں افراد
کی آوازیں کسی وقت بھی وہاں سے حاصل ہو سکتی ہیں [illegible]
سیاست، صحافت، شعر و ادب اور دیگر فنون لطیفہ
تمام [illegible]
جناب لطف اللہ خاں نے اپنی نوعیت کی واحد لائبریری
قائم کر لی ہے۔ جناب لطف اللہ خاں گلفشاں کے علاقے
میں رہتے ہیں جو نسبتاً مرکزی آبادی کے علاقوں سے
دور ہے۔ مجھے ایسا لگا کہ انہوں نے شعراء ادبا کے
آوازوں کی صدا بندی کے لئے شہر میں اپنے نمائندے بھی
مقرر رکھے ہیں چنانچہ ہم دوستوں نے جو کلام پڑھ رکھا تھا
وہ بھی تو پہلے سے ان کی دسترس میں تھا۔ ایک

شاعر صبا اکرام، علی حیدر ملک، رعنا اقبال اور ظہور الحسن
اور میں نے ___ کو سب لطف اللہ صاحب کے یہاں
LOTFULLAH AUDIO LIBRARY کی
زیارت کے لئے نکلے۔ اس پورے ادارہ کو دیکھ کر مجھے حیرت
ہوئی کہ یہ سب کچھ ایک فرد کی اکیلی کوشش کا نتیجہ ہے
صدا بندی کے لئے ایک حصہ کو ایر کنڈیشنڈ رکھا جاتا
ہے۔ ساری چیزیں بڑے سلیقے سے رکھی ہوئی ہیں۔ آوازوں
کے کیسٹ کو انگریزی کے طریقہ پر ایسی CATALOGU-
ING کے ساتھ رکھا گیا ہے کہ مطلوبہ کیسٹ فوراً
ہی نکل آئے۔ جناب لطف اللہ خاں نے کافی دیر اپنے پروجیکٹ
پر گفتگو کی۔ امکانات اور خدشات کا بھی ذکر کیا۔ حکومت
کی بے توجہی کی بات آئی تو میں نے کہا کہ اگر حکومت کی طرف سے
بھی یہ پراجیکٹ ہو جائے تو شاید اس کے عملے اس کی دیکھ
ریکھ بھی نہیں کر پائیں گے اس لئے کہ جس ذاتی دلچسپی
اور انہماک سے وہ خود کام کر رہے ہیں ظاہر ہے سرکاری
ملازمین کو اس سے کیا تعلق۔ یہ سچ ہے کہ جناب لطف
اللہ خاں نے اپنی زندگی کا قیمتی حصہ اس کام کو جمع
کرنے میں خرچ کیا ہے۔ انہوں نے ان ساری آوازوں کو
محفوظ کر لیا ہے۔ اور سب کچھ اپنی جیب خاص سے ہوا
گیا ہے۔ حکومت چاہے تو مالی تعاون کر کے اسے آگے
بڑھا سکتی ہے۔ گفتگو کے دوران انہوں نے پر تکلف
ضیافت بھی کی اور پھر اپنے ریکارڈنگ روم میں ہم سب کو
... مخلوقات کی ریکارڈنگ کی ... [illegible]
شوق کو دیکھ کر ... ریکارڈنگ ختم ہوئی تو
اور ہم نے دوستوں کے پاس ... [illegible]
انہوں نے پھر ... طلب کیا اور ایک دوسرے سیشن میں
لے گئے۔ پتہ چلا ہے تو ... کا شعبہ ... [illegible]

بیٹھ کر یادوں کا حساب بے باق کر رہا ہوں۔

تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ
جب آنکھ کھل گئی تو زیاں تھا نہ سود تھا



تصویر کشی بھی ہوتی۔ ان کے پاس فن کاروں کی چیزوں
وعدے [illegible] قرینے سے محفوظ اور مرتب ہیں کہ کبھی
کسی وقت بھی کسی کی [illegible] نکالی جا سکتی ہے۔ اب پتہ
چلا کہ لطف اللہ خاں صاحب کا یہ ادارہ دراصل
AUDIO-VISUAL LIBRARY ہے (۱۹۱[illegible]
فن دوستی، اس قرینے اور سلیقے اور اس شوق و [illegible]
سے آدمی بہت متاثر ہوتا۔ سچ ہے۔

بے منت کوہکن کوئی جوہر نہیں کھلتا
روشن خرد تیشہ سے ہے خانۂ فرہاد

وہاں سے واپس آکر ہم لوگ فاطمہ حسن کے یہاں پہنچے
یہ وہی فاطمہ حسن ہیں جن کی نظموں نے پاکستان میں ایسی
دھوم مچائی ہے کہ آواز ہندوستان تک پہنچتی ہے۔ ان
کا ذکر آگے پھر آئے گا اور بار بار آئے گا ابھی تو صرف یہ بتانا
ہے کہ ہم لطف اللہ خاں صاحب کے یہاں سے [illegible] پہنچے
جب کہ رات ہو چکی تھی۔ کھانے کا وقت تھا، کھانا بھی
تیار تھا [illegible] کھانے کے بعد واپسی کے لئے
تیار ہوئے تو فاطمہ حسن نے [illegible] تصویر کی فرمائش
کی۔ کیمرہ آگیا۔ تصویر کھینچی گئی۔ تصویر دھل کر ایک
کاپی میرے پاس آچکی ہے۔ یہ تصویر ابھی میرے [illegible]
ہے۔ اسے دیکھتا ہوں تو ایک فریب التباس میں مبتلا
ہو جاتا ہوں۔ مجھے لگتا ہے میری داہنی طرف فاطمہ حسن
کھڑی ہیں [illegible] ان کے بازو [illegible] اپنے
بائیں بازو میں علی حیدر ملک کا خلوص محسوس کر رہا
ہوں اور ان کے ساتھ ہی صبا اکرام بھی موجود ہیں۔
اپنائیت کی ایک گرمی سی ہے جس پر لمس کا شائبہ
ہوتا ہے — مگر التباس محض التباس ہے
[illegible]

شباب للت
شملہ

غزل میں اپنی نئے اذہاں انقلاب ہوں میں
اسی خطا کے لئے مورد عتاب ہوں میں
میں چھپیں جاؤں تو اک بحر بے کنار بھی ہوں
جو اپنے آپ میں سمٹوں تو اک حباب ہوں میں
نئی رتوں کی ہوائے ازل لباس میرا
بجا ہے مجھ پہ یہ تہمت کہ بے حجاب ہوں میں
تم آج ہی مجھے بک شیلف سے ہٹا دو گے
کتاب ہوں مگر اردو کی اک کتاب ہوں میں
خود اپنے بارے میں لیڈر نے کر لیا تسلیم
جو روشنی نہیں دیتا وہ آفتاب ہوں میں
کتاب دل میں جسے رکھ کے آپ بھول گئے
مرے حضور! وہ سوکھا ہوا گلاب ہوں میں
رواں دواں ہوں سمندر سے اپنے ملنے کو
ندی کے سینے میں اک موجِ اضطراب ہوں میں
کسر تو کوئی نہ چھوڑی تھی دشمنوں نے شباب
مگر دعا سے بزرگوں کی کامیاب ہوں میں

ساتھ ترا اے جانِ وفا جب دو ہی قدم پر چھوٹ گیا
ایک لہو کا فوارہ سا روح کے اندر چھوٹ گیا
وائے مقدر دامنِ جاناں ہاتھ میں آ کر چھوٹ گیا
میرے لبوں تک آتے آتے ہاتھ سے ساغر چھوٹ گیا
سب سے گلے مل ملنے والی! عصمت ہے تیری انمول
واقف اس کا لازم ہے گر ہاتھ سے گوہر چھوٹ گیا
کیا اس کو پاداش کا خطرہ کیا اس کو قانون کا خوف
رشوت دے کر قید ہوا تھا رشوت دے کر چھوٹ گیا
ملا برک کا بیچارہ بھٹک گیا ہوں جنگل میں
وہ راجا جوں کر سوں کا جس کا لشکر چھوٹ گیا
چوک کے بیچوں بیچ پڑی تھی وہ کس کی لاش تھی
ایک فسادی نے دیکھی تو ہاتھ سے خنجر چھوٹ گیا
ہم نے بھی کچھ سوچ سمجھ کر کا خوں کر اپنا ہاتھ
یہ مت پوچھو کیوں ہم سے پچھلا بستر چھوٹ گیا
اب تو نہیں اس دل کو تمنا کسی سہارے کی
اب تو شباب زمانہ گذرا ہم سے سمندر چھوٹ گیا

ضیاء الانجم، جبلپور

آنکھوں کی گلیوں سے جو گزرا وہ منظر بھیجنا — [illegible] کی اساس ایسی تھی
کورے لب کے واسطے منطق پیمبر بھیجنا — پی گیا میں کہ پیاس ایسی تھی
چاند بجھے جگنوؤں کا کیا بھروسہ کیجئے — میرے آگے [illegible] خود کو
[illegible] جیسا روشن اپنا پیکر بھیجنا — کہ ہوا [illegible] حبس ایسی تھی
[illegible] خواہشوں کی [illegible] — منہ بھی کرتے تو خاک! کیا کرتے
[illegible] نے لفظوں کے خنجر بھیجنا — مفلسی میرے پاس ایسی تھی
[illegible] اپنی انا کے سمندر کو — ہمارے گلشن پہ راج اس کا ہے
اے [illegible] ایسا لشکر بھیجنا — [illegible] ایسی تھی
[illegible] اپنے [illegible] — اس کے آنے سے آ گئی رونق
[illegible] خوشبو [illegible] بھیجنا — دل کی دنیا اداس ایسی تھی
شام [illegible] — [illegible] ہے سمندروں نے رہا
میرے [illegible] بھیجنا — تشنگی ہے بلا کی پیاس ایسی تھی
جاگ جائے جس سے میرے [illegible] — اسے عطا حرف حرف [illegible]
اب کے [illegible] بھیجنا — [illegible] پیاس ایسی تھی
ایک [illegible] صورت [illegible]
ایسا کوئی [illegible] بھیجنا

پرکاش تیواری، نئی

سانچے میں کرب و درد کے ڈھلتی
کھا کھا کے غم یہ زندگی پلتی ہے

جیتا جہاں سمیٹ کے طوفان [illegible]
آنکھوں میں لہر لہر مچلتی ہے

سینے میں تلخیاں لئے صہبا کے
قطرہ بہ قطرہ جام میں ڈھلتی

خانہ خراب دل میں تمناؤں
امیدوں کے لباس بدلتی

جنگل کی کوئی راہ ہے اجنبی
تنہائیوں کا زہر نگلتی ہے

کیسی ہے آگ وقت کی [illegible]
شیشے کی طرح جان پگھلتی

علیم صبا نویدی

جسم کس کا ہے، جان کس کی ہے
روحِ پرور اڑان کس کی ہے
کہیں ظاہر میں وہ نہیں موجود
پھر یہ باطن میں شان کس کی ہے
میں بھی ششدر ہوں وہ بھی ہیں حیراں
یہ مہک درمیان کس کی ہے
دور دلی سے رہنے والا میں
میرے منہ میں زبان کس کی ہے
میں تو مہمان ہوں وقت کے گھر کا
یہ زمیں میزبان کس کی ہے
میں فلک آشنا تھا اونچا تھا
پھر بدن میں تھکان کس کی ہے
یاد وہ کوئی ہے یا کہ عداوت علیم
یہ نئی داستان کس کی ہے

۵۵

یہ کون آنے کو تھا اہتمام کس کا تھا
دلوں میں جلوہ فشاں لب پہ نام کس کا تھا
خزاں کے پیڑ بھی سجدہ کناں ہوئے ہر سو
سرِ بہارِ چمن جشنِ عام کس کا تھا
بہار کرنے لگی تھی طواف روز و شب
یہ سبز پتوں پہ لکھا کلام کس کا تھا
زمانہ پوچھ رہا تھا، زمیں بھی ششدر تھی
ورق ورق پہ نمایاں یہ نام کس کا تھا
گواہی دے گی زمیں وقت ہی بتائے گا
دلوں میں آگ لگانے کا کام کس کا تھا
جہانِ شعر میں مانندِ آفتاب تھا وہ
صباؔ رسولِ غزل تھا، غلام کس کا تھا

۸۸

میں کہاں اور میں کب پوشیدہ
ذات ہے میری عجب پوشیدہ
دن میں روپوش ہے اک اور کبھی دن
شب میں آکے اور ہے شب پوشیدہ
پھول ہی پھول میری جھولی میں
ہے مرا دستِ طلب پوشیدہ
در و دیوار بھی چپ، لوگ بھی چپ
سب کی چپ میں ہے سبب پوشیدہ
ہے انوکھا مرا تخلیق کا رنگ
بے ادب میں ہے ادب پوشیدہ

فرحت [illegible]، جلال نگر، خانیوال

منور حسن خلش آشنا رہا ہوں میں
تنہا میں بھی پریشان سا رہا ہوں میں
جہاں غم میں [illegible] رات پوچھ
اک آئینہ کی طرح سے صدا رہا ہوں میں
تمہارے شہر حسیں میں سکون دل کے لئے
کئی مسافتیں طے کر کے آ رہا ہوں میں
کتاب زیست کا ہر باب جس سے [illegible] ہے
وہ خون دل کا فسانہ سنا رہا ہوں میں
ہر ایک شخص ہے [illegible]
جہاں سے [illegible] زخم کھا رہا ہوں میں
صعوبتوں میں بھی [illegible] رہا محدود
بکھر گیا تو زمانے پہ چھا رہا ہوں میں
[illegible] قائم [illegible] دنیا میں
[illegible] رہا ہوں میں
گوارا کی ہے [illegible] برتری تسلیم
انا پہ کیا تو ہر سو [illegible] رہا ہوں میں
اب اعتماد کی فہرست میں بھی نام نہیں
سزا خلوص وفا کی یہ پا رہا ہوں میں
کسی کے [illegible] فرحت
[illegible] رہا ہوں میں

★

فراغ روہوی، کلکتہ

اس حسن کے پیکر کا بدل ہے کہ نہیں ہے
دیکھو تو حسیں میری غزل ہے کہ نہیں ہے
بلبل نہ بنا کر و الفاظ کے [illegible]
یہ دل بھی تو شیشے کا محل ہے کہ نہیں ہے
تدبیر کا تیشہ تو مرے پاس ہے، لیکن
تقدیر کا لکھا بھی اٹل ہے کہ نہیں ہے
دو چار قدم پر تو گھنا پیڑ ہے، لیکن
معلوم نہیں شاخ پہ پھل ہے کہ نہیں ہے
سوچا بھی کرتا ہوں یہی تنہائی میں اکثر
اچھا کوئی اپنا بھی عمل ہے کہ نہیں ہے
دیکھا کوئی پرچہ تو یہی سوچ کے دیکھا
اس میں بھی کہیں میری غزل ہے کہ نہیں ہے
مانا کہ جناب آپ ہیں مشہور سخنور
اس شہر میں بھی کوئی بدل ہے کہ نہیں ہے
مانا کہ فراغ آپ کو نسبت ہے کسی سے
لیکن یہ مسائل کا بھی حل ہے کہ نہیں ہے

★

مقبول منظر، سلم گڑھ، ڈالٹن گنج

وہی تقدیر کا مارا ہوا ہے
جسے تدبیر سے دھوکا ہوا ہے

جو دریا صورتِ قطرہ ہوا ہے
سمٹ کر بھی بہت پھیلا ہوا ہے

خیال آئینہ جس کو نہیں تھا
بھری محفل میں وہ رسوا ہوا ہے

مری گفتار کا شکوہ جہاں تھا
خموشی کا وہیں چرچا ہوا ہے

ہوا لے جائے گی اس کو اڑا کر
جو پتا شاخ پر لٹکا ہوا ہے

سمجھتے تھے جسے ہم دوست منظر
وہ [illegible] دشمن کا ہوا ہے

شہرِ قاتل میں تم اگر چلنا
لے کے ہاتھوں میں اپنا سر چلنا

رہروی کا یہی تقاضہ ہے
راہزن سے نہ بے خبر چلنا

کام لینا حواس ہی سے سدا
گھر سے باہر جدھر جدھر چلنا

شب گذارو نہ راستے میں کہیں
شام ہونے سے قبل گھر چلنا

چھوڑ کر گھر چلے تو ہو منظر
لے کے ماں کی دعا مگر چلنا

نسیم سہسرامی، بیرو بھجور

میرا اپنا کہاں کوئی یارو
بوجھ لگتی ہے زندگی یارو
کیا کہوں کیسا کہ میرے بھائی نے
ٹھان رکھی ہے دشمنی یارو
خود میں بکھرا بکھرا سا لگتا ہوں
کیسی پروائی یہ چلی یارو
سوچتا ہوں کہ گھر سے گھبرا کر
خاک چھانوں میں دشت کی یارو
باغباں کہتے ہیں کہ گلشن کی
چھین لیتے ہیں تازگی یارو
ایسے ماحول میں رہا جو نسیم
بھول جائے گا شاعری یارو

جوگندر پال
دہلی

خوراک

وہ پانچوں بہنیں اسی چھوٹی سی کھولی میں رہتے تھے
چاہے بہت کام دھام کی تلاش میں نکل جاتے اور پانچوں ان
کے بچوں کا [illegible] تمام اوقات [illegible] کہانیاں لکھتا۔
بچے [illegible] کسی کو کوئی کام نہ تھا، خوراک سبھی
[illegible] ہی پڑے رہتے۔

ان میں سے ایک ننھا فرش پر لیٹے لیٹے کہانی کار کے بارے
میں بولا: "ہم سارا سارا دن روٹیاں پکاتے رہتے ہیں اور
اندر بیٹھا بادشاہ مزے سے ہاتھ پہ ہاتھ دھرے کرسی
میں بیکار رہتا ہے۔"

"ہاتھ پہ ہاتھ دھرے کہاں بیٹھا رہتا ہوں۔" لیے
بادشاہ نے دفاع میں کہا: "ساری صبح پڑا رہا تھا [illegible]
دن بھر بنیے کی دکان سے آٹا چرانے کی تاک میں لگا رہا۔"

"شاباش بادشاہ! تم واقعی بادشاہ ہو۔" سبھی
کہہ بیٹھے گئے۔ "کیا کچھ آٹا بھی چرا لائے؟"

"بڑی مشکل سے آٹے پہ ہاتھ صاف کیا۔" دو چار
[illegible] روٹیاں نکال کر
رکھنے لگا۔ "آؤ بیٹھو۔"

"مگر روٹی کے ساتھ کھائیں گے کیا؟"

"میرا سر۔" بادشاہ نے اپنا سر [illegible] کے [illegible]
"[illegible] کھا لو، بڑا مزیدار ہے۔"

چاروں اس کے ارد گرد بیٹھ کر روکھی روٹیوں پر ٹوٹ پڑے۔

"اب بادشاہ آج کل کیا لکھ رہے ہو؟"

"تمہارے بادشاہ کو کہانی لکھنے کے علاوہ اور آتا
ہی کیا ہے۔"

"کیوں؟ روٹیاں بھی تو چرا لیتے ہو۔"

"روٹیوں کا کیا ہے؟ وہ آٹا ہو تو تم بھی پکا سکتے ہو۔"
بادشاہ ان کے لئے پانی کے پیالے بھر بھر کے رکھنے لگا۔

"میں نے ایک بڑی زبردست کہانی لکھی ہے۔ وہ یہ ہے
کہ اکیسویں صدی کے شروع میں آبادی اتنی بڑھ گئی اور
خوراک اتنی کم ہو گئی کہ دنیا کے آدھے لوگ راتوں رات
ہی مر گئے۔"

"کیا خوب! اکیسویں صدی آنے سے پہلے ہی
[illegible]"

"کیا جانتا ہے کہ یہ شیر ہے۔" بادشاہ
نے اس کی حرکت کو دیکھ کر [illegible]
[illegible] ہوتا ہے کہ [illegible] کے بیچ کا ہوتا ہے۔
"مگر اے بادشاہ، ہمارے لوگ کہاں اور کہیں
ملک کیوں! ۔ ہم [illegible] کے [illegible] کے
سمجھاتے ہیں۔"
"تم بابلیوں ملک کے لوگ ہو۔" اے بادشاہ
چلا سا گیا: "[illegible] میں چھوڑ دوں۔"
"غصے ہو گئے کہ ہے بادشاہ، [illegible]
ٹکڑے کر لیے ہیں۔"
شیر اپنے تینوں ساتھیوں کے ٹکڑے ہوؤں
کی طرف نگاہ دوڑا کر بے اختیار ہنسنے لگا۔ "مجھے لگتا
ہے کہ ٹکڑے [illegible] میرے [illegible] آگاہ ہے اور میں
شکار کی [illegible] میں بیٹھا ہوں۔"
"ہا ہا ہا ——— ہا!"
اب بادشاہ ان کی وحشیانہ ہنسی پر گھبرا سا گیا۔
"اچھا [illegible] کہاں کا ملک ہے؟ [illegible] سے میں
پوری [illegible] دنیا ہوں [illegible] بات پوری
کر کے [illegible] ———۔"
"[illegible] بادشاہ [illegible] ساتھی
[illegible] ہیں۔"
"[illegible] ——— [illegible] کے
ساتھی [illegible]
کر لیا ———۔"
"[illegible] آج [illegible]
[illegible]"

"اے [illegible] میں [illegible] بادشاہ
کو دن [illegible] سے [illegible] اللہ تعالیٰ [illegible]۔"
"اسے میں تمہیں بتاتا ہوں۔" شیر نے
کو مخاطب کر کے کہنے لگا: "کل میری ملاقات ایک بڑے
[illegible] کی کھال [illegible]
[illegible]
[illegible]
کرتے رہو ———۔"
"[illegible] ہے۔"
"[illegible]"
"میں کہاں [illegible]" شیر نے اپنی [illegible]
[illegible]
لینا چاہا، مگر وہ میرے ہاتھ سے پہلے [illegible]
[illegible] ———۔"
"تو [illegible]"
"[illegible]؟"
[illegible]
"[illegible]، مرنے [illegible]
[illegible] جاتے ہیں؟"
"اسے [illegible] کیا ہوا؟ [illegible]"
[illegible]
[illegible]
[illegible]

لقمان نے [illegible] شیرے کی طرف منہ پھیر لیا۔ تو
پھر تم نے اس [illegible] کو چھوڑ دیا؟"
"میں کیا چھوڑتا؟ وہ مجھے چھوڑ کر بھاگ گئی۔"
"واقعی تم دو کوڑی کے بھی نہیں شیرے۔ بنا
بنایا کھیل چوپٹ کر دیا۔" لقمان کی طرف بادشاہ نے
ایک اللہ دی بڑھائی تو وہ اچانک اس پر برس پڑا۔
"کیا کروں تمہارا سر؟ بیٹے کھا آتا تو چلا آتے، خالی مرچیں
مانگنے لے آئے؟"
"روٹی کھلانے والے کو کیوں خواہ مخواہ ڈانٹ
رہے ہو۔" شیرے لقمان کو ہدایت کر کے بادشاہ
کی طرف دیکھنے لگا۔ "اے بادشاہ تمہاری کہانی پھر
بیچ میں رہ گئی۔"
"ہوں تو کہانی ادھوری ہے۔"
"چھوڑو بادشاہ۔ تمہاری کہانیاں سن سن کر تو
ہم اکتا گئے ہیں۔"
"تو ٹھیک ہے بھاڑ میں جاؤ۔" بادشاہ چڑ کر
بیٹھ گیا۔ "تم اپنے کانوں سے سنتے رہو، میں اپنا
کھانا شروع کرتا ہوں۔"
"ارے جانے دو بادشاہ۔" لقمان نے جھک
کر اس کی گردن میں اپنا بازو ڈال لیا۔ اور پیار سے اس
کا منہ چوم لیا۔ پھر بولنا شروع کیا۔
"سنو کیا کہتا ہے؟" بادشاہ پھر اس کی طرف
گھوما۔ "صرف کہانی سنانے کے لئے [illegible]
[illegible]
[illegible]

"ہاں، آگے کا قصہ یہ ہے، سائنس دانوں نے
تجربے کر کے ثابت کیا کہ آدمی کا گوشت مرغے کے
گوشت سے کہیں زیادہ مزیدار ہے۔ اور آدمی کا مکمل
خوراک کا کام دیتا ہے — نہ آٹا، نہ چاول، نہ
دال — آدمی کا گوشت کھائیں تو اور کسی
چیز کی ضرورت نہیں رہتی —"
"سچ، بادشاہ؟"
"ہاں، بالکل سچ۔" اب بادشاہ نے جھک
کر جواب دیا۔ "تم ٹھیک ہاں کر دو تو میں تمہیں اپنی ران
سے کچھ گوشت کاٹ کر کھلاؤں گا۔"
سن کے لالو سے [illegible] لقمان اور شیرے نے
اپنی کرسیاں [illegible] آنکھیں بادشاہ کی ران پر جما لیں، تاڑ رہے
تھے۔ اور پھر شرما کر ایک دوسرے کی طرف دیکھتے
ہوئے شرمندگی سے ہنسنے لگے۔

تامل کہانی

جی ترومل وتی

شعیب احمد کمال

جنٹلمین

شام کے چار بجے وینکٹش (VENKATESH) کو منیجر نے بلا بھیجا۔ اور اگلے ہی لمحے وہ منیجر کے سامنے تھا۔ جو اس سے کہہ رہا تھا۔ "وینکٹش ترویندرم سے ابھی ابھی ٹیلی گرام آیا ہے سبری کی ملازمت کے سلسلے میں کل [illegible] کل صبح دس بجے اسے وہاں رہنا ہے۔ میں نے تمام کوششیں کر ڈالی ہیں۔ آج کی رات کا کوئی ٹکٹ کسی بھی گاڑی سے ریزرویشن نہیں مل سکا ہے۔ اگر تم کچھ کر سکو تو شکر گزار رہوں گا۔"

"آپ فکر مت کیجیے سر! کام ہو جائے گا۔" وینکٹش نے کہا "کمرشیل سپرنٹنڈنٹ سے میری واقفیت ہے۔ [illegible] میں کام ہو جاتا ہے۔" اس نے اتنا کہہ کر وہیں سپرنٹنڈنٹ سے نمبر ملایا۔ اور [illegible] اس کے سامنے رکھی [illegible] "ہیلو سر [illegible] وینکٹش [illegible] کتنے [illegible] کوشش کر رہے ہو [illegible] انتظار کی فہرست تین سو سے بڑھ گئی ہے۔ V.I.P کوٹہ بھی ختم ہو گیا ہے۔" [illegible] سپرنٹنڈنٹ نے جواب دیا۔ فون رکھتے [illegible] سر آپ سات بجے [illegible] ترویندرم میل (TRIVANDRUM MAIL) (TRIVANDRUM MAIL) [illegible]

کچھ ایسے ہی موقع ہوتے ہیں [illegible] کرنے کے اور وینکٹش یہ موقع کھونا نہیں چاہتا تھا۔

مدراس سینٹرل اسٹیشن پر وینکٹش نے کوشش کی کہ آخری وقت پر سفر ملتوی کرنے والوں کا ایک ٹکٹ مل جائے۔ یہ کچھ نہ ہو سکا۔ پلیٹ فارم [illegible] رہا تھا۔ ٹرین پلیٹ فارم پر پہنچ گئی تھی۔ اور ہر ڈبے کے اندر شانے سے شانہ چھل رہا تھا۔ [illegible] کو پکار، گرمی، گھٹن، [illegible] تک لوگ۔ چند لمحوں میں [illegible] مل جائے۔

پوری ٹرین میں صرف [illegible] اور یہ ڈبہ [illegible] کے [illegible] تھا۔ [illegible] کے [illegible] آیا۔ [illegible] پارسل [illegible]

اسے [illegible] رستم اس کی جانب آیا۔ "ہیلو
[illegible] کہاں جا رہے ہو؟"

مرکزی [illegible] نے جواب دیا۔ "میں نہیں
منیجر کا بیٹا، تم غلط سمجھ رہا ہے۔ لیکن مجھے حال ہی میں کل
صبح وہاں رہنا ہے۔ پھر ریزرویشن نہیں مل سکا۔ تم کچھ
کر سکو گے؟"

"آؤ میرے ساتھ۔" رستم نے جواب دیا اور [illegible]
کو جیسے کسی نے طویل ملاقات کے بعد بستر سے اٹھایا ہو، وہ
[illegible] رستم کے ساتھ چلا۔

رستم اسے ایک ایسے ڈبے کے پاس لے گیا
[illegible] کی ایک چھوٹی تھی۔ اس ڈبے کا نصف حصہ
[illegible] اور باقی آدھا خالی تھا۔

"[illegible]" رستم نے پلٹ کر [illegible] کو آواز دی۔
[illegible] کیا تھا۔ تمہیں [illegible] ہے
[illegible] ایک سپاہی نے ایک [illegible]
[illegible]

"آؤ [illegible] آ گئے ہیں! ہماری [illegible] سے
[illegible] میں ایک [illegible] ہوں
[illegible] صرف ایک [illegible] کی [illegible]
[illegible] اپنا [illegible] بند رکھو۔ اور
صرف ایک [illegible] کا ذکر کرو [illegible]
[illegible]

[illegible] ہو گیا۔
[illegible] کے کان میں سرگوشی کی۔ "یہ
[illegible] نہیں جانتا اس پاس ہے،
کیونکہ صرف آدھا [illegible] ہے۔ [illegible]

ہم ریلوے کے لوگ کبھی ایسے اوقات میں اپنے دوستوں
اور رشتے داروں کی مدد کرتے ہیں۔ آ جاؤ، [illegible] کوئی
دوسرا اس میں گھسے گا بھی نہیں۔" ڈبے کے اندر جب
دونوں داخل ہوئے تو دیکھا کہ ساری ہی نشستوں
اور سونے کی جگہوں پر ریلوے اخبار کے پلندے سے [illegible]
ہوئے ہیں۔

"ہاں۔ بدمعاشوں نے ساری جگہ گھیر لی ہے"
رستم نے یہ کہتے ہوئے جھٹکے کے ساتھ ایک بڑا اور لمبا
[illegible] دروازے
کی جانب پھینک دیا۔ پھر [illegible] سے کہا۔ "تم اپنے
لڑکے کو یہاں سلا دو" اور تبھی دو لڑکے دروازے
کے پاس نظر آئے جو [illegible] نظروں سے رستم کی جانب [illegible]
رہے تھے۔

"کس نے یہ کپڑے یہاں رکھے ہیں؟" رستم
نے ان سے پوچھا۔

دونوں میں سے کسی نے جواب نہیں دیا۔
"جاؤ" رستم نے [illegible] اور دونوں کھسک گئے۔
[illegible] نے رستم کا شکریہ ادا کیا کہ اس بروقت امداد
کے لئے۔ پھر رستم واپس ہونے لگا۔ [illegible]
پاس [illegible] ایک [illegible] کی جانب [illegible]
"ہیلو جنٹلمین!" ایک [illegible] سا شخص [illegible]
[illegible] نشے کے [illegible]، [illegible]
[illegible] ہاتھوں [illegible]، [illegible]
[illegible] تھا۔ رستم کی آواز [illegible] سر ہلایا۔ [illegible]
اپنا [illegible] کیا۔ اور [illegible]
[illegible]

"اوکے گڈ لک" رتنم نے کہا اور چلا گیا۔

وینکٹش نے ڈبے کا جائزہ لیا۔ رتنم نے اس سے کہا تھا کہ صرف آٹھ ملٹری کے لئے مخصوص ہونے کی بات ایک راز ہے لیکن اس وقت ایسا لگ رہا تھا کہ یہ ایک کھلا راز ہے۔ کیونکہ آدھا چھوڑ پورا ڈبہ لوگوں سے کھچا کھچ بھر چکا تھا۔ ملٹری والے لوگوں نے ڈرا دھمکا کر، بہلا پھسلا کر ہتھیار ڈال چکے تھے۔ اور کچھ عجیب سے تناظر دیکھنے کو مل رہے تھے۔

ایک قلی نے مسافر کو نشست دلانے کا وعدہ کیا تھا۔ اور اب اندر گھسنے کی جگہ نہیں تھی۔ اور مسافر قلی پر برس رہا تھا۔ تبھی اس جینٹلمین نے جس سے رتنم نے گفتگو کی تھی نے مداخلت کی اور مسافر سے کہا نہیں قلیوں اور دوسرے لڑکوں وغیرہ سے نشستیں حاصل کرنے کا کام نہیں لینا چاہئے۔ ان لوگوں کی ہمت توڑنی ہے نہیں۔ ریلوے کے حکام اس لعنت سے چھٹکارا پانے کی ہر ممکن کوشش میں مصروف ہیں۔ لیکن ہم۔ اس لئے دس پانچ گنی کے بجائے ہم اس کے دیکھ ریکھ میں آگئے آگئے ہیں جینٹلمین کی بات سن کر ایک دوسرے مسافر نے ہانک لگائی ___

"انسان کا کبھی تو گزارہ ہونا ہے۔ یہ آئیڈیل ہے نیا کرنے دو نہیں یہ کام۔"

"ہاں ہاں! گزارہ ہونا چاہئے" جینٹلمین نے جواب دیا۔ "پر مسافروں کی اگر وہ انسان کی سہولت قیمت پر نہیں۔ ہی دیکھو ہم سات دوست ہیں۔ جو گنتور جا رہے ہیں۔ ہمنے قبل ہی ہم اسٹیشن پہنچ گئے تھے اسلئے یارڈ جا … … … اور بیچنے کی بجائے کر

آگئے۔ ہمارے سامنے ہی باقی جگہ چھ کروں اور قلیوں نے سنبھالی تھی۔ ابھی بھی میرے دوست ریزرویشن کی کوشش میں لگے ہیں۔ اگر مل جائے گی تو میں بھی چلا جاؤں گا۔"

منیجر کا بیٹا سبری سات بجکر ۴۰ منٹ پر نمودار ہوا ہانپتا، کانپتا، دوڑتا لپکتا، ہر ڈبہ جھانکتا کھنگالتا۔ وینکٹش نے دور سے ہی اسے دیکھ لیا اور لپک کر اسے کھینچ لیا۔ اور اس کی جگہ بٹھا دیا جو رتنم دلا گیا تھا۔ سبری نے شکریہ ادا کرنے کی بجائے اسے ایک بوتل تھمائی اور پانی مانگا۔ وینکٹش بوتل ہاتھ میں لئے بھیڑ کو چیرتا اور لوگوں کی باتیں سنتا، دھکے کھاتا ڈبے کے دروازے تک پہنچا۔ تبھی اس کے کانوں تک جینٹلمین کی آواز پہونچی جو کسی مسافر سے کہہ رہا تھا۔

"دراصل میں نے اپنے دوست کے لئے قلی کو پانچ روپے دیکر ایک نشست حاصل کی تھی، تم چاہو تو پانچ روپے دے کر وہ سیٹ حاصل کر سکتے ہو، کیونکہ میرے دوست کو ریزرویشن مل چکا ہے۔"

وہ مسافر ہچکچایا تو دوسرے مسافر نے پانچ روپے کا نوٹ جینٹلمین کے ہاتھ میں تھما دیا۔ اور جینٹلمین نے ہاتھ کے اشارے سے سامنے والی نشست کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "تو لیا اٹھا کر بالائی برتھ میں ڈال دو اور اطمینان سے بیٹھ جاؤ۔"

وینکٹش کو عجیب سا لگا۔ اس نے جینٹلمین کی طرف دیکھا۔ اپنی جانب دیکھتا پا کر جینٹلمین مسکرایا پھر وینکٹش پانی لینے اتر گیا۔

پانی سے بھری بوتل سبری کو دیکر وینکٹش پلیٹ فارم پر کھڑا ہو گیا۔ اور دیکھتا رہا کہ جینٹلمین … … [illegible]

نئی کتابوں کا تعارف

(تبصرہ کے لئے کتابوں کی دو جلدوں کا آنا لازمی)

خموشی بول اٹھی

کتاب :- خموشی بول اٹھی
شاعر :- عبدالاحد ساز
صفحات :- ۱۹۱ قیمت :- چالیس روپے
مبصر :- مشتاق مدنی (پونہ)
ناشر :- قلم پبلیکیشنز، ۔ مریا پو کھونے اسٹریٹ، بمبئی ۳ (۱) مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، بمبئی، دہلی، علی گڑھ

عبدالاحد ساز نئی نسل کے ان شعراء میں سے ہیں جنھوں نے غزل کو ایک نیا آہنگ، نئی جہت، نیا رنگ و اسلوب دیا ہے۔ فی زمانہ طبقۂ عوام و خواص میں غزل کی مقبولیت چاہے وہ کتب و رسائل کی شکل میں ہو یا کیسٹ کی شکل میں یا پھر اسٹیج یا ٹی۔وی غزل سنگرز کے ذریعہ، غزل بہرحال دیوان خانوں اور مخصوص حلقوں سے نکل کر راستے، چوک، بازار، گلیوں تک آگئی ہے اور غزل کی اس ہمہ جہت و ہمہ طبقہ کامیابی میں جہاں نئے شاعروں کی کوششیں اور جمالیاتی رنگ و حسن اور اثر انگیزی ہی تو کام کر رہی ہے۔

عبدالاحد ساز متعدد معیاری رسائل میں [illegible] ہیں۔ میں نے بعض اوقات انہیں رسائل کے پورے صفحہ پر امتیازی شان کے ساتھ جلوہ فگن دیکھا ہے۔ حال ہی میں ہفت روزہ بیباک (مالیگاؤں) نے ان پر گوشہ بھی شائع کیا تھا۔ جس میں ان کی شخصیت، فن اور شاعری کے ان چھوٹے اور پوشیدہ پہلو بھی مؤقر قلم کاروں نے سامنے لائے تھے۔ میں اسے اپنی بدقسمتی ہی سمجھتا ہوں کہ بیباک کے گوشہ میں ان پر میرا کوئی مضمون نہ تھا۔

عبدالاحد ساز کا شعری لہجہ سراسر جمالی ہے جو کہ جدید شاعری کی روح اور اس کا پورا فلسفہ ہے۔ ورنہ شاعری نے وہ دن بھی دیکھے ہیں جب شعروں کے نام پر بھول بھلیوں کی عمیق اور تاریک غاریں قارئین اور سامعین کے سامنے رکھ دی جاتی تھیں۔ عبدالاحد ساز کا شعری رویہ اور زاویہ خود میرے نظریۂ ادب سے اتنا ہم آہنگ ہے کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ ہر شعر بلکہ ہر مصرعہ تخلیق کے کرب و لذت سے گذر کر چنار کا ایک چھتنار درخت بن گیا ہے۔

کھلے میں پھول کی صورت، ترے وصال کے دن
ترے جمال کی راتیں، ترے خیال کے دن

نفس نفس نئی تہہ داریوں میں ذات کی کھوج
عجب تھے تیرے بدن، تیرے خد و خال کے دن

میں بڑھتے بڑھتے کسی روز تجھ کو چھو لیتا؟
کہ گن گن کے رکھ دیئے تو نے مری مجال کے دن

عبدالاحد ساز کی شعری وسعت کا دائرہ بھی بڑا متنوع اور ہمہ گیر ہے۔ مجموعہ میں شامل ۸۴ غزلوں کے علاوہ مختلف موضوعات پر ۲۶ تاثراتی نظمیں بھی ہیں جن میں ۶ نظمیں ایسی ہیں جن کو شاعر نے ابتدائے سخن کا نام دیا ہے۔ جیسے آرزو، گوشے، الوداع، عید اس برس وحشی کی، کہاں جانا ہے؟ زندگی روبرو، وغیرہ۔ اگرچہ یہ نظمیں ابتدائے سخن کے عنوان سے شامل ہیں مگر ان میں بھی ساز کی اپنے ذہن و قلم پر مضبوط گرفت کا بخوبی پتہ چلتا ہے ؎

کیا سناتے ہیں نئے لمحے کہانی دیکھ لیں
آ، تری باریکیاں اے زندگانی دیکھ لیں
تو بھی لے کر آ جلو میں لاکھ اسرارِ نہاں
ہم بھی ذوقِ جستجو کی بے کرانی دیکھ لیں
آزمالے تو بھی اپنی الہ دادی قوتیں
ہم بھی اپنے حوصلوں کی سخت جانی دیکھ لیں
(زندگی کے روبرو)

ان نظموں کے علاوہ جن مختلف نظموں میں ساز نے اپنے اظہار و تاثر کو لفظی قالب و پیکر عطا کیا ہے ان کی بھی ایک جھلک دیکھ لیجئے!

یہ نیم شب، یہ چاند، یہ واژدھوں کی بانیاں
استادہ خامشی میں یہ بارہ کمانیاں
محرابیں ہیں کھلی؟ کہ ہیں پیچاک سنگ سے
تاریخ کے جمال کی جلوہ فشانیاں
اوراق کھل رہے ہیں تصور کی آنکھ پر
سرگوشیوں میں وقت کی ہیں قصہ خوانیاں

دربار سا سجا ہے خموشی کے صحن میں
جاری شکوہ و رعب سے ہیں حکمرانیاں
(بارہ کمانی)

عبدالاحد ساز کی شعری لطافتوں میں حسن و جمال کی کیفیتیں اتنی فطری اور original ہیں کہ مصرعہ مصرعہ چاندنی میں ڈھلا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنے شعری زاویوں کو ایسا خوبصورت جمالیاتی آہنگ بخشا ہے کہ ان کی غزل رسائل میں، ٹی وی پر ریڈیو اور ویڈیو کیسٹ پر برابر برابر کامیاب رہنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ آج کل کہ computerised عہد میں جب کہ شاعری کی جہتیں اور ذمہ داریاں پہلے سے کہیں زیادہ وسیع اور متنوع ہو گئی ہیں۔ ساز کی غزلوں کو، جو کہ فطری سادگی، تازہ کاری اور حسن کاری سے مزین ہیں ہر ایک میڈیا MEDIA کا سہارا ملنا چاہئے۔ جہاں تک ان کے شعری مجموعہ کا تعلق ہے، وہ اس قدر خوبصورت، دیدہ زیب اور مضبوط چھپا ہے کہ ہر باذوق کے مطالعہ کی میز پر اس کتاب کی موجودگی خود صاحب خانہ کے اعلیٰ اور نفیس ذوق کا ثبوت فراہم کرے گی۔

نام کتاب: تنہا تنہا
شاعر: سید شکیل دسنوی
ضخامت و قیمت:- ۱۵۱ صفحات، نفیس کتابت و طباعت
قیمت: ۴۰ روپے

تبصرہ نگار:- تارا چرن رستوگی

سید شکیل دسنوی پیشے کے اعتبار سے انجینیر ہیں
ہاں جب دل و دماغ تخیلات سے بھرپور ہوں، زبان و بیان
پر قابلِ تعریف گرفت ہو شاعروں کے تصورات پر عبور ہو

معمولی بات نہیں ہے ۔ شاعری کا نفسیاتی تجزیہ یہی انکشاف کرتا ہے کہ تجربات وخیالات کو جذباتی معادلات سے ہمکنار کرتے ہوئے تحفیظ کرنا ہی شاعری ہے ۔ شکیل صاحب کے خیالات و تصورات اور ان کی الفاظ میں پیشکش لغایت دل آویز ہیں ۔ جذبے میں خیال کی لو اور خیال میں جذبے کا تحرک ایسے اوصاف ہیں جو گہرے مطالعہ و مشاہدہ سے پیدا ہوتے ہیں ۔ مجموعہ کا نام ہی کلیہ معنوی فراہم کرتا ہے یعنی اکیلے اکیلے ۔ تنہا کی تکرار گہری معنویت کی حامل ہے ۔ اڑلیسہ غیر اردو ریاست ہے ۔ جیسے کہ آسام اردو بیلٹ میں مشمول نہیں ہے ۔ فی الواقع ، ماحول تنہائی کا احساس پیدا کرتا ہے ۔ مگر تنہائی نے منفی اثرات مرتب نہیں کئے ہیں بلکہ شاعر کے جذبات و تصورات کو بے پناہ شدت آگیں کر دیا ہے ۔

نمونہ کلام :-

تجھ سے ٹوٹا ربط تو پھر اور کیا رہ جائے گا
انتشار ذات کا ایک سلسلہ رہ جائے گا
قربتیں مٹ جائیں گی اور فاصلہ رہ جائے گا
چند یادوں کے سوا بس اور کیا رہ جائے گا

تم نے کچھ بھی نہ کیا ، خاموش رہے
دو قطروں میں خواب ہمارا ڈوب گیا

کبھی ایک معصوم لڑکی مرے ذکر پر جھینپ جاتی تو ہوگی
حیا بار آنکھوں میں سپنے سجائے وہ کچھ سوچ کر مسکراتی تو ہوگی
وہ بن کر سنور کر اکیلے میں اکثر شکیل ایک قیامت جگاتی تو ہوگی
تصور میں مجھ کو قریب پا کر وہ شیشے سے نظریں چراتی تو ہوگی

(اس غزل میں مطلع و مقطع ہیں اور سبھی کیف آگیں تغزل میں ڈوبے ہوئے ہیں ۔)

وہ سراپا گلاب جیسا تھا
ایک حقیقت تھا خواب جیسا تھا

اس نوعیت کے تغزل آگیں حقیقت و خواب کے بہترین جرعات اس مجموعہ کلام سے قارئین کو مست و بیخود بناتے ہیں ۔

شکیل کے شاعرانہ اوصاف پورے مضمون کا مطالعہ کرتے ہیں ۔ اور وہ مضمون یہ ثابت کرے گا کہ ان کا شمار ملک کے بہترین شاعروں میں کیا جاسکتا ہے ۔

(بقیہ خطوط)

ادب سے وابستہ لوگ واقف ہیں ۔ پھر یہ بھی تصور کرنا غلط ہوگا کہ یہ صرف خوبصورت ، دیدہ زیب اور خوشنما حرف ہی ڈھال سکتا ہے اور کچھ نہیں جانتا ۔ شاعر اور ادیب نہ ہو یہ دوسری بات ہے لیکن اتنی شدبد تو رکھتا ہی ہے کہ وہ "خفتہ" کو خفتہ ہی کے مقام پر استعمال کر سکتا ہے ۔

کاتب میں تھوڑی یا بہت ایک خوبی یہ ضرور ہوتی ہے کہ وہ ہر قسم کی ٹیڑھی میڑھی تحریر کو پڑھ لیتا ہے لیکن بعض اوقات یہ بھی الجھن اور شدید کوفت کا شکار ہو جاتا ہے جب "خود ہی لکھے اور خود ہی پڑھے" جیسی تحریر کا سامنا ہوتا ہے ۔ اب کاتب بھلا کیا کرے یہ تحریر بھیجنے اور تنقید کرنے والوں کو سوچنا چاہیئے ۔

غلطیاں تو ہوں گی ہی اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا ۔ پروف ریڈنگ کے بعد بھی یہ امکان باقی رہ جاسکتا ہے ۔ کاتب کے سر منڈھنا جو روایت ہے اسے بھی برقرار رکھئے لیکن توہین آمیز ، حقارت آمیز اور بازاری جملوں سے احتراز کیجئے ۔ یہ میری استدعا ہے ———

سید عبدالاحد گیاوی ، گیا

شہرِ خیال

انفرادی مکتوب ــــ اجتماعی پیغام

زیرِ نظر مکتوب اگرچہ مدیرِ سہیل کے نام ہے مگر دراصل اس کے مخاطب وہ سارے لوگ ہیں جو کہیں نہ کہیں سے اردو زبان و ادب سے منسلک ہیں۔ اردو والوں کو اپنی زبان کی خاطر کیا کرنا چاہئے اور وہ کس طرح اپنے فریضے سے غافل ہیں؟ ایسے مسائل پر ہمیں سنجیدگی سے غور کرنا چاہئے۔ اردو کے لئے جس اخلاص کی ضرورت ہے کیا آپ اپنے عمل سے اس کا اظہار کرتے ہیں؟ اپنا جائزہ خود لیجئے۔

ــــ ادارہ ــــ

دعا کیجئے کہ میں واقعی مدھیہ پردیش اردو اکادمی کے ذریعے اردو کی بھرپور خدمت کرسکوں۔ اس کوشش میں رات دن لگا ہوا ہوں۔

میرا اپنا خیال ہے کہ اردو کو سب سے زیادہ نقصان ہم اردو والے ہی پہنچا رہے ہیں۔ ایک بڑی تعداد ایسے لوگوں کی پیدا ہوگئی ہے جو اردو کی خدمت کرنے کے بجائے اپنی خدمت اردو سے کرا رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عام طور سے گھروں سے اردو نکالی جارہی ہے۔ اردو اخبارات اور رسائل کو اس طرف متوجہ ہونا چاہئے اور اردو گھروں میں اردو کی محافظت کے لئے بیداری پیدا کرنی چاہئے۔

اردو کی محافظت کا مطلب اردو، اردو بولنے والوں کے گھروں میں عزت کے ساتھ زندہ رہے۔

سہیل برابر مل رہا ہے۔ بہت بہت شکریہ

آپ کا

عبدالقوی دسنوی، سکریٹری

مدھیہ پردیش اردو اکادمی ــــ بھوپال

ماہنامہ سہیل کے ۱۵ ویں جلد کا شمارہ ۵ واں
ملا۔ سہیل کو ہر طرف سے دیکھا کہ اس پر کہیں ماہ اشاعت
نظر آجائے مگر ناکام رہا۔ البتہ سہیل کے سرورق پر بڑی
خوبصورت خط پلیسی میں میرا نام اور پتہ تحریر ہے۔ سہیل
میرے نام بھیجنے میں محترم ظہیر غازیپوری صاحب اور جناب
والا دونوں کا شکریہ لازم ہے۔ آپ کی بڑی مہربانی بڑا
کرم کہ آپ نے ایک وقیع رسالے سے متعارف کرایا —
ماشاء اللہ سہیل گذشتہ ۱۵ سال سے شائع ہو رہا
ہے اور ایک ایسے مقام سے جہاں اسے باقاعدگی سے
جاری رکھنے میں آپ کو اب تک بے شمار مسائل کا سامنا
کرنا پڑ رہا ہے۔ میری دعا ہے کہ رب العزت آپ کے
مسائل حل فرمائے اور ادب میں جس صحت مند رجحان
کے لئے آپ نے سہیل کے جس مشن کو جاری رکھا ہے۔
وہ کامیاب و کامرانی سے طے ہوتا رہے۔

چند ماہ قبل محترم ڈاکٹر علیم اللہ حالی صاحب
بھی کراچی تشریف لائے تھے۔ میری ان سے ملاقاتیں ہوئیں۔
حالیہ شمارہ میں ان کا مضمون "ہم مسافر جہاں جہاں پہنچے" پڑھا۔
ڈاکٹر صاحب نے ابھی سفر کی ابتدا کی ہے۔ کراچی تک نہیں
پہنچے ہیں۔ مجھے ان کی بقیہ خطا کا شدت سے انتظار ہے
اگر آپ کرم کریں تو آئندہ سے سہیل میرے پاس ہر ماہ آ
سکتا ہے۔

یوں تو میں کراچی اور پاکستان کے کئی رسالوں
سے وابستہ ہوں تاہم "رعنائیاں" پہلا جریدہ ہے جو
میری ادارت میں شائع ہو رہا ہے اس کا اشتہار بھی
منسلک ہے سہیل میں جگہ دیتے رہیں گے تو مشکور رہوں گا
۔ سہیل کا اشتہار مذکورہ رسائل میں آتا رہے گا۔
جنوری تا مارچ میرا انڈیا آنے کا پروگرام ہے
میری لازمی کوشش ہوگی کہ اپنے وطن کلکتہ کو دیکھ لوں۔
اگرچہ میری پیدائش پاکستان کی ہے لیکن میرے ابا،
کا مسکن تو تھا۔ شاید آپ حضرات کے نیاز بھی حاصل
ہو جائیں۔

سید معراج جامی، کراچی (پاکستان)

○ امید ہے آپ مع متعلقین و رفقا بخیر ہوں گے۔
جریدہ سہیل پابندی سے مل رہا ہے۔ یہ آپ کی عقیدت و
سعادتمندی ہے جس کے لئے ممنون ہوں۔ میں ہی ادھر
صحت کی خرابی کی بنا پر مناسب طور سے اپنے اس
پسندیدہ جریدے کی خدمت سے قاصر ہوں۔ معاف
فرمائیں گے۔ ڈاکٹر تارا چرن رستوگی صاحب کو خط لکھیں
تو میرا اسلام ضرور لکھ دیں گے۔ ان کے بارے میں یہ معلوم
کر کے کہ وہ کینسر کے پرانے مریض ہیں۔ بڑا دکھ ہوا۔ مزاج
پرسی کے طور سے ڈاکٹر صاحب کو خط لکھا تھا۔ ادھر
ان کا کوئی خط نہیں ملا ہے۔

فضا ابن فیضی

○ کل سہیل کا تازہ شمارہ موصول ہوا۔
آپ یقین کریں کہ سہیل پر جتنا حق آپ کا ہے اتنا ہی
حق میں اپنا بھی سمجھتا ہوں اس کی جتنی ذمہ داری آپ
پر ہے اتنی ہی مجھ پر بھی عائد ہوتی ہے۔ اگر میں سہیل کے
لئے کچھ کر سکوں تو مجھے خوشی ہوگی۔ آپ جس یکسوئی اور
جانفشانی کے ساتھ ادب کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں
اسے دیکھ کر رشک ہوتا ہے۔
حالانکہ سہیل پہلے سے ہی ادبی حلقوں میں کا
مقبول ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اگر اس کے طرح دیے

...ہے اگر آپ تھوڑی تبدیلی لانے کی سعی کریں یہ اور مقبول ہوگا۔ میں دوسرے لوگوں کی طرح یہ نہیں مانتا کہ اردو میں پڑھنے والوں اور لکھنے والوں کی کمی ہے بلکہ میں تو یہ کہتا ہوں کہ اردو میں رسالے خریدنے والے اور اچھا لکھنے والے دونوں موجود ہیں اگر ہم TALENTS کی تلاش کریں۔ اردو میں ان کی کوئی کمی نہیں۔ لیکن بیشتر اردو رسالے گروہ بندی کے شکار ہیں اور تعصب کی عینک اتار کر دیکھنا نہیں چاہتے۔ ہم جب بہار نوازی پر اتر آتے ہیں تو بہار والوں کی گھٹیا چیزوں کو بھی شاہکار مان لیتے ہیں اور بہار سے باہر والے بھی یہی کرتے ہیں اس ذہنیت کا خاتمہ ہونا چاہئے۔ خواہ یہ بہار ہو یا کہیں اور ——— تخلیقات کے انتخاب میں کچھ اور محتاط ہونے کی ضرورت ہے۔

علیم اللہ حالی کا سفرنامہ بے حد پسند آیا۔
...وقی کی کہانی "ایک کمیونسٹ کی موت" مزہ دے گئی۔
شمارہ کے باقیہ مشمولات بس ٹھیک ٹھاک ہیں۔

اور ہاں! میری غزل کا مطلع غلط شائع ہوگیا ہے جو دراصل یوں ہے ؎

"جانے کی بستی سے یا خواب نگر سے آئے گا
کس کو بھی معلوم ہے پہلا تیر کدھر سے آئے گا

غزل میں "تیز" کے بجائے "میز" چھپ گیا ہے۔ براہِ مہربانی اگلے شمارہ میں تصحیح کے ساتھ میرے مجموعہ کلام کا اشتہار بھی شائع کردیں۔

نعمان شوق ، آرہ

○ ماہنامہ سہیل کے ذریعہ آپ اردو کی ترویج واشاعت اور نئے ادیبوں اور شاعروں کو قدر مدنیت سے متعارف کرانے کی گراں قدر خدمت انجام دے رہے ہیں۔ ہر موضوع پر

مضامین اور نظمیں شامل کرکے ماہنامہ کو دلچسپ بنانے کی کوشش بھی لائق تحسین ہے۔ کتابت اور طباعت کا کام اتنا پیچیدہ اور جان لیوا ہے کہ باوجود کچھ غلطیوں کا رہ جانا فطری ہے اور جسے قارئین فراخ دلی سے نظر انداز کرسکتے ہیں۔

اشاعت کے لئے ایک اور نظم ارسال خدمت ہے۔ ریڈیو، ٹیلی ویژن، اخبارات، سیاسی جلسوں اور ہڑتالوں کے ذریعہ چاروں طرف صبح وشام رونما ہونے والے واقعات پر اتنا پرچار ہوتا ہے کہ یہ واقعات اور ان پر نت نئے تبصرے دل ودماغ پر بوجھ بن جاتے ہیں اور جی چاہتا ہے کہ ان سے ہٹ کر کسی سدابہار موضوع پر کچھ کہا یا لکھا جائے۔ کہنے والے اسے فرار ہی کیوں نہ کہیں۔

شوکت صمدانی، خانپور

○ سہیل کا تازہ شمارہ موصول ہوکر طمانیت کا باعث ہوا، شکریہ۔ جناب تاراچرن رستوگی کا ڈاکٹر خلیق انجم کے حق میں مغز اور لائق مطالعہ تفصیلی مقالہ "غالبیات اور ڈاکٹر خلیق انجم پر تجزیہ ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ غالب شناسی کی صحیح تعریف کا نام بھی دیا جائے تو کچھ غلط نہ ہوگا۔ بیشتر دانشوروں کو غالب شناسی کا بخار ہے یا شعوری طور پر پھیلوایا گیا ہے۔ میرے خیال میں ایسے حضرات غلط فہمی یا خوش فہمی میں مبتلا ہیں۔

اقبال شناسی، غالب شناسی کا لیبل لگا دینا یا لگا لینا بہت آسان ہے۔ غالبیات کو بہ نظر غائر دیکھا جائے غالب کے کلام میں تہہ دار یا فلسفہ حیات کا حق ادا ... ان میں موجود ... سب کا اظہار ...

...مشکل کام نہیں۔ میں سمجھتا ہوں زیر نظر مقالہ نثر مقالوں [illegible] منفرد ہے اور غالب کے پرستاروں کے لئے نعمت [illegible] بھی ہے۔

اس مقالہ سے سہیل کے وقار میں مزید اضافہ ہوگا

عبدالمتین نیاز، بھوپال

○ سہیل ۵ میں ڈاکٹر تارا چرن رستوگی، [illegible] اور رؤف جاوید پسند آئے۔ طباعت پر توجہ دیجئے۔

منیر سیفی، پٹنہ

○ شمارہ ۵ موصول ہوا

آپ کا نمود اپنے اندر فکر انگیزی لئے ہوتا ہے۔ اس سے اتفاق کیا جائے یا اختلاف۔ لیکن اتنا تو ماننا ہی ہوگا کہ آپ اسے پورے خلوص اور دل سوزی کے ساتھ لکھتے ہیں۔ اسے پڑھ کر نثری نظم کا لطف بھی حاصل ہوتا ہے۔ سو وہ ایک الگ خوبی ہوگی!

خالد عبادی، دربھنگہ

○ آپ نے نمود میں ایک جگہ لکھا ہے "ہمیں آج تھوڑی دیر کے لئے ٹھہر کر یہ دیکھنا چاہئے کہ کل کیا لکھا گیا تھا اور آج جو ہم لکھ رہے ہیں وہ کل کے مقابلے میں کیسا ہے۔"

مجھے آپ کی اس بات سے پوری طرح اتفاق ہے لیکن معاملہ آپ کی اس بات سے ہرگز متفق نہ ہوں کہ لوگ آنکھیں موند کر کے صرف لکھتے ہی جانے کو سب کچھ سمجھتے ہیں اور ایسے لوگوں کی تعداد ہمارے یہاں زیادہ ہے اور یہ ایک افسوسناک حقیقت ہے۔

[illegible]، دربھنگہ

○ سہیل کے شمارہ ۵ کے "شہر خیال" کالم میں ایک خط منیر سیفی صاحب کا نظر سے گزرا۔

یوں تو یہ روایت بنی رہی ہے کہ غلطیاں کاتب حضرات کے سر بڑے اطمینان سے منڈھ دی جاتی ہیں۔ اور کاتب حضرات بھی تقریباً اس صورت حال کے عادی ہو چکے ہوتے ہیں۔ اور یہ کوئی ایسی بات نہیں جس کے لئے کچھ لکھ کر وقت ضائع کیا جائے۔ لیکن میں اس لئے لکھنے پر مجبور ہوا ہوں کہ منیر سیفی صاحب نے نعمان شوق صاحب کے شعر کے کاتب کے لئے جو جملہ استعمال کیا اور جس لفظ کے سہارے شعر کے غلط کتابت ہونے کی نشاندہی کی وہ انتہائی غلط اور قابل توجہ ہے۔ منیر سیفی صاحب جیسے عظیم المرتبت شاعر کے لئے اس قسم کے بازاری لفظ و جملے زیب نہیں دیتے۔ اس طرح ان کی صلاحیت مشکوک بن جا سکتی ہے۔

کتابت ایک پر وقار کام اور پیشہ ہے۔ اور کاتب حضرات کے لئے ذریعہ معاش۔ ممکن ہے کچھ حضرات لطور تفریح اور شوق سے کتابت کر رہے ہوں مگر اکثریت کے لئے یہ ذریعہ معاش ہی ہے جس سے وہ اپنی اور اپنے بال بچوں کی کفالت کرتا ہے پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ لاپرواہی اور غیر ذمہ داری کا مظاہرہ کرے اور خود اپنے پاؤں میں کلہاڑی مار لے۔

منیر سیفی صاحب اتنا تو ضرور جانتے ہوں گے کہ کتابت کے بعد مسودہ کو آنکھیں موند کر پریس کے حوالے نہیں کیا جاتا۔ کئی مراحل طے کرنے کے بعد پہنچتا ہے۔ پھر بھی چوک ہو جاتی ہے اور کاتب حضرات خاموشی سے اپنے سر غلطیوں کا قبول کر لیتے ہیں اور اُف تک نہیں کرتے۔ لیکن اس کا مطلب نہیں کہ جس کے جو دل میں آئے کہہ کر گذر جائے۔ اور نہ یہ والے سمجھیں کہ یہ قوم بڑی بے آبرو اور بے حیثیت ہوتی ہے۔ ار ادب میں اس قوم کی اہمیت و افادیت کی ہے اس سے

وہ اور کے لوگ۔ رتم نے کہا اور چلا گیا۔

ڈیکنش نے ڈبے کا جائزہ لیا۔ رتم نے اس سے کہا تھا کہ صرف آدھا ڈبہ [illegible] کے لیے مخصوص ہونے کی بات الگ رہ جاتی ہے لیکن اس وقت ایسا لگ رہا تھا کہ یہ ایک کھلا راز ہے۔ کیونکہ آدھا چھوڑ پورا ڈبہ لوگوں سے کھچا کھچ بھر چکا تھا۔ ملٹری والے لوگوں کو ذرا دھمکا کر، بہلا پھسلا کر ہتھیار [illegible] تھے۔ اور کچھ عجیب سے تناظر دیکھنے کو مل رہے تھے۔

ایک قلی نے مسافر کو نشست دلانے کا وعدہ کیا تھا۔ اور اب اندر گھسنے کی جگہ نہیں تھی۔ اور مسافر قلی پر برس رہا تھا۔ تبھی اس جنٹلمین نے جس سے رتم نے گفتگو کی تھی نے مداخلت کی اور مسافر سے کہا ہمیں ان قلیوں اور دوسرے لڑکوں وغیرہ سے نشستیں حاصل کرنے کا کام نہیں لینا چاہئے۔ ان لوگوں کی ہمت توڑنی ہے نہیں۔ ریلوے کے حکام اس لعنت سے چھٹکارا پانے کی ہر ممکن کوشش میں مصروف ہیں۔ لیکن ہم۔ اس پودے کی بیخ کنی کے بجائے اس کے دیکھ ریکھ میں لگے ہوئے ہیں جنٹلمین کی بات سن کر ایک دوسرے مسافر نے ہانک لگائی ـــــ

• ایسا ان کا گزارا ہوتا ہے۔ یہ انڈیا ہے اٹھیا۔ کرنے دو انہیں یہ کام۔

ان ہاں! کہنا چاہتے ہیں جنٹلمین نے جواب دیا۔ پر مسافروں کو اس سہولت کی قیمت پر نہیں۔ ابھی بھی سات دوست ہیں جو گھوم رہے ہیں۔ [illegible] جب ہی ہم اسٹیشن آ گئے اس لیے [illegible] کرنے [illegible] اور بیٹھنے کی جگہ بنا کر آ گئے۔ ہمارے سامنے ہی باقی جگہ [illegible] اور قلیوں نے سنبھالی تھی۔ ابھی تک میرے دوست ریزرویشن کا [illegible] میں لگے ہیں۔ اگر مل جائے گی تو میں بھی چلا جاؤں گا۔

منیجر کا [illegible] سات جگہ [illegible] پر [illegible] ہانپتا کانپتا، روتا لنکتا، پھر ڈبہ میں جا گھسا [illegible] نے دور سے ہی اسے دیکھ لیا اور لپک کر اسے کھینچ لیا اور اس کی جگہ بٹھا دیا جو رتم [illegible] اس کا شکریہ ادا کرنے کی بجائے اسے ایک [illegible] اپنا [illegible]۔

ڈیکنش بوتل ہاتھ میں لیے بیٹھ کر چہرا [illegible] کی باتیں سنتا۔ [illegible] ڈبے کے دروازے تک [illegible]۔ تبھی اس کے کانوں تک جنٹلمین کی آواز پہنچی جو کسی مسافر سے کہہ رہا تھا۔

• دراصل میں نے اپنے دوست کے لیے قلی کو پانچ روپے دے کر ایک نشست حاصل کی تھی۔ تم چاہو تو پانچ روپے دے کر وہ سیٹ حاصل کر سکتے ہو کیونکہ میرے دوست کو ریزرویشن مل چکا ہے۔

وہ مسافر ہچکچایا تو دوسرے مسافر نے پانچ روپے کا نوٹ جنٹلمین کے ہاتھ میں تھما دیا۔ اور جنٹلمین نے ہاتھ کے اشارے سے سامنے والی نشست کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا آپ تو لیا اٹھا کر [illegible] بیگ میں [illegible] اور [illegible] سیٹ ہو جائیے۔

ڈیکنش کو عجیب سا لگا اس نے جنٹلمین کی طرف دیکھا۔ اپنی جانب دیکھتا پا کر جنٹلمین مسکرایا پھر [illegible] پانی لینے چلا گیا۔

[illegible] قائم [illegible] کھڑکی [illegible] اور دیکھتا رہا کہ جنٹلمین [illegible]

نئی کتابوں کا تعارف

(تبصرہ کے لئے کتابوں کی دو جلدوں کا آنا لازمی ہے)

خوشبو [illegible]

نام کتاب:۔ خوشبو [illegible]
شاعر:۔ عبدالاحد ساز
صفحات:۔ ۱۹۱ قیمت:۔ چالیس روپے
مبصر:۔ مشتاق صدف (ممبئی)
ملنے کا پتہ:۔ [illegible] مرالی گھرو اسٹریٹ، ممبئی
(۲) مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، ممبئی، دہلی، علی گڑھ

عین ممکن ہے عبدالاحد ساز نئی نسل کے ان شعرا میں سے ہوں جنہوں نے غزل کو ایک نیا چہرہ، نئی جہت، نیا آہنگ اور اسلوب دیا ہے۔ [illegible] غزل کی [illegible] کتب و رسائل کی شکل میں جو [illegible] کی شکل میں [illegible] باقی ۔ وہی [illegible] کے ذریعہ غزل [illegible] [illegible] کہ غزل کی اس جہت [illegible] شاعروں کی [illegible] [illegible] اور [illegible] کام کر رہا ہے۔

عبدالاحد ساز [illegible] رسائل میں [illegible] نے بعض اوقات [illegible] رسالوں [illegible] خاں کے [illegible]

ساتھ جلوہ فگن دیکھا ہے۔ حال ہی میں جنت روزہ بیباک (مالیگاؤں) نے ان پر گوشہ بھی شائع کیا تھا جس میں ان کی شخصیت، فن اور شاعری کے ان چھوئے اور پوشیدہ پہلوؤں کو قلمکاروں نے سامنے لانے کی [illegible] میں اسے اپنی بدقسمتی ہی سمجھتا ہوں کہ بیباک کے گوشہ میں ان پر میرا کوئی مضمون نہ تھا۔

عبدالاحد ساز کا شعری لہجہ سراسر جمالی ہے جو کہ جدید شاعری کی روح اور اس کا پورا فلسفہ ہے۔ ورنہ شاعری نے وہ دن بھی دیکھے ہیں جب شعروں کے نام پر پہیلیاں، بلیوں کی مبہم اور تاریک فضا میں قارئین اور سامعین کے سامنے رکھ دی جاتی تھیں۔ عبدالاحد ساز کا شعری رویہ اور [illegible] خود ان کے لفظوں کا اسلوب ساتھ ہم آہنگ ہے کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ ہر شعر بلکہ ہر مصرعہ تخلیق کے کرب و لذت سے گزر کر جیسے کوئی چھتنار درخت بن گیا ہے۔

[illegible] ہست [illegible] کے دن
تیرے جمال کی [illegible] [illegible] کے دن

[illegible]
[illegible]

[illegible] بڑھ کے [illegible] کسی [illegible]
کوئی [illegible] کے [illegible] ہو [illegible]

عبدالاحد ساز کی شعری وسعت کا دائرہ بھی بڑا متنوع اور ہمہ گیر ہے۔ مجموعہ میں شامل ۸۴ غزلوں کے علاوہ مختلف موضوعات پر ۲۶ تاثراتی نظمیں بھی ہیں جن میں ۶ نظمیں ایسی ہیں جن کو شاعر نے ابتدائے سخن کا نام دیا ہے۔ جیسے آئینہ و گوشے، الوداع، عہد اس پہ وحشی کی، کہاں جانا ہے؟ زندگی روبرو، وغیرہ۔ اگرچہ یہ نظمیں ابتدائے سخن کے عنوان سے شامل ہیں مگر ان میں بھی ساز کی اپنے ذہن و قلم پر مضبوط گرفت کا بخوبی پتہ چلتا ہے ؎

کیا سناتے ہیں نئے لمحے کہانی دیکھ لیں
آ، تہہ بیداریاں اے زندگانی دیکھ لیں
تو بھی لے کر آ جلو میں لاکھ اسرار نہاں
ہم بھی ذوقِ جستجو کی بے کرانی دیکھ لیں
آزمالے تو بھی اپنی [illegible] قوتیں
ہم بھی اپنے حوصلوں کی سخت جانی دیکھ لیں

(زندگی کے روبرو)

ان نظموں کے علاوہ جن مختلف نظموں میں ساز نے اپنے اظہار و تاثر کو لفظی قالب میں پیکر عطا کیا ہے ان کی بھی ایک جھلک دیکھ لیجئے!

یہ نیم شب یہ چاند یہ رازدلی کی چاندنیاں
استادہ خامشی میں یہ بارہ کہکشانیاں
[illegible] کوئی [illegible] کرتی ہو [illegible] سنگ سے
[illegible] کی جلوہ [illegible]
ادراک [illegible] میں تصور کی آنکھ پر
[illegible] وقت کی [illegible] فراوانیاں

[illegible] شوق کے [illegible]
[illegible]
([illegible])

عبدالاحد ساز کی شعری [illegible] کی کیفیتیں اتنی فطری اور original ہیں کہ معروضی [illegible] ماحول میں ڈھلا ہوا محسوس ہوتا ہے [illegible] نے اپنے شعری زاویوں کو ایسا خوبصورت [illegible] بخشا ہے کہ ان کی غزل رسائل میں، ٹی وی پر [illegible] ویڈیو کیسٹ پر برابر کامیاب ہونے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ آج کل کہ computerised عہد میں جب کہ شاعری کی جہتیں اور ذمہ داریاں پہلے سے کہیں زیادہ اور متنوع ہو گئی ہیں۔ ساز کی غزلوں کو [illegible] تازہ کاری اور حسن کاری سے مزین ہیں ہر ایک [illegible] media کا سہارا ملنا چاہئے۔ جہاں تک ان کے شعری مجموعہ کا تعلق ہے، وہ اس قدر خوبصورت اور [illegible] اور مضبوط چھپا ہے کہ ہر باذوق کے مطالعے کی میز پر اس کتاب کی موجودگی خود صاحب خانہ کے اعلیٰ اور نفیس ذوق کا ثبوت فراہم کرے گی۔

نام کتاب: تنہا تنہا
شاعر: سید شکیل دسنوی
ضخامت و قیمت: ۱۵۱ صفحات، نفیس کتابت و طباعت
قیمت: ۴۰ روپے
تبصرہ نگار: تاراچرن رستوگی

سید شکیل [illegible] کے اعتبار سے [illegible]
[illegible] سے بھرپور ہیں [illegible]
[illegible]

عمیق بات ... ہے۔ شاعری کا نفسیاتی تجزیہ یہی انکشاف کرتا ہے کہ ... و خیالات کو جذباتی معادلات سے ہمکنار کرتے ہوئے تلفظ کرنا ہی شاعری ہے۔ شکیل صاحب کے خیالات و تصورات اور ان کی الفاظ میں پیشکش نہایت دل آویز ہیں۔ جذبے میں خیال کی لو اور خیال میں جذبہ کا محرک ایسے اوصاف ہیں جو گہرے مطالعہ و مشاہدہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ مجموعہ کا نام ہی کلیہ معنوی فراہم کرتا ہے یعنی اکیلے اکیلے۔ تنہائی کی تکرار گہری معنویت کی حامل ہے۔ ازلیہ غیر اردو ساخت ہے۔ جیسے کہ آسام اردو بیلٹ میں شمول نہیں ہے۔ فی الواقع، ماحول تنہائی کا احساس پیدا کرتا ہے۔ مگر تنہائی نے منفی اثرات مرتب نہیں کئے ہیں بلکہ شاعر کے جذبات و تصورات کو بے پناہ شدت آگیں کر دیا ہے۔

نمونۂ کلام :-

تجھ سے ٹوٹا ربط تو پھر اور کیا رہ جائے گا
انتشار ذات کا ایک سلسلہ رہ جائے گا
قربتیں مٹ جائیں گی اور فاصلہ رہ جائے گا
چند یادوں کے سوا بس اور کیا رہ جائے گا

تم نے کچھ بھی نہ کیا، خاموش رہے
دو قطروں میں خواب ہمارا ڈوب گیا

کبھی ایک معصوم لڑکی مرے ذکر پہ جھینپ جاتی تو ہوگی
ہمارا آنکھوں میں سپنے سجائے وہ کچھ سوچ کر مسکراتی تو ہوگی
وہ پھر مسکرا کر اکیلے میں اکثر شکیل ایک قیامت جگاتی تو ہوگی
... مجھ کو قریب پا کر وہ آئینے سے نظریں چراتی تو ہوگی
... اور ... آگئیں

تغزل میں ڈوبے ہوئے ہیں۔)

وہ سراپا گلاب جیسا تھا
ایک حقیقت تھا خواب جیسا تھا

اس نوعیت کے تغزل آگیں حقیقت و خواب کے بہتر جذبات اس مجموعہ کلام سے قارئین کو مست و بیخود ... ہیں۔

شکیل کے شاعرانہ اوصاف پورے مضمون ... مطالعہ کرتے ہیں۔ اور وہ مضمون یہ ثابت کرے کہ ان کا شمار ملک کے بہترین شاعروں میں کیا جانا ہے۔

(بقیہ خطوط)

ادب سے وابستہ لوگ واقف ہیں۔ پھر یہ بھی تصور کرنا غلط ہوگا کہ یہ صرف خوبصورت، دیدہ زیب اور خوشنما ہی ڈھال سکتا ہے اور کچھ نہیں جانتا۔ شاعر اور ادیب پھر یہ دوسری بات ہے لیکن اتنی شدید تو رکھتا ہی ہے کہ "خفتہ" کو خفتہ ہی کے مقام پر استعمال کر سکتا ہے۔

کاتب میں تھوڑی یا بہت ایک خوبی یہ ضرور ہوتی ہے ہر قسم کی ٹیڑھی میڑھی تحریر کو پڑھ لیتا ہے لیکن بعض اوقات ... الجھن اور شدید کوفت کا شکار ہو جاتا ہے جب "خود ہی لکھا ... ہی پڑھے" جیسی تحریر کا سامنا ہوتا ہے تب کاتب بھلا کر ... یہ تحریر لکھنے اور تنقید کرنے والوں کو سوچنا چاہئے۔

غلطیاں تو ہوں گی ہی اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا پروف ریڈنگ کے بعد بھی یہ امکان باقی رہ جاتا ہے کہ کاتب سر زد ہونا ہو روایت ہے اسے بھی برقرار رکھئے لیکن ... حقارت آمیز اظہار کی ... سے احتراز کیجئے۔ ... ... گیا

شہرِ خیال

انفرادی مکتوب ـــ اجتماعی پیغام

زیرِ نظر مکتوب اگرچہ مدیر سہیل کے نام ہے مگر دراصل اس کے مخاطب وہ سارے لوگ ہیں جو کہیں نہ کہیں سے اردو زبان و ادب سے منسلک ہیں۔ اردو والوں کو اپنی زبان کی خاطر کیا کرنا چاہئے اور وہ کس طرح اپنے فریضے سے غافل ہیں؟ ایسے مسائل پر بھی سنجیدگی سے غور کرنا چاہئے۔ اردو کے لئے جس اخلاص کی ضرورت ہے کیا آپ اپنے عمل سے اس کا اظہار کرتے ہیں؟ اپنا جائزہ خود لیجئے۔

ادارہ

○ دعا کیجئے کہ میں واقعی مدھیہ پردیش اردو اکادمی کے ذریعے اردو کی بھرپور خدمت کر سکوں۔ اس کوشش میں رات دن لگا ہوا ہوں۔

میرا اپنا خیال ہے کہ اردو کو سب سے زیادہ نقصان ہم اردو والے ہی پہنچا رہے ہیں۔ ایک بڑی تعداد ایسے لوگوں کی پیدا ہو گئی ہے جو اردو کی خدمت کرنے کے بجائے اپنی خدمت اردو سے کرا رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عام طور سے گھروں سے اردو نکالی جا رہی ہے۔ اردو اخبارات اور رسائل کو اس طرف متوجہ ہونا چاہئے اور اردو گھروں میں اردو کی محافظت کے لئے بیداری پیدا کرنی چاہئے۔

اردو کی محافظت کا مطلب اردو، اردو بولنے والوں کے گھروں میں عزت کے ساتھ

[illegible]

سہیل بیابر [illegible] بہت بہت شکریہ

آپ کا

عبدالقوی دسنوی [illegible]

[illegible] ـــ بھوپال

[illegible] سہیل کے ادبی مجلہ کا شمارہ دوران
[illegible] سہیل کا [illegible] اشاعت
نظر [illegible] الحمد سہیل کے [illegible] بھی
خوشی [illegible] خط [illegible] میرا نام اور پتہ تحریر ہے سہیل
[illegible] بھیجیں محترم [illegible] صاحب اور جناب
[illegible] کا شکریہ لازم ہے۔ آپ کی بڑی مہربانی بڑا
کرم کہ آپ نے ایک [illegible] رسالے سے متعارف کرا دیا ـ
[illegible] سہیل گذشتہ ۱۵ سال سے شائع ہو رہا
[illegible] ہے جہاں سے باقاعدگی سے
جاری رکھتے ہیں آپ [illegible] مسائل کا سامنا
کرنا پڑا ہے میری [illegible] رب العزت آپ کے
مسائل حل فرمائے اور ادب کی جس خدمت [illegible]
کے لئے آپ نے سہیل کے جشن [illegible] کو جاری رکھا ہے۔
وہ کامیاب و کامران [illegible] ہوتا رہے۔

چند سال قبل محترم ڈاکٹر علیم اللہ حالی صاحب
[illegible] تشریف لائے تھے۔ میری ان سے ملاقاتیں ہوئیں۔
[illegible] شمارہ میں ان کا مضمون "ہم مسافر جہاں جہاں پہنچے" پڑھا
ڈاکٹر صاحب نے اس سفر [illegible] کراچی تک [illegible]
پہنچایا ہے۔ مجھے ان کی بقیہ [illegible] کا شدت سے انتظار ہے
اگر آپ کرم کریں تو آئندہ سے سہیل میرے پاس ہر ماہ آ
سکتا ہے۔

یوں تو میں کراچی اور پاکستان کے کئی رسالوں
[illegible] جو
[illegible] صورت میں شائع ہو رہا ہے اس کا اشتہار [illegible]
[illegible] سہیل میں جگہ دے دیں گے تو شکر گزار ہوں
[illegible] کا اشتہار [illegible] رہے گا۔
[illegible]

[illegible] پاکستان [illegible]
[illegible] شاید آپ حضرات کے [illegible]
[illegible]

سید معراج جامی، کراچی (پاکستان)

○ امید ہے آپ مع متعلقین و رفقا بخیر ہوں گے۔
جریدہ سہیل پابندی سے مل رہا ہے۔ یہ آپ کی عقیدت و
[illegible] ہے جس کے لئے ممنون ہوں۔ میں بھی ادھر
[illegible] کی وجہ سے [illegible] اپنے اس
[illegible] جریدے کی خدمت سے قاصر ہوں۔ معاف
فرمائیں گے۔ ڈاکٹر تارا چرن رستوگی صاحب کو خط لکھیں
تو میرا سلام ضرور لکھ دیں گے۔ ان کے بارے میں یہ معلوم
کر کے کہ وہ کینسر کے پرانے مریض ہیں۔ بڑا دکھ ہوا [illegible]
[illegible] کے طور سے ڈاکٹر صاحب کو خط لکھا تھا۔ ادھر
ان کا [illegible] خط نہیں ملا ہے۔

[illegible]

○ کل سہیل کا تازہ شمارہ موصول ہوا۔
آپ یقین کریں کہ سہیل پر جتنا حق آپ کا ہے اتنا ہی
حق میں اپنا بھی سمجھتا ہوں اس کی [illegible]
[illegible] مجھ پر بھی عائد ہوتی ہے۔ اگر میں سہیل کے
لئے کچھ کر سکوں تو مجھے خوشی ہوگی۔ آپ جس یکسوئی اور
جانفشانی کے ساتھ ادب کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں
اسے دیکھ کر رشک ہوتا ہے۔
[illegible] سہیل پہلے سے [illegible] میں کافی
[illegible] ہے لیکن میں [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] انتخاب میں کچھ اور افسانہ ہونے کی ضرورت ہے۔

علیم اللہ حالی کا سفرنامہ بھی پسند آیا۔
[illegible] ایک کمیونسٹ کی موت مزہ دے گئی۔
[illegible] ٹھیک ٹھاک ہیں۔

اور [illegible] میری غزل کا مطلع غلط شائع
ہو گیا ہے صحیح [illegible] یوں ہے

[illegible] سے یا خواب [illegible]
[illegible] معلوم [illegible]

[illegible] برائے
[illegible] تصحیح کے ساتھ [illegible] سلام کا
[illegible]

[illegible] آنند

[illegible]

[illegible] کتابت اور طباعت
کا کام [illegible] اور جان [illegible]
[illegible]
[illegible] سکتے ہیں۔

اشاعت کے [illegible] ایک اور [illegible]
ہے۔ [illegible]
[illegible]
[illegible] واقعات [illegible]
[illegible]
[illegible] چاہتا ہے کہ [illegible]
[illegible]
[illegible]

شوکت [illegible]

[illegible] شکریہ۔ جناب [illegible]
[illegible] تفصیلی مقالہ "غالبیات [illegible]"
خلیق انجم [illegible]
غالب [illegible]
[illegible]

[illegible]

ماہنامہ سہیل گیا

کچھ کرنا آسان کام نہیں۔ میں سمجھتا ہوں زیر نظر مقالہ بیشتر مقالوں میں منفرد ہے اور غالب کے پرستاروں کے لئے تحفہ [illegible] بھی ہے۔

اس مقالے سے سہیل کے وقار میں مزید اضافہ ہوگا

عبدالمتین نیاز، بھوپال

○ سہیل شمارہ میں فکشن نمبر تارا چرن رستوگی، علیم الشعلان اور نصرت جاوید لسینہ آئے۔ طباعت بہتر ہو دیکھئے۔

منیر سیفی، پٹنہ

○ شمارہ موصول ہوا

آپ کا نمود اپنے اندر فکر انگیزی لئے ہوتا ہے۔ اس سے اتفاق کیا جائے یا اختلاف۔ لیکن اتنا تو ماننا ہی ہوگا کہ آپ اسے پورے خلوص اور دل سوزی کے ساتھ لکھتے ہیں۔ اسے پڑھ کر نثری نظم کا لطف بھی حاصل ہو جاتا ہے۔ سو وہ ایک الگ خوبی ہوگی!

خالد عبادی، دربھنگہ

○ آپ نے نمود میں ایک جگہ لکھا ہے کہ آج تھوڑی دیر کے لئے مڑ کر دیکھنا چاہئے کہ کل کیا لکھا گیا تھا [illegible] لکھ رہے ہیں وہ کل کے مقابلے میں کیسا ہے۔"

مجھے آپ کی اس بات سے پوری طرح اتفاق ہے لیکن [illegible] آپ کی اس بات سے ہرگز متفق نہ ہوں [illegible] کر کے صرف لکھتے ہی جانے کو سب [illegible] ہیں کی تعداد بہت زیادہ [illegible]

○ سہیل کے شمارہ [illegible] کے "شعر خیال" کالم میں ایک منیر سیفی صاحب کا نظریہ گذرا۔

یوں تو یہ روایت بنی رہتی ہے کہ غلطیاں کاتب حضرات کے سر بڑے اطمینان سے منڈھ دی جاتی ہیں۔ اور کاتب حضرات بھی تقریباً اس صورت حال کے عادی ہو چکے ہیں۔ اور یہ کوئی ایسی بات نہیں جس کے لئے کچھ لکھ کر وقت ضائع کیا جائے۔ لیکن میں اس خط لکھنے پر مجبور ہوا کہ منیر سیفی صاحب نے نعمان شوق صاحب کے شعر کے کاتب کے لئے جو جملہ استعمال کیا اور جس لفظ کے سہارے شعر کے غلط کتابت ہو جانے کا شکوہ کیا وہ انتہائی [illegible] اور قابل توجہ ہے۔ منیر سیفی صاحب جیسے عظیم المرتبت کے لئے اس قسم کے بازاری الفاظ و جملے زیب نہیں دیتے [illegible] طرح ان کی صلاحیت مشکوک بن جا سکتی ہے۔

کتابت ایک پر وقار کام اور پیشہ ہے۔ اور کاتب حضرات کے لئے ذریعہ معاش۔ ممکن ہے کچھ حضرات مطالعہ [illegible] اور شوق سے کتابت کر رہے ہوں مگر اکثریت کے لئے یہ ذریعہ معاش بھی ہے جس سے وہ اپنی اور اپنے بال بچوں کی کفالت کرتے ہیں۔ کیسے ممکن ہے کہ وہ لاپروائی اور غیر ذمہ داری کا مظاہرہ کرے اور خود اپنے پاؤں میں کلہاڑی مار [illegible]

منیر سیفی صاحب اتنا تو ضرور جانتے ہوں گے کہ بعد مسودہ کو آنکھیں موند کر پریس کے حوالے نہیں کیا جاتا۔ کئی مراحل طے کرنے کے بعد پہنچتا ہے۔ پھر بھی چوک ہو جاتی ہے اور کاتب حضرات خاموشی سے اپنے سر غلطیوں کو لے لیتے ہیں اور اُف تک نہیں کرتے۔ لیکن اس کا [illegible] مطلب نہیں کہ جو دل میں آئے کہہ کر گذر جائے۔ [illegible] [illegible] [illegible]

بانی:۔ حافظ محمد عبدالرحمٰن بسمل شمسنہاروی ○ بیادگار:۔ زین العابدین احمر و ادریس شمسنہاروی

ماہنامہ سہیل گیا

مجلس مشاورت

- ڈاکٹر تاراچرن رستوگی
- ڈاکٹر قمر رئیس
- اصغر علی انجینئر
- قیصر عثمانی
- شاہد احمد شعیب
- ڈاکٹر محمد مثنیٰ
- ڈاکٹر علیم اللہ حالی
- سید احمد قادری

چیف ایڈیٹر ——— مسعود منظر
ایڈیٹر ——— جمیل منظر
معاونین:۔ شکیل احمد جمالی، عبدالقیوم ابدالی، فیضان عزیزی
• کتابت:۔ سید عبدالاحد گیاوی •

فہرست

نمود ——— ۵
دکنی کلچر — ڈاکٹر راج بہادر گوڑ ۶
ظ۔ انصاری۔ کچھ یادیں ۔۔۔ ڈاکٹر مثنیٰ رضوی ۱۱
ہم مسافر جہاں جہاں گزرے۔ ڈاکٹر علیم اللہ حالی ۱۵
شوق نیموی ۔۔۔۔۔۔ ڈاکٹر فاران شکوہ یزدانی ۱۹
مشورہ (نظم) شمیم انجم وارثی ۲۳
آزاد نظم — ڈاکٹر سید ابوالفیض سید آبادی ۲۳
غزلیں۔ ڈاکٹر محمد علی اثر، اختر شاہجہاں پوری ۲۴
غزلیں۔ صغیر احمد ریاضی، دیپک قمر ۲۵
غزلیں۔ ستیہ پال طہور ترنا عارف، محسن رضا رضوی ۲۶
غزلیں۔ احسن امام احسن، اظہر نیّر ۲۷
بہروپیے — علی حماد عباسی ۲۸
زندگی کا کباڑ خانہ — شفیقہ فرحت ۳۳
نئی کتابوں کا تعارف ۳۷
شہر خیال ۴۰

شمارہ ۱۲ جلد ۵

بدل اشتراک
- فی شمارہ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۴/= روپے
- زرسالانہ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۴۰/= روپے
- [illegible] ۔۔۔۔۔۔ ۵۰۱/= روپے

▲ خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ ▲

ماہنامہ سہیل گیا
ریلوے سائیڈ روڈ، گیا - ۸۲۳۰۰۱
فون نمبر - ۲۱۵۴۳

کالا آزار

آپ اسے پھیلنے سے روک سکتے ہیں

بالو مکھی اس مرض کی جراثیم پھیلاتی ہے۔ گیلی اور نمی والی جگہوں، گھروں کی دیواروں کے شگاف یا سوراخوں، گوبر کے ڈھیر یا جمع کوڑا کرکٹ پر انڈے دیتی ہے اور اپنی نسل بڑھاتی ہے۔

علاج

کالا آزار ہونے کا شبہ ہوتے ہی مریض کو قریبی اسپتال میں یا ہیلتھ سنٹروں میں ڈاکٹروں کی صلاح کے مطابق علاج کرانا چاہئے۔ اگر جانچ کرنے پر کالا آزار نکلے تو اس کا بروقت پورا علاج کرنا چاہئے۔ کم سے کم ۲۰ سوئی ضرور لگوائیں لگاتار ـــ سرکاری اسپتال اور ہیلتھ سنٹروں میں مفت علاج ہوتا ہے۔ ڈی۔ ڈی۔ ٹی کا چھڑکاؤ گھروں اور گوہالوں میں ضرور کرائیں

سال میں دو بار فروری مارچ اور مئی جون میں ڈی۔ ڈی ٹی کا ۵ فیصد محلول چھڑکاؤ کے لئے استعمال میں لائیں۔

اس کے لئے تین پاؤنڈ ڈی۔ ڈی ٹی (۵۰ فیصد) پاؤڈر کو ایک گیلن پانی میں محلول تیار کریں۔

روک تھام

(۱) گھر کو صاف ستھرا رکھیں (۲) گھر میں حتی الامکان روشنی داخل ہونے دیں (۳) زمین پر نہیں سو کر چوکی یا کھاٹ پر سوئیں۔ (۴) ننگے جسم نہ رہیں۔ (۵) رات کو باریک مچھردانی استعمال کریں۔ (۶) گھر کے آس پاس پانی کا جماؤ نہیں ہونے دیں۔ (۷) سونے والا گھر کو گوہال سے دور رکھیں (۸) گھر کے آس پاس گوبر کا ڈھیر نہیں کریں۔ (۹) سرسوں تیل سے بنائے گئے چکنے لوشن کا رات میں استعمال کرنے سے بھی اس مرض سے آپ کی حفاظت ہو سکتی۔

▲ پہچانیں ▲

مرض کی علامت

- رک رک کر تیز بخار آنا۔ بخار کسی بھی قسم کا ہو سکتا۔
- کمزوری محسوس کرنا
- جسم میں خون کی کمی ہونا
- جسم کا وزن گھٹنا
- بھوک میں کمی ہونا
- تلی (اسپلین) اور جگر (لیور) کا بڑھنا
- پیٹ کا بڑھ جانا
- پرانے مریضوں کے ہاتھ پاؤں اور چہرے کے چمڑے کا کالا پڑ جانا۔

کالا آزار لاعلاج نہیں

وقت پر مناسب علاج سے یہ مرض پوری طرح ٹھیک ہو سکتا ہے۔

جاری کردہ: محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ، بہار

نمود

آہ ! عصمت چغتائی

عصمت چغتائی اب ہمارے درمیان نہیں رہیں۔ یہ صحیح ہے کہ ہم گذشتہ کئی برسوں سے ادب میں ان کی جزوی دلچسپی کو محسوس کرتے ہوئے انہیں دولت گم گشتہ تصور کر رہے تھے۔ لیکن کھوئی ہوئی چیز کبھی واپس بھی آ سکتی ہے۔ یہی توقع ہمیں تسلی دیتی تھی۔

مگر آج عصمت چغتائی اس خاکداں سے دور جا چکی ہیں۔ اور اب ہم ان کی تخلیقات کے بکھرے ہوئے ریزوں سے دوبارہ لعل و جوہر تلاش کرنے کے لئے تیار ہو رہے ہیں۔ ہمیں ایسا کرنا بھی چاہئے کہ وقت کبھی کبھی کروٹ لے کر کھوئے ہوئے سرمایوں کی یاد دلا دیتا ہے۔

عصمت چغتائی نے شعر و ادب میں اٹھنے والے بہت سے توجہات کا تماشا دیکھا ہے۔ ترقی پسند تحریک کی ابتدا اور عروج میں شریک کار رہی ہیں، پھر نئے حالات میں معاشرہ کا بدلتا منظر بھی دیکھا ہے ـــــ اس تمام اتار چڑھاؤ میں عصمت کا یہ ایمان نہیں بدلا کہ ادب تمام انسانوں کے لئے ہے۔ یہ مظلوموں کی داد رسی کرتا ہے، یہ انسانی اقدار کے تحفظ کے لئے لڑتا ہے۔ یہ سماجی رشتے کی مضبوط ڈوری میں ایک فرد کو دوسرے سے وابستہ رکھتا ہے۔ یہ خانے بنا بنا کر انسانوں کو بانٹتا نہیں۔

عصمت کو جو کرنا تھا کر چکیں، جو لکھنا تھا کہہ چکیں۔ اب وہ ہماری بزم سے رخصت بھی ہو گئیں۔ ہمیں اب ان کی تحریروں سے اپنی زندگی اور اپنے ادب کو نکھارنے اور سنوارنے کے لئے مثبت نکتے تلاش کرنے ہیں ـــــ مرنے والوں کو اس سے بہتر خراج عقیدت اور کیا پیش کیا جا سکتا ہے؟

مسعود منتظر

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ

دکنی کلچر

'دکنی کلچر' کے بارے میں گفتگو کرنے سے پہلے ہمیں سا بات کا تعین کرنا ہوگا کہ 'دکن' سے کونسا خطہ مراد ہے 'کلچر' کا واضح مفہوم کیا ہے۔

دکن کے معنی تو جنوب کے ہیں۔ ویسے سنسکرت میں ششن داہنی کو کہتے ہیں۔ اس لئے داہنی بازو کی پارٹیوں ہندی میں "دکھشن پنتھی" کہتے ہیں۔ لیکن سورج کی طرف منہ کر کے کھڑے ہوں تو داہنی جانب جنوب ہوتا ہے۔ اس غالباً دکشن جنوب کے معنوں میں بھی استعمال ہونے لگا۔

لیکن "دکن" سارے جنوبی ہند کو نہیں کہتے۔ دکن جنوبی ہند کے اس خطے کو کہتے ہیں جو سطح مرتفع کا علاقہ ہے اور سہادری بربتے سے کرشنا اور تنگ بھدرا تک پھیلا ہوا ہے۔

"کلچر" کیا ہے؟ یہ ان ساری مادی اور اخلاق قدروں پر محیط ہے جو انسانی سماج نے اپنی تاریخ کے مختلف ادوار میں سیکھے ہیں۔ کلچر اس ارتقائی منزل کا بھی مظہر ہوتا ہے جو سماج نے کسی نوبت پر حاصل کر لیا ہے۔

کلچر کے ظاہر ہے دو پہلو ہوئے ایک مادی دوسرے روحانی اور اخلاقی، جو بھی کہہ لیجئے۔

'مادی کلچر' ان قدروں کا اظہار ہے جو سماج کے پیداواری رشتوں، طور طریقوں اور تجربوں کی آفرینت ہوتی ہیں

'روحانی کلچر' اپنے ہر دو معنی میں کوئی ساکن و جامد ہیں جو علم و ادب، فن تعمیر، موسیقی، رقص، فلسفہ، اخلاقیات، جمالیات، اور تعلیم کے میدانوں میں نشو و نما پاتی ہیں۔ اور یہ بھی سماجی ارتقا کی نشاندہی کرتی ہیں۔

اس لئے کلچر اپنے ہر دو معنی میں کوئی ساکن و جامد سماجی حالت اور کیفیت نہیں ہے۔ اس میں بھی ارتقا ہوتا رہتا ہے اور وہ سارے عوامل جو انسانی پیداواری تعلقات کو متاثر کرتے ہیں۔ وہ سب کلچر کے روپ پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں۔

یہ بات بھی واضح ہے کہ انسانی سماجی تاریخ میں مذہب کا بہت بڑا رول رہا ہے اور مذہب نے بھی کلچر پر اثر ڈالے ہیں لیکن کسی کلچر کو کسی مذہب سے بالکلیہ وابستہ کر دینا دوسرے اقتصادی اور سماجی عوامل کے ساتھ ناانصافی کرنا ہے جنہوں نے بھی کلچر کی آبیاری کی ہے۔

'دکنی کلچر' کی بات ہم کہاں سے شروع کریں؟

پہلی بات تو یہ ہے کہ جنوبی ہند کا سارا علاقہ دیک

کے آریاؤں کے میدان فکر وعمل سے باہر تھا۔ وہ وندھیاچل کے نیچے آئے ہی نہیں۔ اور دکنی کلچر کے سمجھنے کیلئے اس بات کی بہت اہمیت ہے۔ اور یہیں سے شمالی ہند کے کلچر کے درمیان امتیاز شروع ہوجاتا ہے۔

ساتواہن سلطنت دکن کی قدیم ترین اور سارے دکن پر محیط رہی ہے۔ یہ شروع ہوتی ہے مسیح سے ۲۳۰ سال پہلے اور کوئی ساڑھے چار سو سال تک چلتی ہے۔ ویسے اس سلطنت میں سنسکرت اور پراکرت دونوں زبانیں چلتی تھیں مگر عوام کی زبان پراکرت ہی رہی۔

تاریخی شہادتوں سے پتہ چلتا ہے کہ جنوبی ہند کے ساحلی علاقوں سے ایران، عرب اور یونان سے تجارت ہوتی تھیں۔ چنانچہ یونانی زبان میں کہاوت ہے کہ "ہم نے ہندوستانی مرچ کے بدلے اپنا سونا دیدیا۔" اور ان ہی تجارتی تعلقات نے ثقافتی روابط بھی پیدا کئے اور مشرقی دکن میں ہم رومن، یونانی اثرات دیکھتے ہیں۔ کرشنا ندی کی وادی میں یونانی لیمپ (یونکا) دستیاب ہوئے ہیں۔

ساتواہن دور میں بدھ مت بہت مقبول تھا اور اس کے اثرات بھی ہمیں نظر آتے ہیں۔ چنانچہ اجنتہ کے غار اس بدھ مت تہذیب کی جیتی جاگتی تصویریں ہیں اور ساتواہن دور کے آثار ہیں۔

• ساتواہن دور میں ہمیں شہر بھی ملتے ہیں جن کے اطراف اونچی دیواریں، فصلیں اور ان میں جابجا دروازے ہوتے ہیں۔

اشوک کے دور میں بدھ مت کا پیغام جنوبی ہند سے ہوکر سری لنکا تک پہنچ چکا تھا۔ اور اشوک کے بعد ہی بدھ مت اور برہمن ازم کے درمیان آویزش شروع ہوچکی تھی۔ گوتم بدھ، خدا کے وجود کے منکر تھے اور برہمنی ورن آشرم کے منکر تھے لیکن برہمنیت کے لئے یہی دونوں عنصر اہم تھے اور وہ سماج پر اپنی برتری کو چھوڑنے کے لئے تیار نہ تھے۔ چنانچہ اس آویزش کو ساتواہن دور میں بھی دیکھتے ہیں اور سنسکرت ایک طرح ان ہی برہمنی اثرات کا مظہر تھی۔

ساتواہن سلطنت کے زوال سے شمال مغرب میں ابھیرا، جنوب میں چوٹو، آندھرا پردیش اکش واکو، جنوب مشرق میں پالو۔ حکومتیں نمودار ہوئیں اور مدھیہ پردیش میں بھی کچھ کی حکومتیں تھیں۔ یہ پانچویں صدی عیسوی کے وسط کا زمانہ ہے۔

علاقہ دکن میں اکش واکو خاندان کے دور میں بھی کلچر میں کسی نمایاں ارتقا کا پتہ نہیں ملتا۔ لیکن ان کے بعد سنہ عیسوی سے ۱۳۲۶ء تک کاکتیہ دور آتا ہے جن کی راجدھانی ہنمکنڈہ (ضلع ورنگل) میں تھی۔

ادھر آندھرا کے ساحلی علاقے میں اکش واکو کے بعد مشرقی چالوکیہ گھرانے کی حکمرانی تھی۔ ان کے دور حکومت میں سنسکرت کے ساتھ تلگو کا استعمال شروع ہوچکا تھا۔ لہذا اس زمانے کے کتبے میں یہ دونوں زبانیں ملتی ہیں۔

کاکتیہ حکمرانوں نے مشرقی چالوکیہ سلطنت پر فتح کر کے سارے تلگو علاقے کو متحد کرلیا۔ اور کاکتیہ دور جہاں تلگو علاقے کے اتحاد کے لئے یادگار رہیگا وہیں ثقافتی کلچر کے فروغ میں بھی اس کو خاص مقام حاصل ہے اور رہیگا۔

اس دور میں تلگو زبان کو فروغ ہوا۔ ورنگل کا قلعہ تعمیر ہوا۔ کھیلوں پر توجہ کی گئی اور ان سب سے بڑھ کر آبپاشی کے لئے تالابوں کی تعمیر کی گئی۔ مندر تعمیر ہوئے اور یہاں ہمیں کاکتیہ فن تعمیر کی بلندی نظر آتی ہے۔ یہ کہنا صحیح رہے گا اس پر مشرقی چالوکیہ فن تعمیر کے اثرات بھی ملتے ہیں۔ گھن پور (ضلع ورنگل)، پلمپیٹ (ضلع نلگنڈہ) کے مندر کاکتیہ فن تعمیر کے عروج کا مظہر ہیں۔ پلمپیٹ مندر کا ... اپنی نوعیت کی آپ مثال ہے ...

ستون اور ان پر بت تراش کے نمونے۔ چھت پر بنایا ہوا چاند ملتا تھا۔ پادو کے چھت کا صلیب اور اس کے پیچھے میں نقاشی۔ قلعہ ورنگل کی تعمیر اور خاص طور پر قلعہ ورنگل کا باب الداخلہ (توران) اپنی نظیر آپ ہیں۔ ان سب پر ہنمکنڈے کا ہزار ستون کا مندر کاکتیہ فن تعمیر کی عظیم الشان مثال ہے۔

۱۳۲۳ء میں خلجیوں کے حملوں کے بعد کاکتیہ دور ختم ہوا اور دکن اور آندھرا دیس پھر سے عدم استحکام کے دور میں داخل ہو گیا۔ کنڈاویڈو میں ریڈی سلطنت، اوراوگل میں کما حکمران اور راجکنڈہ (دیورکنڈہ) میں ویلما حکومت قائم ہو گئیں۔ اور یہ سارا علاقہ متعدد حکمرانوں میں تقسیم ہو گیا۔ ایسے میں ہم کیا امید کر سکتے ہیں کہ کلچر کا ارتقا ہو گا۔ پھر بھی امرابق (ضلع کنٹور) میں کچھ شلپ ملتے ہیں۔

مگر یہاں ایک تاریخی حقیقت بھی دیکھنی چاہیے۔ خلجی حملے یا بعد کے دولت آباد پر تغلق حملوں نے شمال اور دکن کے درمیان غالب اور مغلوب کے رشتے قائم کیے جو نفرت پیدا کرتے ہیں اور نفرت کا کلچر سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا پھر یہ بھی ہوا کہ حملہ آور تو واپس ہو گئے لیکن کچھ سپاہی کچھ صوفی، کچھ تاجر اور ایسے ہی پیشہ ور لوگ یہیں بس گئے اور یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ چودھویں صدی عیسوی میں یہی شمال اور جنوب کے تعلقات میں یہ نیا عنصر ملتا ہے۔ اور یہی وہ عنصر ہے جو دکن پر شمال کے تہذیبی اثرات ڈالتا ہے۔ اور یہ اثرات زبان اور فن تعمیر پر خاص طور پر ہوتے ہیں۔

۱۳۳۴ء سے ۱۳۴۷ء تک وہ زمانہ ہے جبکہ دکن کے سارے صوبے دار کیا پایا ناتک اور جعفر خان کے ساتھ متحد ہو کر تغلق شاہی کا [illegible] اور خان کی حکمرانی سے آزاد اپنی حکومتوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ لیکن جلد ہی یہ اتحاد ٹوٹ جاتا ہے اور جعفر خان، علاءالدین حسن گنگو کا خطاب حاصل کر کے ۱۳۴۷ء میں بہمنی سلطنت کی بنیاد رکھتا ہے۔

بہمنی حکمرانی کی دو خصوصیتیں قابل ذکر ہیں۔

ایک تو یہ کہ اس دور میں شمالی ہند کی مختلف بولیوں برج، ہریانوی، پنجابی کے زیر اثر دکن کی زبانوں تلگو، مراٹھی کنڑی سے اکتساب کر کے ایک دکنی زبان کو فروغ ملتا ہے اور بہمنی دور میں دکنی کو اور دکن کے ادیبوں خاص طور پہ صوفی ادیبوں کو فروغ ملا۔ اگر اس زمانے کو دکنی زبان کے بننے کا دور کہا جائے تو صحیح ہوگا۔

دوسرا یہ کہ بہمنی دور میں ایران سے راست تعلق پیدا ہو گیا تھا اور متعدد ایرانی دانشور اور ماہرین تعلیم و نظم و نسق بیدر آ گئے۔ انہیں آفاقی کہا جاتا تھا۔ اور ان میں اور مقامی لوگوں میں تناؤ بڑھتا گیا۔ خود محمود گاواں آفاقی تھا۔ اور اس لئے قتل کر دیا گیا۔ بہمنی بادشاہوں نے کوشش کی کہ آفاقیوں اور مقامی لوگوں میں مفاہمت ہو۔ ان دونوں کو الگ الگ علاقوں کا نظم و نسق سونپا گیا لیکن تلخیاں بڑھتی ہی رہیں جنہوں نے بالآخر بہمنی سلطنت کا خاتمہ ہی کر دیا۔

بہمنی سلطان فیروز شاہ کے دور میں فن تعمیر کو بہت ترقی ہوئی۔ قلعے اور فصیلیں بنائی گئیں۔ آج بھی وجیانگر سلطنت کی تعمیرات کی جو نشانیاں باقی ہیں ان پہ بہمنی فن تعمیر کے اثر کو دیکھا جا سکتا ہے۔ ہاسپیٹ کے ریلوے اسٹیشن سے آگے بڑھئے تو عظیم الشان مندروں کے ساتھ ساتھ رانی کے زنانہ احاطے، رانی کے اشنان محل، کنول محل اور ہاتھی خانہ بھی بہمنی طرز تعمیر کی یاد تازہ کرتے ہیں۔

گلبرگہ میں خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کا مقبرہ آج بھی بہمنی ایرانی اور قدیم ہندو طرز تعمیر کے امتزاج کا نقشہ پیش کرتا ہے۔

اگر دکنی کلچر، ممتاز کرنے والی قدروں کو جانچنا ہو تو یہ معلوم ہوگا کہ قدیم ساتواہن، مشرقی چالوکیہ، اور کاکتیہ کلچر پر ایرانی اور شمالی ہند کے چودھویں اور پندرھویں صدی عیسوی میں فروغ پانے والی تہذیبی قدروں کے اثر کے تحت ان کا ارتقا ہوا ہے۔ دکنی زبان، فن تعمیر اس کے نمایاں مظہر ہیں۔ اور اس نئے دور کی ابتدا بہمنی حکمرانوں سے ہوتی ہے۔

موسیقی کے میدان میں کرناٹک، مکتب موسیقی یہاں بنیاد ہے لیکن شمالی ہند کی موسیقی کے اثرات بھی نمایاں ہیں

دو سو برس تک حکومت کرنے کے بعد جب بہمنی سلطنت ٹوٹی تو اس کے بطن سے پانچ سلطنتیں نمودار ہوئیں۔ برار اور ملحقہ علاقوں میں عماد شاہی، احمد نگر اور اس کے اطراف کے علاقوں میں نظام شاہی، بیدر اور آس پاس پر محیط برید شاہی، گولکنڈہ اور تقریباً تمام تر علاقہ تلنگانہ کا احاطہ کئے ہوئے قطب شاہی اور بیجاپور سے گوا تک عادل شاہی حکومتوں کا تسلط تھا۔

قطب شاہی اور عادل شاہی حکمرانوں کے دور میں دکنی کلچر، کو مزید فروغ حاصل ہوا۔ قطب شاہی دور میں ادھر ساحلی علاقے اور جنوب میں رائل سیما کے علاقوں کو حاصل کرکے تقریباً تلگو علاقے کو پھر سے متحد کر دیا گیا۔

اس دور میں تجارت کو فروغ ہوا۔ رائل سیما کے ہیرے حیدرآباد لائے جاتے۔ یہاں صاف کئے جاتے اور پھر باہر بھیجے جاتے تھے۔ حیدرآباد کو رائل سیما اور ساحلی آندھرا علاقوں سے جوڑنے کے لئے سڑکیں تعمیر کی گئیں۔ تلگو اور دکنی دونوں زبانوں کی ترقی کی راہیں ہموار ہوئیں۔ دونوں ہی زبانوں کے شاعروں کو دربار میں رسوخ حاصل تھا۔ خود بادشاہ تلگو جانتے تھے۔ قلی قطب شاہ کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ تلگو میں شاعری کرتا تھا۔ ابراہیم قلی نے خود اپنا بچپن وجیانگر کے راجاؤں کی سرپرستی میں گزارا ہے۔ تلگو سے اس کی محبت نے تلگو ادب کی تاریخ میں اسے "ملک ابھیرام" کا نام دیا ہے کوچی پوڑی رقص کو پھر سے آگے بڑھایا گیا۔ تصویر کشی کو ترقی ہوئی، مصوری کا ایک خاص طرز پیدا کیا گیا۔

قطب شاہی دور میں فن تعمیر کے کرشمے دکھائے گئے۔ چار مینار اس کا زبردست مظہر ہے جو آج بھی تاریخ کے گن گا رہا ہے۔

قطب شاہی گنبدوں میں قلی قطب شاہ (بانی شہر حیدرآباد) کی گنبد دیکھئے۔ دہلیز کے آگے قدم رکھتے ہی ہمیں محسوس ہوگا کہ ہم کسی مندر میں داخل ہو رہے ہیں۔ دہلیز اور مقبرے کے درمیان کا علاقہ گربھ گڑیا (Sanctum - Sanctorum) - جیسا لگتا ہے۔ اور پھر تعمیر پر اس دور کی بعض کمانیں (Saracenic ، سارسینی۔ ایرانی) اثرات لئے ہوئے ہیں۔

میدان ادب میں دکنی طرز ادب کی بنیاد پڑی جسے ہندی اور اردو، دونوں ہی کے مورخ اپنی اپنی زبانوں کی ابتدائی شکل سمجھتے ہیں۔ پنڈت رائل سانکرتیاین نے "دکشن بھارت میں ہندی کا وکاس" اپنی تصنیف میں معراج العاشقین کو ہندی نثر کی پہلی کتاب کہا ہے۔

قلی قطب شاہ کو تو پہلا صاحب دیوان شاعر ہونے کا اعزاز حاصل ہے اور یہ شاعری دکنی زبان ہی میں ہے لیکن تصوف میں دکنی تہذیب نے ایک نئے مکتب کا اضافہ کیا ہے۔

ہندوستان کے باہر تقریباً ہر جگہ یہ مانا جاتا ہے کہ انسان چار عناصر آب و آتش، خاک و باد (پانی، آگ، مٹی اور ہوا) سے بنا ہے۔ چکبست نے جب یہ کہا

زندگی کہاں ہے عناصر میں ظہور ترتیب

قرآن کے پیش نظر بھی یہی چار عناصر تھے۔

لیکن قدیم ہندوستان کے فلسفی انسان کو پانچ تتو کا بنا ہوا بتاتے ہیں۔ اور یہ ہیں پانی، آگ، مٹی، ہوا اور آکاش

انسانی زندگی کے ادوار بھی ان ہی سے متعلق کے یوں کہتے ہیں۔

بچپن۔ خاک، لڑکپن۔ آب، جوانی آتش، بڑھاپا باد، ہوا، اور موت، آکاش۔

ان کی رائے میں انسانی جسم چار عناصر سے تعمیر ہوا ہے لیکن انسانی اوصاف قدرت کی دی ہوئی ہیں اور آکاش کی آفریدہ ہیں۔

جب کبیر نے پانچ تتو کا جو تلا" کہا یا گرو نانک نے کہا۔

پانچ تت کا پتلا کھیلے نانک میرا نان

تو یہ دونوں قدیم ہندوستانی مفکرین کے خوشہ چیں تھے۔ لیکن بے جاپور کے صوفی شاعر امین الدین علی اعلیٰ نے چار عناصر کے مشرق وسطیٰ کے تعمیر میں قدیم ہندوستانی مفکرین کے پانچویں عنصر کو جوڑ دیا۔ یہ اجتہاد بھی تھا اور قدیم ہندوستانی فکر کے ساتھ امتزاج بھی موجودات عالم اور ان کے سارے مظہرات کو سمجھنے کے لئے فکری اختراع بھی۔ چنانچہ وہ پانچ عناصر کے قائل ہیں۔ اور اپنے طور پر اس کی توضیح کرتے ہیں۔ پھر ہر عنصر کے پانچ گن ہیں۔ ڈاکٹر حسینی شاہد نے اپنی کتاب "امین الدین علی اعلیٰ" میں اس مسئلہ پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ اور کہا ہے کہ اس لئے امین الدین علی اعلیٰ کو پانچ عناصر اور ۲۵ گن کا صوفی کہا جاتا ہے۔ مغل حکمرانوں کے حملوں کے بعد ایک طرح مغل بالادستی کا دور شروع ہوا۔ آصف جاہی حکمران جو مغلوں ہی کے سائے میں پروان چڑھے تھے، اس مغل کلچر کے حامی تھے اور حیدر آباد شہر قطب شاہیوں کے شہر سے بالکل مختلف شمالی ہند سے اٹھا کر لایا ہوا زمین کا ٹکڑا لگتا تھا" دکنی کلچر" کے ارتقا کے دن گذر چکے تھے۔ آثار رہ گئے تھے۔

"دکنی کلچر" کا جو علاقہ ہے اور اس اصطلاح کے جو معنی ہیں، اور اس کے ابتدا اور ارتقا کے جو پہلو ہیں ان کا ذکر تو ہوا لیکن آج ایسا لگتا ہے کچھ بیتے ہوئے دنوں کی یادیں ہیں۔ اور گذرے ہوئے زمانے کے آثار ہیں۔

آج کلچر کے نئے تقاضے ہیں۔ اسے نئی پیداواری رشتوں کا چیلنج ہے۔ آج دنیا بہت چھوٹی ہو گئی ہے۔ آمد و رفت کے ذرائع بھی بڑھ گئے ہیں اور ضرورت بھی۔ تجارت نے ثقافتی تعلقات میں نئے ابعاد پیدا کر دیئے ہیں۔ سائنس اور ٹکنالوجی نے اس میں نئی وسعتیں پیدا کر دی ہیں۔

خود ہمارے ملک میں ثقافتی گونا گونی کو تہذیبی ایک ہم آہنگی کی لہر دوڑتی نظر آ رہی ہے۔ اور ہم ایک ہندوستانی کلچر کے وارث ہیں اور اپنے طور پر اس کے ارتقا اور اسے نئی منزلوں سے آشنا کرنے والے تاریخی عوامل کا رول بھی ادا کر رہے ہیں۔ ارتقا کی انسانی منزلوں میں ہماری زمین کی سوندھی خوشبو بھی ہوگی بلکہ اس میں کبھی الگ الگ پھولوں کی الگ الگ خوشبوؤں کا امتزاج ہوگا اور باہر سے — مشرق و مغرب، شمال و جنوب سے آنے والی ہوائیں بھی اپنے اندر کچھ اور خوشبوئیں بھی لاتی رہی ہیں۔ اور لاتی رہیں گی۔ ان کا بھی نمایاں اثر ہوگا۔

کہیں یہی تو وہ جادوئی راستہ تو نہیں جو قومی کلچر کو آفاقی کلچر کی سرحدوں سے جوڑتا ہے۔

○ تحریر خوشخط ارسال کریں ○

ڈاکٹر محمد مثنیٰ رضوی

ظ۔ انصاری ۔ کچھ یادیں کچھ باتیں

ظ۔ انصاریؔ کے نام سے میں سب سے پہلے بمبئی سے شائع ہونے والے اردو ہفتہ وار "قومی جنگ" کے توسط سے واقف ہوا۔ ان دنوں میں شبلی کالج میں انٹرمیڈیٹ کے سال اول کا طالب علم تھا۔ قومی جنگ کے ایڈیٹر سید سجاد ظہیر تھے جو اس وقت کمیونسٹ پارٹی کے قومی سطح کے ممتاز رہنما تھے۔ اس کے علاوہ ایک اردو ادیب اور دانشور کی حیثیت سے بھی ان کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ انہوں نے قومی جنگ کو بائیں بازو کا ایک انتہائی اہم اور اعلیٰ درجہ کا رسالہ بنانے کے لئے اپنے گرد بڑے ذہین اور ہونہار ادیبوں کا حلقہ اکٹھا کر لیا تھا۔ اس حلقہ میں سید سبط حسن، مرزا اشفاق بیگ، علی سردار جعفری، کلیم اللہ، کیفی اعظمی اور ظ۔ انصاری شامل تھے۔ ظ صاحب تقریباً ہر ہفتہ ایک کالم ضرور لکھتے اور اکثر سیاسی، مذہبی، سماجی اور ادبی مسائل سے متعلق پوچھے گئے سوالات کا جواب بھی دیتے۔ ہم لوگ ان کی تحریروں کو بڑی دلچسپی کے ساتھ پڑھتے تھے کیونکہ ان میں کام کی باتوں کے ساتھ شائستہ زبان و بیان کا لطف بھی رہتا تھا۔ ظ۔ صاحب سے پہلا تعارف اسی طرح ہوا۔ بعد میں ان کے بارے میں ایک دلچسپ بات یہ معلوم ہوئی کہ ان کا اصل نام ظل حسنین نقوی تھا اور وہ بنیادی طور پر اسلامی دینیات کے فاضل ہیں۔ جس شخص کو مولانا ظل حسنین نقوی ہونا تھا وہ ادب اور صحافت کی دنیا میں ظ۔ انصاری کے نام سے ایک اشتراکی ادیب اور دانشور کی حیثیت سے اُبھرا۔

۱۹۵۲ء میں میں بمبئی گیا اور تقریباً چار مہینے تک وہاں ٹھہرا۔ بمبئی ان دنوں اردو زبان کے بہت سے نامور اور ممتاز ادباء و شعراء کی پناہ گاہ بن چکا تھا۔ کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، علی سردار جعفری، رفعت سروش، نیاز حیدر، حبیب تنویر، مجروح سلطانپوری، جاں نثار اختر، خواجہ احمد عباس، ساحر لدھیانوی، راما نند ساگر، مہندر ناتھ، کیفی اعظمی، اور شکیل بدایونی وغیرہ سبھی بمبئی کی دنیا میں کھوئے ہوئے تھے۔ ان میں سے بیشتر کا تعلق فلم انڈسٹری سے تھا۔ لیکن ظ۔ انصاری نے ہمیشہ اپنے کو اس دنیا سے دور رکھا اور نہایت وفاداری کے ساتھ ادب اور صحافت کی دنیا سے وابستہ رکھا۔ میرا بمبئی کا سفر اس مقصد کے تحت تھا کہ کسی انگریزی روزنامہ یا ہفتہ وار میں کام کرنے کا موقع مل جائے۔ استاد محترم ڈاکٹر اعجاز حسین مرحوم نے خواجہ احمد عباس کے نام ایک تعارفی خط دیا اور پروفیسر آل احمد سرور

نے دو خط دیئے تھے ایک عصمت چغتائی کے شوہر شاہد لطیف کے نام اور دوسرا جناب شہاب الدین دسنوی کے نام جو ان دنوں صابو صدیق انسٹی ٹیوٹ کے پرنسپل تھے اور بمبئی کی تعلیمی اور سماجی زندگی میں بڑا اثر اور رسوخ رکھتے تھے ۔ خواجہ صاحب نے کوئی خاص دلچسپی نہیں لی اور رسمی طور پر ہندستان ہوشلسٹ لیڈر معین الدین حارث کے نام ایک سفارشی خط لکھ کر دے دیا تھا جس سے کچھ حاصل نہیں ہوا ۔ شہاب صاحب نے ضرور دلچسپی لی اور حتی الامکان کوشش بھی کی۔ اکثر کہتے تھے کہ آپ ذرا دیر سے پہنچے کاش عبداللہ بریلوی زندہ ہوتے ۔ عبداللہ بریلوی صرف بمبئی کرانیکل جیسے انگریزی روزنامہ کے ایڈیٹر ہی نہیں تھے بلکہ ایک عرصہ تک پورے ملک کی انگریزی صحافت پر ان کی حکمرانی تھی ۔ ان کے تربیت کردوں کی تعداد کافی ہے جن میں سے کئی آگے چل کر بڑے نامور صحافی ثابت ہوئے انہیں میں خواجہ احمد عباس، آر. کے. کرنجیا، ڈی. ایف. کراکا اور باسط انصاری وغیرہ شامل تھے۔ خاصی جدوجہد کے باوجود مجھے خاطر خواہ کامیابی نہیں ملی۔ اسی جدوجہد کے درمیان میری ملاقات ظ. صاحب سے پہلی بار ہوئی ۔

ظ. صاحب کچھ ہی دنوں پہلے بمبئی کے سب سے مشہور اور ہردلعزیز اردو روزنامہ "انقلاب" کی ادارت سے اصولی اختلاف کی بنیاد پر مستعفی ہوئے تھے اور ایک آزاد صحافی کی حیثیت سے زندگی گزار رہے تھے۔ ان کا قیام اردو اخبار "آفتاب" کے دفتر کے ایک کمرہ میں تھا۔ میری پریشانی اور دوڑ دھوپ کو دیکھ کر بمبئی کے ایک سیاسی اور سماجی کارکن وحشی جونپوری نے مجھے کچھ لوگوں سے خاص طور پر ملایا انہیں میں ظ. صاحب بھی تھے۔ "آفتاب" کے دفتر میں ان سے ملاقات ہوئی۔ سفید موٹے کرتہ اور پائجامہ میں ملبوس ظ. انصاری نہایت اطمینان اور سکون کے ساتھ سگریٹ پی رہے تھے۔ بڑی محبت اور اپنائیت کے ساتھ ملے اور بڑی تفصیل کے ساتھ میری تعلیمی ۔۔ علمی اور ادبی مشاغل کے متعلق بات چیت ہوئی۔ ایک دلچسپ بات یہ ہوئی کہ اس کمرہ میں تھوڑے سے فاصلہ پر ایک ایسے صاحب کچھ لکھتے پڑھتے نظر آئے جو علی گڑھ یونیورسٹی میں مجھ سے ایک سال سینئر تھے۔ اور سر سید ہال میگزین میں (جس کے وہ مدیر تھے) میرا ایک مضمون بھی شائع کر چکے تھے۔ کبھی کبھی میری طرف نظر اٹھا کر دیکھ لیتے تھے اور پھر اپنے کام میں لگ جاتے تھے۔ ظ. صاحب نے ان سے میرا تعارف کروانا چاہا تو وہ خود ہی بول اٹھے کہ "ہم دونوں علی گڑھ میں ساتھ پڑھ چکے ہیں۔ میں تو بس اپنی باری کا انتظار کر رہا تھا۔ آپ لوگوں کی بات چیت ختم ہو تو میں دخل دینے کی ہمت کروں؟" یہ تھی پہلی ملاقات ظ. انصاری کے ساتھ۔ اس کے بعد تو ان سے بہت سی ملاقاتیں ہوئیں اور رفتہ رفتہ مجھ پر ان کی شخصیت کے جوہر کھلتے گئے۔

ظ. انصاری نے بمبئی کے صحافتی زندگی کے سارے نشیب و فراز کے متعلق اشارے کئے اور اس راہ میں جو رکاوٹیں اور دشواریاں تھیں وہ بھی بتلائیں۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ ان دقتوں پر قابو پانے کے طریقوں سے بھی واقف کروایا۔ انہوں نے مجھے بمبئی کرانیکل کے نائب مدیر باسط انصاری سے ملنے کا مشورہ دیا۔ ان کا یہ مشورہ بڑا صائب اور مفید تھا۔ لیکن اس وقت مجھے اس کا اندازہ نہیں تھا۔ اس لئے میں نے تساہلی برتی اور باسط صاحب سے نہیں مل سکا۔ جب میں بمبئی سے لوٹ کر اعظم گڑھ پہنچا تب مجھے باسط انصاری صاحب کی اہمیت کا پورا پورا اندازہ ہوا۔ اگر میں ظ. صاحب کے مشورے پر عمل کر کے باسط صاحب سے مل لیا ہوتا تو شاید

اپنے مقصد میں کامیابی حاصل ہو جاتی۔ ظ۔ صاحب
ے ساتھ میں پہلی بار انجمن ترقی پسند مصنفین (بمبئی شاخ)
جلسہ میں شریک ہوا۔ اگرچہ دعوت نامہ کیفی اعظمی کی طرف
ے تھا۔ ابھی تک اس جلسہ کا نقش ذہن سے محو نہیں ہوا۔
بکہ ادب میں جمود کے مسئلہ پر احتشام حسین مرحوم نے اس
بسہ میں بڑی پر مغز اور خیال انگیز تقریر کی۔ اور سردار جعفری
مباحثہ میں حصہ لے کر اس جلسہ کو اور زیادہ اہم اور دلچسپ
دیا۔ اس کے بعد کے جن جلسوں میں شرکت کا موقع ملا
ان میں میں نے ہمیشہ ظ۔ انصاری کو بہت فعال پایا۔ کبھی خود
مضمون سناتے کبھی بحثوں میں حصہ لے کر اپنی ذہانت، بذلہ
ی اور لطف بیان سے محفل میں گرمی اور کیف پیدا کر دیتے
ن کا اصل جوہر تو اس وقت کھلتا جب شرکا میں سے کوئی
ن پر مزاحیہ یا طنزیہ فقرہ چست کر دیتا۔ اور وہ بڑے
ینان اور سکون سے اس کا جواب دیتے۔ اکثر ان کا
اب نہلے پر دہلے کے مصداق ہوتا۔ ان کی تقریریں بڑی
سپ ہوتیں اور وہ انہیں اکثر طنز و ظرافت سے آراستہ
روں کی مدد سے بڑی دلکشی عطا کر دیتے۔ ان دنوں وہ
ے کٹر ترقی پسند تھے اور اس سلسلے میں کسی طرح کے سمجھوتے
قائل نہیں تھے۔ اردو روزنامہ "انقلاب" سے محض اس
مستعفی ہو گئے تھے کہ ان کے ایک اداریہ کی اشاعت
بار کے مالک عبدالحمید انصاری نے روک دی تھی۔ اسی
نے میں انہوں نے ایک طویل مقالہ غزل کی نارسائی اور کم
ی پر بھی لکھا تھا جو بہت دنوں تک ادبا اور ناقدین
درمیان موضوع بحث بنا رہا۔ وہ آخر تک اپنے اس
یہ پر جمے رہے کہ غزل برق رفتاری سے بدلتی ہوئی زندگی
ما تھ اطمینان بخش طور پر نہیں دے سکتی۔ اس احساس
باوجود خسرو اور غالب پر ان کی تنقیدی تحریریں ایک

مگر ان قدر اضافہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔

"انقلاب" سے الگ ہونے کے بعد وہ "آفتاب" کے دفتر کے ایک کمرے میں بالکل الگ تھلگ ادبی اور علمی مشاغل میں ہمہ تن محو رہتے تھے۔ غالباً انگریزی زبان کی طرف ان کی توجہ اسی زمانے میں ہوئی اور انہوں نے برنارڈ شا کا گہرا مطالعہ کیا اور اس پر ایک مقالہ بھی لکھا لیکن اس دور کی سب سے نمایاں بات روسی زبان سے ان کی گہری دلچسپی اور واقفیت کے لئے کڑی محنت اور کوشش قرار دی جا سکتی ہے۔ آگے چل کر ان کا یہی شغف ان کو روس لے گیا۔ جہاں انہوں نے روسی زبان کے اہم ترین شعری اور نثری کارناموں کو اردو زبان میں منتقل کیا اور پھر ہندوستان واپس آکر وہ بمبئی یونیورسٹی کے روسی زبان کے شعبے کے سربراہ رہے۔

ایک طویل عرصہ کے بعد ظ۔ صاحب سے میری ملاقات بھوپال میں ہوئی جہاں وہ اقبال پر لکچر دینے کے لئے آئے تھے۔ اتنی مدت گزر جانے کے بعد بھی میں نے ان کو پہلے ہی کی طرح سرگرم شگفتہ مزاج اور گل افشاں پایا۔ عمر ان کی خوش مزاجی اور بذلہ سنجی پر حاوی نہیں ہو سکی تھی۔ ان سے کچھ دیر بات کرنے کے بعد میں پروفیسر شبیہ الحسن کے کمرے میں چلا گیا جہاں گوپی چند نارنگ بھی بیٹھے ان سے باتیں کر رہے تھے۔ چند ہی لمحوں بعد ظ۔ صاحب بڑے موڈ میں مسکراتے ہوئے داخل ہوئے۔ کہنے لگے بھائی! میرے کمرے کا گلاس پتہ نہیں کہاں غائب ہو گیا۔ کیا میں آپ کا گلاس تھوڑی دیر کے لئے لے جا سکتا ہوں۔ شبیہ صاحب نے ہنستے ہنستے گلاس ان کی جانب بڑھایا اور کہا لیجئے گلاس حاضر ہے لیکن آپ اسے اب اپنے ہی پاس رکھیں [illegible] ضرورت ہوگی۔ با
— ہم سب ہنس پڑے اور ظ۔ صاحب بھی ہم لوگوں کے قہقہے

میں پوری طرح شامل ہے۔ مجھے لگا کہ ان کی زندہ دلی میں ذرا بھی فرق نہیں آیا ہے۔ جی بہت خوش ہوا۔

ظ۔ صاحب سے میری آخری ملاقات دہلی میں ہوئی کوئی گیارہ بارہ سال پہلے۔ میں آل انڈیا ریڈیو کی کینٹین سے باہر نکل رہا تھا۔ میرے ساتھ غیاث احمد گدی بھی تھے سامنے ظ۔ انصاری کینٹین کی طرف آتے ہوئے دکھائی پڑے گرمی کی شدت سے بدحواس اور پریشان۔ میرا ہاتھ پکڑا اور کہنے لگے۔ "یہاں آپ کا حکم چلتا ہے۔" میں نے جواباً عرض کیا۔ "درخواست اور استدعا کا اثر تو ضرور ہوگا۔" ہم لوگ کینٹین کی طرف پھر واپس آئے۔ یکایک مجھے محسوس ہوا کہ غیاث اور ظ۔ صاحب صورت آشنا نہیں ہیں۔ میں حیرت میں ڈوب گیا۔ کیونکہ غیاث احمد گدی اپنی جس کہانی سے اردو کے سنجیدہ ادبی حلقوں میں روشناس ہوئے تھے اسے ظ۔ انصاری نے اپنے "شاہراہ" کے دور ادارت میں اپنے تجرباتی نوٹ کے ساتھ شائع کیا تھا۔ میں نے تعارف کروایا تو دونوں بے اختیار ایک دوسرے کے گلے لگ گئے۔ کچھ دیر تک میں بھی گفتگو میں شامل رہا لیکن درمیان میں ہی اٹھنا پڑا کیونکہ میں آل انڈیا ریڈیو کے ایک ریفریشر کورس (Refresher Course) کے سلسلے میں دہلی گیا ہوا تھا۔ اور بڑی سختی سے حاضری کی نگرانی ہوتی تھی۔ ایک منٹ کی تاخیر بھی وہاں کے ارباب حل و عقد کو گوارا نہیں تھی۔ افسوس کہ ظ۔ صاحب سے میری یہ ملاقات آخری ملاقات ثابت ہوئی۔

آج جب ظ۔ صاحب ہمارے درمیان نہیں ہیں تو مجھے شدت سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنی کثیر الجہات شخصیت کے اظہار سے جو بیش بہا خدمات علم و ادب کی دنیا میں انجام دیں ان کو دیکھتے ہوئے ہمارے ادیبوں اور ناقدوں نے ان کے ساتھ بالکل انصاف نہیں۔ انہوں نے اپنے زور قلم سے ادبی صحافت، سیاسی سماجی صحافت، ادبی تنقید نگاری، خاکہ نگاری سبھی میں اپنی پر وقار انفرادیت کے نقش چھوڑے ہیں۔ ان کا ذکر صرف ایک ادبی صحافی کی حیثیت سے جائے تو "شاہراہ" اور "آئینہ" دونوں کی مثال سے کون انکار کر سکتا ہے — اگر ان کو صرف ناقد کی حیثیت سے یاد کیا جائے تو خسرو، انیس اقبال، پشکن اور گوگول پر ان کی تنقیدوں کو نظر انداز کر سکتا ہے — اگر انہیں صرف ایک نگار کی حیثیت سے پرکھنے کی کوشش کی جائے سجاد ظہیر، جوش، فراق اور احتشام حسین کے مرقعوں کا مزا کون بھلا سکتا ہے — غرض کہ ادبی سرگرمی کے کس کس پہلو کا ذکر کیا جائے

— بقیہ:- شوق نیموی —

مصرعہ طرح:- پرساں نہیں بیمار محبت کی قضا کے

کرتے ہو ستم ہوتے ہو پھر اس پہ خفا بھی
کیا دل میں تمہارے نہیں کچھ خوف خدا بھی

ایماں بھی لیا آپ نے اور دل بھی ہمارا
بتلائیے کچھ دیجئے گا اس کا صلہ بھی

تاثیر سے مایوس یہاں تک میں ہوا ہوں
اٹھتا نہیں اب ہاتھ میرا بہر دعا بھی

جاتا ہے وہ سیر گلستاں کو دم صبح
ہے قصد کہ ہمراہ چلے آج صبا بھی

علیم اللہ حالی

ہم مسافر جہاں جہاں گزرے

(قسط ۶)

[illegible] یادوں کا قرض چکانا آسان نہیں کہ حساب بے باق بھی نہیں ہوتا اور دوسرا بقایا سر لیتا ہے۔ بہت دنوں قبل جب میں پہلی بار پاکستان تھا تو ایک واقعہ کی کرچیاں ذہن و دل میں چبھ گئی ں اور آج اس سفر کی داستان لکھتے ہوئے بار بار وہ ۔ مجھے اپنی طرف بلاتا ہے۔

ہوا یوں کہ برسوں پہلے پاکستان کے اولین سفر بے لاہور سے راولپنڈی جانا تھا، کچھ اور اعزہ بھی تھے۔ ہم لوگوں نے ایک میکسی ٹیکسی ریزرو کرائی فوکس ویگن تھی۔ ہم جیسے ہی اس میں سوار ہوئے خاتون نے پوچھا کہ گاڑی کہاں جا رہی ہے۔ ہم نے انہوں نے کہا کہ انہیں بھی اس طرف جانا ہے اور ں سے کچھ پہلے اتر جانا ہے۔ ہم نے ان کا استقبال کیا ہمارے ساتھ ہو گئیں۔ راستہ خوشگوار باتوں میں گا۔ اس قدر لمبے سفر میں کئی جگہوں پر چائے اور کھانے کے لئے گاڑی رکتی رہی۔ وہ بھی ہم سبھوں تہ لاہور میں ہوٹل میں خورد و نوش کے لئے اترتیں۔ اس طرح بے گانگی میں ایک اپنائیت کا احساس ہو چلا تھا۔ دوران گفتگو کچھ ذاتی سوالات بھی ہوتے رہے۔ بعد میں یہ پتہ چلا کہ خاتون کوئٹہ کی رہنے والی ہیں اور کالج یا یونیورسٹی کی طالبہ ہیں کسی عزیز کے یہاں جا رہی تھیں اور چند دنوں کے بعد انہیں مری میں بابا لعل شاہ کی درگاہ پر حاضری دینی تھی۔ خاتون کی دین داری، خوش عقیدگی، عفت مآبی، خوش گفتار اور مہمان نوازی کسی کو بھی متاثر کر سکتی تھی۔ میں تو خیر یوں بھی طبقۂ نسواں کی طرف سے حسن ظن رکھتا ہوں۔ اور حسن ظن کا قائل ہوں۔ جہاں جہاں ہوٹلوں میں کھانے پینے کا مسئلہ آتا وہ بل کی ادائیگی میں سبقت لے جانے کی کوشش کرتیں، وہ ہمیں اکثر و بیشتر مہمان کہہ کر زیر کر دیتیں۔ اور پیسوں کی ادائیگی خود کر دیتیں۔ یہ بات میرے لئے کوفت کی بھی تھی مگر وہ اس اطمینان کے ساتھ خرچ کرتیں گویا ہم لوگ انہیں پر انحصار کرکے پاکستان گئے ہوں۔ وہ بابا لعل شاہؒ کی سچی عقیدت مندوں میں تھیں۔ اور بار بار بڑے اعتماد اور یقین کے ساتھ یہ دہراتی تھیں کہ یہ وہ دربار ہے جس سے کبھی کوئی خالی نہیں گیا۔ جو دعا وہاں مانگو گے وہ

پوری ہوگی۔ انہوں نے اصرار کیا کہ ہم وہاں بھی ضرور حاضری دیں اور اپنی مرادیں مانگیں۔ میں نے اپنی مصروفیات کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ راولپنڈی میں چند دن رک کر پھر مجھے کراچی جانا ہے اور پھر جلد سے جلد ہندوستان واپس ہونا ہے۔ مگر انہوں نے اس درگاہ شریف کے اعجاز اور کرشموں کے جو واقعات بیان کئے انہیں سن سن کر یہ خواہش جاگتی رہی کہ ایک بار وہاں کی زیارت ضرور کر لی جائے۔ جب ان کی منزل قریب آنے لگی تو انہوں نے اپنا نام بتایا، ڈائری میں میں نے پتہ بھی لکھا، چلتے چلاتے انہوں نے نہایت عاجزی اور اصرار سے سو روپیوں کا ایک یا دو نوٹ بڑھایا اور یہ کہا کہ یہ رقم بابا صاحب کی طرف سے ہے اور اس لئے ہے کہ آپ وہاں ضرور جائیں۔ پنڈی سے کوہ مری کچھ زیادہ دور نہیں ہے۔ انہوں نے بسوں کی تفصیل بتائی، مری پہنچ کر بابا لعل شاہؒ کی درگاہ پہنچنے کا راستہ بتایا۔ عرس کی تاریخوں سے مطلع کیا، یہ عرس بس چند دنوں کے بعد ہونے والا تھا۔ یہ بھی کہا کہ وہ خود عرس سے ایک دن قبل وہاں موجود رہیں گی۔ میں نے روپے کے سلسلے میں سخت مزاحمت کی اور وعدہ کیا کہ وہاں ضرور پہنچ جاؤں گا۔ وہ ایک نہیں مانیں۔ اس عارفہ نے بار بار یہی کہا کہ یہ بابا صاحب کا حکم ہے۔ ظاہر ہے اس حکم کے آگے اس بندے کی فریاد و فغاں کی کیا حیثیت تھی۔ انتہائی جبر برداشت کر کے روپے قبول کر لینے پڑے۔ اور یہ طے ہوا کہ درگاہ میں ہماری ملاقات ضرور ہوگی۔

راولپنڈی میں دو تین دن قیام کے بعد عرس کی مقررہ تاریخ پر ہم اس وعدہ کی تکمیل کی خاطر کوہ مری کی طرف روانہ ہوئے۔ پتہ نہیں کن کن راستوں سے گزرتے ہوئے پانچ چھ گھنٹوں کی مسافت کے بعد ہماری بس مری کے دامن میں تھی۔ ... زائرین کا ہجوم تھا اور جنہیں کو دیکھو

وہ پاپیادہ کشاں کشاں پہاڑ کے دامن کی طرف رواں
معلوم ہوا اس جانب بابا لعل شاہ کی درگاہ ہے۔
جیسے اجنبی تھے، کلچر، زبان، لباس سب کچھ مختلف ...
لیکن ایک بات مشترک تھی ــــ اور وہ یہ کہ سارے کے
لوگ عقیدت کے مارے ہوئے تھے، سبھوں کے دل میں جو
کا درد تھا۔ مجھے بھی بابا لعل شاہؒ سے عقیدت ہو چلی تھی
کا جذبہ مجھے بھی اس صعوبت میں ایک لازوال مسرت دے
تھا۔ اب شام ہو چکی تھی، مئی جون کا مہینہ تھا مگر مری
بے پناہ ٹھنڈک تھی۔ ناہموار پہاڑی راستوں پر چلنے کی
عادت نہیں رہی لیکن ایک شوق مجھے کھینچے لئے جاتا تھا
لامعلوم تعلق اور ہلکی سی ملاقات بھی بسا اوقات کتنی مضـ
ہو جاتی ہے۔ ایک زخم مجھے زخم ... کا محتاج کر چکا
درگاہ کے اطراف و جوانب آدمیوں کا ریلا تھا، شام
آخری سرحدرات کے ابتدائیہ میں کہیں گم ہو چلی تھی۔
کہیں دکانیں سجی تھیں، دور چند شامیانے نظر آئے۔ ا
بجلی کے قمقمے روشن تھے۔ کسی نہ کسی طرح مجھے درگاہ
مرکزی حصے میں پہنچنا تھا۔ یہ بات ذہن میں موجود تھی کہ
کے ... کوئی خالی نہیں جاتا، دل میں کچھ طلب لے کر گیا
اسے بھی حاضری کے وقت پیش کرنا تھا ــــ لیکن سب
پہلے یہ کہ ان خاتون سے ملاقات ہو جائے۔ روضہ
کے اردگرد سجادگان کی سجی سجائی نشستیں تھیں۔
ان خاتون کی ہدایت کے مطابق سجادۂ خاص کی نشـ
کے پاس جا کر خاتون کے بارے میں دریافت کیا، کہ
جگہ دریافت کرنے کی ہدایت ملی۔ دوسری نشست گاہ
کچھ اتا پتا نہ ملا۔ متعدد لوگوں، پرانے زائرین اور
خدمت گزاروں سے سامنے چلتے اور حوالے کے سا
کرنا چاہا ــــ مگر افسوس کسی نے کچھ نہیں بتایا۔ ایک

بندے نے خواتین کے خیمے میں دریافت کرنے کی ہدایت کی۔ یہ بھی کیا۔ خواتین کے دو خیمے تھے۔ خوشامدیں کی، منت سماجت کی تو کسی بھلی عورت نے اِدھر اُدھر پوچھ تاچھ کی مگر وہ خاتون انسان ہوں تو ملیں ـــــ نہ جانے کیوں پہلے سے میرے ذہن میں یہ بات تھی کہ جس انداز سے وہ ملی تھیں، جیسی خاطر مدارات کی تھی، جس طرح درگاہ پر حاضری کی دعوت دی تھی اور قلب و نظر پر جو اثر ڈالا تھا ـــــ وہ یقیناً کسی آدم زادی کا کام نہیں ہو سکتا۔ یہ ایک وہم تھا جو چند دنوں پہلے پیدا ہوا تھا ـــــ اور اب دل میں اس کی تصدیق ہو چلی تھی۔ انہوں نے کہا تھا میں ہر سال بلا ناغہ زیارت کرتی ہوں، سجادگان اور خدام سب کے سب مجھے اچھی طرح جانتے ہیں، میرے قیام کی خاص جگہ ہے، سب اس سے واقف ہیں۔ یہ ساری باتیں ایک طرف اور دوسری طرف تمام متعلق افراد سے پوچھتا ہوں اور کوئی ان کے بارے میں کچھ بھی بتانے سے انکار کرتا ہے۔ میرا وہم و شک یقین میں بدلتا جا رہا تھا مگر میں ہمت نہیں ہارتا تھا۔ اسی عالم میں بابا لعل شاہؒ کی درگاہ پر حاضری بھی دی، جو مانگنا تھا شاید وہ بھول چکا تھا اور تازہ واردات کی دادرسی کر کے وہاں سے نکلا تو یخ بستہ ہوائیں چلنے لگیں تیز برفیلی آندھی نے سب کچھ درہم برہم کر دیا، زبردست برفباری ہونے لگی، کوئی جائے پناہ نہیں، کسی طرح ایک مزار شریف کے چھجے کے نیچے پناہ لی اور ٹھنڈک سے کانپنے لگا جب جب طوفان کا تھپیڑا آتا مختلف پہاڑیوں سے لوگ اجنبی لہجے میں نعرۂ تکبیر بلند کرتے۔ ایک نعرہ کے جواب میں دوسری طرف سے نعرہ بلند ہوتا شاید یہ سب کچھ بے پناہ ہیبت خوف اور عدم تحفظ کی وجہ سے ہو رہا تھا۔ آدمی ایسے ماحول میں اپنے آپ کو کمزور پاتا ہے اور چیخ کر ایک طرف اپنے وجود کا احساس دلاتا ہے اور دوسری طرف دوسرے انسانوں کی آواز سن کر تقویت محسوس کرتا ہے۔ خیر جو کچھ ہو نہایت کرب اور شدید ٹھنڈک کا مقابلہ کرتے ہوئے میں نے درگاہ کے ایسے چھجے کے نیچے بیٹھے بیٹھے رات گزار دی۔ صبح کی اذان کی آواز آئی تو مجھے محسوس ہوا کہ میں ابھی زندہ ہوں، سپیدۂ سحر نمودار ہوتے ہی ایک چائے خانے میں جا کر دو پیالی چائے سے اپنے آپ کو جس حد تک گرم کر سکتا تھا کر لیا اور پھر بس کے اڈے پر جا کر بس پر سوار ہوا، افتاں و خیزاں شکست خوردہ اپنی قیام گاہ پر راولپنڈی واپس ہوا۔

مجھے ایک خلش تھی کہ ان خاتون سے ملاقات کیوں نہ ہوئی۔ جس یقین کے ساتھ انہوں نے ملاقات کی بات کہی تھی اور اپنی دیرینہ حاضری کی وجہ سے درگاہ کے مجاورین سے جس شناسائی کا دعویٰ کیا تھا ـــــ وہ سب کا سب غلط کیوں ہو گیا۔ پھر یہ خجالت بھی تھی کہ درگاہ پر حاضری کے لئے جو رقم انہوں نے دی تھی وہ میں نے کیوں رکھ لی تھی، اگر وہ وہاں تھیں اور میں نہ مل سکا تو ان کے ذہن میں یہ خیال آئے گا کہ میں نے وہ رقم کسی اور مد میں خرچ کر دی ہے۔ میں سخت ادھیڑ بن میں رہا اور کئی دنوں تک اندر اندر اپنی شکست کی آواز سنتا رہا۔ پھر خیال آیا ڈائری میں ان کا پتہ لکھ لیا ہے، کراچی پہنچ کر اطمینان سے انہیں خط لکھوں گا۔ اور ان کی رقم کوئٹہ کے پتے پر واپس کر دوں گا۔ اس فیصلے کے بعد مجھے اطمینان مل گیا۔ کراچی پہونچا، چند دنوں تک اعزہ کی ملاقاتوں نے فرصت نہ دی۔ ایک روز شرف آباد سے کریم آباد آنا تھا۔ گاڑی اپنے تصرف میں اس روز نہیں تھی۔ مجبوراً ٹیکسی لے لی۔ ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا، پاس ہی سیٹ پر وہ پورٹ فولیو بیگ بھی رکھا جو برابر میرے ساتھ رہتا تھا۔ اس میں میری بیاض تھی، ایک عدد ضخیم قلم تھا۔ بہت سے ضروری کاغذات تھے، کچھ غیر ضروری چیزیں بھی

تھیں۔ کریم آباد اتر کر ٹیکسی والے کو کرائے کی رقم دی، بیگ اٹھانا بھول گیا۔ گیٹ کھول کر جیسے ہی اترا ڈرائیور نے چشم زدن میں گاڑی اسٹارٹ کر دی، ایک لمحہ میں مجھے احساس ہوا کہ پورٹ فولیو بیگ چھوٹ گیا ہے۔ میں گاڑی کے آخری سرے پر ہی تھا، ڈرائیور کو آواز دی، دیکھتے دیکھتے اس نے یکایک رفتار بڑھا دی، میں چیختا ہوا دور تک گیا مگر اس نے غیر معمولی رفتار سے گاڑی کو آگے بڑھا دیا تھا۔ اس کے اس بے تحاشہ بھاگنے پر مجھے اندازہ ہو گیا کہ ڈرائیور پورٹ فولیو بیگ دیکھ چکا تھا۔ وہ بے چارہ یہ سمجھ رہا ہوگا کہ اس میں موٹی رقم ہوگی۔ اسے دولت ہاتھ لگے گی۔ اسے تو کچھ ہاتھ نہیں لگا لیکن میرے ہاتھوں سے ایک اہم سرمایہ نکل گیا۔ اس بیگ میں وہ ڈائری بھی تھی جس میں اس خاتون کا پتہ تھا، مجھے لگا جیسے ایک آن میں میرا سب کچھ لٹ گیا ہو۔ میں نے اخبارات میں اعلان کرایا کہ میری ڈائری میں کچھ ضروری پتے ہیں، کوئی بندہ اسے بھیج دے۔ مگر اعلان بھی بیکار رہا کبھی کبھی زندگی کے چھوٹے چھوٹے واقعات آخری دم تک ڈنک مارتے رہتے ہیں۔ اس واقعے نے ذہن میں جو گرہ ڈال دی ہے وہ کبھی نہیں کھل سکتی۔ وہ خاتون کون تھیں ؟ ان کا نام بھی یاد نہیں رہا، کیا سچ مچ وہ کوئٹہ کی رہنے والی تھیں۔ بابا لعل شاہؒ کی درگاہ پر وہ کیوں نہیں ملیں۔ میں انہیں ان کے روپے کیوں کر واپس کر سکتا ہوں، درگاہ پر ملاقات نہیں ہونے کی وجہ سے وہ میرے بارے میں کیا سوچتی ہوں گی۔ یہ اور ایسے کتنے ہی سوالات جب سے لے کر آج تک جھنجھوڑتے رہتے ہیں۔ کراچی گیا تو یہ خلشِ ناتمام اور محرومی جاوید شاخِ نہالِ غم کی طرح ہری ہو گئی۔ بابا لعل شاہؒ کے مزار مقدس پہ مانگی ہوئی دعا بھی بے اثر ہو گئی کیا اس خاتون کا دعوہ جھوٹا تھا، یا مجھے مانگنے کا ہنر نہیں آتا ۔۔۔ یا اس پورے واقعے کے ذریعہ خدائے تعالیٰ مجھے سوختنِ ناتمام کی دولت بے بہا دینا چاہتا تھا۔ سو میں نے پالیا ۔۔۔ درد کی دوا پائی درد لا دوا پایا

عالم سوز و ساز میں وصل سے بڑھ کے ہے فراق
وصل میں مرگ آرزو ہجر میں لذتِ طلب

(جاری)

۔۔۔ بقیہ : بہروپیے ۔۔۔

"حضور! ایک بہروپیا یہ کیسے کہہ سکتا ہے"
لیکن وہ سب کچھ کہہ گیا تھا۔

وہ اب خاموش تھا۔ میں بھی چپ تھا۔ لیکن میرے من میں ایک دوسری آواز گونج رہی تھی ۔۔۔ اپنی پہچان کی آواز !!

اس کے بعد کئی دن تک اس سے ملاقات نہیں ہوئی
اب اس کا میرے شہر سے میل [illegible] تھا

وہ مجھ سے آخری بار ملنے آیا۔ آج وہ بہروپیا نہیں صرف سلیم بن کر آیا تھا۔ اس نے حسب دستور جھک کر سلام کیا میرے سامنے ایک رجسٹر کھول کر رکھ دیا جس میں شہر کے مختلف طبقوں کے افراد کی طرف سے دی جانے والی رقمیں درج تھیں ۔ انعام کے طور پر ۔۔۔ اور ان کے اسمائے گرامی اور دستخط بھی درج تھے۔ سب سے بڑی رقم سو روپے کی تھی۔

میں نے رقم کے خانے میں پانچ سو روپے لکھ دیئے اپنے نام کے سامنے لکھ دیا "ایک چھوٹا بہروپیا" اور اس کے آگے اتنا اور بھی جوڑ دیا ۔ "ایک بڑے بہروپیے کی طرف سے ایک چھوٹے بہروپیے کی نذر ۔۔۔ اس یقین کے ساتھ کہ ہم سب بہروپیے ہیں۔

ڈاکٹر فاران شکوہ یزدانی

شوق نیموی عظیم آبادی کے چند پورنیوی شاگرد

اور ان کا کلام

علامہ محمد ظہیر احسن شوق نیموی عظیم آبادی سے کتنے شعراء نے مشورۂ سخن کیا خود انہیں یاد نہیں تھا۔ بعض شعراء نے تو ان کو اپنے دیوان کا دیوان دکھایا اور اس پر اصلاح لی اور وہ اپنے خلق و مروت کی بنا پر نیکی کر اور دریا میں ڈال کے مصداق ان دوستوں اور شاگردوں کی فرمائش پوری کرتے رہے۔ ان کی تعداد کیا تھی اور وہ کون کون تھے علامہ کو اس کا بھی پتہ نہیں۔ ہاں بعض شعراء نے باقاعدہ ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا تھا اور برابر ان سے اپنے کلام پر اصلاح لیا کرتے تھے صرف انہی شعراء کا تذکرہ انہوں نے یادگار وطن میں کیا ہے۔ ان میں سے اکثر صاحب دیوان تھے۔ خود تحریر فرماتے ہیں۔

" احیاناً خدا جانے کتنے لوگوں نے مجھ سے مشورہ لیا ہے اور دستانہ بعض اوقات دیوان کا دیوان بہ نظر اصلاح دیکھنے کا اتفاق ہوا مگر جو لوگ بحیثیت شاگردی آج تک اپنا کلام دکھایا کرتے ہیں اور مجھ سے اصلاح لیا کرتے ہیں اور اکثر ان میں صاحب دیوان ہیں ان کے نام وغیرہ لکھے جاتے ہیں "[1]

علامہ شوق نیموی عظیم آبادی نے یادگار وطن میں مندرجہ بالا تحریر کے بعد جن شعراء کا تذکرہ کیا ہے اور نمونہ کلام پیش کیا ہے ان میں پورنیہ کے دو شاعر تسکین اور تفسیر پورنیوی بھی ہیں جن کے متعلق گمان غالب ہے کہ صاحب دیوان ہوں گے گرچہ ان کا دیوان ابھی تک دریافت نہیں ہو سکا ہے۔ تلاش جاری ہے۔ خدا کرے مل جائے۔

لہٰذا تسکین اور تفسیر پورنیوی کے متعلق جو کچھ مواد اب تک مل سکا ہے نمونہ کلام کے

[1] یادگار وطن صفحہ ۱۴۰

سانحہ درج ذیل ہے۔

تسطیر پورنیوی

آپ کا نام منشی امیر الدین تھا۔ تخلص تسطیر فرماتے تھے۔ موجودہ پورنیہ کمشنری کے صدر مقام پورنیہ کے محلہ عامل گنج کے رہنے والے تھے۔ جو پورنیہ سیٹی میں ہے۔ حضرت شوق نیموی کے شاگردوں میں تھے۔ تذکرہ یادگارِ وطن اور تذکرہ مسلم شعرائے بہار میں آپ کا ذکر آیا ہے۔ آپ کا سنِ پیدائش اور وفات ابھی تک نہیں مل سکا ہے۔ زیر تفتیش ہے۔ لیکن ستمبر ۱۹۰۳ء کے پیامِ یار، لکھنؤ میں آپ کا کلام ملتا ہے جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ آپ ستمبر ۱۹۰۳ء تک بقیدِ حیات رہے ہوں گے۔ واللہ اعلم

نمونۂ کلام

کوچۂ عشق میں چلنے کا ارادہ پھر ہے
خیر ہے حضرتِ دل آپ یہ کیا کرتے ہیں ؟
مظلوم کی آہوں کی بڑی ہوتی ہے تاثیر
پچھتاؤ گے تم نے جو ستایا میرے دل کو

پیامِ یار نمبر ۹ جلد ۱۲ ص ۵ ستمبر ۱۹۰۳ء میں یہ غزل ملتی ہے۔

طرح مصرعہ:- کیوں شورِ فغاں آج عنادل میں نہیں ہے

جناب امیر الدین صاحب تسطیر از پورنیہ شاگرد جناب شوق نیموی عظیم آبادی۔

غزل

خورشید بھی اس رخ کے مقابل میں انہیں ہے
یہ نورِ تجلّی مہِ کامل میں نہیں ہے
پریوں نے کہا دیکھ کے اس رشکِ قمر کو
یہ حسن کسی حورِ شمائل میں نہیں ہے
کیا سخت سفر ملکِ عدم کا ہے لے تسطیر
راحت کو جو ڈھونڈو کسی منزل میں نہیں ہے

پیامِ یار قومی پریس لکھنؤ مرتبہ محمد نثار حسین نثار شمارہ جلد ۱۲ صہ ۱۲ ۱۹۰۳ء میں مندرجہ ذیل غزل ملتی ہے۔

سر رگڑتے درِ جاناں پہ زمانہ گزرا
ہائے تقدیر کے لکھے کو مٹائیں کیوں کر
انہیں اغیار کی باتوں سے ملی کب فرصت
پھر کہو قصۂ غم اپنا سنائیں کیوں کر
دل مضطر تو ہے بیتاب مگر وہ ظالم
پہلوئے غیر میں بیٹھا ہے بلائیں کیوں کر
قیدِ ہستی سے جو آزاد ہوا ہو تسطیر
ایسے دیوانے کو زنجیر پہنائیں کیوں کر

پیامِ یار نمبر ۹ جلد ۱۲ ص ۶ ستمبر ۱۹۰۳ء میں مندرجہ طرح پر ایک غزل ملتی ہے۔

مصرعہ طرح :- وہ سنتے ہیں ہماری داستاں پر

غزل

بتوں کے ظلم جورِ چرخِ گردوں
ہزاروں آفتیں ہیں ایک جاں پر

تفسیر پورنیوی

۱؎ یادگارِ وطن تالیف محمد ظہیر احسن شوق نیموی عظیم آبادی مطبوعہ قومی پریس لکھنؤ ص ۱۱۴-۱۱۶

تذکرہ مسلم شعرائے بہار حکیم سید احمد اللہ ندوی، جلد اول ص ۱۰۲

پورنیہ پر فوجداروں کی حکومت۔ اکمل یزدانی جامعی مطبوعہ جنرل پرنٹنگ پریس کشن گنج ص ۱۱۹

منشی معیز الدین اپنا تخلص تفسیرؔ فرماتے تھے۔
آپ کے والد کا نام مولوی منیر الدین احمد تھا۔ پورنیہ بستی
محلہ سید پاڑہ کے رہنے والے تھے۔ [1] شوق نیموی
کے شاگرد رشید تھے۔

نمونۂ کلام

رنج و غم اپنا کوئی کیا جانے
درد دل درد آشنا جانے
نزع میں بالیں سے اٹھ کر گھر چلے
آپ میرے حق میں یہ کیا کر چلے؟

[1] یادگار وطن صفحہ ۱۱۷-۱۱۶

تسطیر اور تفسیر کے علاوہ شوق نیموی عظیم آبادی
کے ایک اور پورنیوی شاگرد کا پتہ چل سکا ہے۔ وہ ہیں
راجہ پرتھی چند لال صبا۔

راجہ پرتھی چند لال صبا

راجہ پرتھی چند لال چودھری پورنیہ بستی کے باشندہ
تھے اور صباؔ تخلص کرتے تھے۔ وہ شعر و شاعری کا اچھا
ذوق رکھتے تھے۔ ان کا کلام معیاری اور زبان صاف
تھی۔ جناب شوق نیموی عظیم آبادی کے شاگرد و ں میں تھے
اکثر پیام یار۔ لکھنؤ میں آپ کا کلام اکثر چھپتا تھا [2]
پورنیہ گزیٹیئر مرتبہ پی۔ سی۔ رائے چودھری [illegible]
[illegible] ۲۱۳ اور بنگال ڈسٹرکٹ گزیٹیئر پورنیہ مرتبہ
[illegible]

لال صبا کے متعلق یوں درج ہے۔
"راجہ پرتھی لال چند رئیس پورنیہ بابو
دھرم چند لال کے لڑکے تھے اور دھرم چند
لال بابو ننک چھیدی لال کے بیٹے تھے جو
ساہوکار (BANKER) تھے جنہوں
نے تجارت سے دولت کمائی تھی دھرم چند
لال نے اپنی آبائی جائداد میں اضافہ کیا
اور بابو پرتاپ سنگھ سے پرگنہ حویلی
خرید لیا جو ان کی بیوی مسماۃ بھگوان
وتی چودھرائن کے نام سے خریدی گئی۔
ان کے لڑکے بابو پرتھی چند لال
چودھری پورنیہ ضلع کے سب سے بڑے
زمینداروں میں شمار کئے جاتے تھے۔
ان کی زمینداری پرگنہ حویلی، آسجا،
سورجاپور، اور لواکھالی اسٹیٹ میں
تھی۔ ان کی زمینداری میں ان کے علاوہ
کچھ اور چھوٹی چھوٹی زمینداریاں
تھیں۔"

نمونۂ کلام

جفائے دوست کا شکوہ جو بار بار کیا
دل حزیں نے محبت کو شرمسار کیا
ہمیشہ جس کو دل و جاں سے ہم نے پیار کیا
اسی نے اس دل ناداں کو داغدار کیا
نہ چین آیا شب ہجر میں کسی کروٹ
بشام وصلت قیامت کا انتظار کیا
گلہ تو ہے نہ کچھ آسماں کا شکوہ ہے
مجھے دل ناداں نے بے قرار کیا

---

[2] تذکرہ ہند و شعرا بہار (۲) پیام یار لکھنؤ اگست ۱۹۰۲ء ص ۱۱

یہ اپنی اپنی ادا ہے یہ اپنی اپنی پسند
وفا کسی نے کسی نے جفا شعار کیا
کبھی جو ان کا کوئی وعدہ ہو سکا پورا
ابھی کا اس دل ناداں نے اعتبار کیا
جہاں میں اور بھی کچھ حسرتیں ہیں اے صبا لیکن
بس ایک خوشی تھی وہ ہم نے اختیار کیا
(مطبوعہ گنج نو' ... صفحہ ۱۲)

'پیام یار' اگست ۱۹۰۲ء صفحہ ۱۱ میں مندرجہ ذیل طرح
پر مندرجہ ذیل غزل ملتی ہے۔ بابو ہرکشن چند لال صبا رکیس
پھولپور شاگرد شوق نیموی

طرح مصرعہ۔ وہ سمجھے ہیں ہماری داستاں پر

ہزاروں ٹھوکریں کھاتا ہوں دن رات
پڑا ہوں جب سے تیرے آستاں پر
بپا کر دی فرشتوں میں قیامت
جو پہنچا میرا نالہ آسماں پر
تمہیں ہنستے ہو سن کر حال ورنہ
جہاں روتا ہے میری داستاں پر
تیرے جور و جفا کا حشر میں بھی
نہ آئے گا گلہ میری زباں پر

پیام یار، اکتوبر ۱۹۰۲ء میں صفحہ ۱۶ میں اس طرح پر ایک
یہ غزل ملتی ہے۔
مصرعہ طرح:۔ مرے قابو میں میری جان اگر دل ہوتا
عشق لیلیٰ کا اگر قیس کو کامل ہوتا
مانع دید کوئی پردۂ محمل ہوتا
ایک دل تھا کہ یار نے لوٹا اس کو
کرتے ہم تم کو نذر اور اگر دل ہوتا

اور کچھ حسن کا تیرے نظر آتا جلوہ
تیرے آگے جو میرا آئینہ دل ہوتا
آب خنجر جو پلاتا عوض شربت وصل
تیرا احسان بہت ہجر میں قاتل ہوتا
چھانتا خاک دل میں کوچۂ وحشت کی کبھی
میرے قابو میں میری جان اگر دل ہوتا
'پیام یار' جون ۱۹۰۳ء صفحہ ۲ پر مندرجہ ذیل
پر یہ غزل ملتی ہے۔

(بقیہ صفحہ ۱۸ پر)



مشورہ

شمیم انجم وارثی
شیام نگر، ٢٤ پرگنہ (بنگال)

مری چاہت کا بس اتنا صلہ دو
مجھے دل سے بھلا دو

کہاں میں اور کہاں تم
نہ پا سکتا تمہاری گرد کو بھی ہو جہاں تم
تمہیں منزل ہو منزل کا پتہ ہو
مرے ذوق تجسس کا خدا ہو
تمہارے گل کی رنگت ہے تمہیں سے
گلستانوں کی زینت ہے تمہیں سے
بتاؤں کیا کہ تم کیا ہو کیاں ہو
مکیں ہو لا مکاں ہو
کہیں حاکم کہیں محکوم ہو تم
کہیں لازم کہیں ملزم ہو تم
تمہیں بیشک یہاں ہو اور وہاں ہو
اگر چہ ہاں میں خرابی کر نہاں ہو
یہ لازم ہے مجھے دل سے بھلا دو
میری چاہت کا بس اتنا صلہ دو!
تمہارے گھر کے غم خواروں کا آج بھی حامل نہیں ہوں
تمہارے عشق کے قابل نہیں ہوں
میری چاہت کا یہ انعام دیدو
بچانے کو مجھے اپنا کوئی الزام دیدو !!

آزاد نظم

(ایک تاثراتی نظم)

ڈاکٹر سید ابوالفیض سحر گیلانی

لوگ کہتے ہیں!
آفتاب ڈوب گیا
بحر ظلمات کی اتھاہ گہرائیوں میں
نور چاند چھپ گیا
دور آسمانوں میں
اور تارے
ریزہ ریزہ ہو کر بکھر گئے
غلط سب غلط!
نہ آفتاب ڈوبا ہے
نہ چاند چھپا ہے
نہ تارے ریزہ ریزہ ہو کر بکھرے ہیں
انتظار، بس انتظار کرو
پھر نئے آب و تاب سے آفتاب نکلے گا
چاند چمکے گا، تارے جگمگائیں گے
پھر حسین صبح، حسین شام اور حسین رات ہوگی !!!

غزلیں

ڈاکٹر محمد علی اثر

حیدرآباد

تو جو احساس پہ لہرائے گا آنچل بن کر
پھیل جاؤں گا تری آنکھ میں کاجل بن کر

دشتِ احساس میں اک شخص کا شبنم لہجہ
پیاس ہونٹوں کی بجھا دیتا ہے چھاگل بن کر

ایک پرچھائیں مرے ساتھ رہا کرتی ہے
کبھی خوشبو، کبھی آہٹ، کبھی آنچل بن کر

ایک آواز مری نیند میں گھل جاتی ہے
کبھی نغمہ، کبھی برکھا، کبھی پائل بن کر

اس کو احساس کے آنگن میں بٹھا کر دیکھو
درد سینے میں مہک اٹھے گا صندل بن کر

ایک رستے ہوئے جوگی کی طرح ہم بھی اثر
دشت و صحرا میں بھٹکتے رہے بادل بن کر

اختر شاہجہانپوری

شاہ جہاں پور

منتظر سب کے سب زوال کے ہیں
دوست دشمن مرے کمال کے ہیں

باغباں ہو کہ ہو کوئی صیاد
ایک ہی ذہن اور خیال کے ہیں

میرے چہرے میں عیب مت ڈھونڈو
یہ نشان گردِ ماہ و سال کے ہیں

میں ہوں غمگین تو ایسا لگتا ہے
اشتہارات سب ملال کے ہیں

بیچتے ہیں وہی جو پاس نہیں
یہ بھی تاجر بڑے کمال کے ہیں

ہجر کی راتیں کٹ گئیں اختر
اب جو دن ہیں سبھی وصال کے ہیں

غزلیں

صغیر احمد ریاضی
جبلپور

توہین کر نہ میرے برابر جواب دے
آ اپنے آسماں سے اتر کر جواب دے

کیوں جھڑکیوں پہ کھال گوارا نہیں مجھے
میرے ہی مرتبے کا قلندر جواب دے

آنکھوں کی روشنی کا بھی اس میں بتاؤ ہے
یعقوب کے مزاج کو پڑھ کر جواب دے

شیشے کی عظمتوں کا کھلا اعتراف ہے
جب بھی جواب میں کوئی پتھر جواب دے

تو خود کو ڈھونڈ لے نہ انہیں ڈھونڈنا پڑے
کب تک ترے خطوں کا کبوتر جواب دے

کل مچھلیوں کا بند اسی مسئلے میں تھا
قطرہ کرے سوال سمندر جواب دے

مٹی بھی بانٹ لو یہ ہمارا جواب ہے
یہ رام دیں جواب نہ بابر جواب دے

ہجرت تلک یہ صلیب اٹھائے رکھو ریاضی
تھک جاؤں تو پاؤں کا چکر جواب دے

●●

دیپک قمر
میرٹھ کینٹ

اب بھی وہ دیکھ دیکھ کے ہنستا نہیں کبھی
شاید شریر پیار نے چھیڑا نہیں کبھی

کہنے کو ایک پھول ہے دل پر رکھا ہوا
پربت سا دل پہ بوجھ ہے ہٹتا نہیں کبھی

اپنا مزاج اور ہے پھولوں کے واسطے
دنیا کے سبز باغ کو چاہا نہیں کبھی

اڑنے دیا ہے دور تک ہم نے خیال کو
وہم و گماں کے پاؤں کو باندھا نہیں کبھی

جانے ہوائیں کس طرف لے جا کے پھینک دیں
مجبور زرد پتے نے سوچا نہیں کبھی

یوں زندگی گزار دی دن کے فریب میں
مکھڑا حسین رات کا چوما نہیں کبھی

منزل پکارتی ہو جب اس کو قدم قدم
رستے میں پھر کسی کی وہ سنتا نہیں کبھی

اب تک ہیں زلف رات کی باندھے ہوئے
لگتا ہے چہرہ صبح کا دیکھا نہیں کبھی

کرنوں کی چڑیا روز ہی دیتی رہیں دستکیں
وہ دل کے در کو کھول کے ملتا نہیں کبھی

●●

ستیہ پال ملہوترہ عارف
(امرت سر)

بحرِ ظلمت سے کسی طور نکالے مجھ کو
ناخدا بن کے کوئی آئے بچالے مجھ کو
خاک ہوں ایک ہی جھونکے میں بکھر جاؤں گا
کر نہ تو غم کی ہواؤں کے حوالے مجھ کو
موت کی نیند سلادے نہ سکوتِ ساحل
کاش یہ موجِ بے تاب اچھالے مجھ کو
روح احساس کے شعلوں میں جھلس جائے گی
کوئی انگارے دوزخ سے نکالے مجھ کو
کتنے ہی گوہرِ گم گشتہ ملیں گے مجھ میں
شرط اتنی ہے کوئی دل سے کھنگالے مجھ کو
شمعِ عرفاں ہوں کوئی کرمکِ شبتاب نہیں
روشنی پھیلتی جائے گی جلالے مجھ کو
چاہتا ہوں کہ تپا کر مجھے کندن کردے
سوزِ الفت! کبھی سینے سے لگالے مجھ کو
بے خودی! اجنبی راہوں ہی میں کھو جاتے
کیا خبر کوئی کہیں ڈھونڈ نکالے مجھ کو
عمر یہ سوچ کے دوزخ ہی میں گزری عارف
ڈر ہے تہذیب کہیں مار نہ ڈالے مجھ کو

غزلیں

محسن رضا رضوی
(نئی دہلی)

خود آشنا تھے، چشمِ جہاں پر عیاں رہے
چمکے ہم آفتاب کی صورت جہاں رہے
ہم آشنائے گوشِ زمانہ کہاں رہے
ہم ہیں وہ داستاں جو پسِ داستاں رہے
اب دیکھنا ہے دیر و حرم کے تضاد میں
میری جبیں رہے کہ ترا آستاں رہے
میں نے کہا کہ آپ کی دل میں بسی ہے یاد
کہنے لگے کہ دل میں بسی ہے تو ہاں رہے
صحرائے زندگی کی غضبناک دھوپ میں
ہم اہلِ قافلہ کے لئے سائباں رہے
اس کے لئے ہمیشہ دعا مانگتے رہو
جو شخص بن کے ذہن پہ بارِ گراں رہے
اپنا وجود خود پہ ہی اک بار بن گیا
ہم اپنے ہی وجود سے کیا سرگراں رہے
ماضی کی یاد دل کو لبھائے چلی گئی
ٹھہرے ہوئے خیال کے جب کارواں رہے
ہر شخص دل سنبھال کے بیٹھا تھا دم بخود
جب تک کہ ان کی بزم میں رضوی میاں رہے

احسن امام احسن
بڑا بازار، ہزاری باغ

کاسۂ دل سے لہو آنکھوں سے پانی لے گیا
زخم دل دے کر وہ میری شادمانی لے گیا
کس قدر ظالم ہے وقت اس کی کہانی کیا کہوں
مجھ کو بوڑھا کر کے وہ میری جوانی لے گیا
کس طرح تالاب میں اب مچھلیاں زندہ رہیں
موسم گرما تو آ کر سارا پانی لے گیا
کتنا اعلیٰ، کتنا مخلص، کتنا وہ ہمدرد تھا
دے کے خوشیاں جو میرے غم کی کہانی لے گیا
میرے ماضی کو کسی اندھے کنویں میں ڈال کر
لمحۂ سفاک میری زندگانی لے گیا
دردِ ماضی، فکرِ حاضر اور فردا کی خوشی
وقت کا طوفان بھی کیا کیا نشانی لے گیا
عہدِ ماضی کے فسانے کس سے لے احسن کہوں
دے کے تازہ غم کوئی یادیں پرانی لے گیا

اظہر نیر
جلال نگر۔ ڈورگ۔ (ایم پی)

میرے ہونٹوں پہ روشن عجب پیاس ہے
پاس میں آس ہے آس میں یاس ہے
خلوتوں میں بھی ہر دم یہ احساس ہے
وہ نہیں۔ اس کا سایہ میرے پاس ہے
شہر بھی جنگلوں کی طرح ہو گئے
زندگی کے مقدر میں بن واس ہے
جھولیوں کو فقیروں کی بھرتا رہوں!
اب متاعِ خوشی بھی میرے پاس ہے
عشق کی خاکساری پہ نازاں ہوں میں
حسن کی برتری کا بھی احساس ہے
مجھ کو سوغاتِ فصلِ خزاں ہے قبول
زرد پھولوں میں بھی کچھ نہ کچھ باس ہے
مال و دولت کا نیرؔ بھروسہ نہیں
معتبر ہے اگر کچھ تو افلاس ہے

غزلیں

علی حماد عباسی
اعظم گڑھ

بہروپیے

وہ فٹ پاتھ پہ کھڑا تھا

روبی ڈپارٹمنٹل اسٹور سے نکل کر میں اپنی سُرخ
تی وین تھاؤزنڈ کی طرف قدم بڑھا رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی
نے چاروں طرف گھیرے بچوں کی بھیڑ کو ہٹا کر وہ میرے قریب
اور ایک خاص انداز سے جھک کر اس نے مجھے سلام کیا۔
نے پوچھا۔

"کہو آج کیا بہروپ ہے؟"
"حضور! آج تو میں جوگی بنا ہوں"

میں اس پہ ایک نظر ڈالی۔ وہ سچ مچ کا جوگی لگ
رہا تھا۔ سر سے کان کی لووں تک بندھی ڈھیلی ڈھالی جوگ
ک کی پگڑی، اسی رنگ کا لمبا کرتا اور لنگی۔ ننگے پاؤں،
دھوں سے لٹکتی ان گنت چھوٹی بڑی جھولیاں، ڈوری
ے بندھا المونیم کا کہیں کہیں سے پچکا ہوا ایک لوٹا، بغل
ں لاٹھی لئے اور بائیں کندھے پر سارنگی لٹکائے وہ میرے
منے کھڑا تھا۔ اس نے سارنگی پر کمانی پھیرتے ہوئے کچھ
نا چاہا تو بچوں نے ایک آواز ہو کر شور مچایا، "جیسے نہیں ا
کی سسرال جاتے وقت کیسے روتی ہے۔ پہلے وہ سناؤ۔"

اس نے ایسا ہی کیا۔

بچوں نے خوش ہو کر زور سے تالیاں بجائیں اور پھر چپ ہو گئے۔ اب وہ میری طرف متوجہ ہوا۔ اس نے آنکھیں موند کر سارنگی کی کمانی کو دوبارہ حرکت دی۔ اس کے تاروں سے ایک نغمہ پھوٹا۔ اس نے کہا کہ جب رانی شام دیئی نے راجا کے ساتھ چلنے کی ضد کی:

تڑپ کے بولے راجا بھرتری جی
سن لے رانی میری ای بات ـ
جوگی ساتھ رہنا نا سو بھے....
کوئی کہے گا ماتا ہے
کوئی کہے گا بہنا ہے
کوئی کہے گا جوگی ٹھگ ہے
اُڑھری لئے پھرت ہے سات

اور اس طرح راجا بھرتری ہری کے جوگ لینے کی کہانی سناتا وہ آگے بڑھ گیا۔

اس کو دیکھا تو میں نے کئی بار تھا لیکن میری اور اس کی یہ پہلی ملاقات تھی۔ کچھ دنوں سے وہ میری کوٹھی [illegible]

حفیظ ذکی کے پیچھے والی گلی میں مقیم تھا۔ اس کا نام سلیم تھا لیکن لوگ اس کو بہروپیا کے نام سے پکارتے تھے۔ وہ روزانہ (جمعہ کے دن چھوڑ کر) تین ساڑھے تین بجے کوئی نہ کوئی بہروپ بنا کر نکلتا اور گلیوں اور بازاروں میں لوگوں کو اپنا سوانگ دکھاتا شام ڈھلے گھر لوٹ آتا۔

پھر دوسری ملاقات

میں ڈرائنگ روم میں بیٹھا کر کا انتظار کر رہا تھا کہ گیٹ پر شور سنائی پڑا۔ باہر نکلا تو دیکھا کہ وہ لان کے پاس کھڑا ہے۔ بچوں کے ہجوم کے علاوہ اس کے ساتھ تین چار آدمیوں کی ایک ٹولی بھی ہے۔ مجھ کو دیکھتے ہی اس نے لہک لہک کر گانا شروع کر دیا — تیرے در پہ آیا ہوں۔ کچھ کر کے جاؤں گا — جھولی بھر کے جاؤں گا — یا مر کے جاؤں گا —

مجھے یہ پوچھنے کی کوئی ضرورت نہیں ہوئی کہ اس نے اس روز کیا بہروپ کیا تھا۔ وہ قوال بنا تھا اور اپنی قوالی پارٹی لئے میرے سامنے کھڑا تھا۔ گردن سے ہارمونیم لٹکائے سر پر سلما ستارہ ٹنکی سُرخ مخمل ٹوپی، پھول دار گلابی کرتے میں چاندی کے گچھے دار بٹن اور اس پر نیلے رنگ کی جھالر لگی واسکٹ، چوڑی دار پیجامہ اور پیروں میں سلیم شاہی جوتے کم و بیش یہی لباس اس کی قوال پارٹی کا بھی تھا۔

اس نے ہارمونیم کے پردوں پر تیزی سے انگلیاں دوڑانی شروع کیں۔ اور دھونکنی کو جلدی جلدی چلاتے ہوئے گانا شروع کیا تو اس کے ساتھی ڈھولکئے نے گردن جھٹک جھٹک کر ڈھولک ٹھنکائی اور دوسرے ساتھیوں نے ڈھولک کی تھاپ پر ٹھیکا دیا۔ کچھ دیر وہ سب مل کر گاتے رہے۔ پھر جھک کر سلام کیا اور گاتے ہوئے گیٹ سے نکل گئے۔

اور ایک دن چوک بازار میں وہ مجھے مجنوں کے بھیس میں ملا۔ بڑی غم ناک آواز میں گاتا ہوا ..... لیلیٰ اپنی پکاروں میں بن میں ... لیلیٰ پیاری لیلیٰ ہے کہیں بن میں ... اس روز اس نے اتنا اچھا میک اَپ کر رکھا تھا کہ اصل اور بہروپ میں امتیاز کرنا مشکل تھا۔ دھول میں اَٹے ہوئے بال۔ چہرہ اداسی کا آئینہ۔ آنکھوں سے آنسو رواں — گریباں چاک، آستین تار تار۔ کرتے پاجامے پر جا بجا خون رنگ دھبے۔ پاگلوں کی طرح آسمان پھاڑ قہقہے لگاتا اچھلتا کودتا۔ ہاتھ میں ایک گول سا پتھر لئے جیسے وہ تیزی سے ہاتھ گھما کر پھینکتے پھینکتے رہ جاتا۔ اس سے پہلے کے میں کچھ کہتا وہ خود بول پڑا۔

"میں آج مجنوں بنا ہوں"

"لیکن تمہاری لیلیٰ کدھر ہے؟" میں نے ذرا ہنس کر پوچھا سن کر اس نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ پھر بڑے شیکھے انداز میں آنکھ مارتے ہوئے کہا۔

"میری ایک لیلیٰ تو بھاگ گئی!"

"تو کیا ہوا۔ دوسری تلاش کرو۔"

"حضور! دوسری لیلیٰ کی تو آپ کو بھی تلاش ہے!"

یہ کہہ کر وہ کچھ دیر تک اپنے دونوں گھٹنوں کو اچکا اچکا کر کھرکھر کرتا رہا اور میری طرف معنی خیز نگاہوں سے دیکھتا رہا۔ پھر یکایک ایک لمبی چھلانگ لگا کر پاگلوں کی طرح ہنستا چنگھاڑتا لیلیٰ! لیلیٰ! پکارتا میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

دوسری لیلیٰ کی تلاش والی بات مجھے ذرا کھلی۔ آخر اس کو یہ بات معلوم کیسے ہوئی کہ میری بیوی [illegible] گئی تھی۔ لیکن یہ سوچ کر کہ وہ یہ بات الل ٹپ کہہ گیا ہو میں نے اس پر کوئی خاص دھیان نہیں دیا۔ آخر تھا تو وہ ایک بہروپیا!

دوسرے دن گھنڈک کمانڈ پروجیکٹ میں اپنے ایک بڑے ٹھیکے کے سلسلے میں مجھے نیپال کی ترائی میں جانا پڑا اور مختلف بلوں اور کاغذوں سے متعلق فائلو ہیں تیار کرانے میں دفتر میں ایک میز سے دوسری میز، ایک بابو سے دوسرے بابو تک ای۔ سے ایس ای کو خوش کرنے اور پے منٹ لینے سے مجھے تقریباً دو ہفتے لگ گئے۔

واپسی پر معلوم ہوا کہ وہ ابھی تک پڑوس میں براجمان ہے اور میری غیر موجودگی میں اپنے معمول کے مطابق وہ بہروپ کے مختلف آئٹم پیش کرتا رہا ہے۔

شاید اس کو میری واپسی کی اطلاع مل گئی تھی۔ شام کے جھٹ پٹے میں مجھے اس کا پیغام ملا کہ وہ مجھ سے ملنا چاہتا ہے۔ باہر آنے پر میں نے دیکھا کہ وہ برآمدے میں کھڑا مسکرا رہا ہے۔

اس کے سر پر پہاڑی لوگوں جیسی زعفرانی رنگ کی پگڑی تھی، آنکھوں پر سنہری کمانی کی آدھے گول شیشے کی عینک ناک کے آخری سرے پر ٹکی ہوئی تھی۔ ہاتھ میں چھتری بغل میں بہی کھاتا، کان پر قلم، ریشمی کرتا، ٹخنوں تک دھوتی، پاؤں میں ہرا اون گھٹنوں کا جوتا اور کندھے سے لٹکتا ہوا سستے ہرو کپڑے کا تھیلا۔ وہ میرے نزدیک آکر بنچ پر بیٹھ گیا۔

بہی کھاتا کھول کر بچوں کے سبق سنانے کے انداز میں اس نے مجھے بتایا کہ جب سے میں ٹھیکیداری کے کام سے باہر چلا گیا تھا میرے ملازمین نے سینکڑوں روپے کا آٹا، دال، چاول، گھی، تیل، مسالہ ادھار لے کر کھا ڈالا اور وہ جو آپ نے بہت پہلے سیٹھ سدرشن داس سے ہزار روپے رقم ادھار لی تھی اسکوٹر خریدنے کے لئے ابھی تک اس کا بیاج [illegible]۔ وہ سیٹھ کا منیم ہے اور تقاضے [illegible] پہ آیا ہے۔

بہت تنگ آ [illegible] کے خیال سے

"اچھا تو منیم جی اب آپ جائیں۔"

"جی سرکار!"

"اور اپنے سیٹھ سے بولیں۔"

"کیا بولوں سرکار!"

"کہ ان کا حساب کتاب اگلے مہینے صاف ہو جائے گا۔"

"اور میرا کمیشن سرکار!"

"وہ سیٹھ جی سے لینا۔"

اس نے جھک کر سلام کیا اور دھوتی کو جھٹکی ہوئی کمر پر سرکاتا، چھتری جھٹکتا، عینک کو آنکھوں پر جماتا وہاں سے چلا گیا۔

"لو، یہ بھی خوب رہی۔"

"کیا حضور؟" میرے نیپالی دربان نے پوچھا۔

"آخر اس بہروپیے کو کیسے معلوم ہوا کہ میں نے کبھی سدرشن داس سے کوئی رقم قرض لی تھی۔"

اس پر دربان نے کہا: "حضور! بس اتنا ہی نہیں وہ تو آپ کے بارے میں لوگوں سے بہت کچھ پوچھتا رہتا ہے۔ مانو وہ آپ کا کوئی راز معلوم کرنا چاہتا ہے۔ ابھی کل مجھ سے بول رہا تھا کہ صاحب کے بارے میں جو فارن ایکسچینج گھوٹالے کی انکوائری ہوئی تھی اس کا کیا ہوا؟ مجھے تو یہ سی آئی ڈی کا آدمی معلوم ہوتا ہے۔"

"سی آئی ڈی کا آدمی!" میں نے حیرت سے کہا۔

حیرت اس لئے کہ میرے خلاف تو انکوائریاں ہوتی ہی رہتی ہیں۔ میرے جیسے لوگ اس سے گھبراتے کہاں ہیں۔ میں ایک اسکول ٹیچر تھا۔ جب میں نے کاروبار کی [illegible] دنیا میں قدم رکھا تو میرا ضمیر کچھ دور تک ساتھ دیتا رہا لیکن پھر وہ بھی میرا ساتھ چھوڑ گیا۔ پھر میں نے جلدی جلدی دولت بٹورنے کے لئے کیا کچھ نہیں کیا۔ سمنٹ میں را

بھی۔ بڑے پیمانے پر اسمگلنگ کی فارن اکسچینج کے بزنس سے پچاسوں لاکھ کمائے۔ بڑے بڑے ٹھیکے حاصل کئے لمبی لمبی رشوتیں دیں۔ افسروں کو قیمتی شرابیں پلائیں۔ عورتیں سپلائی کیں۔ اور تو اور میں نے اپنی بیوی کو بھی ترقی کے زینے کے طور استعمال کرنا چاہا تو اس نے مجھے پہلے تو بار بار سمجھایا کہ جو کچھ اسکول کی تنخواہ اور ٹیوشن سے ملتا ہے وہی گزر بسر کرنے کے لئے کافی ہے۔ زندگی میں سکون اور آرام چاہئے جو سونے چاندی کے انبار پر بیٹھنے سے نہیں ملتا۔ اس نے میرے ساتھ چلنے سے صاف انکار کر دیا۔

پھر میں نے سماج میں اپنی ساکھ بنائے رکھنے کے لئے انگلش میڈیم اسکول کھولے، کئی شہروں میں اس کی شاخیں قائم کیں۔ ٹیچرس کو بھی ہر طرح سے اکسپلائٹ کیا اور اس کا کامیابی سے تجزیہ کیا کہ کثیر آمدنی (اور بلا گرفت آمدنی) کے لئے انگلش میڈیم اسکول سب سے اچھا میڈیم (ذریعہ) ہے۔

لیکن بہروپیا اور سی آئی ڈی! اس کے پیچھے راز کیا ہے؟ بہروپیے کی اصلیت کیا ہے؟"

دوسرے دن میں نے بہروپیے کے دروازے پر دستک دی۔

اس نے دروازہ کھولا۔ مجھے سامنے پاکر اس کو حیرت ہوئی۔ اس سے پہلے کہ وہ مجھ سے اندر آنے کو کہتا میں اس کے گھر کے اندر داخل ہو چکا تھا۔ گھبراہٹ کے عالم میں کبھی مجھے اور کبھی اپنے گھر کو دیکھ رہا تھا۔ میں تو وہاں یہ سوچ کر گیا تھا کہ ایک ایسا آدمی جو طرح طرح کے بہروپ بناتا ہے اور پھر اس پر سرکاری جاسوس ہونے کا بھی شبہ ہو اس کی زندگی تو بہت شاندار ہوگی

پھر یہ کیا؟ وہاں تو کچھ بھی نہیں تھا۔ اس کا تاریک کمرے میں ایک پرانا سا ٹاٹ بچھا ہوا تھا جس کے ایک کونے پر ایک ادھیڑ عمر کی عورت بیٹھی ہوئی [illegible] ان بچوں کو ایک ساتھ دودھ پلا رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے اپنی چھاتیاں بلاؤز کے نیچے سرکا کر چھپا لیں پھر اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ اس کے بہروپ کے سامان پورے کمرے میں بکھرے پڑے تھے۔

اس نے مجھے بیٹھنے کے لئے ایک چٹائی دی اور خود ٹاٹ پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔

"فیروزہ!" اس نے آواز دی

"جی ابا"

"بڑے صاحب آئے ہیں چائے بنا کر لاؤ۔"

اس کے بعد وہ میری طرف متوجہ ہوا۔

"کہئے حضور کیسے تکلیف کی؟"

کوشش کے باوجود میں اس کو اپنے اس طرح اس کے گھر میں گھس آنے کا مدعا نہ بتا سکا۔ تھوڑی دیر کے لئے میں اس کے چہرے سے نظریں ہٹا کر کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ پھر میں نے کہا۔

"اصل بات یہ ہے۔۔۔!!"

"ہاں ہاں، فرمائیے حضور!!"

"میں تمہارا بہروپ تو بہت دیکھ چکا اور اب۔"

"اور اب کیا؟" اس نے سوال کیا

"میں تمہارا اصلی روپ دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"میرا اصلی روپ!" اس نے تعجب سے پوچھا

اتنے میں ایک نوجوان لڑکی بے حد معمولی اور [illegible] کپڑوں میں بہت [illegible] ہوئی کمرے میں آئی اور [illegible] میں چائے کی پیالی تھما رہی تھی۔ لڑکی خوبصورت [illegible] لیکن مجھے ایسا لگا کہ جیسے مفلسی نے اس کے چہرے [illegible]

کو کھلنے [illegible] رکھا ہے۔
"لیکن [illegible]! میں تو ایک بہروپیا ہوں۔"
"[illegible] کا اپنا بھی ایک روپ ہوتا ہے۔"
یہ سن کر وہ کچھ سوچ میں پڑ گیا۔ اس کے چہرے پر گہری سوچ کی لکیریں ابھرتی ڈوبتی رہیں۔ شاید کچھ کہنا چاہتا ہو لیکن نطق و لب یاوری نہیں کر پا رہے تھے۔ پھر کچھ توقف کے بعد اس نے کہا۔
"اور ہر آدمی کا بہروپ بھی"
"میں سمجھا نہیں!"
"اس میں سمجھ میں نہ آنے والی کیا بات ہے۔" اس نے کہا۔ "بہت سے لوگ اصل میں ہوتے کچھ ہیں اور نظر آتے ہیں کچھ اور! یہ بھی تو ایک طرح کا بہروپ ہوا۔"
"لیکن میں تو تمہارے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔"
"میں تو ایک پیشہ ور بہروپیا ہوں لیکن عجیب بات ہے۔"
"کیا؟"
"کہ میں چاہے لاکھ بہروپ کروں، میری گردن پر ہمیشہ ایک ہی چہرہ اٹکا رہتا ہے۔"
"بس ایک ہی چہرہ!"
"جی ہاں"
"لیکن کس کا چہرہ، کیسا چہرہ؟"
"وہی غریب کا چہرہ!!" اس نے ذرا تامل سے کہا "ایک غریب آدمی جب پیٹ پالنے کے لئے بہروپ کرتا ہے تو وہ اس کا پیشہ کہلاتا ہے لیکن جب کوئی بڑا آدمی بننے کے لئے اپنی گردن پر سینکڑوں چہرے لگائے پھرتا ہے تو وہ اس کا فن کہلاتا ہے۔ سیاست میں لوگ ایک پارٹی سے دوسری پارٹی اور دوسری پارٹی سے تیسری پارٹی میں حالات کے تیور دیکھ کر چلے جاتے ہیں۔ ان کی گردن پہ لگے چہروں کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔ اچھا چھوڑیئے اس کو میں آپ سے ایک سوال کرنا چاہتا ہوں۔"

اس نے ذرا بے تکلف ہوتے ہوئے پوچھا
"اچھا آپ خود ہی بتائیے کہ آپ کی گردن پر کیا بس یہی ایک چہرہ ہے جو ہمارے سامنے ہے۔"
میں نے محسوس کیا کہ میں اس کے سوال کا جواب نہیں دے سکتا۔ میں عجیب کشمکش میں پڑ گیا۔ کہاں تو میں یہ معلوم کرنے آیا تھا کہ وہ سی۔آئی۔ڈی کا کوئی ایجنٹ تو نہیں لیکن اس کے ایک سوال نے مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ یکایک میرے چاروں طرف بے شمار چہرے منڈلانے لگے۔ چکر کاٹنے لگے میں ان بے شمار چہروں میں کس چہرے کو اپنا چہرہ کہوں۔ میں اپنا اصل چہرہ کیسے تلاش کروں۔ میرے جیسے بے ضمیر آدمی کا کوئی ایک چہرہ ہوتا ہی نہیں۔
بہروپیا مجھ سے کہہ رہا تھا کہ اپنے دیش میں لکشمی کی پوجا ہوتی ہے۔ لیکن لکشمی یہ نہیں دیکھتی کہ ہمارے پاس دولت کہاں سے آتی ہے، کیسے آتی ہے۔ رشوت خوری، بے ایمانی، کسی کا گلا کاٹ کر کمائی ہوئی دولت کو سماج میں احترام حاصل ہے۔ دولت بے ایمانی کا سہارا لئے بغیر جمع ہی نہیں ہو سکتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہماری پوجا بھی ایک بہروپ ہے۔ ہماری زندگی بھی ایک بہروپ ہے۔ اصل میں ہمارا اصل روپ بھی اسی بہروپ کا پرتو ہے، عکس ہے۔
میں نے پھر کہا۔
"اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم سب بہروپیے ہیں!"
اس نے جواب میں کہا

شفیقہ فرحت
بھوپال

زندگی کا کباڑ خانہ

سردیوں کی دوپہر تھی اور چھٹی کا دن۔ اور زندگی اس منزل پہ آ چکی تھی جب سردیوں کی دوپہریں بھی لمبی لگنے لگتی ہیں۔ میں اکتائی اکتائی سی برآمدے کے تخت پہ لیٹی تھی۔ جس کے کھلے کھلے چوڑے دروں سے بڑی خوشگوار دھوپ ادھر ادھر بکھر رہی تھی۔ اسی عالم میں پتہ نہیں کتنا وقت گزرا کہ سناٹے کے سمندر میں قدموں کی آواز کی کنکریاں گرنے لگیں۔ ایک، دو، تین، چار، پانچ...... سولہ سیڑھیاں ہیں میرے زینے میں۔ پھر گھنٹی کی ہلکی سریلی جھنکار سارے میں پھیل گئی۔

میں قدموں کی اس چاپ کو بھی پہچانتی تھی اور گھنٹی کے اس انداز کو بھی۔ آٹا، شکر، دودھ، چائے، تیل، گھی، کچھ بھی ہو۔ یہ ستارا تو صرف دینے کے لئے باہر جائے گا۔

میں نے خوش ہو کر کہا۔ "آ جاؤ۔"

ہم جیسے تنہا لوگ دروازہ ہمیشہ کھلا رکھتے ہیں۔ وہ جھینپا جھینپا سا اندر آیا۔ ان کے بچوں لئے ہمیشہ وہی بھیجا جاتا ہے۔

"کیا چاہئے پپو؟"

"جی، وہ ممی نے آپ کی چابیاں منگوائی ہیں۔ ان کا گچھا کہیں کھو گیا ہے۔"

اس نے تیزی سے رٹا رٹایا فقرہ دہرا دیا۔

"بیٹے! تمہاری امی کو تو معلوم ہے کہ میں کبھی تالے لگاتی ہی نہیں۔"

اور میں نے سوچا یہ تالوں کے گچھے تو کسی سے کھلتے نہیں جو تالے پڑ جاتے تو اور کتنی ویرانی چھا جاتی۔ پپو بیچارہ کچھ پریشان سا کھڑا رہا۔ اس کی پریشانی پہ مجھے بے حد رحم آیا۔

"پپو! میرے پاس کل دو چابیاں ہیں۔ ایک دروازے کی دوسری الماری کی۔ مگر ان سے کوئی تالا کھل نہیں سکتا۔ لے جانا ہو تو لے جاؤ۔"

میں چابی لینے کے لئے اٹھی۔

"جی نہیں۔ یہ نہیں۔ امی نے کہا ہے بڑی والی چابیاں

نہیں، اس کے علاوہ میرے پاس کچھ نہیں۔

میری بھی ماضی پہ مایوس ہو کر جانے کے لئے ... تک وہ مجھے یاد آیا کہ پرانے سامان والے بکسے میں کچھ لوہا لنگڑ پڑا ہے۔

پیچوڑ کو میں دیکھتی ہوں۔

اسٹور کے آخری کونے میں ایک بڑا سا لوہے کا زنگ آلودہ بکسا تھا جس پر تالا ... اچار کا گھڑا، اور دو چار ایسی ہی دوسری چیزیں رکھی تھیں ہم دونوں نے مل کر یہ سامان ہٹایا اور بڑی مشکلوں سے بکسا کھولا۔

یہ بکسا میرا کباڑ خانہ تھا۔ متوسط طبقے کے ہر گھر میں جہاں سلیقے سے سجے سجائے ڈرائنگ روم کے ساتھ ایک عدد گندا اور کباڑ خانہ بھی ضرور ہوتا ہے۔ آج جب گھر سکڑ کر کمرے سے بھی چھوٹے ہو گئے ہیں تو کباڑ خانے بھی ایک آدھ دیمک لگی الماری اور دو ایک ٹوٹے بکسوں تک محدود ہو گئے۔ میرا کباڑ خانہ تو بس یہی ایک بکسا تھا جو آج برسوں بعد کھولا گیا تھا اور اس کے کھلتے ہی جانے کتنی یادیں، کتنی باتیں، کتنے قہقہے، کتنے آنسو یہاں وہاں سے جھانکنے لگے۔ سچ ہے کباڑ خانہ ہمارا رشتہ ماضی سے جوڑے رکھتا ہے جس گھر میں کباڑ خانہ نہیں اس گھر کے مکینوں کا کوئی ماضی نہیں۔ اللہ اللہ ہم اس مطلق ماضی کو کھنگالنے کے لئے ہاتھ پیر مار رہے ہیں۔

سوتی کی ... کے بعد مجھے بھورے رنگ کا چھالوں والا ... تھیلا ملا جسے اماں نے اپنے جہیز کے لحاف کے ... سے بنایا تھا ۔۔۔

اس میں تقریباً ساٹھ ستر چھوٹی بڑی کالی پیلی پرانی چابیاں تار کے کئی گچھوں میں پروئی رکھی تھیں۔ جانے اماں کے پاس اتنی چابیاں کہاں سے آئیں۔ اور ان کے تالے کہاں گئے؟ کیا وہ ساری عمر اپنی قسمت کا کوئی ان دیکھا تالا کھولنے کے جتن کرتی رہیں۔

تھیلی میں نے بیو کو پکڑا دی۔ اور خود بکسے کی چیزیں ... لگی۔ اوپر ہی کالی کے برابر چھوٹا سا کریم کلر کا پرس پڑا تھا جو میں نے بمبئی کے کرافورڈ مارکیٹ کے فٹ پاتھ کی دوکانوں سے خریدا تھا۔ پرس کا رنگ اب مٹیالا ہو چکا تھا۔ اور جگہ جگہ سے ریگزین ٹوٹ چکا تھا۔ میں نے زپ کھولا۔ زپ اب بھی اچھا تھا۔ یہ پرس مجھے بے حد عزیز تھا۔ حالانکہ اس میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ قیمت بھی اس کی اس وقت دو یا شاید ڈھائی روپے تھی۔ مگر مجھے اس لئے پسند تھا کہ کتابوں کے ساتھ رکھا جا سکتا تھا۔ ہاتھ میں لٹکانے کی ضرورت نہ تھی۔ پہلے دن جب میں نے ... تو بھی پرس میرے پاس تھا۔ ... کے لئے شاید یہ پہلی بالکل نیا تھا لہٰذا سب کی توجہ کا مرکز بن گیا تھا۔ سب نے اسے پسند کیا اور اس کے واسطے سے مجھے بھی...... اور وہ جو ایک نئے شہر کے اجنبی ماحول کا خوف اندر ہی اندر کھائے جا رہا تھا وہ ذرا سی دیر میں ختم ہو گیا۔ پہلے دن اس کی وجہ سے کتنی لڑکیوں سے دوستی ہو گئی۔ پھر پرس تو پرانا ہو گیا۔ مگر دوستی ہر لحظہ ... ہوتی گئی اور ہر لحظہ پہلے دن کی تازگی کا احساس ہوتا رہا تھا۔

ہائے کیا زمانہ تھا۔ ہر وقت ہنسی ... لگی۔ ہر وقت ہاہا ہوہو۔ کلاس تک میں ہنسی رکتی نہیں تھی۔

جیسے جیسے کلاس ختم کرتے پھر دی گئی تھی، گھٹی گھٹی۔ واپسی کی جلدی کسی کو بھی نہیں ہوتی تھیں۔ گھنٹوں کینٹین میں ڈٹے رہتے اور چائے پہ چائے پیے جاتے۔ میری بلانوشی کا تو سارے شہر میں چرچا تھا۔ اب چوتھی، پانچویں پیالی پی لوں تو جانے کیا کیا ہونے لگتا ہے۔

اس زمانے میں کام بھی کتنا کرتے تھے ہم لوگ، کالج کے، ادھر ادھر کے کام ہماری چنڈال چوکڑی کے ہی سپرد ہوا کرتے تھے۔ اور ہم لوگ ہنستے ہنستے سب نمٹا دیتے۔

کالج سے لوٹتے ہی سیر سپاٹے کی سوجھتی۔ کبھی شملہ پلز جا رہے ہیں کبھی یاٹ کلب، کبھی شاپنگ ہو رہا ہے۔ کبھی بوٹنگ ہو رہی ہے اور کچھ نہیں تو پکچر ہی ہو آئے اچھی بری سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ بلکہ بری کو زیادہ ہی انجوائے کرتے کہ اس میں کمنٹس کر کر کے ہنسنے کے زیادہ مواقع ملا کرتے۔

فرصت تو اس زمانے میں اشتہار دے کر بھی نہ ملتی تھی۔ آج کرنے کو کچھ ہے ہی نہیں۔

جی تو چاہتا تھا کہ پرس کو کھولتی اور بند کرتی رہوں اور اس جیسی ہزاروں یادیں اور ہزاروں باتیں نکل نکل کر بکھرتی رہیں۔ مگر ان بکھرے موتیوں کو کون سمیٹے گا۔ سب کے دامن اپنے اپنے سنگریزوں سے بھرے ہیں۔

پہلی دراز کو کھول کر میں یکسر بند کرنا چاہتی ہوں۔ اس لئے کہ میں سوچتی تھی کہ نہ کوئی کل تھا نہ کوئی کل ہوگا۔ تیمورس کا بچہ پھر آگیا۔ حیرت ہے اب کے مجھے اس کے قدموں کی چاپ تک سنائی نہیں دی۔ اس کے ہاتھ میں وہی چابیوں سے بھری تھیلی تھی مجھے پیچھے سے پہلی سی دلچسپی نہ رہی تھی۔

میں نے چپ چاپ تھیلی لے لی۔

چند لمحوں کے انتظار کے بعد خود ہی بولا۔

"جی وہ ہمارے سب تالے آپ کی کنجیوں سے کھل گئے تھے"

"اچھا" میں نے بے دھیانی میں کہا۔

"امی کہہ رہی ہیں اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو وہ دونوں چابیاں ہم رکھ لیں۔"

"ضرور رکھ لیں بلکہ امی سے کہنا جب بھی کسی کنجی سے تالا کھل جائے، کنجی رکھ لیں۔ تالے کے بغیر کچھ نہیں۔" بچہ کچھ سمجھا اور کچھ نہیں سمجھا۔ اور چپ چاپ چلا گیا۔ میں نے چابیوں کی تھیلی دوسرے بکسے میں ڈال دی۔ تھیلی کسی چیز سے ٹکرائی۔ وہ بھی ایک پرانا سا نیپکن میں لپٹی ہوئی تھی۔ اٹھا کر دیکھا تو ایلابسٹر کا چھوٹا سا سفید گلدان تھا جس پر بڑے نازک اور حسین پیلے اور کالے پھول بنے تھے۔ اور ان پھولوں کے بیچ سے گہری جمی ہوئی خون کی لکیر کی طرح سیاہ میلی دھاری گلدان کے اس سرے سے اس سرے تک چلی گئی تھی۔ ٹوٹے گلدان کا یہ بال وقت کے ساتھ کالا اور میلا ہوتا چلا گیا تھا۔ انجانے میں ایک ہلکی سی آہ میرے منہ سے نکل گئی۔

یہ گلدان بے حد قیمتی اور خوبصورت تھا۔ بھابی کی شادی میں کہیں سے تحفتاً آیا تھا۔ میرے بچپنے کے شوق کو دیکھ کر بھابی نے وہ مجھے دے دیا تھا۔

اس وقت بھابی کو کیا معلوم تھا کہ میں کوئی چیز سنبھال کر نہیں رکھ سکتی۔ اس وقت میرے پاس اس سے قیمتی کوئی گلدان نہیں تھا۔ میں اس گلدان کے لئے بڑے جتن سے پھول لاتی۔ اور بڑے ارمانوں سے سجاتی۔ میں ان دنوں ہوسٹل چھوڑ کر اس مکان میں

بچی تھی۔ یہاں کچھ اور لوگوں سے ملاقاتیں ہوئیں۔ اور
ن میں پتہ نہیں کیوں ریاض کو ذہنی رفاقت کا کچھ زیادہ
ہی احساس ہوا۔ اور یہ تو سب ہی جانتے ہیں کہ ایک
پرزنالٹی دماغ سے ہوتا ہوا دل تک بھی جاتا ہے۔

بات اس گلدان کی ہو رہی تھی۔ اور ذکر آ گیا ریاض کا۔ مگر نہیں اس گلدان سے ریاض کا گہرا رشتہ ہے۔ تو ہوا یوں کہ ریاض تقریباً روز شام کو آنے لگے۔ ایک شام میں نے اس گلدان میں ہولڈر کے سہارے سرخ گلیڈیولی کی ایک ڈنڈی لگائی۔ ڈنڈی دو ایک جگہ سے بل کھائی ہوئی تھی اور اس پر تین پھول کھلے تھے۔ اس زمانے میں میری تین چھوٹی کزنز میرے ساتھ رہتی تھیں۔

حسب معمول ریاض آئے، حسب معمول سب لوگ بیٹھے گپ شپ کرتے رہے یکایک ریاض کی نظر گلدان پر پڑی۔

"واہ آج تو تم نے غضب کر دیا ہے۔ حد خوبصورت لگ رہا ہے یہ گلدان۔ یہ بل کھاتی ہوئی ٹہنی یہ تین سرخ پھول۔"

ناہید کو شرارت سوجھی۔ "بولی ریاض بھائی یہ ساری خوبصورتی ان تین پھولوں کی وجہ سے ہے۔"

واقعی تینوں کزنوں کی وجہ سے گھر میں بہت رونق ہو گئی تھی۔ اور ریاض بھی انہیں عزیز رکھتے تھے۔ مگر میں کیوں اپنی ہتک برداشت کرتی۔ میں نے پھولوں پر ایک اچٹتی نظر ڈالی۔ "ایسے پھول تو سب ہی شاخوں پہ کھلتے ہیں حسن تو اس آڑھی ترچھی ڈنڈی کی وجہ سے ہے۔" (واضح ہو کہ لکھنے والی کافی آڑا ترچھا لکھتی ہے) ریاض ہنس چکنے والے تھے۔

"ابھی نہ پھول نہ ڈنڈی، جو کچھ ہے یہ گلدان ہے

دوسرے میں لگا کے دیکھ لو ذرا جما جا سکے۔"

میں نے پہلے ریاض کی طرف دیکھا۔ اور پھر گلدان کی طرف دیکھا۔ واقعی ایسا لگ رہا تھا جیسے دونوں ہاتھوں کا حلقہ بنائے وہ سب کو اپنے اندر سمیٹے ہے۔ ڈنڈی کو بھی، پھولوں کو بھی۔

پھر یوں ہوا کہ صفائی کرنے میں لڑکی سے گلدان ٹوٹ کے دو ٹکڑے ہو گیا۔ اور مجھے لگا جیسے میرا کوئی اپنا مجھ سے بچھڑ گیا ہو۔ اور میرا دل آہستہ آہستہ گلدان کی طرح کٹنے لگا۔ گلدان جڑ گیا۔ مگر نشان باقی تھا۔

ریاض نے درد میں ڈوب کر کہا۔

"ٹوٹی ہوئی چیزیں بھی کبھی جڑا کرتی ہیں؟"

"وہ زمانے لد گئے"، میں نے اکڑ کر جواب دیا۔

"اب تو ایسے لوشن آ گئے ہیں کہ ہر چیز جڑ جاتی ہے۔"

"مگر بال تو رہ جاتا ہے۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے بس کام چلنا چاہیے۔"

پھر یوں ہوا کہ گلدان کی طرح میرے ہاتھوں سے دھیرے دھیرے ریاض چھوٹ گئے۔ چھوٹتے گئے۔ مگر بڑی عجیب بات ہے کہ وہ ٹوٹے نہیں، مگر میں گلدان کی طرح دو ٹکڑے ہو گئی۔ میں نے کہا تھا نا کہ سب جڑ جاتا ہے تو سو میں بھی ٹوٹ کے جڑ گئی۔

"مگر اب بال کو کیا کریں؟"

شاید اسی بال نے زندگی اتنی اداس، اتنی بے مصرف بنا دی ہے کباڑ خانے کی طرح جیسے کوئی برسہا برس نہیں کھولتا۔

مگر میں نے کیوں یہ کباڑ خانہ پھیلا لیا؟

لاؤ سب کچھ پہلے ہی کی طرح بھر دوں۔ اور پہلے ہی کی طرح سکون سے بیٹھ جاؤں اور انتظار کروں اس بال کے نکلنے کا [illegible]

نئی کتابوں کا تعارف

تبصرہ کے لئے دو جلد کتابوں کا آنا لازمی

نام کتاب :- انتخاب افسانہ ۸۹
مرتب :- انیس امروہوی
ضخامت :- ۲۲۴ ——— قیمت :- ۶۰ روپے
پتہ :- تخلیق کار، پبلشرز۔ ۴۰۷، فراشخانہ دہلی ۱۱۰۰۰۶

جیسا کہ انیس امروہوی نے پیش گفتار کے تحت خود بھی لکھا ہے۔

"زیر نظر انتخاب ۱۹۸۹ء کے دوران لکھے گئے افسانوں میں بہتر کی تلاش کی طرف ایک کوشش ہے۔ اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے کہ ۱۹۸۹ء میں اچھے افسانوں کی تعداد بہت کم ہے ——— اور افسانہ نگاروں کی رفتار مدھم ——— انتخاب کا کام اتنا آسان اس لئے بھی نہیں تھا کہ کئی معروف افسانہ نگار حضرات کے افسانے سال رواں کی تخلیقات کے زمرے میں نہیں آتے تھے۔ برعکس اس کے، کئی نئے لکھنے والوں نے اپنی بہترین کوششیں اردو ادب کو پیش کیں لہٰذا انتخاب تاخیر سے شائع ہو رہا ہے اور اس یقین کے ساتھ کہ یہ قارئین اردو ادب اس انتخاب کو اس برس کے دوسرے انتخابات سے مختلف پائیں گے افسانوں کی ترتیب میں بھی حفظ مراتب کا لحاظ نہیں رکھا گیا ہے۔"

اس طرح کا انتخاب صحیح معنوں میں کافی مشکل کام ہے۔ لیکن اس سے قبل افسانوی انتخاب کی جتنی بھی کتابیں میری نظر سے گزری ہیں میں یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ یہ انتخاب مجھے جامع اور ہر لحاظ سے مکمل نظر آتا ہے۔ نئے پرانے فنکاروں کی شمولیت نے اس انتخاب کو چار چاند لگا دیئے ہیں۔ بلا شک و شبہ انیس امروہوی اس خوبصورت انتخاب کے لئے مبارکباد کے مستحق ہیں۔

اس مجموعے کا سب سے زبردست افسانہ عرفان عالم ذوقی کا "بھیگی کہانی" ہے۔ مشاہدے اور تجربے کی ایسی زبردست گیرائی میں نے اردو افسانے کی پچھلی دو دہائیوں کے اندر کسی بھی فنکار کے یہاں نہیں پائی۔ یہ ایک غیر معمولی، چونکا دینے والا افسانہ ہے۔ اور محض صرف ایک افسانے "بھیگی کہانی" کے حوالے سے یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ اردو افسانہ فن کی جن بلندیوں کو چھو رہا ہے وہ اپنے آپ میں ایک مثال ہے ——— "بھیگی کہانی" ذوقی صاحب کا ایک ایسا نہ بھولنے والا شاہکار ہے کہ جب جب آزادی کے بعد نئے افسانے کی بات چلے گی "بھیگی کہانی" کا ذکر کئے بغیر نئے افسانے کی بات چیت بھی ادھوری ہی رہے گی۔

دوسرا کامیاب افسانہ زیب اختر کا "گراف" ہے جس کا سہل پسندانہ لہجہ اور چھوٹی سی بات میں فن کو برتنے کی گہرائیوں کو چھو لیتا ہے۔

انتخاب کے باقی افسانے بھی بہتر ہیں۔ لیکن اقبال مجید اور رتن سنگھ متاثر نہیں کرتے۔ شوکت حیات بس ٹھیک ٹھاک ہیں۔ قیمت واجب سرورق لاجواب۔

جاوید اقبال حمد اللہ

●●

نام کتاب:۔ زکی انور شخصیت اور فن

مصنف:۔ ڈاکٹر شبیر احمد

نوعیت:۔ نثری تخلیق

صفحات:۔ ۱۷۰ ۔ قیمت:۔ چھپن روپے

سن اشاعت:۔ ۱۹۹۱ء

مطبع:۔ دی آزاد پریس سبزی باغ پٹنہ

"زکی انور شخصیت اور فن" ڈاکٹر شبیر احمد کے تحقیقی مقالہ برائے پی۔ ایچ۔ ڈی بعنوان "اردو ناول کے ارتقا میں زکی انور کا حصہ" کا ایک حصہ ہے۔ جسے کتابی شکل دے کر محقق نے اپنے قارئین کے سامنے پیش کیا ہے۔ یہ کتاب اردو اکادمی کے مالی تعاون سے شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ کے بعد تشنگی کا جو احساس ہوتا ہے وہ بہت ہی شکھا ہے کیونکہ ان کے جو تحریر ماہنامہ سہیل اور بعض دوسرے رسائل و اخبارات میں ہیں، جن کا حوالہ محقق نے دیا ہے، اس سے کہیں زیادہ [illegible] ہیں۔ پھر زکی انور کا حلقہ احباب بہت [illegible] سے [illegible] کے ساتھ زندہ ہو جسے کی مدد لی جا سکتی تھی [illegible] سے ایسا لگتا ہے

کہ محقق موصوف نے یا تو کوشش ہی نہیں کی یا پھر اکادمی کے زیر تعاون کے اندر ہی کام نپٹانے کی غرض سے مسودہ کر دیا۔ پھر بھی عرق ریزی کا ان کا دعویٰ ہے تو تحقیق عرق ریز کا کام ہی ہے۔ یہاں تو ایک ایک لفظ اور ایک ایک بات۔ در در کی خاک چھاننی اور دشتوں کی سیاحی کرنی پڑتی۔ کافی مطالعہ کرنا پڑتا ہے۔ تب جا کر تحقیقی مقالہ پایۂ تکمیل پہنچتا ہے۔

مقالہ نگار نے اپنے مقالہ کے اس حصے کو "دیوان کے مقدمہ شعر و شاعری" سے تشبیہ دی ہے۔ جیسے ان تحقیقی کام میں اس حصے کی ضرورت ہی نہ تھی اور اس کے بغیر بھی وہ اپنا کام پورا کر سکتے تھے۔ اس سلسلے میں میں محقق کو یہ کہنا چاہتا ہوں کہ تخلیق کار پر تحقیقی کام کرنے سے پہلے اس کی شخصیت کے مختلف پہلو، اس کی تخلیق کا لہجہ اور اس کے اپنے پس منظر کی واضح واقفیت ضروری ہوتا ہے۔ محقق انہیں نکات کے ذریعہ اپنے قاری سے اپنی بات کہتا ہے۔ اب رہا سوال اس حصے کے مقدمہ شعر و شاعری سے تو یہ غلطی نہیں ہے۔ محقق موصوف خوش فہمی کے شکار ہیں۔ حالی نے ضرورت نہ ہوتے ہوئے مقدمہ لکھ کر اردو زبان و ادب میں شاعری کے لئے اصول و ضوابط مقرر کئے جبکہ یہ ایک لازمی جزو ہے۔

مقالہ نگار نے زکی انور کو بہار کا کرشن چندر کہا کر ان کی ادبی شناخت و تشبیہ کے ساتھ ناانصافی کی۔ زکی ہندوستان گیر مقام کے حامل ہیں اور اپنے فن میں کسی سے کم نہیں۔

مقالہ نگار نے اس کتاب کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا حصہ حیات اور جد و جہد سے تعلق رکھتا ہے۔ دوسرا حصہ مختلف اصناف فن سے زکی انور کی وابستگی

کو بتاتا ہے۔ میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ دونوں ہی حصہ کافی تشنہ ہے۔

پھر بھی ڈاکٹر شبیر احمد صاحب نے جو کچھ کیا ہے وہ قابلِ ستائش ہے کیونکہ یہ کتاب ہمیں زکی انور جیسے پختہ ذہن اشتراکی کے ذہن وفکر کو سمجھنے، اس کی انسانیت دوستی کے پیغام کو یاد رکھنے اور اس کے اپنائے ہوئے راستے پر چل کر ایک پرامن اور خوشحال سماج کی تعمیر میں مددگار ضرور ثابت ہوگی۔ ابتدائی مختصر ترین واقفیت کے لئے اس کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

جہاں تک اس کتاب کے کاغذ، اس کی طباعت اور سرورق کا تعلق ہے۔ اس کا کاغذ اچھے قسم کا نہیں ہے۔ طباعت بہت حد تک چل سکتی ہے۔ سرورق گھٹیا قسم کا ہے۔

● ڈاکٹر سید ابو الفیض سید آبادی

نام کتاب: نفی ضرب نفی

مصنف: ساجد حمید — نوعیت: شعری مجموعہ
ضخامت: ۱۴۲ — قیمت: پچاس روپے
سنہ اشاعت: جون ۱۹۹۰ء
ناشر: ہرین پبلی کیشنز "آشیانہ" ڈی۔ الف۔ اے۔ ڈانڈیلی
ملنے کا پتہ: نمبر ۱۹ نہرو نگر، ساگر - ۵۷۷۴۰۱

• "نفی ضرب نفی" ساجد حمید کا دوسرا شعری مجموعہ ہے۔ ان کا پہلا مجموعہ "یادوں کے مہتاب" چند سال قبل شائع ہو کر اردو دنیا میں اپنا مقام بنا چکا ہے۔ اس مجموعہ پر عنوان چشتی نے ایک بصیرت افروز تاثر قلمبند کیا ہے جو جامع اور حقائق پر مبنی ہے۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ اگر ساجد حمید اسی انداز سے اپنے سفر پر گامزن رہے تو وہ بہت ہی جلد اپنی منزل کو پا لیں گے کیونکہ صبح کی پہلی کرن ہی دوپہر کا پتہ دیتی ہے۔

کتاب کے شروع میں ساجد کا انتساب ان کے [illegible] ذہن کی جھلکیاں پیش کرتا ہے جو اختتام تک قائم رہتا ہے۔ ساجد کے اندر آمد کا غلبہ ہے ایسا لگتا ہے کہ خیالات کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے جو ان کے ذہن سے نکل کر قلم تک آنے کے بعد شعری سانچے میں خود بخود ڈھل کر حسین و جمیل اور جاذبِ نظر صورت وشکل اختیار کر لیتا ہے اور اس سانچے سے نکلا ہوا ایک ایک مصرعہ ہر طرح مکمل و موزوں ہو جاتا ہے۔ آورد کا تو کہیں نشان و پتہ ملتا ہی نہیں۔ آمد کی جو صورت ساجد حمید کے یہاں ہے نئے لکھنے والوں کے یہاں خال خال ہی ملے گی۔

اس مجموعہ میں ۷۴ نظمیں اور ۶۱ غزلیں ہیں جو سب کی سب مربوط و منظم اور فنی خوبیوں سے مرصع ہیں۔ ساجد نے مقامی اور عام فہم ہندی کے الفاظ کا جابجا استعمال کر کے ان کے حسن میں چار چاند لگا دیا ہے۔ الفاظ کی نشست و برخاست اور اشعار میں پوشیدہ موسیقیت اور دھنک رنگ نے اس مجموعے میں شامل غزلوں اور نظموں میں جادو جگا دیا ہے اور اسے جاذبِ نظر بنا دیا ہے۔

کتاب کی طباعت بڑی صاف ستھری اور اچھی ہے کاغذ اچھے قسم کا ہے۔ سرورق دلکش اور جاذبِ نظر ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے حسین رنگوں اور طباعتی فن کاری میں نفسیاتی پہلو چھپائے ہوئے ہے۔ جس سے ان کے ذوق اور نفسیاتی ادراک کا پتہ چلتا ہے۔ سرورق پہلی ہی نظر میں قاری کو اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے۔ پھر جیسے جیسے ورق الٹئے خیالوں کے دریچے وا ہوتے جاتے ہیں اور نئی نئی بے شمار پگڈنڈیاں نظر آنے لگتی ہیں۔

اس کتاب کی قیمت زیادہ ضرور ہے لیکن باذوق حضرات کے لئے اس کا مطالعہ لازم ہے۔ آغاز سے اختتام تک مطالعہ کر لینے اور مجموعہ کی تہہ تک پہنچ جانے کے بعد آپ خود ہی کہیں گے کہ کتاب کی قیمت وصول ہو گئی۔

● ڈاکٹر سید ابو الفیض سید آبادی

شہرِ خیال

○ ایک عزیز کے یہاں سہیل کے دو شمارے (۱۵ . دیکھنے . بہت خوشی ہوئی کہ بسمل سنسہادری مرحوم نے ملّت پہ لو گیا میں جو چراغ ادب کا جلایا تھا اسے ایک روشن رکھے ہوئے ہیں . صنہ بہار تو رسالوں کا مدفن ہے . کتنے رسالے شائع ہوئے اور پھر ایسے جذب ہوئے کہ بہار کی نئی نسل ان کے نام سے بھی شاید واقف ہو .

" کارگہ شیشہ گری " جیسا مضمون عظیم فیروز آبادی ہی لکھ سکتے تھے جو اس فن کے اسرار و رموز سے فیروز آباد میں قیام کی وجہ سے اچھی طرح واقف ہیں .

ڈاکٹر حلیم اللہ حالی کا سفرنامہ پاکستان خوب ہے اسے ان سے مکمل کرائیے . قیوم خضر صاحب کی تحریر " چچا علی حسن " پڑھ کر بہت لطف آیا . کہاں کہاں سے الفاظ جمع کئے ہیں . بعض تو ممکن ہے سید سیف الدین احمد مچھلی مرحوم کی فرہنگ میں بھی ہوں . ان سے بہار کے ادیبوں اور شاعروں پر تاثراتی مضامین بھی لکھوائیے . بہت سے لوگوں سے وہ ذاتی طور پر ہیں اس لئے بہت اچھا مضمون لکھ سکتے ہیں .

قیصر عثمانی صاحب پرانے شفیق اور کرم فرما ہیں . ان سے عرصے سے ملاقات نہیں ہوئی . ان پر یہ شمارہ آپ نے شائع کیا ہے ممکن ہو تو وہ بھیج دیجئے . اس طرح ضعف ملاقات تو ہو ہی جائے گی . بلکہ اس سے کچھ زیادہ ہی .

" شہرِ خیال " کے تحت بعض دلچسپ خطوط پڑھنے حقانی القاسمی صاحب کا خط کیا ہے پورا مضمون .

▲ ممتاز الدین احمد (علی گڑھ)

○ میرے ساتھ ایک سانحہ ہو گیا . ۱۰/ اکتوبر کی شریکِ حیات نے اچانک اس جہانِ آب و گل سے رشتہ لیا . یوں تو پہلے بھی زندگی خوشگوار نہ تھی لیکن اس نے جینا اور بھی مشکل کر دیا . جناب رام پرکاش راہی ہی سکونت فرماتے ہیں . تقریباً روزانہ میری خاطر آتے ہیں . انہوں نے سہیل کے شمارہ ۹ میں شائع جناب حقانی القاسمی صاحب کا خط پڑھ کر سنایا شمارہ مجھے نہیں ملا . اور اب راہی صاحب سے معلوم ہے کہ سہیل کا ایک اور شمارہ بھی آ گیا ہے . یہ شمارہ مجھے نہیں ملا . یعنی تازہ دو شمارے نہیں ملے) موصوف میرے خط کے متعلق فرمایا ہے کہ اس کا صحیح فیصلہ تو ادب کے باشعور قارئین ہی کریں گے لیکن اردو بقول میر کہ پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ اگر کوئی ہو بھی تو غریب کیا فیصلہ یا تجزیہ کرے گا کہ ایک جاہل نے حقانی القاسمی صاحب سے علامہ ا کے کلام میں ان عناصر کی نشاندہی کرنے کی التجا کی جن کی بنا پر موصوف علامہ کو عظیم شاعر قرار دیتے ہیں مجھے اپنی جہالت کا اعتراف ہے . دوسری طرف صاحب محقق بھی ہیں اور ادیب بھی . اگر میں نے ان روشنی کی بھیک مانگی تھی تو انہیں یہ زیب نہ دیتا مجھ جیسے تنک بندے ہی شاعرانہ عظمت کے معیار (criteria) کا تعین کرنے کے لئے کہیں . او

اگر میں شاعرانہ عظمت کے معیار کا تعین کرنے کی حماقت کر بھی لوں تو بحث اس معروضہ معیار پر ہوگی نہ کہ اقبال کی شاعری میں عظمت کے عناصر پر۔

حقانی القاسمی صاحب نے پروفیسر جگن ناتھ آزاد کے مضمون سے اقبال کے متعلق فراق گورکھپوری کی رائے نقل کرکے فراق گورکھپوری پر ظلم ڈھایا ہے۔ اس سلسلے میں آزاد صاحب کے بیان پر ایمان لانا خطرے سے خالی نہیں ہے آزاد صاحب اگر دیکھتے کہ فراق کے بارے میں لکھتے ہوئے اقبال کی عظمت کا ذکر نہیں آسکتا تو وہ ہرگز مضمون نہ لکھتے۔ اس کے علاوہ ان کے بیان کی صحت پر بھی شک گزرتا ہے۔ فراق نے اقبال کے متعلق بہت لکھا ہے۔ یہاں تک کہ انہوں نے اقبال کو بیگن کا ٹھیلہ دھکیلنے والا بھی کہا ہے۔ اگر حقانی صاحب کو علامہ کے متعلق فراق کے خیالات جاننے سے دلچسپی ہے تو وہ براہ راست فراق کے مضامین پڑھیں جو اردو میں بھی ہیں اور انگریزی میں بھی۔ محقق کو ہمیشہ حقائق کی روشنی میں فیصلہ کرنا چاہئے۔

تیری میری باتوں میں آکر نہیں۔

جہاں تک مہاتما گاندھی کا تعلق ہے میں حقانی القاسمی صاحب سے درخواست کروں گا کہ وہ اس سلسلے میں اس وقت کے مسلم لیگ کے رہنماؤں اور ان کے حواریوں کی تحریروں سے دامن بچائیں۔ اور کسی بھی دوسرے سورس سے معلومات حاصل کرلیں کیونکہ اس وقت مہاتما گاندھی کو اونچی ذات کے ہندوؤں کا رہنما اور مولانا آزاد کو کانگریس کا شو بچہ کہہ کر ہی مسلم لیگ برصغیر کے مسلمانوں کو اپنی طرف متوجہ کرسکتی تھی اور مسلمانوں کی اکثریت اس جال میں پھنس گئی تھی کے نتائج ہمارے سامنے ہیں۔

اپنے نوٹ کے ساتھ رام پرکاش راہی صاحب کی سات غزلیں شمارے میں شامل کرکے آپ نے اپنا اردو پر احسان کیا ہے جس کے لئے آپ شکریے کے مستحق ہیں۔

▲ بلراج حیرت (دہلی)

○ سہیل ہر ماہ پابندی سے مل رہا ہے۔ پچھلے شمارے کے بارے میں کچھ لکھنے ہی والا تھا کہ اس ماہ کا شمارہ بھی مل گیا۔ دراصل مجھے ڈاکٹر علیم اللہ حالی کا سفرنامہ بہت پسند آرہا ہے۔ "ہم مسافر جہاں جہاں گزرے" عنوان ہی بہت پیارا ہے اور پھر ڈاکٹر حالی کی تحریر بہت مزہ دے رہی ہے۔ سفرنامہ کی زبان بہت علمی ہے۔ عموماً سفرنامے انشائیوں کی طرح لکھے جاتے ہیں مگر حالی صاحب نے اس کی علمی سطح بہت بلند رکھی ہے۔ میں تو ڈر گیا تھا کہ کہیں یہ سفرنامہ ختم نہ ہوگیا ہو۔ پچھلے مہینے اس کا اختتام "جاری" کے ساتھ نہیں ہوا تھا۔ ڈاکٹر علیم اللہ حالی کا گھر ہمیشہ سہی مگر میں جب کبھی "گیا" جاؤں گا۔ ان کو ڈھونڈ کر ملوں گا۔ یا وہ حیدرآباد تشریف لائیں تو ان کی خدمت میں حاضر ہوکر مجھے خوشی ہوگی۔

پچھلے شمارے میں اصغر علی انجینیر کا مضمون اچھا ہے مگر بہت زیادہ روشن خیالی کو minimise کرکے پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ دراصل یہ ایک حساس موضوع ہے۔ احمد فراز کی شاعری پر بہت ہلکا پھلکا مضمون ہے۔ ڈاکٹر قمر رئیس صاحب نے موضوع ہی کچھ ایسا منتخب کیا ہے کہ "احتجاج" نہیں کیا جاسکتا۔

ارشد مسعود کی جو تخلیقات نظموں کے نام سے پیش کی گئی ہیں وہ ٹھیک ہی ہیں۔ آئندہ چند برسوں میں ایسی ہی نظمیں لکھی جاسکتی ہیں کیونکہ اردو کی آئندہ نسل

[illegible] اور بیان سے کوری ہی تو ہوگی۔ خیال سب کچھ نہ ہو جائے گا۔ پیش کش بے معنی ہو جائے گی۔ لوگ خیال کو داد دینا تو چاہتے ہیں مگر آہنگ کے حسن کے ساتھ۔ اس میں آہنگ اور فنی رچاؤ کی امید بھی رکھتے ہیں۔

اہل کراچی کے لئے صاحب کرامات رفیق جابر کی غزلیں اور اہل کراچی کی سوغات اور کرامات کا مزہ رکھتی ہیں۔ یہ غزلیں پڑھ کر اہل کراچی پر کیا گزرے

▲ رؤف خیر (حیدرآباد)

○ یہ اعتراف تو کرنا ہی ہوگا کہ اب سہیل ہمہ گیریت کا حامل ہے اور صاف ستھرا انداز بیان پابندی سے [illegible] ہے۔ اگر یہ ایک اسٹالوں پر نظر آئے تو اور اچھا ہو گا۔ آج کل ایک اسٹالوں پر ایسے جرائد دکھائی دیتے ہیں جن کو ادب سے واسطہ نہیں۔ اردو پڑھنے والوں کے لئے اور ذہنی رُخ کو بدلنے کے لئے سہیل جیسے رسالوں کا اسٹالوں پر ہونا ضروری ہے۔

▲ شاہد الایمان (کلکتہ)

○ سہیل کے دونوں شمارے مل گئے۔ بہت اچھے ہیں۔ ڈاکٹر قمر رئیس کا مضمون "احمد فراز کی شاعری میں احتجاج" بہت اچھا ہے۔ اس کے علاوہ عظیم فیروز آبادی کا مضمون اور [illegible] کی بھی اچھا لگا۔ ارشد مسعود ہاشمی کی [illegible] بھی لائق التفات ہیں۔ پچھلے دوسرے شمارے میں [illegible] اور ڈاکٹر [illegible] ایک ایسا مضمون [illegible] ڈاکٹر [illegible] [illegible] ظاہر کیا ہے۔ میں ڈاکٹر تارا چرن رستوگی کو [illegible]

ادب کا ایک اچھا محقق اور نقاد تسلیم کرتا ہوں۔ بلاشبہ وہ باقیات الصالحات میں ہیں۔ اس سے قبل بھی رستوگی صاحب نے بعض فکر انگیز مقالے غالب اور اقبال کے سلسلے میں مختلف ادبی جرائد میں لکھے ہیں۔ جن سے تمام ارباب فکر و فن کو روشنی ملتی ہے۔

بہرحال سہیل ایک ادبی رسالہ ہے۔

▲ خورشید سمیع (مظفر پور)

○ آپ نے بالکل بجا فرمایا ہے کہ فنکار کو ہیئتوں کی زنجیر پہنانا اس کی تخلیقی آزادی کو سلب کرنے کے مترادف ہے۔ ارشد مسعود ہاشمی کی نثری نظمیں تخلیقی فن پارے کا عمدہ نمونہ ہیں۔ ہماری طرف سے انہیں مبارکباد دیدیں۔ ہنس راج رہبر کی کہانی نے اچھا تاثر قائم کیا ہے علیم اللہ حالی اچھا جا رہے ہیں۔ احمد فراز کی شاعری کے متعلق احمد فراز کا مضمون تشنہ ہے۔ ایک عرصے کے بعد۔ بلکہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ سہیل میں پہلی بار مزاحیہ تخلیق میری نظروں سے گذری

▲ راشد انور راشد (رانچی)

○ سہیل کا تازہ شمارہ ملا۔ شکریہ ! ڈاکٹر قمر رئیس اور غلام ربانی کے مضامین اپنی اپنی نوعیت پر بھرپور ہیں۔ ویسے تمام مشمولات اچھے اور معیاری ہیں۔ شعری تخلیقات کے انتخاب میں کچھ اور [illegible] برتتے۔

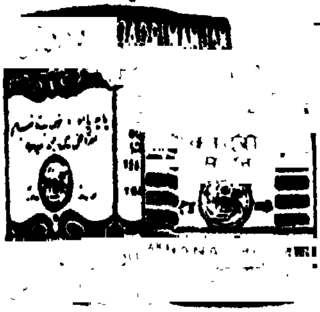
▲ نوشاد احمد کریمی (کٹیہار)

گھر کے ہر فرد کا محافظ

زعفرانی

ایک حیرت انگیز پیشکش

چوٹ، موچ، درد، زخم، کٹے، جلنے،
ورم، ناگہانی حادثات اور بچوں
کی مالش میں کام آنے والا تیز اثر
اور فائدے بیشمار۔



قادری منجن

پائیریا، خون و پیپ کا آنا،
ہلتے ہوئے دانتوں کو جمانے
اور دانتوں کے جملہ امراض میں
اکسیر ہے۔

قادری منجن کے انعامی کوپن جمع کریں اور سو مختلف
مفت انعامات سے رسٹ واچ سمیت بالکل مفت
حاصل کریں۔ انعامی تفصیل کوپن پر درج
کردی گئی ہے۔

Regd. P. & T. Gaya – 4 *R.N.I. Regd. No 3520/57*

The SOHAIL Monthly River Side Road, Gaya—823001

51 years of Publication Phone : 21573